سُن تو سہی
مشتاق احمد یوسفی کی منتخب تحریریں
مرتبہ
ڈاکٹر انور سدید
خواجہ عبدالرحمٰن طارق

ع سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا

(آتش)

سُن تو سہی

مشفق خواجہ کی منتخب تحریریں

مرتبین

ڈاکٹر انور سدید

خواجہ عبدالرحمٰن طارق

پورب اکادمی، اسلام آباد

طبع اول: مارچ 2008ء
ناشر: پورب اکادمی، اسلام آباد
فون نمبر: 051 - 538 29 67, 0301 - 559 58 61
ای میل: info@poorab.com.pk
ویب سائٹ: www.poorab.com.pk

Su'n tu Sahi

by: Mushfiq Khawaja

compiled by: Dr. Anwar Sadaid, Khawaja Abd-ur-Rehman Tariq

Published by: Poorab Academy, Islamabad, Pakistan

ISBN: 969-8917-54-3

۸۹۱٫۴۳۹۵

مش ف مشفق خواجہ

سن تو سہی: مشفق خواجہ کی منتخب تحریریں / مشفق خواجہ، مرتب: ڈاکٹر انور سدید،
خواجہ عبدالرحمن طارق۔ - اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۰۸ء
۳۰۸ ص

۱۔ اردو - ادبی کالم
۱۔ ڈاکٹر انور سدید ۲۔ خواجہ عبدالرحمن طارق

نتاشا اور مامون کے نام
جن کی ذہانت کے
جی نانا (مشفق خواجہ مرحوم)
بھی معترف تھے۔

فہرست

کچھ وقت خامہ بگوش (مشفق خواجہ) کے ساتھ

میں نے مشفق خواجہ (مرحوم) (خامہ بگوش) کے شہرۂ آفاق کالم "سخن در سخن" کی چوتھی جلد "سخن ہائے گسترانہ"[1] کا پیش لفظ لکھا تو انھیں ان خوش قسمت آدمیوں میں شمار کیا جنھیں اپنے عنفوانِ شباب میں بابائے اُردو مولوی عبدالحق کے ساتھ ان کی زندگی کے آخری چند برسوں میں علمی و ادبی کام کرنے، ان کی خدمت میں حاضر رہنے اور ان کا اعتماد اور موافقت حاصل کرنے کا اعزاز حاصل ہوا۔ مشفق خواجہ فروری ۲۰۰۵ء میں کچھ عرصہ بیمار رہنے کے بعد فوت ہو گئے تو ان کی وفات کو اس صدی کے چند بڑے ادبی المیوں میں شمار کیا گیا اور ان کی ہمہ جہت شخصیت اور ادبی خدمات کا اعتراف پوری اُردو دنیا میں وسیع پیمانے پر کیا گیا۔ اس ادبی سانحے پر مرحوم کے حوالے سے جو تعزیتی اور تاثراتی تحریریں اخبارات اور رسائل میں شائع ہوئیں ان کو کتابی صورت میں محمد عالم مختار حق صاحب نے مرتب کر کے اشاعت کی منزل تک پہنچایا[2] اور ان سے اپنی محبت کی نسبت قائم رکھنے کے لیے کتاب کا نام "مشفق من، خواجۂ من" رکھا۔ وہ مشفق خواجہ صاحب مرحوم کے ذاتی دوستوں میں سے تھے۔ باہمی دلچسپی کے موضوعات پر خطوط کا تبادلہ دونوں کا معمول تھا۔ خواجہ صاحب کی خطوط کی ادبی اہمیت سے محمد عالم مختار حق شناسا تھے۔ انھوں نے ان خطوط کو محفوظ رکھا اور ان کی وفات کے بعد یہ ادبی امانت قوم کے سپرد کرنے کے لیے "مشفق نامے" کے عنوان سے شائع کر دی۔[3] مشفق خواجہ فطری طور پر استغنا پسند تھے، شہرت سے شعوری طور پر گریز کرتے تھے۔ اپنی زندگی میں انھوں نے اپنے بے مثال کارناموں پر کسی کو لکھنے کی اجازت نہیں دی۔[4] وہ ہندوستان گئے تو کئی ادبی انجمنوں نے ان کے اعزاز میں تقریبات منعقد کرنے کا ارادہ ظاہر کیا لیکن انھوں نے سب سے معذرت کر لی۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے اس صورتِ حال میں تحریری اظہار کا راستہ نکالا اور صرف تین دن میں خواجہ صاحب کے دوستوں، مداحوں اور عقیدت مندوں سے ان کے فن اور شخصیت پر مضامین لکھوا کر ایک کتاب شائع کر دی[5] جو ہندوستان اور

پاکستان میں اپنی نوعیت کی پہلی کتاب شمار کی گئی۔ کیونکہ پہلی بار کسی ادبی شخصیت کا استقبال اس کے فن، ادب اور شخصیت کے بارے میں لکھی گئی کتاب سے کیا جا رہا تھا۔ اہم بات یہ ہے کہ گزشتہ ۳۲ برس کے دوران خواجہ صاحب کے سوا یہ اعزاز کسی اور ادیب کو حاصل نہیں ہوا۔ جب کہ حقیقت یہ بھی ہے کہ ان کی زندگی میں ان کو بتائے بغیر کئی اصحاب ان پر تحقیقی وتنقیدی نوعیت کا کام کرتے رہے ہیں۔ میں یہاں وحید الرحمٰن خان کی کتاب "خامہ بگوش..... ایک مطالعہ"[۶] اور شاہ نواز فاروقی کی کتاب "اکابر صحافت"[۷] کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں۔ ان میں سے اوّل الذکر خواجہ صاحب کی زندگی میں اور موخر الذکر ان کی وفات کے بعد شائع ہوئی لیکن اس کی تکمیل ان کی زندگی میں ہو چکی تھی۔

مشفق خواجہ (مرحوم) کی ایک خوش قسمتی کا ذکر اوپر کر چکا ہوں۔ مجھے اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کہ انھوں نے اس احسان فراموش اور محسن کش زمانے میں زندگی بسر کی لیکن انھوں نے اپنے بزرگوں کے "ملی لاج" کے مزاج کو قائم رکھا جہاں ہر شام ڈاکٹر اقبال، شیخ عبدالقادر، مولوی احمد دین، مفتی عبداللہ ٹونکی، خواجہ رحیم بخش، سیّد مہر شاہ وکیل، خلیفہ نظام الدین، خواجہ امیر بخش، شیخ گلاب دین، شہاب الدین، خواجہ کریم بخش اور مولوی محمد حسن جیسے نامور معماران تہذیب وتمدن جمع ہوتے تھے[۸] اور قومی اور ادبی مسائل پر بحث کرتے اور بالواسطہ طور پر نئی نسل کی تربیت کرتے تھے۔ مشفق خواجہ کے والد گرامی خواجہ عبدالوحید ان محفلوں کے عینی شاہد بھی تھے اور جب ان کا شعور پختہ ہو گیا تو انھوں نے شرکائے محفل کی گفتگو سے استفادہ بھی کیا۔[۹] خواجہ عبدالوحید کے کریمانہ انداز مشفق خواجہ کو منتقل ہوئے تو انھوں نے اپنے عہد کے منفی اثرات قبول کرنے کی بجائے ادب کے ضمیر کثیر کو خسروانہ انداز میں تقسیم کرنا شروع کر دیا اور یہ سلسلہ ان کی وفات تک جاری رہا۔ یہاں بھی اس واقعے بلکہ سانحے کا ذکر ملال سے کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اُردو کے ایک مقبول ترین ادیب، جس نے اپنی زندگی کے کم از کم ۷۰ برس ادب کی "سروس" میں خرچ کر دیے تھے اور سینکڑوں نئے لکھنے والوں کی نظمیں، غزلیں، افسانے اور مضامین اپنی سرخ روشنائی سے درست کر کے اپنے رسائل میں شائع کیے اور ادب کی بلند مسند پر بٹھایا تھا، وفات کے صرف چند ماہ بعد ہی بھلا دیے گئے۔[۱۰] غزلیں چھپوانے والوں نے نئے نئے آشیانے تلاش کر لیے۔ ان کا عالم آرا جریدہ، جو ادب کے افق پر چالیس برس تک "ترقی پسند" روشنیاں بکھیرتا رہا، بند کر

دیا گیا۔ لیکن مشفق خواجہ کو ان کی معاودتِ کریمانہ سے فیض یاب ہونے والے انھیں تحریری طور پر یاد کر رہے ہیں۔ ماہنامہ "قومی زبان" کراچی، دو ماہی "سویرا" لاہور، "مکالمہ" کراچی، "الحمرا" لاہور، "خیال" کراچی، "الاقربا" اسلام آباد، "الزبیر" بہاول پور، "روشنائی" کراچی اور "عبارت" حیدر آباد میں ان پر گوشے چھپ چکے ہیں اور ان پر مزید کتابیں شائع کرنے کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ اکابرینِ ادب ان کو تحریری طور پر یاد کر رہے ہیں۔ میں یہاں چند اقتباسات پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں جن میں ان کی شخصیت اور ادبی کارناموں کا ذکر دل سے نکلتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

ڈاکٹر اسلم فرخی

"خواجہ صاحب اہلِ علم کی تکریم کرتے تھے۔ طلبہ اور تحقیق وجستجو کا کام کرنے والوں کی مدد کرتے تھے۔ لوگ خطوط کے ذریعے ان سے استفادہ کرتے تھے۔ اتوار کی صبح ان کے یہاں اذنِ عام ہوتا تھا۔ بہت لوگ جمع ہوتے تھے۔ یہ کراچی کے ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کا بڑا فورم تھا، ان کی وفات سے یہ فورم بھی ختم ہو گیا...... حاشیہ نگاری میں انھوں نے کمال حاصل کر لیا تھا۔ "کلیاتِ یگانہ" کے حواشی اس کا منھ بولتا ثبوت ہیں۔"

(مرے مشفق محسن ...... ایک معرکہ مستانہ"، "قومی زبان"، کراچی، مشفق خواجہ نمبر، ص ۳۱،۲۹، فروری ۲۰۰۶ء)

جمیل الدین عالی

"ان کا نام عبدالحی تھا۔ خواجہ خاندانی نسبت، تخلص مشفق۔ کارناموں میں سب سے بڑا یہ کہ مجھ جیسے محض تخلیقی شوق رکھنے والے کو اردو کی بڑی بھلی خدمت میں لگا دیا۔ کتابیں مقدار کے لحاظ سے کم لکھیں مگر اپنا مثالی معیار رکھتی ہیں، واللہ کہ اگر وہ صرف شاعری ہی کرتے تب بھی "ابیات" زندہ جاوید ثبوت ہے۔ عصرِ حاضر کے نمایاں ترین شعرا میں بھی ایک اعلیٰ مقام کے حامل ہوتے ("ابیات" پر بھرپور توجہ کیجیے تو اب بھی ہیں)۔ "غالب اور صفیر بلگرامی" (ایک تحقیقی مطالعہ)، "تذکرہ خوش معرکہ زیبا" کی تدوین (بڑی ہی محنت کا کام)، "جائزہ مخطوطاتِ اُردو" (تحقیق و تدوین)، "تحقیق نامہ"، خامہ بگوش کے نام سے ادبی طنزیات کے دو مجموعے "سخن در سخن" اور "سخن

باتے ہی گفتنی" دراصل ان کی طرح یہ سلسلوں کے انتخابات ہیں..... اور یہ بھی غیر ناقد کی نہیں بڑے بڑے اہل نظر کی رائے ہے کہ معاصرین میں جناب مشتاق احمد یوسفی کا مقام تو گویا ایک بے مثال کرامت کی حیثیت رکھتا ہے...... بلاتکلف خواجہ صاحب کی سی ذکاوت، قدرتِ تحریر، بلاغت اور کاٹ پاک و ہند اُردو میں کہیں اور نظر نہیں آتی۔"

("مشفق خواجہ ہمہ صفت نادرِ روزگار شخصیت تھے۔" روزنامہ "جنگ"، لاہور، ۲۸ فروری ۲۰۰۵ء)

سجاد میر

"خواجہ صاحب تحقیق کے ایسے آدمی تھے کہ دور دور تک ان جیسا کوئی دوسرا نظر نہیں آتا۔ جانے کتنے لوگوں کی تحقیقات خواجہ صاحب کی مرہونِ منت ہیں۔ ان کے دروازے سب کے لیے کھلے تھے اور فیض سب کے لیے عام تھا۔ ان کا کتب خانہ صرف کتابوں کا ڈھیر نہیں تھا بلکہ یہاں جو کچھ تھا، وہ سب ان کے ذہن میں تھا۔ برصغیر میں جو کتاب چھپتی جب تک ان تک نہ پہنچ پاتی، بیکار رہتی..... ایک کمال کی بات یہ ہے کہ محققین کو عام طور پر تنقیدی اور تخلیقی صلاحیتوں سے عاری سمجھا جاتا ہے یا کم از کم یہ سوچا جاتا ہے کہ ان میں شگفتگی نام کی چیز نہیں ہوتی۔ جیسی بامعنی شگفتہ تحریریں خواجہ صاحب نے لکھی ہیں، وہ اس خیال کو غلط ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں۔ عام زندگی میں بھی وہ بڑے ہی نفیس اور خوشدل شخصیت تھے..... ان جیسا کوئی دوسرا نہیں ہے۔ اس شہر (کراچی) میں نہیں..... اس ملک میں بھی اور دوسرے برصغیر میں بھی بلکہ جہاں جہاں اُردو بولی اور سمجھی جاتی ہے وہاں وہاں تک..... اس شہر کے سر سے تو علم کا سایہ اٹھ گیا ہے۔ اس کا حافظہ چھن گیا ہے۔"

("ہمارے خواجہ صاحب!" بحوالہ "مشفق من، خواجۂ من" مرتبہ محمد عالم مختار حق، ص ۴۰، حوالہ ایضاً)

ڈاکٹر ممتاز احمد خان

"خواجہ صاحب..... عظیم المرتبت شخصیت کے مالک اس لیے بھی ہے کہ شہرت اور نام و نمود سے دور رہے..... خواجہ صاحب کی خوبی یہ تھی کہ دنیا سے الگ تھلگ رہنے کے باوجود پوری ادبی دنیا کے ہر شہر اور ہر قصبے میں جاری و ساری ادبی و علمی سرگرمیوں سے واقف تھے۔ ہر کام کی تحریر پڑھتے تھے۔ کتابیں خریدتے تھے۔ انھیں اپنی لائبریری کی سائنسی انداز میں زینت بناتے

تھے..... انڈیا پاکستان سے اور دوسرے ممالک سے آنے والے استفسارات کا وہ شافی جواب اسی وجہ سے دے پاتے تھے جس سے لوگ ان کے ممنونِ احسان رہتے۔ افسوس کہ اب وہ دروازہ بند ہو گیا ہے۔"

("مشفق خواجہ۔ گنجینۂ محض رخصت ہوا" بحوالہ "مخزن"، لاہور، شمارہ نمبر ۹، ۲۰۰۵ء)

پروفیسر اُسلوب احمد انصاری

"مشفق خواجہ بہ حیثیت انسان بڑی خوبیوں کے حامل تھے۔ ساتھیوں کی مثل وہ مہر و محبت، لطف و کرم اور صدق و صفا کا پیکرِ مجسم تھے۔ تصنع اور ریاکاری سے تمام تر منزہ۔ محاورۂ سخن کو بدل کر ہم ان کے بارے میں کہہ سکتے ہیں:

"He was a man without a mask."

وہ محقق ہونے کے باوصف قدیم اور جدید تخلیقی کارناموں سے نہ صرف واقفیت رکھتے ہیں بلکہ ان کے حسن و قبح کو بڑے خوشگوار انداز میں متعین کرنے اور جانچنے کا بھی ان میں غیر معمولی ملکہ ہے۔"

("مشفق خواجہ کی یاد میں" ماہنامہ "قومی زبان" "مشفق خواجہ نمبر" ص ۳۲، ۲۷ فروری ۲۰۰۶ء، کراچی)

ڈاکٹر انور محمود خالد

"مجھے گزشتہ ۳۰ برسوں میں بے شمار لوگوں سے مشفق خواجہ کے بارے میں گفتگو کا موقع ملا اور میں برملا اعتراف کرتا ہوں کہ وہ واحد آدمی ہیں جن کی تعریف میں ہر شخص رطب اللسان تھا۔ میں نے کسی صاحبِ علم سے ان کی برائی نہیں سنی..... میرا تجربہ اور مشاہدہ یہ ہے کہ ان میں کمزوریاں نہ ہونے کے برابر تھیں۔ انھیں کسی سے کوئی شکایت نہیں تھی اور نہ کوئی ان کے رویے سے شاکی تھا۔ اپنے ادبی کالموں میں البتہ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ ہلکی پھلکی چھیڑ چھاڑ کر لیا کرتے تھے..... مشفق خواجہ کی سو خوبیوں کی ایک خوبی یہ تھی کہ وہ دلآزاری سے کوسوں دور تھے۔"

("مشفق خواجہ مرحوم کی یاد میں" بحوالہ ماہنامہ "الحمرا"، لاہور، اپریل ۲۰۰۵ء)

شفقت رضوی

"وہ ادب کا ایک مستحکم ستون تھے۔ ان کا علمی و ادبی قد بہت اونچا تھا کہ معاصرین میں ان کے برابر کا کوئی نہیں تھا۔ وہ ہر چاہنے والے اور ہر اجنبی سے پیار کرنے کے ساتھ ان کا احترام بھی کرتے حالانکہ وہ اس کے متقاضی کبھی نہ رہے۔ وہ نادانستہ اس اصول کے پابند رہے کہ پہلے دوسروں کا احترام کرو تاکہ وہ تمہارا احترام کرنا سیکھ جائیں۔ ان کی علمی فضیلت کی طرح ان کے اخلاص کی شہرت چار دانگ عالم میں تھی دور دراز کے ملکوں سے لوگ اشتیاقِ ملاقات میں ان کے ہاں حاضری دیتے۔ علم اور اخلاص کی دولت سمیٹ کر لوٹتے..... کہنے کو مشفق خواجہ ایک شخص تھے لیکن ان کی شخصیت پہلو دار تھی۔ وہ ایک پیکر تھے مگر ان کے کئی روپ تھے اور ہر روپ میں وہ درجہ کمال پر تھے اور منفرد تھے۔"

("مشفق سُن، خواجہ مَن"، ماہنامہ "قومی زبان" "مشفق خواجہ نمبر" فروری ۲۰۰۶ء، ص ۱۵۵، کراچی)

مشفق خواجہ کی وفات پر اہلِ ادب نے گہرے رنج و غم کا اظہار کیا اور ان کی خوبیوں اور نیکیوں کو جس والہانہ انداز میں یاد کیا، اس کی مثال کم از کم مجھے دستیاب نہیں۔ وہ خود اہلِ علم، اہلِ قلم اور اہلِ ادب و دانش میں کتنی دلچسپی لیتے تھے، اس کی ایک جھلک پروفیسر مختار الدین احمد نے اپنے نام آئے ہوئے مشفق خواجہ کے خطوط کی روشنی میں مرتب کی ہے۔ معاصرین اور احباب کا یہ تذکرہ ماہنامہ "قومی زبان" کے ۴۳ صفحات پر محیط اور نادر معلومات پر مشتمل ہے۔ (۱۲) مختار الدین احمد سے ان کی خط و کتابت ۱۹۵۶ء میں شروع ہوئی اور سالِ وفات ۲۰۰۵ء تک جاری رہی۔ انھوں نے لکھا ہے:

"میرے نام خواجہ صاحب کے خطوط کی تعداد ۱۰۰ سے زائد ہی ہوگی۔ وہ نثر میں تکلف اور تصنع کے قائل نہ تھے۔ نہ مسجع زبان لکھتے تھے۔ ان کی نثر سادہ و پُرکار ہوتی تھی۔ یہی انداز ان کے خطوں میں بھی نمایاں تھا۔ وہ چھوٹے چھوٹے فقرے لکھتے تھے اور بہت سادہ لیکن واضح انداز میں اپنی بات مکتوب الیہ تک پہنچانے میں بھرپور قدرت رکھتے تھے۔ وہ کبھی کبھی جب موج میں ہوتے تو اپنے مکتوب الیہ پر اعتبار کر کے ایسی باتیں بھی لکھ جاتے تھے جو دوسرے عام طور پر

خطوں میں نہیں لکھتے۔ وہ اپنے خطوط کی اشاعت پسند نہیں کرتے تھے۔ لیکن کسی نے ان کا کوئی خط چھاپ دیا تو برا بھی نہیں مناتے تھے۔" (۱۳)

ان خطوط میں خواجہ صاحب نے اپنی زندگی کے بعض حالات اور کوائف بھی لکھے ہیں۔ مختار الدین احمد صاحب نے ان حصوں کی تدوین اس طرح کر دی ہے کہ ان کی شخصیت کی صحیح تصویر بنانے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ مشفق خواجہ خود اپنی شخصیت کے بارے میں خطوط میں بہت کم باتیں کرتے لیکن استفسار پر سب کچھ کہہ جاتے تھے۔ اپنی کالم نگاری کے بارے میں ۲۳ر مارچ ۱۹۹۰ء کے خط سے اقتباس:

"آپ نے میری کالم نویسی کی تفصیلات دریافت کی ہیں تو عرض ہے کہ یہ کام میں نے ۱۵ر نومبر ۱۹۷۰ء سے شروع کیا تھا۔ الطاف حسن قریشی نے کراچی سے روزنامہ "جسارت" جاری کیا تھا۔ ۱۲ر اپریل ۱۹۷۱ء تک میں اس میں روزانہ ایک کالم "اندیشۂ شہر" کے عنوان سے اور "غریبِ شہر" کے نام سے لکھتا رہا۔ پھر ۱۹۷۷ء سے ۱۹۷۸ء میں نو ماہ تک یہ کام کیا۔ پھر ۱۹۸۱ء سے ۱۹۸۳ء تک ۲۷ ماہ کالم لکھا۔ "سخن در سخن" (خامہ بگوش) کا سلسلہ ہفت وار تھا۔ جو ۸۲ء سے ۸۴ء کے شروع تک "جسارت" میں لکھا۔ پھر ۲۳ر مارچ ۸۴ء سے "تکبیر" میں لکھ رہا ہوں۔ ۱۹۷۱ء میں کچھ عرصہ "ورقِ ناخواندہ" اور "خامہ بگوش" کے نام سے "زندگی" میں کچھ کالم لکھے۔ ۱۹۷۴ء میں روزنامہ "صداقت" کراچی میں "سخن در سخن" اور "سخن جملہ" کے نام سے کالم نگاری کی۔ ۱۹۶۵ء میں "سنا آپ نے؟" کے عنوان سے ریڈیو پاکستان سے ایک روزانہ کالم نشر ہوتا تھا۔ غرض یہ کہ اس کام میں خاصہ وقت صرف کیا۔ سچی بات یہ ہے کہ اس کام میں کبھی دل نہیں لگا۔ جب بھی لکھا اپنی طبیعت پر جبر کر کے لکھا۔ مجھ سے فرمائش پر کچھ لکھا نہیں جاتا اور یہی وجہ ہے کہ بار بار میں اس کام کو چھوڑتا رہا۔ مگر تقاضوں سے مجبور ہو کر دوبارہ شروع بھی کرتا رہا۔ میں کسی طرح نہیں چاہتا کہ یہ کام میری پہچان بنے۔" (۱۴)

مشفق خواجہ اپنے کالموں میں صداقت اور حقیقت کو "سخن گسترانہ" انداز میں لکھنے سے گریز نہیں کرتے تھے۔ اور وہ تصنیف اور صاحبِ تصنیف کو جس طرح متعارف کراتے اس کی

انفرادیت سب کو متاثر کرتی۔ حتیٰ کہ ان کا "تختۂ مشق" بننے والا اپنی نئی کتاب چھاپتا تو فرمائش کر کے کالم لکھواتا۔ اس ضمن میں وہ لکھتے ہیں:

"کالم کے بارے میں آپ نے جو کچھ لکھا ہے، معاملہ اس کے برعکس ہے۔ یقین کیجیے کہ اکثر لوگ فرمائش کر کے کالم لکھواتے ہیں اور جو کچھ میں لکھتا ہوں، اس کی شکایت کرنے کے بجائے، شکر گزار ہوتے ہیں۔ شہرت طلبی نے اچھے اچھے لوگوں کو اس حد تک گرا دیا ہے کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ اخبار میں کچھ نہ کچھ آتے رہنا چاہیے، وہ خلاف ہی کیوں نہ ہو۔"(۱۵)

پروفیسر مختار الدین احمد کو ایک اور خط میں لکھا:

"......"سخن در سخن" میرے لیے عذاب جان ہے۔ بہت ضروری کاموں کو چھوڑ کر یہ کام کرنا پڑتا ہے۔ آپ کو حیرت ہوگی کہ لوگ اصرار کر کے اپنے بارے میں کالم لکھواتے ہیں اور جب چھپ جاتے ہیں تو شکریہ ادا کرتے ہیں۔ لوگوں کا نظریہ یہ ہے کہ نام سامنے آنا چاہیے۔ اس کا نتیجہ رسوائی ہی کیوں نہ ہو......"

ان دو اقتباسات سے اور مجموعی تاثرات سے یہ حقیقت تسلیم کرنی ناگزیر ہے کہ خامہ بگوش (مشفق خواجہ) کے کالم "سخن در سخن" شخصی اور خصوصی تصاویر کا مرقع ہیں اور قلم سے پورٹریٹ اس طرح تیار کیے گئے ہیں کہ زیرِ بحث مصنف کی داخلی ناہمواریاں اور کمزوریاں بھی منکشف ہوتی چلی گئی ہیں۔ کشادہ ظرف لوگوں نے "خامہ بگوش" کو ادب کا محتسب اعلیٰ تسلیم کیا اور انھیں صداقت پر مبنی فیصلہ سنا دینے پر کھل کر داد دی۔ لیکن "بعض تنگ نظر افراد نے انھیں خطرناک اور بعض ستم رسیدوں نے خوفناک تک قرار دیا۔"(۱۷) تاہم میرا خیال ہے کہ خامہ بگوش (مشفق خواجہ) اردو ادب کے جزر و مد میں خود بھی شریک نظر آتے ہیں، انھیں ادب، ادیب اور ادبی معاشرے کی ہر کروٹ کا علم ہوتا تھا لیکن وہ اتنے باحوصلہ تھے کہ حق بات کہنے سے گریز نہ کرتے اور حق بات بھی اس طرح کہتے کہ ادب اور شخصیت کی ناہمواری یا کجی ظاہر ہو جائے لیکن کردار شکنی نہ ہو۔ بلکہ قاری کے ہونٹوں پر ایک لطیف سی مسکراہٹ بے اختیار اُبھر آئے جو اس کے اندر کی داد کی آئینہ دار ہو۔ "خامہ بگوش" (مشفق خواجہ) کی انفرادیت یہ ہے کہ وہ کسی ایک مخصوص سمت میں قلم کو دوڑانے کے بجائے اپنی نظر چاروں اطراف میں دوڑاتے ہیں اور بعض اوقات تو مصنف کے بھیتر میں بھی

گھس جاتے اور طنز و ظرافت کی پھلجھڑیاں بکھیرتے چلے جاتے ہیں اور دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ کام کی بات جو کہنا چاہتے ہیں اور جس کی حیثیت بنیادی بھی قرار دی جا سکتی ہے، اس سے صرفِ نظر ہرگز نہیں کرتے بلکہ مظفر علی سید کی اس بات کو ہمیشہ مدِ نظر رکھتے نظر آتے ہیں کہ ان دنوں سنجیدہ ترین باتیں مزاح ہی مزاح میں کہی جا سکتی ہیں۔(۱۸) ان کے اس عمل کی ایک مثال اس کالم سے دی جا سکتی ہے جو انھوں نے پشاور کے رسالہ "جریدہ" (مدیر: تاج سعید) کے "احمد فراز نمبر" پر لکھا تھا۔ اس کالم کا "ابتدائیہ" یوں ہے:

"اس میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں کہ احمد فراز آج کے دور کا مقبول ترین شاعر ہے۔ اس کی مقبولیت کے اسباب کے بارے میں البتہ دو سے زیادہ رائیں پائی جاتی ہیں اور مقبولیت کا اظہار جن طریقوں سے ہوا ہے، ان میں سے بعض پر حدود آرڈی نینس کے تحت کارروائی ہو سکتی ہے۔"

تاج سعید (مدیر "جریدہ") نے غالب اور فراز میں مماثلت تلاش کی تو ان کی اس دلیل کو بالکل معقول قرار دیا جو بظاہر ہموار ہے لیکن اس میں مزاح کے عناصر "خامہ بگوش" (مشفق خواجہ) نے دریافت کیے ہیں:

"رسالے کے ابتدائیے میں وہ (تاج سعید) لکھتے ہیں، "مرزا غالب دہلی کے ایک کوچے بلی ماراں میں رہتے تھے تو احمد فراز نے پشاور کے ایک کوچے چڑی ماراں میں زندگی کے ابتدائی دن گزارے"..... بلی ماراں اور چڑی ماراں میں صوتی یکسانیت ہی نہیں معنوی مماثلت بھی پائی جاتی ہے۔ بلیماراں ملاحوں کا محلہ تھا۔ یہ ملاح بلیوں یعنی بانسوں سے کشتیاں کھیتے تھے۔ محلہ چڑی ماراں میں وہ لوگ رہتے تھے جو پرندوں کو پکڑنے کے لیے بانس استعمال کرتے تھے جن پر لاسا لگا ہوتا تھا۔ پھر ایک زمانہ ایسا آیا کہ ان محلوں میں بلیمار رہے، نہ چڑی مار..... صرف بانس باقی رہ گئے ہیں۔ لہٰذا اب یہ شاعروں کی قد و قامت ناپنے کے کام آتے ہیں۔"(۱۹)

انیس ناگی، اختر انصاری اکبر آبادی، نظیر صدیقی، منظر علی خان منظر اور انور سدید وغیرہ کی طرح "اردو کی مختصر ترین تاریخ" کے مؤلف ڈاکٹر سلیم اختر بھی ان کے کالموں کا مستقل کردار

ہیں۔ "خامہ بگوش" (مشفق خواجہ) ان کی تعریف و تحسین کے ہمیشہ پُرمزاح گوشے تلاش کر لیتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

"ڈاکٹر سلیم اختر ہمارے دیرینہ کرم فرما ہیں، وہ نہ صرف اپنی کتابیں عنایت فرماتے رہتے ہیں بلکہ گاہ گاہ دوسروں کی تصانیف بھیج کر بھی ہماری ادبی و علمی تربیت کا فریضہ انجام دیتے رہتے ہیں۔ ہمارے علم کا ۹۵ فی صد ڈاکٹر صاحب ہی کی عطا کردہ کتابوں کا مرہونِ منت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ باقی ۵ فی صد علم بھی ہمارے کسی کام نہیں آیا۔ افسوس کہ ڈاکٹر صاحب اپنی تصانیف خود نہیں پڑھتے۔ ورنہ آج وہ جس مقام پر جلوہ گر ہیں، اس سے کہیں زیادہ بلند مقام پر فائز نظر آتے۔ ڈاکٹر صاحب اپنی تصنیف کردہ کتابیں شاید اس وجہ سے نہیں پڑھتے جس وجہ سے ایک ہوٹل کا مالک اپنے ہوٹل کا کھانا نہیں کھاتا تھا۔ اپنا کھانا گھر سے منگواتا تھے۔ جب اس سے اس کا سبب پوچھا گیا تو اس نے بتایا، اگر اپنے ہوٹل کا کھانا کھا کر مجھے کچھ ہو گیا تو گاہکوں کی خدمت کون کرے گا؟"[20]

مشفق خواجہ اپنے فطری مزاج کے مطابق ایک ایسے محقق تھے جو ادبی صداقت کی جستجو میں مگن رہتا ہے۔ لیکن مبدائے فیاض نے انھیں تحقیقی مہارت کے ساتھ بات کو اس قدر گہری سنجیدگی سے پیش کرنے کا ملکہ بھی عطا کیا تھا کہ سیدھا اور سادہ جملہ ندرت آفریں ہونے کے علاوہ شتریت بھی پیدا کر دیتا اور جملے کا پس منظر مزاح کا آئینہ دار بن جاتا۔ ایک مثال حسبِ ذیل ہے:

"۳۵ برسوں سے ہم ظفر اقبال کی شاعری کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ یہ واحد شاعر ہے جس کا دریائے سخن سال بھر طغیانی پر رہتا ہے۔ طغیانی کا نتیجہ...... تعمیر و تخریب...... دونوں کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ تعمیر یہ کہ اطراف دریا کی پیاسی زمینیں دور دور تک سیراب ہو جاتی ہیں اور تخریب یہ کہ طغیانی کی زد میں آنے والی بستیاں اگر مکمل طور پر تباہ نہیں ہوتیں تو شکست و ریخت کے عمل سے ضرور گزرتی ہیں۔ ظفر اقبال کے دریائے سخن نے جہاں نئے نئے پھول کھلائے ہیں، وہیں پرانے درختوں کو بھی جڑ سے اکھاڑ پھینکا ہے۔"[21]

وہ ظفر اقبال کی شاعری کے طغیان میں غوطہ زنی کرتے کرتے جب اس کی نثر کی طرف

آئے تو ایک دلچسپ موازنے کا محل پیدا ہو گیا۔ ملاحظہ کیجیے:

"وہ جو مثل مشہور ہے کہ "سو سنار کی اور ایک لوہار کی"...... تو یہ پوری مثل ظفر اقبال پر صادق آتی ہے۔ وہ شاعری میں سنار اور نثر میں لوہار ہیں۔ وہ شاعری میں نقش گری کرتے ہیں اور نثر میں ہر نقش کو...... نیا ہو یا پرانا...... اپنی ضربِ قلم سے ملیامیٹ کر دیتے ہیں۔ وہ منفرد طنز و مزاح نگار ہیں۔ طنز ایسا کاری کہ جو اس کی زد میں آئے، کراہنے لگے...... اور مزاح ایسا صحت مند کہ طنز کے وار سے تڑپنے والا بھی ہنسنے لگے۔ ان کے اخباری کالم...... اخباری اداریوں سے بھی زیادہ خندہ آور ہوتے ہیں۔ حیرت ہے کہ وہ نثر میں لسانی مجتہد کا کردار ادا نہیں کرتے ہیں۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ لسانی خوش فعلیاں شاعری ہی میں چل سکتی ہیں۔ نثر میں ان کا مظاہرہ کیا جائے تو لکھنے والا دو قدم نہیں چل سکتا۔"[22]

ڈاکٹر شمیم حنفی نے درست کہا ہے کہ "یہ تحریریں طنز و مزاح کے طوفانی لمحوں میں بھی تمکین اور گہرائی دیتی ہیں۔ یہی پہلو بظاہر وقتی موضوعات پر لکھی جانے والی ان تحریروں کو ایک مستقل حیثیت دیتا ہے۔"[23] ادبی زوال کے اس نقشے پر بے شمار کتابیں اور ان گنت مصنف ابھرے اور خامہ بگوش (مشفق خواجہ) کی سنجیدہ لاتعلقی کے عمل کے دوران تخلیق مزاح کا باعث بن گئے۔ انھیں احساس تھا:

"ہم سے وہ لوگ عموماً ناراض ہو جاتے ہیں جن کو موضوع بنا کر ہم اظہار خیال کی جرأت کرتے ہیں۔"

انھیں احساس تھا کہ انھوں نے جو کچھ لکھا ہے ہمیشہ نیک نیتی سے لکھا ہے، لیکن اگلے ہی لمحے انھوں نے اس حقیقت کا انکشاف بھی کر دیا:

"مگر آج کل نیت کو کون دیکھتا ہے۔ صرف وہی دیکھا جاتا ہے جو کاغذ پر لکھا ہوتا ہے۔ کیا زمانہ آ گیا ہے کہ لکھنے والے کو غلط سمجھا جائے اور اس کی تحریر کو درست۔"[24]

خامہ بگوش کے بارے میں محمد خالد اختر کا یہ جملہ کئی مرتبہ اقتباس ہو چکا ہے کہ "ان کے قلم کا ۱۸ سالہ پانی نہیں مانگتا۔"[25] لیکن واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنے بسیط ادبی مطالعے کی اساس پر

ادیبوں کو نمود و نمائش سے احتراز کرنے اور تخلیق کاری کو اپنا انعام آپ باور کرانے کی کوشش کی۔ انھوں نے قاری کو معلومات سے سرفراز کیا اور ادیب کو اپنے اندر جھانکنے اور یہ سوچنے کی دعوت دی کہ......

سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا
کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا

حق گوئی و بے باکی کے اس عمل میں انھوں نے ادب کے اجتماعی عمل اور اصناف ادب کے تاثر پر نظر ڈالنے کی کاوش کی (۲۶) اور خاصے، بجھتے آفریں لیکن حقیقت افروز نتائج پیش کر دیے۔ چند اقتباسات ملاحظہ کیجیے:

"آپ بیتی لکھنا آسان بھی ہے اور مشکل بھی۔ آسان اس لیے کہ جھوٹ بولنا بعض لوگوں کے لیے بائیں ہاتھ کا کام ہوتا ہے۔ مشکل اس لیے کہ سچ بولنا اور وہ بھی اپنے بارے میں دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔ آپ بیتی میں کئی طرح کا جھوٹ سما جاتا ہے۔ ایک جھوٹ تو وہ ہے جو لکھنے والا دوسروں کے بارے میں بولتا ہے۔ اور دوسرا وہ جو لکھنے والا اپنی ذات کے حوالے سے بولتا ہے۔ پہلے جھوٹ کی تردید کی کبھی نہ کبھی کوئی صورت نکل ہی آتی ہے لیکن دوسری قسم کا جھوٹ پکڑنا بہت مشکل ہے۔ تا آنکہ لکھنے والا" حافظہ نباشد" کے تحت اپنے ایک جھوٹ کی تردید دوسرے جھوٹ سے نہ کر دے۔ آپ بیتیوں میں جھوٹ سے کام وہ لوگ لیتے ہیں جو خلق خدا کے درمیان اپنے آپ کو اونچے چبوترے پر بیٹھے ہوئے دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ ایسے لوگ عملی زندگی میں ناکامیوں اور مایوسیوں کو آپ بیتی کے ذریعے کامیابیوں اور کامرانیوں میں تبدیل کر دیتے ہیں، اس طرح آپ بیتی حقیقت کی ترجمان نہیں رہتی، محرومیوں کا ازالہ بن جاتی ہے۔" (۲۷)

"آج کل بعض اہل ادب کچھ اصناف ادب کو مقبول بنانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں۔ ایک طرف انشائیے کو اُردو کی آبرو بتایا جا رہا ہے تو دوسری طرف اُردو شاعری کے مستقبل کا خواب نثری نظم میں دیکھا جا رہا ہے۔

جو لوگ انشائیے اور نثری نظم کو بھاری پتھر سمجھتے ہیں انھوں نے نسبتاً ایک ہلکی صنف کا انتخاب کیا ہے جسے ہائیکو کہا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ جس طرح پاکستان میں جاپان کی سوزوکی کار چل گئی ہے، اس طرح جاپانی صنفِ سخن ہائیکو بھی چل جائے گی۔ یہ دونوں چیزیں اگرچہ یہیں "اسمبل" ہوتی ہیں لیکن سوزوکی کے ساتھ ہائیکو کا چلنا دشوار نظر آتا ہے۔ وجہ یہ کہ اول الذکر ایک کارآمد چیز ہے اور ثانی الذکر کے کارآمد ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ اس کا تعلق آمد کی بجائے آورد سے ہے۔" (۲۸)

"ایک صنف ادب ایسی بھی ہے جس کے لیے کوئی باقاعدہ تحریک نہیں چلائی جا رہی، اس کے باوجود یہ صنف حیرت ناک حد تک ترقی کر رہی ہے۔ اس کا نام ہے فلیپ نگاری...... کوئی بھی کتاب اٹھا کر دیکھ لیجیے اس کے فلیپ پر آپ کو چار چھ لوگوں کی ایسی تحریریں ضرور نظر آئیں گی جن میں کتاب اور مصنف دونوں پر مبالغے کا ملمع کیا گیا ہوگا۔ مصنف کے بارے میں عموماً اس قسم کی بات کی جاتی ہے کہ اگر موصوف پیدا نہ ہوتے تو ادب یتیم رہ جاتا۔ اور کتاب کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ اگر یہ لکھی نہ جاتی تو ادب میں ایسا خلا رہ جاتا جسے پُر کرنا ممکن نہیں تھا۔ یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے کہ آدمی اپنی جھوٹی تعریف سن کر خوش ہوتا ہے لیکن کسی کی جھوٹی تعریف لکھ کر خوش ہونا...... ایک سمجھ میں نہ آنے والی بات ہے؟" (۲۹)

"پچھلے چند برسوں میں ایک عجیب و غریب صنف ادب بڑی تیزی سے مقبول ہوئی ہے۔ اس کا نام ہے...... "انٹرویو"......

جس اخبار رسالے کو دیکھیے اس میں انٹرویو دینے اور لینے والوں کی قطاریں نظر آتی ہیں۔ جس طرح انشائیے کو فروغ دینے کے لیے دبستان سرگودھا نے ہائیکو کے لیے جاپانی سفارت خانے اور نثری نظم کے لیے انیس ناگی نے

تحریکیں چلا رکھی ہیں، اسی طرح کوئی تحریک "انٹرویو" کے لیے نہیں چلائی گئی۔ اس کے باوجود یہ صنفِ ادب ترقی کی منزلیں جس تیزی سے طے کر رہی ہے اتنی تیزی سے مجموعی طور پر ہمارے ادب نے تنزل کی منزلیں بھی طے نہیں کیں۔ اس صنف کی وجہ سے انٹرویو لینے والوں کا ایک ایسا طبقہ وجود میں آ گیا ہے جس کا ادب سے صرف اتنا ہی تعلق ہے کہ وہ ادیبوں سے الٹے سیدھے سوال کرتے ہیں اور ان سوالوں کے الٹے سیدھے جواب حاصل کر کے چھاپ دیتے ہیں۔ سوال عموماً اس طرح کے ہوتے ہیں...... آپ کو کون سا رنگ پسند ہے...... آپ کس طرح لکھتے ہیں...... بیٹھ کر، کھڑے ہو کر یا لیٹ کر...... آپ رات کو کس وقت سوتے ہیں اور کیوں...... خواب کیسے دیکھتے ہیں...... صبح اٹھنے کے بعد چائے پیتے ہیں یا لسی؟...... ظاہر ہے اس قسم کے سوالوں کے جواب کیا ہوں گے۔ جب ادب سے سنجیدہ تعلق ختم ہو جائے اور معاملہ زبانی جمع خرچ تک محدود ہو جائے تو اس قسم کی باتیں اچھی لگتی ہیں!"(۳۰)

مشفق خواجہ نے اپنی زندگی میں دو کام ایسے کیے جو اپنی ذات کی ترقی کو پسند کرنے کے اس دور کے مزاج کے خلاف تھے۔ اول یہ کہ جب وہ انجمن ترقی اُردو، پاکستان کے مختارِ کل سمجھے جاتے تھے، انجمن کے تمام منصوبے ان کے مشورے بلکہ فیصلے سے طے پاتے تھے اور انجمن ان کی شناخت اور حوالہ بن گئی تھی تو انھوں نے ۱۹۷۳ء میں اپنے عہدۂ جلیلہ کو اپنے ارادے سے چھوڑ دیا اور خانہ نشین ہو گئے۔ تا کہ اپنے تحقیقی منصوبوں پر جم کر کام کر سکیں۔ دوم، جب ان کا کالم "سخن در سخن" پوری اُردو دنیا میں بڑی دلچسپی سے پڑھا جا رہا تھا، لوگ ان کے گرویدہ و مشتاق ہو گئے تھے اور بقول ڈاکٹر خلیق انجم یہ روایت قائم ہو گئی کہ

"خامہ بگوش نے جس ہندوستانی شاعر کے مجموعۂ کلام پر تبصرہ کیا، اسے ساہتیہ اکیڈمی انعام مل گیا۔"(۳۱)

تو انھوں نے کالم نگاری ترک کر دی۔ چھوٹے چھوٹے وقفے تو اس سے پہلے بھی آتے رہے تھے اور ایک مرتبہ تو انھوں نے یہ وضاحت بھی کی:

"کالم نگاری چھوڑنے کے بے شمار اسباب تھے۔ سب سے بڑا سبب تو

ہم خود تھے کہ ہمیں اپنے کالموں میں یکسانیت نظر آنے لگی تھی۔ جیسے ہمارے کالم نہ ہوں منظور حسین یاد کے انشائیے ہوں۔ ایک ہی جیسی باتیں اور ایک ہی جیسا انداز اور ایک ہی جیسے لوگوں کا تذکرہ ہوتا تھا...... وہی انیس ناگی، وہی ساقی فاروقی، وہی ڈاکٹر انور سدید، وہی ڈاکٹر سلیم اختر، وہی بشیر بدر، وہی باقر مہدی اور حد تو یہ ہے کہ وہی لاغر مراد آبادی، جن کے سامنے ہم نے اپنے کالموں کی یکسانیت کا مسئلہ پیش کیا تو انھوں نے فرمایا، اُردو ادب کی دنیا محدود ہے۔ جب اس میں وسعت اور تنوع نہیں ہے تو آپ کے کالموں میں کوئی نئی بات کہاں سے آئے گی۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، بس اپنا فرض ادا کرتے رہیے۔ ہم نے پوچھا، ہمارا فرض کیا ہے؟ فرمایا، یہی کہ ایک ہی جیسی باتیں ایک ہی جیسے انداز میں لکھتے رہیے۔"(۳۲)

اس طویل طنزیہ و مزاحیہ جملۂ معترضہ سے قطع نظر انھوں نے اصل حقیقت مختار الدین احمد صاحب کو لکھی کہ

"میں کسی طرح نہیں چاہتا کہ یہ کام میری پہچان بنے۔"(۳۳)

یہ اچھا ہوا انھوں نے ۲۲ مارچ ۱۹۹۷ء کے بعد کوئی کالم نہیں لکھا اور اپنے تحقیقی کام میں مگن ہو گئے جس کا آخری نقش "دیوانِ یگانہ" کی تدوین ہے۔ اپنے والدِ گرامی خواجہ عبدالوحید (مرحوم) کی ڈائری کی تدوین بھی انھوں نے اپنی زندگی میں مکمل کر لی تھی لیکن یہ کتاب ان کی وفات کے بعد شائع ہوئی۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ عام مخطوطہ شناسوں اور محققوں کی طرح غرقِ کتاب اور تارکِ دنیا نہیں ہوئے بلکہ ادبی معاشرے اور معاصر ادب اور ادب سے اپنا ناتا قائم رکھا۔ ڈاکٹر اسلم فرخی کے الفاظ میں:

"خواجہ صاحب ہوش و گوش کے انسان تھے۔ نہایت باخبر، معمولی سے معمولی واقعے سے پوری طرح باخبر رہتے تھے اور دوستوں کو اس سے آگاہ کرتے تھے۔ بیرونی دنیا سے ان کے رابطے کے دو ذریعے تھے، فون اور ڈاک۔"(۳۴)

اور دلچسپ بات یہ ہے کہ ان کا فون کبھی خراب ہوا اور نہ ڈاک میں کبھی گڑبڑ ہوئی۔ ڈاکٹر اسلم فرخی کا فون ایک دن خراب ہو گیا تو خواجہ صاحب نے انھیں بتایا:

"میں ڈاکیے کو پچاس روپے مہینہ دیتا ہوں تا کہ میری ڈاک گڑبڑ نہ ہو اور سو روپے ماہانہ فون کے لائن مین کی نذر کرتا ہوں۔"

ڈاکٹر صاحب نے کہا "یہ تو صریحاً رشوت ہے۔" مشفق خواجہ بولے، "آپ اسے رشوت کہہ لیں، میں اسے "حق الخدمت" کہتا ہوں۔" ...... اسلم فرخی صاحب نے پوچھا، "انھیں تنخواہ کس بات کی ملتی ہے؟" کہنے لگے، "میں انھیں پیسے اپنی خوشی سے دیتا ہوں۔ ان کی طرف سے کوئی مطالبہ نہیں ہوتا۔"(۳۵)

کالم نگاری ترک کر کے مشفق خواجہ اپنے دل پسند کوچۂ تحقیق میں تو آ گئے اور انھوں نے "دیوانِ یگانہ" مرتب کرنے کا بے مثال کارنامہ انجام دینے کے علاوہ بے شمار نوجوان ادیبوں کے تحقیقی کاموں میں راہنمائی کی، لیکن یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ اردو کا ادبی معاشرہ اس محتسبِ اعلیٰ سے محروم ہو گیا:

۱۔ جو کتابوں کی رونمائی کی تقریبات کو، جن میں مصنف کی تعریف مبالغہ آمیزی سے کی جاتی تھی، ادب اور ادیب کے حق میں مضر سمجھتا تھا۔

۲۔ جو سرکاری ادبی اداروں کو اس لیے پسند نہیں کرتا تھا کہ یہ ادارے ادیبوں کی خدمت کی بجائے یہ احساس پیدا کرتے تھے کہ غیر ادبی ذرائع سے نام و نمود کس طرح حاصل کی جائے۔

۳۔ جو ذاتی شہرت کے لیے اپنے عہدے کو استعمال کرنے والے سرکاری افسروں کا مخالف تھا اور جس کا قول تھا کہ "ایسا شخص جو ۱۲ نقادوں کا صرف اپنے عہدے کی وجہ سے ممدوح بن جاتا ہے، اگر اس شخص سے اس کا عہدہ چھین لیا جائے تو ۱۲ نقاد تو کیا اس کے پاس ایک نوحہ گر بھی نہ ہو۔"(۳۶)

۴۔ جو اپنے بارے میں تو تعریفی مضامین لکھوانے، اپنے لکھے پر اترانے، انعام اور شہرت کے لیے سرکاری افسروں کی چاپلوسی کرنے، اپنے جشن منانے، اپنی ناموری کے لیے اور دوسروں کو نیچا دکھانے کے لیے سیاسی حربے استعمال کرنے والوں کو قبول نہیں کرتا تھا۔

مشفق خواجہ نے خامہ بگوش کے روپ میں ان موضوعات پر جرأت مندی سے لکھا، قلم سے نوکِ سناں کا کام لیا اور ایک لازوال کردار، استاد لاغر مراد آبادی بھی پیدا کیا جو مشفق خواجہ کا ہمزاد

[illegible] ادبی معاشرے کی ناہمواریوں کو چشمِ نگراں سے دیکھتا اور ان پر بے لاگ تبصرہ کرنے کا کوئی موقع فروگزاشت نہیں کرتا تھا۔ مشفق خواجہ (خامہ بگوش) اب ہم میں موجود نہیں لیکن "خامہ بگوش کے قلم سے"...... "سخن در سخن"...... اور "سخن ہائے ناگفتنی" جیسی کتابوں کی وجہ سے وہ ادب کی دنیا سے کہیں غیر حاضر شمار نہیں ہوں گے اور بیسویں صدی میں نثر کے مزاح نگاروں ...... رشید احمد صدیقی، شوکت تھانوی، ابن انشاء، ابراہیم جلیس، مجید لاہوری، کنہیا لعل کپور، مجتبیٰ حسین، یوسف ناظم، شفیق الرحمٰن...... محمد خالد اختر، کرنل محمد خان، سید ضمیر جعفری اور مشتاق احمد یوسفی کے ساتھ زندہ رہیں گے۔

مذکورہ تینوں کتابیں جناب مظفر علی سید کی نظرِ انتخاب کا نتیجہ تھیں اور مشفق خواجہ صاحب کی زندگی میں اشاعت کی منزل سر کر چکی تھیں۔ ان کی وفات کے بعد جناب خواجہ عبدالرحمٰن طارق نے ان کے تمام کالموں کی تلاش و جستجو کا فریضہ انجام دیا۔ ایک مجموعہ "سخن ہائے گسترانہ" کے عنوان سے شائع کیا جس کا پیش لفظ لکھنے کا شرف مجھے حاصل ہوا۔ طارق خواجہ صاحب نے ہی مجھے "مرتب" کے اعزاز سے بھی سرفراز فرمایا۔ "سخن در سخن" کے سلسلے کی پانچویں کتاب اب پیش کی جا رہی ہے تو میں اس افتخار پر نازاں ہوں کہ اس کا پیش لفظ لکھنے کے لیے بھی مجھے منتخب کیا گیا۔ مجھے [illegible] مشفق خواجہ کے ساتھ مزید وقت گزارنے کا موقع دیا گیا۔ حق تعالیٰ ان کی مغفرت کرے۔ آمین

انور سدید

حواشی

۱۔ مشفق خواجہ کے کالموں کے سابقہ تین مجموعوں کے نام حسب ذیل ہیں:

۱۔ ''خامہ بگوش کے قلم سے''، مرتبہ مظفر علی سید، پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی، لاہور، ستمبر ۱۹۹۵ء (اس برس یہ انتخاب دلی سے بھی شائع ہوا تھا)

۲۔ ''سخن در سخن'' (خامہ بگوش تحریروں کا انتخاب)، مرتبہ مظفر علی سید، اکادمی بازیافت، کراچی، اپریل ۲۰۰۳ء

۳۔ ''سخن ہائے گفتنی'' (خامہ بگوش: تحریروں کا انتخاب)، مرتبہ مظفر علی سید، اکادمی بازیافت، کراچی، اپریل ۲۰۰۳ء

۲۔ محمد عالم مختار حق، ''مشفق من خواجہ من''، بک مین، لاہور، ۲۰۰۶ء

۳۔ محمد عالم مختار حق، ''مشفق نامے'' (مکتوبات مشفق خواجہ بنام محمد عالم مختار حق)، اردو اکیڈمی پاکستان، لاہور، فروری ۲۰۰۶ء

مشفق خواجہ نے اردو دنیا میں سینکڑوں ادیبوں کو خطوط لکھے اور ان کے ادبی امور میں ان کی دستگیری کی۔ ان بکھرے ہوئے خطوط کی تعداد ہزاروں میں ہے۔ ''مشفق نامے'' (جلد اول) ان کے خطوط کا پہلا مجموعہ ہے، جسے سب سے پہلے شائع کرنے کا اعزاز محمد عالم مختار حق کو حاصل ہے۔ اس مجموعے میں ۲۷۶ خطوط شامل ہیں۔ حواشی اور تعلیقات کی تعداد ۳۰۳ ہے جو خطوط کے پس منظر کو روشن کرنے میں معاون ہیں۔ ڈاکٹر صدیق جاوید کے نام خطوط رسالہ ''سویرا'' میں، ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر تحسین فراقی، محمد حمزہ فاروقی، اصغر عباس، ڈاکٹر رؤف پاریکھ اور ڈاکٹر اشفاق احمد ورک کے نام خطوط رسالہ ''مکالمہ'' میں، ڈاکٹر منیر زاہد عامر کے نام خطوط رسالہ ''ادبستان'' اور ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کے نام خطوط ''اورینٹل کالج میگزین'' میں اور نظیر صدیقی کے نام خطوط رسالہ ''قرطاس'' میں چھپ چکے ہیں۔

۴۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے لکھا ہے:

''ہندوستان میں خواجہ صاحب کے دوست، مداح اور معتقد بہت بڑی تعداد میں ہیں۔ تقریباً یہ سب دوست اور ہندوستان کے بہت سے ادبی ادارے انھیں برسوں سے مختلف بہانوں

سے ہندوستان بلاتے رہے۔ لیکن خواجہ صاحب ہندوستان کیا آتے، کہیں کراچی سے باہر نہیں گئے۔ دو تین مہینے قبل ''ہماری زبان'' میں مالک رام کی بیماری کی خبر شائع ہوئی۔ مشفق خواجہ صاحب کو مالک رام سے دلی عقیدت ہے۔ یہ خبر پڑھ کر بے چین ہو گئے۔ خط آیا کہ وہ مالک رام صاحب کی عیادت کے لیے ہندوستان آ رہے ہیں۔ کسی دوست کو یقین نہیں آیا کہ قطب کی لاٹھ اپنی جگہ سے ہل سکتی ہے۔ لیکن ۲۶ رنومبر (۱۹۸۵ء) کو معجزہ ہو گیا، یعنی خواجہ صاحب واقعی دلّی پہنچ گئے۔ ان کی آمد پر دلّی کی بیشتر ادبی تنظیموں نے استقبالیہ جلسوں کی تیاری شروع کی لیکن خواجہ صاحب نے سب سے معذرت کر لی۔ ۲۶ رنومبر (۱۹۸۵ء) کی صبح کو خواجہ صاحب دلّی پہنچے اور اسی دن شام کو علامہ انور صابری کی یاد میں ہونے والے ایک بہت بڑے ادبی جلسے اور مشاعرے میں مہمان خصوصی کی حیثیت میں شرکت کرنی تھی، دعوت ناموں اور اشتہاروں میں خواجہ صاحب کا نام چھپ چکا تھا۔ اردو اکادمی دلّی کے زیر اہتمام سہ روزہ سیمینار منعقد ہو رہا تھا۔ سیمینار کے دعوت نامے کے مطابق ۲۷ رنومبر (۱۹۸۵ء) کی ایک نشست کی صدارت خواجہ صاحب کو کرنی تھی۔ اس صدارت سے بچنے کے لیے خواجہ صاحب صبح کو گھر سے غائب ہو گئے اور شام کو واپس آئے۔ (بحوالہ ''مشفق خواجہ..... ایک مطالعہ''، مرتبہ خلیق انجم، ماہنامہ ''کتاب نما''، جامعہ نگر، نئی دہلی، ۱۹۸۵ء)

۵۔ اس کتاب کا نام ''مشفق خواجہ..... ایک مطالعہ'' ہے۔ مضامین لکھنے والوں میں ہندوستان کے ڈاکٹر نور احمد علوی، شمیم حنفی، مالک رام، مجتبیٰ حسین، ڈاکٹر خلیق انجم، مخمور سعیدی، رشید حسن خان، یوسف ناظم، شہباز حسین اور ایم حبیب خان شامل ہیں۔ کتاب کے آخر میں مشفق خواجہ کی نثر و نظم کا انتخاب بھی دیا گیا ہے۔

۶۔ ''خامہ بگوش..... ایک مطالعہ'' وحید الرحمٰن خان کا تحقیقی مقالہ ہے جس پر انھیں ایم فل کی ڈگری تفویض کی گئی۔ ناشر، اکادمی بازیافت، کراچی، جولائی ۲۰۰۴ء

۷۔ شاہ نواز فاروقی..... ''اکابر صحافت (۲)'' شعبہ ابلاغ عامہ، جامعہ کراچی، نومبر ۲۰۰۵ء (ایم اے کے امتحان کے لیے لکھا گیا تحقیقی، تنقیدی و تجزیاتی مقالہ)

۸۔ ''دلی لاج'' کی تفصیل کے لیے حکیم احمد شجاع کی کتاب ''خوں بہا'' (لاہور ۱۹۵۱ء) ملاحظہ کیجیے۔

۹۔ خواجہ عبدالوحید (مرحوم) نے لکھا ہے:

''بچپن کی بہت سی باتیں میرے حافظے میں محفوظ ہیں اور ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ''علی لاج'' میں میرے بزرگوں اور ان کے دوستوں کی محفلیں آدھی رات تک گرم رہتی تھیں...... بچپن سے لے کر اٹھارہ برس (پیدائش ۳ رجنوری ۱۹۰۱ء) تک ان محفلوں کا عینی شاہد رہا ہوں۔ ابتدا میں محض تماشائی تھا، لیکن جوں جوں عمر بڑھتی گئی اور شعور پختہ ہوتا گیا، میں شرکائے محفل کی گفتگو سے مستفید بھی ہونے لگا۔ (بحوالہ ''نقوش''، اقبال نمبر۲، دسمبر ۱۹۷۷ء، ص ۳۸۱)۔ خواجہ عبدالوحید کا روزنامچہ (۱۹۲۷ء-۱۹۴۹ء) مشفق خواجہ نے اپنی زندگی میں مرتب کر دیا تھا۔ یہ روزنامچہ اس دور کے لاہور کے تہذیبی، تمدنی، ادبی، علمی اور سیاسی واقعات کا بہترین ماخذ ہے۔ یہ روزنامچہ ''یادِ ایام'' کے نام سے جامعہ کراچی کے شعبۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ نے خالد جامعی صاحب کے اہتمام سے ۲۰۰۶ء میں شائع کر دیا ہے۔

۱۰۔ مرحوم کے ایک عقیدت مند نے جب دیکھا کہ ان کی وفات کے بعد جب ان کا یومِ پیدائش خاموشی سے گزر گیا تو انھوں نے اخبار میں اپنے کالم میں ملال کا اظہار کیا کہ وہ زندہ ہوتے تو ان کی سالگرہ کا جشن کسی سات ستارہ ہوٹل میں منعقد کیا جاتا، ان کے نام کا ایوارڈ تقسیم ہوتا۔

۱۱۔ خواجہ صاحب کے اس وقت تک طنز و مزاح کے تین مجموعے جناب مظفر علی سید نے پیش کیے تھے۔ پہلا مجموعہ ''خامہ بگوش کے قلم سے'' تھا۔ چوتھا مجموعہ اب ''سخن ہائے گسترانہ'' کے نام سے چھپ چکا ہے، جس کی تلاش و تحقیق خواجہ عبدالرحمٰن طارق نے کی۔ پیش لفظ (''عرضِ سدید'') اس ناچیز نے لکھا اور مرتب قرار دے کر مجھے خواجہ صاحب کے ساتھ منسلک کر دیا گیا۔ میں اس اعزاز پر جتنا فخر کروں کم ہے۔ (الف سین)

۱۲۔ مختار الدین احمد (پروفیسر)، ''مشفق خواجہ کے معاصرین اور احباب'' (ان کے خطوط کی روشنی میں)، ماہنامہ ''قومی زبان''، کراچی، مشفق خواجہ نمبر، ص ۱۱ تا ۵۳، فروری ۲۰۰۶ء

۱۳۔ مختار الدین احمد (پروفیسر)، ''مشفق خواجہ اپنے خطوط کی روشنی میں''، سہ ماہی ''فنون''، لاہور، ص ۳۱ تا ۴۷، شمارہ ۱۲۶ (نومبر ۲۰۰۵ء تا مارچ ۲۰۰۶ء)

۱۴۔ مشفق خواجہ کا مکتوب مختار الدین احمد کے نام، ''فنون''، لاہور، بحوالہ ایضاً، ص ۳۷

۱۵۔ ایضاً، ص ۳۶، (مکتوب ۲۹ ر اکتوبر ۱۹۸۶ء)

۱۶۔ ایضاً، (مکتوب ۲۵ ر فروری ۱۹۸۷ء)

۱۷۔ بحوالہ مظفر علی سید، ''سخن ہائے گفتنی''، (دیباچہ)، ص ۱۱، اکادمی بازیافت، کراچی، ۲۰۰۴ء

۱۸۔ ایضاً، ص ۱۰

۱۹۔ خامہ بگوش، ''ایک کالم احمد فراز کے لیے''، ہفت روزہ ''تکبیر''، ص ۴۹، ۸ ر ستمبر ۱۹۹۴ء، کراچی

۲۰۔ خامہ بگوش، ''قلم برداشتہ ادب''، ہفت روزہ ''تکبیر''، ص ۴۵، ۷ ر جولائی ۱۹۹۴ء، کراچی

۲۱، ۲۲۔ خامہ بگوش، ''مزاحمتی ادب یا جعل سازی بنام ادب''، ہفت روزہ ''تکبیر''، ص ۴۹، ۲۰ ر اپریل ۱۹۹۵ء، کراچی

۲۳۔ ڈاکٹر شمیم حنفی، ''خامہ بگوش کے قلم سے''، سرورق کی پشت پر رائے

۲۴۔ خامہ بگوش، ''عاقل نامہ''، ''خامہ بگوش کے قلم سے''، ص ۵

۲۵۔ محمد خالد اختر، بحوالہ ''سخن در سخن''، مرتبہ مظفر علی سید، حوالہ ایضاً، ص ۱۰

۲۶۔ اس زاویے سے جناب وحید الرحمٰن خان کی کتاب ''خامہ بگوش...... ایک مطالعہ'' ملاحظہ کیجیے، ناشر اکادمی بازیافت، کراچی

۲۷۔ ''علم چھوت کی بیماری نہیں''، از خامہ بگوش، ''تکبیر''، ص ۴۸، ۱۲ ر مارچ ۱۹۸۷ء

۲۸۔ ''لندن کے اردو بازار میں صرف کھوٹے سکے چلتے ہیں''، ہفت روزہ ''تکبیر''، ص ۳۱، ۷ ر جنوری ۱۹۸۸ء

۲۹۔ ایضاً

۳۰۔ ''اس کتاب میں شرفائے ادب کے ساتھ غیر شریفانہ رویہ اختیار کیا گیا ہے''، ''تکبیر''، ص ۴۷، ۱۱ ر اگست ۱۹۸۸ء

۳۱۔ ڈاکٹر خلیق انجم، بحوالہ ماہنامہ ''کتاب نما''، جولائی ۱۹۹۵ء، ص ۵۲۔

۳۲۔ خامہ بگوش، ''کالم نگاری یا کوچہ گردی''، ''تکبیر''، ۳۱ ر مارچ ۱۹۹۴ء، ص ۴۳

۳۳۔ مختار الدین احمد، (مکتوب ۳ ر مارچ ۱۹۹۰ء)، بحوالہ ''فنون''، لاہور، شمارہ ۱۲۶، ص ۳۷

۳۴۔ ڈاکٹر اسلم فرخی، ''قومی زبان''، کراچی، مشفق خواجہ نمبر، فروری ۲۰۰۶ء، ص ۷

۳۵۔ ایضاً

۳۶۔ ''مشفق خواجہ...... ایک مطالعہ''، مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم، ص ۴۴، دہلی، ۱۹۸۵ء

یومیہ اُجرت پر شاعری

اگر پچھلے مہینے حیدر آباد سندھ میں دلاور فگار کو شہنشاہِ طنز و ظرافت کا خطاب نہ ملتا تو ہم جیسے کم بخت جادۂ ادب کو معلوم ہی نہ ہوتا کہ دلاور فگار طنز و مزاح نگار ہیں۔ اس صورتِ حال کی ذمہ داری ہم پر نہیں، اُن پر ہے جو لکھتے ہیں، اور اس طرح لکھتے ہیں کہ مزاح اور سنجیدگی میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ گزشتہ دس برسوں میں نثری نظم کے جتنے مجموعے بھی ہماری نظر سے گزرے ہیں، انھیں مزاحیہ ادب سمجھ کر ہم پڑھتے اور ہنستے رہے ہیں اور جب بعض نقادوں کے تشریحی مضامین سے معلوم ہوا کہ نثری نظمیں سنجیدہ ادب کا حصہ ہیں تو ہم تنقید کو بھی مزاح سمجھ کر پڑھنے لگے۔

جس ملک میں نثری نظمیں اور تنقیدی مضامین اتنی فراوانی سے لکھے جا رہے ہوں، وہاں طنز و مزاح کے نام پر الگ سے شاعری کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ دلاور فگار کے معاملے میں یہ سوال بعد از وقت ہے کیونکہ وہ نثری نظم کی پیدائش سے پہلے سے شاعری کر رہے ہیں اور ان کے مجموعوں کی تعداد دیکھ کر تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ گزشتہ دو تین صدیوں سے شعر کہہ رہے ہوں۔ آٹھ مجموعے تو ان کے چھپ چکے ہیں، نواں پریس میں ہے اور غیر مدوّن کلام اتنا ہے کہ دس پندرہ مجموعے با آسانی چھپ سکتے ہیں۔ اور جب تک یہ چھپیں گے، اس وقت تک موصوف مضامین تو کے اتنے انبار لگا چکے ہوں گے کہ آبادی کی طرح شاعری کے لیے بھی منصوبہ بندی کے پروگرام چلانے کی ضرورت پڑ جائے گی۔

یہ سب کچھ عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ دلاور فگار شاعری کے معاملے میں نہ صرف خود کفیل ہیں بلکہ انھوں نے ایسا ذہن رسا پایا ہے کہ چاہیں تو درجن دو درجن ضرورت مندوں کو بھی صاحبِ دیوان بنا سکتے ہیں۔ دلاور فگار کی قادر الکلامی کا اندازہ اس سے کیجیے کہ وہ ایک طویل عرصے سے ایک اخبار میں منظوم کالم نگاری کر رہے ہیں۔ نثر میں کالم لکھنا کوئی مشکل کام نہیں کہ یہ کام تو ہم اور مولانا کوثر نیازی بھی کر لیتے ہیں، لیکن نظم میں کالم لکھنا چاول پر قل ھو اللہ لکھنے کے

مترادف ہے۔ دلاور فگار کے پاس ایسے چاولوں کی بوریاں ہیں۔

اُردو میں منظوم اخبار نویسی کی روایت بہت پرانی ہے۔ گزشتہ صدی میں بعض ایسے اخبار بھی شائع ہوتے رہے ہیں جو اوّل تا آخر منظوم ہوتے تھے۔ اس وقت "اخبار نظم" یاد آرہا ہے جو لکھنؤ سے شائع ہوتا تھا اور جس کے ایڈیٹر دوار کا پرشاد اُفق اور رام سہائے تمنا تھے۔ اس میں اداریے سے لے کر خبروں اور اشتہارات تک سب کچھ منظوم ہوتا تھا۔ اس اخبار کے ۱۵ مارچ ۱۸۹۰ء کے شمارے کی ایک منظوم خبر ہمارے سامنے ہے۔ لاہور میں میراں بخش نامی ایک شخص نے دارو نامی ایک طوائف کی ناک کاٹ لی تھی۔ یہ خبر یوں شائع ہوئی:

یہاں کی ہے طوائف ایک مشہور
پرستاروں کی پرکاہ فردوس کی حور
حسین و نازک و چالاک ہے وہ
جہاں کی رنڈیوں کی ناک ہے وہ
زمانے میں ہے دارو نام اس کا
تھا یوسف بندۂ بے دام اس کا
مزاج حسن ہفت افلاک پہ تھا
پئے عشاق غصہ ناک پہ تھا
ہے لب عشاق کو جاں بخش اُس کا
تھا یارِ غار میراں بخش اس کا
محبت میں بہم شیروشکر تھے
گل و بلبل پئے اہل نظر تھے
وفاداری کے دم بھرتے تھے دونوں
نہ تھا کھٹکا مزے کرتے تھے دونوں
فلک نے تفرقہ کی رہ نکالی
گرہ دارو کے نازک دل میں ڈالی
ہوا دارو کو شوقِ بے وفائی
نظر سے صورتِ عاشق گرائی
بگاڑی ایک عرصے کی بنی بات
نئے دھوکے کی چالوں سے کیا مات
سرِ عاشق پہ مارا خنجر جور
جو اپنے واسطے ڈھونڈا کوئی اور
نہ میراں بخش کی کچھ بھی قدامت
جس سے بند کی صاحب سلامت
ہوا بے تاب میراں بخش کا دل
جگر سینے میں تڑپا شکل بسمل
رکھی دارو کی اٹھتے بیٹھتے تاک
کسی دن پا کے موقع کاٹ لی ناک
مٹا اسباب خود بینی کا دم میں
گئی چہرے کی مرغوبی عدم میں
گئی جب بے رُخی سے اس طرح ناک
نہ تاب آئی، ہوئی دارو غضبناک
رخ مطلب پہ کی غازے کی مالش
عدالت چڑھ کے کی عاشق پہ نالش

بس اب پیشی پہ پیشی ہو رہی ہے
جہاں کو اس خبر سے آگہی ہے

منظوم اخبار نویسی کی اس روایت کو دلاور فگار نے نہایت خوش اسلوبی سے آگے بڑھایا ہے اور حق تو یہ ہے کہ حق ادا کیا ہے۔ ان کے منظوم کالموں کا انتخاب "سنچری" کے نام سے اسی برس شائع ہوا ہے اور یہ اس وقت ہمارے پیش نظر ہے۔

شاعری سے بڑے بڑے کام لیے گئے ہیں۔ قوموں کی تقدیر بدلنے سے لے کر کاغذ کا رنگ بدلنے تک یعنی سفید کو سیاہ کرنے تک، شاعری کے کارناموں کی ایک طویل فہرست موجود ہے لیکن دلاور فگار نے شاعری سے جو کام لیا ہے، وہ سب سے الگ ہے۔ انھوں نے ہر اس چیز کو شعر کا موضوع بنا دیا ہے جس کی سمائی نثر میں بھی بمشکل ہو سکتی تھی۔ مثلاً ایک مغربی ملک میں کتوں کے پندرہ منٹ سے زیادہ بھونکنے پر پابندی لگائی گئی تو دلاور فگار نے ایک طویل کالم لکھا جس میں کتوں کو تہذیب سے کام لینے، آدمیت کے دائرے میں رہنے اور بلاضرورت نہ بھونکنے کے مفید مشورے دیئے گئے ہیں۔ جن دنوں ٹیلی ویژن ڈرامہ "اندھیرا اجالا" ٹیلی کاسٹ ہوتا تھا تو لوگ اس میں اتنے محو ہو جاتے تھے کہ چوروں کو اپنا کام کرنے کا موقع مل جاتا تھا۔ دلاور فگار نے اس پر بھی ایک کالم لکھا ہے اور بتایا ہے کہ جس ڈرامے کا موضوع جرائم کی روک تھام ہے، اس کی وجہ سے جرائم پیشہ افراد کو کھل کھیلنے کا موقع مل رہا ہے۔ یہی نہیں دلاور فگار نے متعدد افراد اور کتابوں پر بھی منظوم تبصرے لکھے ہیں۔ کتابی تبصروں کے ساتھ ناشر کا نام اور قیمت بھی لکھی دی ہے تاکہ کوئی شخص کتاب خریدنا چاہے تو اس کی رہنمائی ہو سکے۔ شاعری کے ساتھ یہ شاہانہ سلوک شہنشاہِ ظرافت ہی کر سکتے ہیں، ہما شما کے بس کی بات نہیں۔

دلاور فگار کا ایک کمال یہ بھی ہے کہ وہ شاعری تو اُردو زبان میں کرتے ہیں لیکن مزاح پیدا کرنے کے لیے انگریزی الفاظ اس کثرت سے استعمال کرتے ہیں کہ اتنی کثرت سے شاید انگریز بھی استعمال نہ کرتے ہوں۔ اس معاملے میں وہ اکبر کے جانشین ہیں۔ فرق یہ ہے کہ اکبر کے ہاں انگریزی لفظ اس طرح آتا ہے جیسے انگوٹھی میں نگینہ۔ دلاور فگار کے ہاں نگینے ہی نگینے ہوتے ہیں، انگوٹھی نظر نہیں آتی۔

"سنچری" ایک دلچسپ اور اپنی نوعیت کا منفرد مجموعۂ کلام ہے۔ لیکن اس سے بھی زیادہ دلچسپ دلاور فگار کی وہ گفتگو ہے جو سوال و جواب کی صورت میں مجموعے کے شروع میں بطور

دیباچہ شامل کی گئی ہے۔ اس میں انھوں نے فلمی اداکاروں کے انداز میں بتایا ہے کہ اُن کا پسندیدہ پھل اور پھول کون سا ہے۔ مرغوب غذا کیا ہے۔ لباس کس قسم کا پسند کرتے ہیں۔ تنہائی میں کیا کرتے ہیں۔ غصہ کس وقت آتا ہے۔ ہنسی کس وقت آتی ہے۔ پسندیدہ فنکار کون ہے۔ کھیل کونسا پسند ہے۔ یہ سب تفصیلات اتنی دلچسپ ہیں کہ اگر کتاب میں صرف یہ کچھ ہوتا تو بھی کتاب کی افادیت میں کمی نہ ہوتی۔

آخر میں بطور نمونہ کلام کے ایک قطعہ پیش خدمت ہے۔ اس کا پس منظر یہ خبر ہے کہ ایک دولہا برات لے کر جب دلہن کے گھر پہنچا تو خسر پر یہ راز فاش ہوا کہ دولہا کہیں مستقل ملازم نہیں ہے بلکہ ایک دفتر میں ڈیلی ویجز (یومیہ اجرت) پر کام کرتا ہے۔ اس پر یہ برات لوٹا دی گئی۔

ڈیلی ویجز پہ ہے اک لڑکا ملازم یہ خبر
کھل گئی اس وقت جب کھلنے کو تھے سہرے کے پھول
اب تو شادی کی یہ صورت ہے کہ خسرِ محترم
ڈیلی ویجز پہ ہی اس داماد کو کر لیں قبول

اس قطعے سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ منظوم کالم نگاری یعنی ڈیلی ویجز پر جو شاعری کی جاتی ہے وہ کس قسم کی ہوتی ہے۔

(۹/اکتوبر ۱۹۸۶ء)

فکاہیہ ادب کا بارودخانہ

ہم کیا، اچھے اچھے مانتے ہیں کہ افواجِ پاکستان نے پاکستان کو دو چیزیں بڑی تاریخی اہمیت کی دی ہیں۔ ایک تو مارشل لا، اور دوسرے طنز و مزاح۔ مارشل لا تو خیر مستقل چیز نہیں ہے کہ ہر آٹھ دس برس کے بعد کچھ عرصہ کے لیے سلطانیِ جمہور کا دور بھی آ جاتا ہے، لیکن طنز و مزاح کا معاملہ سدا بہار ہے۔ ذرا اندازہ کیجیے کہ جس فوج نے میجر جنرل شفیق الرحمٰن، کرنل محمد خان اور میجر ضمیر جعفری جیسے بلند مرتبہ طنز و مزاح نگار پیدا کیے ہوں، اسے مارشل لا لگانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ یہ تینوں فوجی اہلِ قلم اتنے مقبول ہیں کہ ان کے ذریعے پاکستانی قوم ہی کو کیا، ایک عالم کو مسخر کیا جا سکتا ہے۔ اس کا اندازہ ہمیں پچھلے دنوں ہندوستان میں ہوا جہاں ہم اپنے اعزاز میں اور اپنے ہی خرچ پر تقریبیں منعقد کرانے کے لیے نہیں، سیر سپاٹے کے لیے گئے تھے۔ ہم جس شہر میں بھی گئے، ہم سے اس قسم کے سوال کیے گئے: کرنل شفیق الرحمٰن آجکل کیا لکھ رہے ہیں؟ (وہاں والوں کو میجر جنرل صاحب کی ترقی کا علم نہیں ہے وہ انھیں ابھی تک کرنل ہی سمجھتے ہیں) ضمیر جعفری کا کیا حال ہے؟ ان کا کوئی نیا مجموعہ شائع ہوا ہے؟ کرنل محمد خاں کی چوتھی کتاب چھپ گئی ہے یا نہیں؟

آخری سوال ہم سے اتنی مرتبہ پوچھا گیا کہ ہم پریشان ہو گئے اور اسی پریشانی کے عالم میں ہمیں یہ کہنا پڑا، ''کرنل صاحب اپنی پہلی تین کتابوں کی اشاعت پر ہی بے حد نادم ہیں، چوتھی کتاب وہ کیا چھپوائیں گے۔''

ایک محفل میں مشہور ہندوستانی مزاح نگار مجتبیٰ حسین نے یہ کہا کہ پاکستان میں بہترین مزاح فوجی اہلِ قلم لکھ رہے ہیں۔ اس پر ہم نے عرض کیا، ''مشتاق احمد یوسفی کے بارے میں کیا ارشاد ہے؟'' کہنے لگے، ''ہم ان سے لندن میں ملے تھے، مزاج کے اعتبار سے وہ بھی فوجی معلوم ہوتے ہیں۔'' ہم نے اس کا سبب پوچھا تو فرمایا، ''ان کی گفتگو میں تکلف اور رکھ رکھاؤ کا یہ عالم

ہے کہ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ اہلِ محفل سے بات چیت نہیں کر رہے، پلٹن میدان میں سلامی لے رہے ہیں۔

ہمارے فوجی حضرات ریٹائر ہونے کے بعد پی آئی اے یا دیگر خود مختار یا نیم خود مختار اداروں یا پھر ہاکی اور کرکٹ کے کنٹرول بورڈوں میں نظر آتے ہیں۔ لیکن کرنل محمد خان اور ضمیر جعفری نے دوسری مرتبہ ریٹائر ہونے کا خطرہ مول نہیں لیا اور ''اردو پنچ'' کے نام سے ایک رسالہ جاری کر دیا جو بقول مدیرانِ گرامی ''فکاہی ادب کا مخزن'' ہے۔ یہاں بھی انھوں نے اپنی عسکری روایت کو برقرار رکھا ہے کہ ''مخزن'' دراصل میگزین، اسلحہ خانے یا بارود خانے کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ''اردو پنچ'' کا ہر شمارہ فکاہیہ ادب کا بارود خانہ ہوتا ہے۔

''اردو پنچ'' کا دسواں شمارہ حال ہی میں شائع ہوا ہے اور یہی اس وقت ہمارے سامنے ہے۔ فاضل مدیروں نے اس میں بہت سی دلچسپ تحریریں جمع کر دی ہیں جو مشہور، غیر مشہور، پیشہ ور اور شوقیہ ہر طرح کے اہلِ قلم نے لکھی ہیں۔ موضوعات کے اعتبار سے بھی ان تحریروں میں بڑا تنوع پایا جاتا ہے۔ احمد جمال پاشا کے ایک نہ دو اکٹھے تین ترجمے شائع کیے گئے ہیں جو امریکی، روسی اور افریقی مزاج کی نمائندگی کرتے ہیں۔ یہ ترجمے اتنے عمدہ اور رواں دواں ہیں کہ جی چاہتا ہے احمد جمال پاشا اب ترجمے ہی کیا کریں۔ اس کا مطلب خدانخواستہ یہ نہیں وہ طبع زاد مضامین لکھنا چھوڑ دیں۔ ضرور لکھیں لیکن اتنا کریں کہ طبع زاد مضامین کے ساتھ بھی روسی، عربی یا انگریزی سے ترجمہ لکھ دیا کریں تاکہ اس بہانے ان مضامین کو بھی دلچسپی سے پڑھا جا سکے۔ یہ بات ہم نے اس لیے لکھی ہے کہ جس طرح دیسی کپڑے پر بدیسی لیبل لگ جانے سے اس کی قدر و قیمت بڑھ جاتی ہے، اسی طرح بعض طبع زاد مضامین کو ترجمہ ظاہر کر کے ان کی قدر و قیمت بڑھائی جا سکتی ہے۔

ڈاکٹر انور سدید نے ''گٹھلیوں کے دام'' کے عنوان سے جو مضمون لکھا ہے اس میں ان کی تنقیدی تحریروں جیسی شگفتہ سنجیدگی پائی جاتی ہے۔ اس لیے ہمیں امید ہے کہ منظر علی خان منظر اپنے اگلے مجموعۂ کلام میں اس مضمون کو بطور دیباچہ ضرور شامل کر لیں گے کیونکہ ان کے لیے شعر کہنا بھی گٹھلیوں کے دام کھرے کرنے کے مترادف ہے۔ ڈاکٹر انور سدید دیباچہ لکھنے کے معاملے میں اور

منظر علی خان منظر دیباچہ لکھوانے کے سلسلے میں خاصے فراخدل ہیں۔ دونوں کی فراخدلی کو کوئی تو مثبت نتیجہ نکلنا چاہیے۔

لیفٹیننٹ کرنل عبدالکریم اوپل نے ۱۹۶۵ء کی جنگ کی یادوں کو نہایت خوبصورت انداز میں قلم بند کیا ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ میدانِ جنگ میں بھی کرنل صاحب کی حسِ مزاح کتنی تیز تھی۔ دشمن کے ہوائی جہاز سروں پر ہوں تو مزاح اور مذاق کی طرف دھیان نہیں جاتا، لیکن کرنل صاحب کا دھیان اس طرف رہتا تھا جیسے وہ محاذِ جنگ پر نہ ہوں ''اردو پنچ'' کے دفتر میں بیٹھے ہوں۔ کیا ہی اچھا ہو اگر موصوف اپنی پوری زندگی کے واقعات اسی انداز میں کتابی صورت میں لکھ ڈالیں۔ ان کی کتاب مزاحیہ ادب میں اور وہ خود مزاح نگاروں میں نادر اضافہ ہوں گے۔

ڈاکٹر ایم ایم حسن نے ''ایک علامتی سفرنامہ'' لکھا ہے۔ ان ڈاکٹر صاحب کا نام ہم نے پہلی بار سنا ہے، اس لیے ہمیں یقین ہے کہ یہ پیشہ ور سفرنامہ نگار نہیں ہیں۔ ان کے ہاں پیشہ ور سفرنامہ نگاروں کے مقابلے پر زیادہ readability پائی جاتی ہے۔ بعض جملے تو انھوں نے معنی خیز لکھے ہیں مثلاً:

- شہر جہلم کے در و دیوار جسمانی اور روحانی علاج کے ماہرین کے اشتہاروں سے پُر نظر آئے۔ شاید اسی غرض سے سکندرِ اعظم نے اس شہر کا رُخ کیا تھا کہ اس کے لاعلاج مرض جوع الارض کا یہاں کوئی مداوا ہو۔
- کھاریاں کے قریب آکر یہ انکشاف ہوا کہ اس علاقے میں حکومت نے سڑک کو محکمۂ آثارِ قدیمہ کی تحویل میں دے دیا ہے جو شیر شاہ کے وقت کی اس قدیم شاہراہ کی اصلی حالت برقرار رکھنے میں کامیاب کوشش کر رہا ہے۔

''اردو پنچ'' میں اور بھی بہت سی تحریریں ایسی ہیں جن سے اس رسالے کے اعلیٰ معیار کا اندازہ ہوتا ہے۔ مثلاً ایک گوشہ اے ڈی اظہر کے لیے وقف کیا گیا ہے جو صاحبِ علم و نظر طنز و مزاح نگار تھے۔ اس میں ان کے کلام کا انتخاب اور بعض دیگر تحریریں شامل کی گئی ہیں۔ ضمیر جعفری نے خواتین کی پسندیدہ مصنفہ بشریٰ رحمن کے بارے میں ایک مضمون لکھا ہے جس کا عنوان ہے ''اردو ادب کی چاند بی بی''۔ یہ مضمون بشریٰ رحمن کے اعزاز میں منعقدہ ایک تقریب میں پڑھا گیا تھا۔ یہ ایک فرمائشی مضمون ہے اور موضوع بھی ادبی اعتبار سے خاصا ثقیل ہے، اس لیے جعفری صاحب

نے لکھنے سے زیادہ نہ لکھنے کا حق ادا کیا ہے۔ یعنی جہاں جہاں وہ اپنے موضوع سے ہٹے ہیں، مضمون خاصا جاندار نظر آتا ہے۔

اتنی بہت سی خوبیوں کے ساتھ اگر رسالے کی بعض دیگر خصوصیات پر بھی نظر ڈال لی جائے تو کوئی مضائقہ نہیں کیونکہ صرف تعریف سے ہمارے پڑھنے والوں کا بھلا نہیں ہو سکتا۔ اس رسالے کا پہلا مضمون "اہل زبان" طنز و مزاح سے زیادہ بد مذاقی کا نمونہ نظر آتا ہے۔ یہ مضمون ۴۰، ۵۰ سال پہلے چھپتا تو کوئی بات بھی تھی کہ اس وقت اہل زبان اور غیر اہل زبان کا مسئلہ زندہ تھا۔ موجودہ دور میں اس موضوع پر کچھ لکھنا اس بات کا ثبوت ہے کہ لکھنے والے کو یہ معلوم نہیں کہ زمانہ کتنا آگے جا چکا ہے۔ اس قسم کے مکالمے مضمون میں جا بجا ملتے ہیں۔ "اردو زبان تو دراصل ہمارے گھر کی لونڈی کہلانی چاہیے، یہ تم لکھنؤ، میرٹھ اور دہلی کے بعد ستوڑے اس کے وارث کہاں سے بن گئے۔" معلوم ہوتا ہے کہ "اردو پنچ" کے مدیران گرامی نے پڑھے بغیر یہ مضمون شائع کر دیا ہے۔ اگر یہ درست ہے تو پھر ان مدیران گرامی کو حضرت صہبا لکھنوی کا مقلد سمجھنا چاہیے۔ وہی صہبا لکھنوی جو "افکار" کے ایڈیٹر ہیں اور جن سے کسی نے ایک مرتبہ پوچھا تھا، "آپ اپنے رسالے میں جو مضامین چھاپتے ہیں، کیا انھیں پڑھتے بھی ہیں؟" صہبا صاحب نے اس کے جواب میں فرمایا تھا، "بھائی! میں رسالے کا ایڈیٹر ہوں، رسالہ نہ خریدار نہیں۔"

"اردو پنچ" میں شاعری کا حصہ بہت کمزور ہے۔ شان الحق حقی اور ضمیر جعفری کے کلام کے سوا کوئی ڈھنگ کی چیز نظر نہیں آتی۔ راغب مراد آبادی اور سلطان رشک کا مزاحیہ کلام چھاپنے کی بجائے ان کا سنجیدہ کلام چھاپ دیا جاتا تو بہتر تھا۔ ان جیسے شاعروں کا سنجیدہ کلام پڑھ کر کم از کم ہنسی تو آتی ہے۔

(۱۶ اکتوبر ۱۹۸۶ء)

بصارت اور سماعت سے چھٹکارا

طاہر مسعود بھی اپنی وضع کے الگ آدمی ہیں۔ سال دو سال میں ایک آدھا ایسا شوشہ چھوڑ دیتے ہیں کہ لوگ چونک جاتے ہیں۔ سب سے پہلا شوشہ تو انھوں نے یہ چھوڑا تھا کہ نہایت کم عمری میں صحافت کے میدان میں آ گئے۔ جس عمر میں انھیں بچوں کے صفحات پر لکھنا چاہیے تھا، اس عمر میں ادارتی صفحات پر لکھنے لگے۔ ایسے آڑے ترچھے کالم لکھے کہ بے شمار جبینیں شکن آلود ہو گئیں اور جس اخبار میں وہ لکھتے تھے اس کی اشاعت اور پریشانیوں میں اضافہ ہوا۔ ادارتی صفحات کے ساتھ ساتھ انھوں نے ادبی صفحات میں بھی دخل اندازی شروع کی اور ادیبوں کے ایسے انٹرویو شائع کیے جن سے بہت سے ادبی تنازعوں کا آغاز ہوا۔ ایک ادیب سے وہ کوئی سنسنی خیز بات کہلواتے تھے اور دوسرے سے اس کی تردید کراتے تھے۔ تردید در تردید کا یہ سلسلہ کچھ ایسا چلا کہ ادیب طاہر مسعود کو انٹرویو دینے سے تو کیا، ان کا سامنا کرنے سے بھی گھبرانے لگے۔ طاہر مسعود کا کمال یہ ہے کہ وہ بڑے سے بڑے ادیب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ایسے سوال کرتے تھے جن سے "عزت سادات" خطرے میں پڑ جاتی تھی۔ ان انٹرویوز کا مجموعہ "یہ صورت گر کچھ خوابوں کے" کے نام سے چھپ چکا ہے۔ مجموعہ کیا ہے، ادب اور ادیبوں کے حال زار کا آئینہ ہے۔

اب طاہر مسعود عملی صحافت سے قطع تعلق کر کے علمی اور تعلیمی صحافت سے وابستہ ہو چکے ہیں۔ یعنی کراچی یونیورسٹی کے شعبۂ صحافت میں لیکچرار ہیں۔ یہاں بھی باوجود ہر قسم کے موقع کے ان کا جذبۂ عمل سرد نہیں ہوا اور انھوں نے "ابلاغیات" کے نام سے ذرائع ابلاغ پر ایک کتابی سلسلہ شائع کرنے کا منصوبہ بنایا ہے۔ "ابلاغیات" کی پہلی کتاب اس وقت ہمارے سامنے ہے جو سوا چار سو سے زیادہ صفحات پر مشتمل ہے اور جس میں تقریباً دو درجن مقالے شامل ہیں۔ بیشتر مقالے مستند اہل قلم کے ہیں، اور جو دو چار ہم جیسے لکھنے والے ہیں، انھوں نے بھی دوسروں کے چراغ لے چراغ جلانے میں خاصی محنت کی ہے۔

ابلاغیات یا ذرائع ابلاغ کی اصطلاح یوں تو دنیا بھر کی فضولیات کا احاطہ کرتی ہے، لیکن عام طور پر صحافت، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے لیے مخصوص ہے۔ زیرِ نظر کتابی سلسلے میں بیشتر مضامین صحافت اور صحافیوں کے بارے میں ہیں۔ چند مقالے ٹیلی ویژن، اشتہار اور کتاب کے حوالے سے بھی ہیں۔ دو تین ترجمے بھی ہیں اور دو تین طبع زاد مضمون ایسے ہیں جو زبان و بیان کے اعتبار سے ترجمہ معلوم ہوتے ہیں۔ گویا "ابلاغیات" میں ایسی تحریریں بھی شامل ہیں جن کا ابلاغ بالکل نہیں ہوتا۔

طاہر مسعود نے "حرفِ آغاز" میں لکھا ہے، "ذرائع ابلاغ ہماری آنکھیں اور کان بن چکے ہیں جن سے ہم دیکھتے اور سنتے ہیں۔" یہ جملہ پڑھ کر استاد لاغر مراد آبادی نے فرمایا، "اگر یہ صحیح ہے تو پھر یہ بھی صحیح ہے کہ ہمیں کچھ دکھائی دیتا ہے نہ سنائی دیتا ہے۔ بصارت اور سماعت دونوں سے ہمیں چھٹکارا مل چکا ہے۔ جس ملک میں اخبارات اشتہاروں کے لیے چھپتے ہوں اور ریڈیو اور ٹیلی ویژن اربابِ اقتدار کی مدح و ستائش کے لیے وقف ہوں، وہاں دیکھنے اور سننے سے بہتر نہ دیکھنا اور نہ سننا ہے۔

استاد لاغر مراد آبادی کے ان زریں خیالات سے ہمیں اتفاق نہیں ہے۔ اگر ہمارے اخبارات اشتہاروں کی خاطر چھپتے ہیں تو اس میں کیا برائی ہے۔ اشتہارات بھی تو ابلاغیات ہی کا حصہ ہیں اور بعض اوقات خبروں اور اداریوں وغیرہ سے زیادہ اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ ہمیں یاد ہے کہ کچھ عرصہ قبل ایک کثیر الاشاعت اخبار کے سرکاری اشتہار بند کر دیے گئے تھے تو اس اخبار نے کئی ہفتوں تک جلی حروف میں اشتہاروں کی بندش کے بارے میں خبریں اتنی کثرت سے شائع کی تھیں جیسے وقت کا سب سے اہم قومی بلکہ بین الاقوامی مسئلہ یہی ہو۔ بعض لوگ اشتہارات کو اخباروں کی شہ رگ کہتے ہیں، اس واقعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اشتہارات شہ رگ ہی نہیں، بعض اخبارات کا ضمیر بھی ہوتے ہیں۔

رہا ریڈیو اور ٹیلی ویژن کا معاملہ تو ہمیں اس میں کوئی برائی نظر نہیں آتی کہ یہ ادارے اہلِ اقتدار کی مدح و ستائش کے لیے وقف کر دیے جائیں۔ یہ ویسی ہی بات ہے جیسے کوئی یہ کہے کہ محکمہ ریلوے، ریلیں کیوں چلاتا ہے اور پی آئی اے ہوائی جہاز کیوں اُڑاتی ہے یا اُڑاتا ہے۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن اگر اربابِ اقتدار کی ستائش نہ کریں تو پھر ان کے لیے کرنے کو کام ہی کیا رہ جائے گا۔

ویسے بھی آج کل حکومتیں اربابِ حکومت کی خوش اعمالیوں سے نہیں، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی خوش اعلانیوں سے چلتی ہیں۔ عوام کو تمام کارناموں کی اطلاع انھی ذرائع سے ملتی ہے۔ حد تو یہ ہے کہ ریفرنڈم تک کی اطلاع کا ذریعہ بھی ریڈیو اور ٹیلی ویژن ہی ہوتے ہیں۔ اگر یہ ادارے نہ ہوتے تو کسی کو پتہ بھی نہ چلتا کہ ہمارے ہاں ایک آدھ ریفرنڈم بھی ہو چکا ہے۔

معاف کیجیے، ہم نے طاہر مسعود کے ایک جملے کی تعبیر و تشریح میں بہت کچھ لکھ ڈالا، حالانکہ "ابلاغیات" کا ہر مضمون اس لائق ہے کہ اس کا تفصیلی تذکرہ کیا جائے۔ خصوصاً وہ مضمون جس کا عنوان ہے: "اُردو صحافت میں کالم نویسی" اور جسے اے آر خالد نے بڑی محنت سے لکھا ہے۔ اس مضمون میں کالم نگاری پر شفیق جالندھری کی کتاب کے حوالے بڑی فراخدلی سے دیے گئے ہیں۔ یہاں تک کہ اے آر خالد نے خود اپنے کالم نگار ہونے کی اطلاع بھی شفیق جالندھری کے حوالے سے دی ہے۔ یہ احتیاط قابلِ داد ہے اگر خالد صاحب بزبان خود ہی فرما دیتے کہ وہ کالم نگار ہیں تو اس کا یقین کون کرتا۔ اب دعویٰ مدلل ہو گیا۔ جس کو اعتراض کرنا ہو گا، شفیق جالندھری پر کرے گا۔ اے آر خالد سے کوئی باز پرس نہیں کرے گا۔ خالص علمی تحقیق کا انداز یہی ہے۔

تحقیق کا ذکر آیا ہے تو پھر ڈاکٹر معین الدین عقیل کے مضمون کی داد نہ دینا ظلم ہو گا۔ انھوں نے نہایت محنت سے اُردو صحافت کی تاریخوں پر ناقدانہ نظر ڈالی ہے۔ ان کی وسیع النظری کا یہ عالم ہے کہ رسالوں میں لکھے گئے تمام مضامین بھی ان کی نظر میں ہیں۔ بلاشبہ تحقیق کے اعتبار سے یہ بلند معیار مقالہ ہے۔ البتہ کہیں کہیں تحقیق بہت زیادہ گاڑھی ہو گئی ہے۔ مثلاً انھوں نے ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کی ایک تصنیف کا سالِ طباعت متعین کرنے کے لیے خاصے تکلف سے کام لیا ہے۔ انھوں نے جو بحث کی ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔ کتاب پر مصنف کا نام "محمد ابواللیث صدیقی البدایونی" لکھا ہے۔ مصنف کے نام کے ساتھ "ڈاکٹر" کا سابقہ نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ کتاب ۱۹۴۱ء سے پہلے چھپی تھی کیونکہ مصنف کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری ۱۹۴۱ء میں ملی تھی۔
۲۔ اس کتاب میں پنڈت کیفی کے ایک مقالے کا حوالہ ملتا ہے جو ۱۹۳۵ء میں چھپا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ڈاکٹر صدیقی کی کتاب ۱۹۳۵ء کے بعد چھپی تھی۔
۳۔ ان دلائل سے ثابت ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صدیقی کی کتاب ۱۹۳۵ء اور ۱۹۴۱ء کے درمیان

چھپی تھی۔

ڈاکٹر عقیل نے بلاشبہ سال طباعت کے ''پانچ سالہ تعین'' میں بڑی تحقیق کی ہے۔ لیکن یہ کام تحقیق کے بغیر بھی انجام دیا جا سکتا تھا۔ وہ اس طرح کہ ڈاکٹر عقیل اور ڈاکٹر صدیقی دونوں کا کراچی یونیورسٹی سے تعلق ہے۔ یقیناً روزانہ ملاقات ہوتی ہوگی۔ ڈاکٹر صدیقی سے ان کی مذکورہ کتاب کا سال طباعت دریافت کیا جا سکتا تھا۔ اگر ڈاکٹر صدیقی رازداری سے کام لیتے تو پھر ڈاکٹر عقیل کو لازم تھا کہ اس اہم مسئلے کو بزور تحقیق حل کرتے۔

اہل تحقیق کی وضع احتیاط کے بارے میں ایک واقعہ یاد آ گیا۔ آپ بھی سن لیجیے۔ اردو کے مشہور محقق قاضی عبدالودود مرحوم نے ایک محفل میں فرمایا: ''نقوش کے شخصیات نمبر میں ڈاکٹر مختار احمد نے میرا سال پیدائش غلط لکھا ہے۔ وہ میرے پرانے جاننے والے ہیں انھیں چاہیے تھا کہ مجھ سے پوچھ لیتے۔'' اس پر کسی نے کہا: ''اگر وہ آپ سے پوچھ کر لکھ دیتے تو پھر آئندہ کے محققوں کے لیے آپ کے سال پیدائش پر تحقیق کرنے کی گنجائش نہ رہتی۔'' قاضی صاحب نے فرمایا: ''ایسا نہیں ہے۔ میں بھی انسان ہوں۔ مجھ سے بھی غلطی ہو سکتی ہے۔''

(۳۰؍ اکتوبر ۱۹۸۶ء)

مہمان اداریہ ہی نہیں لکھتے پروف بھی پڑھتے ہیں

پچھلے ڈیڑھ دو ماہ سے کراچی میں غیر ملکوں سے آنے والے ادیبوں کی وجہ سے بڑی رونق ہے۔ ادب اور لذت کام و دہن، دونوں کی بڑے پیمانے پر آزمائش ہو رہی ہے۔ کہیں ادبی نشستیں اور کہیں شعری محفلیں، کہیں ظہرانے ہیں اور کہیں عشائیے۔ اخباروں کے ادبی ڈائری نویسوں کی پانچوں گھی میں ہیں۔ وہ صبح ہوتے ہی قلم کان پر نہیں، جان ہتھیلی پر رکھ کر نکلتے ہیں اور محفلوں کے شرکا کی فہرستیں مرتب کرنے کا غیر دلچسپ اور محنت طلب کام کرتے ہیں۔ اس فہرست سازی کی اتنی اہمیت ہے کہ ہر محفل میں مہمانِ خصوصی سے زیادہ ادبی رپورٹروں کو اہمیت دی جاتی ہے۔ شرکا ان سے بڑھ بڑھ کر ہاتھ ملاتے ہیں، خیریت پوچھتے ہیں تاکہ جب اخبار میں رپورٹ شائع ہو تو اس میں ان کا نام بھی شامل ہو۔ چند روز پہلے کا واقعہ ہمیں کبھی نہیں بھول سکتا۔ ایک پاکستانی ادیب نے ایک ہندوستانی ادیب کے اعزاز میں عشائیہ دیا۔ مہمانِ خصوصی اور دیگر مہمانوں کو دو گھنٹے تک کھانے کے انتظار میں بٹھایا گیا۔ ہم اس صورت حال سے سخت پریشان ہوئے۔ ہمت سے کام لے کر ہم نے میزبان سے پوچھا: ''اب کس کا انتظار ہے؟'' انھوں نے فرمایا: ''علی حیدر ملک اور شیراز منظر کا۔'' اس جواب پر ہمیں بڑی حیرت ہوئی، ہم نے عرض کیا: ''کیا یہ بھی ہندوستان سے آئے ہیں؟'' میزبان نے رازدارانہ انداز میں فرمایا: ''بھئی یہ دونوں اخبارات میں ادبی ڈائریاں لکھتے ہیں۔ ذرا خوش ہو جائیں گے کہ ہم نے ان کا انتظار کیا۔''

ہندوستانی مہمانوں میں سب سے پہلے ڈاکٹر انور معظم اور جیلانی بانو تشریف لائے۔ ہم نے عام رواج کے خلاف جیلانی بانو کا نام بعد میں لکھا ہے، ورنہ اخباری اطلاعات کے مطابق یوں لکھنا چاہیے تھا کہ جیلانی بانو تشریف لائیں اور ان کے ساتھ ان کے شوہر ڈاکٹر انور معظم بھی تھے۔ اس صورت حال کی وجہ یہ ہے کہ جیلانی بانو افسانہ نگار ہیں اور ان کی شہرت چار دانگ عالم میں ہے۔ ڈاکٹر انور معظم صرف عالم و فاضل اور محقق و دانشور ہیں، اس لیے ان کے تعارف کا حلقہ محدود

ہے۔ گویا جیلانی بانو شہرت میں آگے نکل گئیں اور ڈاکٹر انور معظم علم و فضل میں۔ علم میں آگے نکل جانے کا مطلب گم شدگی ہوتا ہے، لہٰذا ڈاکٹر انور معظم بڑی حد تک پس منظر ہی میں رہے۔ بیشتر تقریبات جیلانی بانو کے اعزاز میں ہوئیں، ڈاکٹر صاحب ان میں شریک تو ہوئے تھے لیکن بطور کے از سامعین۔ ہاں دو چار جگہ ڈاکٹر صاحب کو اظہار خیال کا موقع ملا تو لوگوں کو اندازہ ہوا کہ اگر جیلانی بانو کی شہرت "پردہ حائل" نہ ہوتی تو اخباروں میں ڈاکٹر صاحب کے دو چار انٹرویو الگ سے بھی چھپ جاتے۔ انٹرویو کی بات ہم نے اس لیے عرض کی ہے کہ جیلانی بانو کے جتنے بھی انٹرویو اخبارات میں چھپے ہیں، ان میں ایک آدھ سوال ڈاکٹر صاحب سے بھی کر لیا جاتا تھا۔ ''نوائے وقت'' کے انٹرویو میں ڈاکٹر صاحب نے یہ کہہ کر دامن چھڑا لیا کہ میں تو ادب کا محض قاری ہوں۔ ڈاکٹر صاحب سے گزارش ہے کہ اتنے انکسار سے کام نہ لیں، ورنہ لوگ انھیں صرف جیلانی بانو کا قاری سمجھنے لگیں گے۔

دوسرے مہمان ''شاعر'' بمبئی کے مدیر افتخار امام صدیقی تھے جو خلاف معمول کسی مشاعرے میں شرکت کے لیے نہیں آئے تھے حالانکہ وہ سفر عموماً مشاعروں ہی کے لیے کرتے ہیں۔ ان کے بارے میں سنا گیا ہے کہ وہ سال میں گیارہ مہینے مشاعروں میں رہتے ہیں اور ایک مہینہ جو بچتا ہے، اس میں مشاعروں کے منتظمین سے خط و کتابت کرتے ہیں۔ ایک بار گھر سے نکلتے ہیں تو دس پندرہ مشاعرے بھگتا کر ہی لوٹتے ہیں۔ کلام بھی اچھا ہے اور ترنم بھی عمدہ ہے۔ اس وجہ سے وہ ادب نوازوں ہی میں نہیں، گانا سننے کے شوقین لوگوں میں بھی مقبول ہیں۔ مشاعرہ بازی کی عادت کی وجہ سے وہ اپنا رسالہ ریل گاڑی میں مرتب کرتے ہیں، اس کے باوجود ''شاعر'' اردو کا بہترین رسالہ ہے۔

افتخار امام کے بارے میں یہ واقعہ سننے میں آیا ہے۔ دروغ بر گردن راوی، چند سال ہوئے ان کے بھائی کی شادی تھی۔ یہ مشاعرہ گردی میں مصروف کسی دور دراز شہر میں مقیم تھے۔ گھر والوں نے تار دیا، ''جلد آجاؤ، بھائی کی شادی ہے۔'' انھوں نے جوابی تار دیا، ''بے حد مصروف ہوں، اس لیے معذرت۔'' گھر والوں نے ایک اور تار دیا، ''شادی کے موقع پر مشاعرہ بھی ہوگا۔ اس لیے تمہاری شرکت ضروری ہے۔'' اب کے افتخار امام کی جواب یہ تھا، ''آرہا ہوں، آمد و رفت کا کرایہ اور محنتانہ پیشگی بھجوا دیجیے۔''

افتخار امام کی آمد کا مقصد یہ تھا کہ وہ اپنے رسالے کا پاکستانی ادب نمبر شائع کر رہے ہیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے کراچی کے تمام اہم ادیبوں سے رابطہ قائم کیا اور بہت سا مواد حاصل کیا۔ وہ لاہور اور اسلام آباد بھی جانا چاہتے تھے، لیکن وقت کی کمی کی وجہ سے وہ ایسا نہ کر سکے۔ لاہور، اسلام آباد کے ادیبوں کو یہ چاہیے کہ وہ بمبئی جا کر افتخار امام کے پاکستانی ادب نمبر کے لیے اپنی تخلیقات پیش کریں۔ ایسا کرنا کچھ مشکل نہیں۔ اکادمی ادبیات کے پاس سیر و سیاحت کے لیے خاصے فنڈز ہیں۔ اکادمی، ادیبوں کو گلگت اور سوات وغیرہ کی سیر تو کراتی ہی رہتی ہے اب کے ''سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی'' اور اگر اکادمی کے انتظامی ڈھانچے میں تبدیلی کی وجہ سے یہ ممکن نہ ہو تو اکادمی کا فرض ہے کہ وہ افتخار امام کو اپنے مہمان کی حیثیت سے پاکستان بلائے۔ ''شاعر'' کا پاکستانی ادب نمبر صحیح طور پر پاکستانی ادب کا عکاس ہونا چاہیے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ افتخار امام پاکستانی ادیبوں سے فرداً فرداً رابطہ قائم کریں۔

تیسرے مہمان شاہین تھے جو کینیڈا سے تشریف لائے تھے۔ یہ پہلے شاہین غازی پوری کے نام سے مشہور تھے۔ اب علامہ اقبال کے شاہین کی طرح صرف ''شاہین'' ہیں۔ فرق یہ ہے کہ یہ پہاڑوں کی چٹانوں پر بسیرا نہیں کرتے، جب پاکستان آتے ہیں تو جناب صہبا لکھنوی، مدیر ''افکار'' کے دولت خانے پر قیام کرتے ہیں۔ جناب صہبا لکھنوی بڑے مہمان نواز ہیں۔ غیر ملکوں سے آنے والے اکثر ادیب انھی کے ہاں قیام کرتے ہیں۔ صہبا صاحب اپنے مہمانوں کا اتنا خیال رکھتے ہیں کہ ان سے افکار کا اداریہ ہی نہیں لکھواتے، پروف بھی پڑھواتے ہیں، اسی لیے افکار میں معنوی غلطیاں تو ہوتی ہیں کتابت کی کوئی غلطی نہیں ہوتی۔ صہبا صاحب اتنے وسیع القلب ہیں کہ غیر ملکیوں سے بھی اپنے ہم وطنوں جیسا سلوک کرتے ہیں۔ یعنی انھیں ان کے نام سے نہیں، افکار کے سالانہ خریدار نمبر سے یاد رکھتے ہیں۔ غیر ملکی مہمان بھی صہبا صاحب کا اس قدر خیال کرتے ہیں کہ اپنے پاسپورٹ پر ''افکار'' کا خریدار نمبر بھی لکھ رکھتے ہیں تاکہ کہیں غلطی سے انھیں دوبارہ خریدار نہ بنا لیا جائے۔

شاہین ''اردو کینیڈا'' کے نام سے انگریزی میں ایک رسالہ شائع کرتے ہیں جس میں اردو تخلیقات کے انگریزی تراجم اور اردو ادب کے بارے میں تعارفی و تنقیدی مضامین شائع ہوتے ہیں۔ کتابوں پر تبصرے اور ادبی خبریں بھی ہوتی ہیں۔ اس رسالے کے اب تک دو شمارے شائع

ہوئے ہیں اور دونوں ہی ایڈیٹر کی محنت اور خوش ذوقی کا آئینہ ہیں۔ شاہین ایک اچھے شاعر بھی ہیں جس کا علم ہمیں ان کے دیوان کی اشاعت سے ہوا تھا، اور مزید علم ''اردو کینیڈا'' سے ہوا ہے کہ اس میں ان کی نظموں کے انگریزی تراجم شامل ہیں۔ یہ تراجم ہمیں اتنے پسند آئے کہ جی چاہتا ہے انھیں دوبارہ اُردو میں ترجمہ کیا جائے۔

''اردو کینیڈا'' میں نئے پرانے، اچھے برے، معروف، غیر معروف، ہر طرح کے ادیبوں کی تخلیقات کے تراجم شائع کیے گئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اُردو ادب واقع بڑی کسمپرسی کی حالت میں ہے۔ خدا کرے یہ رسالہ تادیر جاری رہے تاکہ ہمارے لکھنے والوں کی جو تحریریں اُردو میں براہِ راست قارئین کو متاثر نہیں کرسکیں، انگریزی میں ترجمہ ہوکر اپنا ایک حلقۂ اثر قائم کرلیں۔ رسالے کا تعارفی و تنقیدی حصہ خاصا معلوماتی ہے۔ کاش اُردو ادب سے متعلق اس قسم کے سنجیدہ ادبی رسالے پاکستان اور ہندوستان سے بھی شائع ہوں۔

(۶ر نومبر ۱۹۸۶ء)

سالِ وفات پر بحث سے ثابت ہوجاتا ہے کہ وفات واقعی ہوئی تھی

پچھلے کالم میں ہم نے بعض غیر ملکی مہمانوں کا ذکر کیا تھا، یہ کالم جب چھپ گیا تو ہمیں خیال آیا کہ اس میں سب سے اہم مہمان کا تو ذکر ہی نہیں ہے۔ خدا جانے یہ ہمارے حافظے کی خرابی یا مہمان مذکور کی شہرت اجتنابی، بہرحال اس کوتاہی کی تلافی ضروری ہے، ورنہ کہیں یہ نہ سمجھا جائے کہ ہم صرف مقبولِ عام قسم کے ادیبوں سے واسطہ رکھتے ہیں اور ان اہلِ قلم سے ہمیں کوئی دلچسپی نہیں ہے جن کی پبلک ریلیشنگ کمزور ہے۔ اس وقت جس مہمان کا ذکر مقصود ہے، ان کا نام ہے ڈاکٹر حمیرا خاتون۔ یہ محترمہ شاعرہ ہیں نہ افسانہ نگار۔ حد تو یہ ہے کہ انشائیہ نویسی بھی نہیں فرماتیں کہ آج کل دنیائے ادب میں داخلے کا آسان ترین راستہ یہی ہے۔ ان کی دلچسپی کا میدان تحقیق ہے۔ ایک خاتون اور تحقیق! جی ہاں، کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے اور ڈاکٹر حمیرا کے معاملے میں تو ایسا ہونا اس لیے بھی ضروری ہے کہ وہ موجودہ دور کے سب سے بڑے محقق قاضی عبدالودود کی قریبی عزیزہ ہیں۔ آپ پٹنے سے تشریف لائی ہیں اور پٹنہ یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو سے منسلک ہیں۔ ڈاکٹر حمیرا خاتون کا نام اہلِ پاکستان کے لیے نیا سہی، لیکن ہندوستان کے علمی و ادبی حلقوں میں انھیں سبھی جانتے ہیں۔ ان کے مقالے علمی و ادبی جرائد میں اکثر شائع ہوتے رہتے ہیں۔

اہلِ تحقیق زندہ لوگوں سے ذرا کم ہی دلچسپی لیتے ہیں۔ جب تک کسی ادیب کے انتقال کو ایک دو صدیاں نہ گزر جائیں، وہ ان کے لیے لائقِ توجہ نہیں ہوتا۔ محققین کے نزدیک کسی ادیب کا زندہ ہونا اس کی اہمیت کو کم کردیتا ہے۔ گویا تحقیق کا مطلب ہے مُردوں کو زندہ کرنا اور زندوں کو مرنے کا موقع دینا تاکہ آنے والی نسلیں ان پر تحقیق کرسکیں۔

ہم اہلِ تحقیق سے بہت ڈرتے ہیں۔ کیوں؟ ایک واقعہ سن لیجیے۔ ایک مرتبہ لکھنؤ کے

مشہور محقق کاظم علی خان صاحب سے ہماری ملاقات ہوئی۔ ہم نے غلطی سے پوچھ لیا کہ آج کل آپ کس موضوع پر تحقیق کر رہے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ وہ میر تقی میر کے بیٹے میر کلو عرش کے سالِ وفات پر تحقیق کر رہے ہیں۔ اس کے بعد وہ دو گھنٹے تک ہمیں اپنے نتائجِ تحقیق سے آگاہ فرماتے رہے۔ آخر میں انھوں نے ہم سے پوچھا: ”اس معاملے میں آپ کی کیا رائے ہے؟“ ہم نے عرض کیا: ”آپ کی علمی گفتگو سے میر کلو عرش کا سالِ وفات ہی نہیں بلکہ ہمارا زمانہ وفات بھی متعین ہو گیا ہے۔“

ڈاکٹر حمیرا خاتون میں عام محققوں والی کوئی بات نہیں۔ ان کے تحقیقی کام کو دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ ان کی گفتگو بھی خشک قسم کی ہوگی، لیکن ایسا نہیں ہے۔ وہ نہایت شگفتہ مزاج ہیں۔ پٹنے کے زندہ ادیبوں اور وہاں کے ادبی ماحول کے بارے میں انھوں نے بہت سی دلچسپ باتیں بتائیں۔ مہدی بخش تسلیم کا دیوان اور رسالہ ”معاصر“ کا شمارہ انھوں نے از راہِ لطف و کرم عنایت فرمایا۔ یہ دونوں چیزیں پہلی مرتبہ ہماری نظر سے گزری ہیں، اس لیے ان کا ذکر ذرا تفصیل چاہتا ہے۔

مہدی بخش تسلیم بہار کے رہنے والے تھے اور ان کے انتقال کو سو برس سے کچھ زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے۔ ڈاکٹر حمیرا خاتون نے تسلیم کا دیوان بڑی محنت سے مرتب کیا ہے اور اس کے حالات اور خصوصیات، شاعری پر بڑا فاضلانہ مقدمہ لکھا ہے۔ عام محققوں کی طرح انھوں نے بھی تسلیم کے سالِ وفات پر خوب جم کر بحث کی ہے، جس سے کم از کم یہ ضرور ثابت ہو جاتا ہے کہ تسلیم کی وفات واقعی ہوئی تھی اور اس کا امکان نہیں ہے کہ وہ اب تک زندہ ہو۔

تسلیم اپنی وضع کے منفرد شاعر تھے۔ انھوں نے ایسی ایسی مشکل بلکہ بنجر زمینوں میں غزلیں کہی ہیں کہ آج کل کے تمام شاعر مل کر بھی ایسی غزلیں نہیں کہہ سکتے۔ ان غزلوں کو پڑھتے ہوئے قاری کو اپنے حواس مرتب کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اسی سے اندازہ کر لیجیے کہ ان کی غزلوں کو کتنی محنت سے مرتب کیا گیا ہوگا۔ تسلیم کی غزلوں کے صرف چند مطلع ملاحظہ فرمائیے، آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ یہ نغمہ گو کس درجے کا استادِ فن ہے۔

ہوں تیری رہ میں ضعف سے ہم دوشِ نقشِ پا
ہے تن مرا کہ حلقۂ آغوشِ نقشِ پا

دیکھیں کب دیکھتے ہیں جادۂ مرگ
اب تو ہم ہیں نظر افتادۂ مرگ

امتحاں میں نہ تھے عاشقِ بے باک کے پاؤں
جم گئے کوہ کی مانند کفِ خاک کے پاؤں

ہے رخسار کی حیرت نے کی تاثیر پانی میں
رنگ آئینہ ہے ہر موج کی تحریر پانی میں

آتشِ رُو کون سا روشن گر آئینہ ہے
موجِ مژگاں سمندر جو ہر آئینہ ہے

کیے اس خنجرِ ابرو نے میرے دل کے سو ٹکڑے
ہوئے شمشیرِ ماہِ نو سے اس بسمل کے سو ٹکڑے

ڈاکٹر حمیرا خاتون نے رسالہ ”معاصر“ کا جو شمارہ ہمیں عنایت کیا ہے، اس میں یوں تو کام کی کئی چیزیں ہیں، مگر سب سے دلچسپ مضمون قاضی عبدالودود مرحوم کا ہے۔ اس مضمون کا سببِ تصنیف یہ ہے کہ کچھ عرصہ قبل مشہور نقاد کلیم الدین احمد مرحوم نے رسالہ ”معاصر“ کا ضخیم قاضی عبدالودود نمبر شائع کیا تھا۔ قاضی صاحب نے اپنے مضمون میں اسی نمبر کے بعض مضامین پر تبصرہ کیا ہے۔ قاضی صاحب کا اندازِ بیاں، ان کے معمول کے برعکس، خاصا شگفتہ ہے۔

ڈاکٹر مختار الدین احمد نے قاضی صاحب پر اپنے مضمون میں لکھا تھا کہ بے پناہ حافظے کے باوجود قاضی صاحب کو مکمل شعر بمشکل ہی یاد رہتے ہیں۔ اس کے جواب میں قاضی صاحب لکھتے ہیں:

”میں ان سے بیت بازی کے لیے تیار ہوں۔ میری شکست ہو تو دو ہزار روپے ان کی نذر کروں گا (یہ رقم بڑھائی بھی جا سکتی ہے) ان کی ہار ہو تو وہی رقم ادارۂ تحقیقاتِ اردو کو عنایت کریں۔ شرطیں طے ہو جائیں گی۔ ایک شخص ثالث ہو گا جس کے پاس رقمِ مذکورہ جمع کر دی جائے گی۔“

ڈاکٹر مختار الدین کے مضمون کی چند اور ”اغلاط“ کی نشاندہی کے بعد قاضی صاحب اعلان کرتے ہیں:

”میرے متعلق ڈاکٹر مختار الدین احمد نے اتنی غلط باتیں لکھی ہیں کہ سب کی تردید کی جائے تو یہ بہت جگہ لے گی۔ میں اجمالاً لکھتا ہوں کہ ان کی کوئی بات، جب تک میں اس کی تصدیق نہ کروں یا معتبر ذرائع سے اس کی تصدیق نہ ہو، قبول نہ کی جائے۔ وہ ثبوت میں میرے خط کا حوالہ دیں تو اصل خط پیش کریں۔“

ڈاکٹر گیان چند نے قاضی صاحب پر جو مضمون لکھا تھا، اس کا عنوان ”بت شکن محقق“ تھا۔ اس میں قاضی صاحب کی تحقیق کی خوبیوں کے ساتھ خامیاں بھی بیان کی گئی تھیں۔ قاضی صاحب کا ردِعمل ملاحظہ فرمائیے:

''ڈاکٹر گیان چند جین ..... خود اپنا نام حق شکن بت رکھ لیں تو ناموزوں نہ ہوگا۔ حق شکن اس لیے کہ وہ حق شکنی کی کوشش کرتے ہیں۔ بت اس لیے کہ بت خاموش رہتا ہے۔ ڈاکٹر جین خاموش نہیں رہتے، لیکن وہ کتنا ہی طول کلام سے کام لیں، نتیجہ وہی ہوتا ہے جو خاموشی سے ہوتا۔ خاص نمبر کی اشاعت کے بعد انھوں نے مجھ سے ایک سوال کیا تھا اور اپنی دریدہ دہنی کی معذرت چاہی تھی۔ میں نے سوال کا جواب تو دیا، لیکن دریدہ دہنی کے متعلق کچھ نہ لکھا۔ لکھتا تو یہ لکھتا کہ دہنت دریدہ تر باد۔ حیدرآباد جانے کے بعد ڈاکٹر جین نے مجھے ایک خط لکھا جس میں میری بہت تعریف کی تھی اور اجازت دی تھی کہ وہ خط شائع کر دیا جائے۔ وہ جانتے ہوں گے کہ مجھے ان کے سرٹیفکیٹ کی ضرورت نہیں اور میں ان کا خط کبھی شائع نہ کروں گا۔''

ڈاکٹر سید محمد حسنین نے اپنے مضمون میں لکھا تھا کہ قاضی صاحب نے کبھی کسی کی تعریف نہیں کی۔ اس کے جواب میں قاضی صاحب لکھتے ہیں:

''ان کی مراد یہ معلوم ہوتی ہے کہ میں نے کبھی ان کی تحسین نہیں کی۔ یہ کمی میں آج پوری کیے دیتا ہوں اور بالاعلان کہتا ہوں کہ پیروی کے فن میں کم لوگ ان کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔''

قاضی صاحب نے ڈاکٹر حسنین کے بارے میں اور بھی بہت کچھ لکھا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ''پیروی کے فن'' سے ان کی مراد ہے سفارش وغیرہ کا فن۔

(۱۳ر نومبر ۱۹۸۶ء)

موازنۂ ادبیاتِ پاک و ہند

ہندوستان اور پاکستان کے ادب کا موازنہ کرتے ہوئے کچھ عجب صورت حال سامنے آتی ہے۔ مثلاً شاعری نہ وہاں اچھی ہو رہی ہے نہ یہاں۔ یہاں نثری نظم جیسی نحیف و نزار صنف کی پرورش ہو رہی ہے تو وہاں آزاد غزل جیسی مخبوط الحواس چیز پروان چڑھ رہی ہے۔ وہاں تنقید کی فصل سارا سال لہلہاتی ہے اور ہر نقاد نے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنا رکھی ہے۔ یہاں قحط سالی ہے۔ اچھے نقاد ہیں نہ اتنی اینٹیں۔ لے دے کے ایک بھائی محمد علی صدیقی ہیں جو زیادہ تر انگریزی میں لکھتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ اگر ان کی اُردو تحریریں، انگریزی میں ملا دی جائیں تو یہ شناخت کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ کون سی تحریر کس زبان میں ہے۔ فکشن میں البتہ دونوں طرف صورت حال بہتر ہے۔ یہاں انتظار حسین ہیں اور وہاں قرۃ العین حیدر۔ دونوں کے قلم بھی زرخیز ہیں اور ذہن بھی۔ تحقیق کی حالت ہندوستان میں قدرے غنیمت ہے۔ وہاں اتنی یونیورسٹیوں میں اُردو شعبے ہیں اور ہر شعبے میں تقریباً اتنی ریسرچ اسکالر ہیں۔ ہر سال پی ایچ ڈی کے لیے سو سے زائد مقالے تیار ہوتے ہیں جن میں کم از کم ایک آدھ ایسا ضرور ہوتا ہے جس میں تحقیق کا حق ادا کیا جاتا ہے۔ پاکستان میں ابھی تحقیق نے اتنی ترقی نہیں کی کہ سو میں سے ایک مقالہ بھی کام کا ہو۔ یہاں ہزار میں ایک بھی کام کا نکل آئے تو غنیمت جانیے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ایک تو پاکستان میں یونیورسٹیاں کم ہیں اور جو ہیں وہاں بھی تحقیق کا شوق اس وقت سے پیدا ہوا ہے جب سے یہ قانون نافذ العمل ہے کہ ہر پی ایچ ڈی استاد کی تنخواہ میں ایک ہزار روپے کا اضافہ ہوگا۔

دونوں ملکوں میں ادبی رسالوں کا حال بھی خاصا پتلا ہے۔ پاکستان میں ڈائجسٹ اور اخباروں کے ادبی صفحے، رسالوں کو کھا گئے۔ ہندوستان میں ادبی رسالوں کو خریدار نہیں ملتے، صرف اعزازی قاری ملتے ہیں۔ ڈھنگ کا ایک ہی ماہنامہ یہاں سے نکلتا ہے (افکار، کراچی) ایک ہی وہاں سے (شاعر، بمبئی)۔ باقی سب رسالے مرضی دار ہیں۔ جب جی چاہا رسالہ شائع کیا، جب جی نہ چاہا نہ کیا۔

تحقیقی و علمی رسالے البتہ ہندوستان میں زیادہ ہیں۔ "غالب نامہ" (دہلی)، "اکادمی" (لکھنؤ)، خدا بخش لائبریری جرنل (پٹنہ)، نقد و نظر (علی گڑھ) اور "اردو ادب" (دہلی) ایسے رسالے ہیں جن پر کوئی بھی زبان فخر کر سکتی ہے۔ اردو سے متعلق علمی ادارے پاکستان میں چند ہی ہیں۔ ہندوستان میں صرف تیرہ تو صوبائی اردو اکیڈمیاں ہیں۔ پھر ترقی اردو بیورو ہے۔ انجمن ترقی اردو اور ادارہ ادبیات اردو جیسے قدیم ادارے بھی ہیں۔ ادبی کتابیں ہندوستان میں زیادہ شائع ہوتی ہیں اور ان کی قیمتیں بھی مناسب ہوتی ہیں، پاکستانی کتابوں کی قیمتوں کی طرح آسمان سے باتیں نہیں کرتیں۔

کالم نگاری میں پاکستان کا پلہ بھاری ہے۔ وہاں اول تو کالم نگاری کی کوئی اہمیت نہیں، دوسرے ایسے اخبار بھی نہیں ہیں جو صرف کالم نگاروں کی وجہ سے چلتے ہوں۔ پاکستان میں کئی اہل قلم ایسے ہیں جنھوں نے کالم نگاری کو سکۂ رائج الوقت بنا دیا ہے، مثلاً عطاء الحق قاسمی، عطاء الحق قاسمی۔ ہمارا ارادہ تھا کہ لفظ "مثلاً" کے بعد ہم کم از کم دو کالم نگاروں کے نام لکھیں گے، لیکن اس لائق ہمیں ایک ہی نام نظر آیا، سو اسی کو دو مرتبہ لکھ دیا۔ قاسمی صاحب بلاشبہ ہمارے ملک کے مقبول ترین کالم نگار ہیں۔ ہم جیسے "عوام" سے لے کر صدر مملکت جیسے خواص تک ان کے قدر دان ہیں۔ صدر مملکت نے اپنی تقریروں میں علامہ اقبال کے بعد جس ادیب کا حوالہ سب سے زیادہ دیا ہے، وہ عطاء الحق قاسمی ہی ہیں۔ علامہ اقبال تو شاید اپنی شاعری کی وجہ سے آئندہ یاد رکھے جائیں، لیکن عطاء الحق قاسمی کے یاد رہ جانے کے لیے صدر مملکت کا حوالہ کافی ہوگا۔

طنز و مزاح کے معاملے میں پاکستان اور ہندوستان، دونوں اپنی جگہ خود کفیل ہیں۔ یہاں نثر میں مشتاق احمد یوسفی، شفیق الرحمن، کرنل محمد خان اور محمد خالد اختر جیسے اہل قلم ہیں جن میں سے ہر ایک اپنی مثال آپ ہے۔ نظم میں ضمیر جعفری اور دلاور فگار ہیں۔ جنھوں نے اپنے تخلصوں کی سنجیدگی بلکہ زخم خوردگی کے باوجود طنزیہ و مزاحیہ شاعری کو درجۂ کمال تک پہنچا دیا ہے۔ ہندوستان میں طنز و مزاح کا چرچا پاکستان سے کہیں زیادہ ہے۔ ہر سال حیدر آباد، دکن میں مزاح کانفرنس ہوتی ہے جس میں سینکڑوں مزاح نگار شرکت کرتے ہیں۔ ہندوستان کے بعض علمی مذاکرے اور سیمینار بھی اس وقت مزاح کانفرنسوں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں جب ان میں ایسے پاکستانی "دانشور" شریک ہوتے ہیں جن کا ان مذاکروں کے موضوعات سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ مثلاً پٹنہ میں مخطوطات پر جو سیمینار ہوا تھا اس میں بعض ایسے پاکستانی مخطوطہ شناس شریک ہوئے جنھیں مخطوطہ اور مطبوعہ کا فرق بھی معلوم نہیں

تھا۔ اس سے پٹنہ والوں کی مردم شناسی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

ہندوستان میں طنز و مزاح پر علمی کام بھی بہت ہوا ہے۔ متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ علی گڑھ میگزین اور "شاہراہ" کے طنز و مزاح نمبر تو ہمارے "نقوش" کے طنز و مزاح نمبر سے پہلے شائع ہوئے تھے۔ حال ہی میں رسالہ "شگوفہ" (حیدر آباد دکن) نے بھی ایک ضخیم نمبر شائع کیا ہے۔ کالم نگاری پر فکر تونسوی کی کتاب اپنی نوعیت کا منفرد کام ہے۔ اس میں کالم نگاری کی تاریخ بھی ہے اور انتخاب بھی۔ ہندوستان میں طنز و مزاح نگار اتنی بڑی تعداد میں ہیں کہ اگر یہ اپنی سیاسی پارٹی بنا لیں تو اکثریتی پارٹی ہونے کی وجہ سے اپنی حکومت بھی قائم کر سکتے ہیں۔ ہندوستان میں اس وقت طنز و مزاح لکھنے والوں میں جن کے نام کا ڈنکا بج رہا ہے، ان میں سر فہرست فکر تونسوی، مجتبیٰ حسین اور یوسف ناظم ہیں۔

یوسف ناظم کے نام پر یاد آیا کہ ہم نے انھی کی تازہ کتاب "فی الحال" کے بارے میں کچھ عرض کرنے کے لیے مذکورہ تمہید باندھی تھی جو موازنۂ ادبیات پاک و ہند کی صورت اختیار کر گئی۔ یہ انداز تحریر ہم نے اپنے کرم فرما ڈاکٹر مولانا ابو سلمان شاہجہانپوری سے سیکھا ہے۔ وہ جب مولانا ابوالکلام آزاد کی صحافت، سیاست یا کسی اور پہلو پر کچھ لکھتے ہیں تو مضمون کا آغاز حضرت آدم کے جنت سے نکالے جانے یا سقراط کے زہر کا پیالہ پینے سے کرتے ہیں اور پھر تاریخ عالم کے تمام اہم واقعات بیان کرنے کے بعد مضمون کے آخری پیراگراف میں مولانا آزاد کی صحافت یا سیاست کا ذکر کر دیتے ہیں۔ یوسف ناظم کے ساتھ بھی ہم کچھ اسی قسم کا سلوک کر رہے ہیں۔

یوسف ناظم ۱۹۴۴ء سے لکھ رہے ہیں اور ۱۹۶۲ء میں ان کی پہلی کتاب "کیف و کم" شائع ہوئی تھی۔ لیکن ان کے فن اور شہرت کا دائرہ ۱۹۷۰ء سے وسیع ہونا شروع ہوا ہے۔ اب تک ان کی ایک درجن کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ صرف شائع ہی نہیں ہوئیں، مقبول بھی ہوئی ہیں۔ ان کے "موضوعات سخن" میں خاصا تنوع پایا جاتا ہے۔ انھوں نے صرف ادبی موضوعات پر ہی نہیں، زندگی کے عام مسائل پر بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ ان کے مزاح میں شائستگی، طنز میں مقصدیت اور انداز تحریر میں شگفتگی پائی جاتی ہے جو قاری کو سچی ادبی مسرت سے ہمکنار کرتی ہے۔ انھوں نے شخصی خاکے بھی لکھے ہیں جن میں طنز و مزاح سے آلاتِ حرب و ضرب کا نہیں، متعلقہ شخصیت کو لکھنے سمجھنے کا کام لیا ہے۔ باقر مہدی کا شخصی خاکہ اس کی بہترین مثال ہے، جس میں اسی قسم کے جملے کثرت سے ملتے ہیں: "باقر مہدی علم کی اس بلندی پر ہیں جہاں خود علم کے پہنچنے میں ابھی دیر ہے۔"

یوسف ناظم کی تازہ کتاب "فی الحال" ان مضامین کا مجموعہ ہے جو پچھلے تین برسوں میں لکھے گئے۔ مضامین کے عنوانات اس قسم کے ہیں: تعلیم بالغاں، قینچی، انتظار، داستان ٹکٹوں کی، اخبار کا آخری صفحہ، مہمانِ خصوصی وغیرہ۔ اس قسم کے عنوانات پر ہمارے ہاں انشائیے لکھے جاتے ہیں۔ مگر یوسف ناظم نے انشائیے نہیں لکھے، کیونکہ وہ دبستانِ سرگودھا میں شرکت کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔ حالانکہ اس میں کوئی ہرج نہیں ہے۔ جس طرح ترقی پسند تحریک والے دونوں ملکوں میں ہیں، اسی طرح دبستانِ سرگودھا سے وابستہ لوگ بھی دونوں جگہ موجود ہو سکتے ہیں۔ ہاں اس سے ڈاکٹر سلیم اختر کی مصروفیات بڑھ جائیں گی۔ جس طرح انھوں نے پاکستان میں دبستانِ سرگودھا کے خلاف محاذ قائم کر رکھا ہے، ایسا ہی محاذ انھیں ہندوستان میں قائم کرنا پڑے گا۔

بہرحال یوسف ناظم نے مذکورہ موضوعات پر جو کچھ لکھا ہے اس سے ان کے جوہر ہی نہیں کھلتے، ان موضوعات کی قلعی بھی کھل جاتی ہے۔ مثلاً انھوں نے تعلیم بالغاں کے اس قسم کے نقصانات گنوائے ہیں: ..... "تعلیم بالغاں سے ایک نقصان تو بالغوں کو یہ پہنچے گا کہ وہ کہیں ناخواندہ مہمان نہیں بن سکیں گے..... اگر بالغوں نے واقعی پڑھنا شروع کر دیا تو انھیں معلوم ہو جائے گا کہ مدرسوں میں ان کے بچوں کو کیا پڑھایا جاتا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ بچوں کے اسکول بھی بند ہو جائیں۔"

"داستان ٹکٹوں کی" میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

"ایک زمانہ تھا کہ ہوائی جہاز وقت پر اڑا اور اترا کرتے تھے۔ جب معلوم ہوا کہ ملک میں کوئی کام بھی وقت پر نہیں ہوتا تو طیارے بھی دیر سے اڑنے لگے اور بعض اوقات تو دوردرشن کے اردو پروگراموں کی طرح منسوخ بھی ہونے لگے۔ جب کوئی جہاز اڑتا نہیں تو اس کے مسافروں کو ایک اور ٹکٹ بھی دیا جاتا ہے۔ یہ ائرپورٹ کے ریستوران میں داخلے اور مفت کھانے کا ٹکٹ ہوتا ہے۔ اس ٹکٹ کی خوبی یہ ہے کہ ریستوران کا منیجر اس ٹکٹ کو دیکھ کر ہنستا ہے۔"

فی الحال یہ دو مثالیں کافی ہیں۔ اگر مثالیں دینے کا سلسلہ شروع ہو گیا تو پوری کتاب نقل کرنی پڑے گی اور اس طرح پاکستان میں ناجائز طور پر چھپنے والی ہندوستانی کتابوں میں ایک اور کا اضافہ ہو جائے گا۔

(۲۰ نومبر ۱۹۸۶ء)

حیدر آباد، فرخندہ آباد کی سیر

شخصی خاکہ نگاری ایک مشکل فن ہے۔ یہ غزل جیسی صنفِ ادب نہیں کہ ردیف و قافیہ کے گلدان میں پامال مضامین کو کاغذی پھولوں کی طرح سجا دیا جائے۔ یہ نثری نظم بھی نہیں کہ لفظوں کو ان کے معنوں سے جدا کر کے چھوٹی بڑی سطروں میں دفن کر دیا جائے۔ یہ علامتی افسانہ بھی نہیں کہ نثری نظم والوں کے دفن کردہ الفاظ کو جھاڑ پونچھ کر دوبارہ صفحۂ قرطاس پر بکھیر دیا جائے۔ یہ جدید سفرنامہ بھی نہیں کہ سفرنامہ نگار خود تو ایئر ہوسٹسوں کے نرغے میں پرواز کرتا رہے اور بیچارہ قاری حیرت و استعجاب کی وادیٔ پُرخار میں پیدل چل چل کر اپنے تلوے لہولہان کر لے۔

شخصی خاکہ نگاری کے لیے چار چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ سب سے پہلے تو ایسی آنکھ چاہیے جو کسی شخص کے ظاہر و باطن کا مشاہدہ کر سکے۔ پھر وہ بصیرت چاہیے جو ان عوامل کا تعین کر سکے جو کسی شخصیت کی تعمیر میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ تیسری چیز حقیقت بیانی ہے، یعنی موضوع کو اسی طرح پیش کیا جائے جیسا وہ ہے، نہ کہ لکھنے والا اپنی منشاء کے مطابق اس کے خدوخال سنوارے یا بگاڑے۔ چوتھی اور سب سے اہم چیز یہ ہے کہ خاکہ نگار کو لکھنے کا فن آتا ہو۔ وہ کم سے کم لفظوں میں زیادہ سے زیادہ معانی پیش کرنے کے ہنر سے واقف ہو۔

ہمارے بہت کم خاکہ نگار ان چار شرائط کو پورا کرتے ہیں۔ اگر کسی کے پاس مشاہدہ ہے تو اس یہ معلوم نہیں کہ اسے کس طرح پیش کیا جائے۔ یا پھر اکثر خاکہ نگاروں نے یہ فارمولا بنا رکھا ہے کہ موضوع کی خوبیوں کے ساتھ دو چار خامیاں بھی بیان کر دی جائیں تاکہ توازن برقرار رکھا جائے۔ بعض توازن کے قائل نہیں، وہ موضوع کو ہیرو بنا کر پیش کرتے ہیں اور بعض خاکہ نگار اپنی ذات کو اس حد تک نمایاں کرتے ہیں جیسے وہ کسی اور کا خاکہ نہیں لکھ رہے ہیں، بلکہ اس سے اپنا خاکہ لکھوا رہے ہیں۔

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اردو میں اچھے خاکے نہیں لکھے گئے۔ لکھے گئے ہیں اور خاصی

تعداد میں ہے۔ مثلاً پچھلے ڈیڑھ سال میں کم از کم دو مجموعے ضرور ایسے شائع ہوئے ہیں جن میں اچھے خاکے خراب خاکوں کی نسبت زیادہ ہیں۔ ان میں سے ایک مجموعہ پاکستان میں شائع ہوا ہے اور دوسرا ہندوستان میں۔ پاکستانی مجموعہ بزرگ افسانہ نگار ممتاز مفتی کا ہے "اوکھے لوگ" (اوکھے، پنجابی لفظ ہے جس کا مطلب ہے "مشکل")۔ ہندوستانی مجموعے کا نام "خاکے" ہے اور اس کے مصنف ہیں عوض سعید۔

ممکن ہے عوض سعید کا نام ہمارے بعض پڑھنے والوں کے لیے نیا ہو۔ لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ بعض پڑھنے والوں کے لیے غالب کا نام بھی نیا ہوتا ہے۔ غالب کا تعارف نامہ تو ہم پھر کبھی پیش کریں گے، فی الحال عوض سعید کے بارے میں عرض ہے کہ وہ خاصے پرانے اور اہم افسانہ نگار ہیں۔ پاکستانی رسالوں خصوصاً میرزا ادیب کے زمانے کے "ادب لطیف" میں ان کی کئی کہانیاں شائع ہو چکی ہیں۔ اب تک ان کے افسانوں کے چار مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں، جنھیں ادبی حلقوں میں بے حد سراہا گیا۔ ان چاروں مجموعوں کو ہندوستان کی مختلف اردو اکیڈیمیوں کے انعامات بھی مل چکے ہیں۔ یہ بات ہم نے قیاساً لکھی ہے۔ ہمارا قیاس اس لیے غلط نہیں ہو سکتا کہ ہندوستان میں اردو کتابوں پر کثرت سے انعامات دیے جاتے ہیں۔ یہ انعام اتنے زیادہ ہوتے ہیں کہ کتابیں کم پڑ جاتی ہیں۔ تب مسودوں کو انعامات سے نوازا جاتا ہے۔ آخر میں ان کتابوں کی باری آتی ہے جو ابھی بطن مصنف میں ہوتی ہیں۔ اس کے بعد بھی گنجائش رہ جائے تو کتابوں کی بجائے افراد کو تختۂ مشق بنایا جاتا ہے، جیسے حال ہی میں مجوزہ عالمی اردو کانفرنس کی طرف سے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور بعض دوسرے ادیبوں کے لیے انعامات کا اعلان کیا گیا ہے۔ اس انعام کی خوبی یہ ہے کہ انعام لینے والے ہی نہیں، دینے والے بھی ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ہیں، اس لیے وہ دوہری مبارکباد کے مستحق ہیں۔

آئیے اب اصل موضوع کی طرف لوٹیں۔ اگر اِدھر اُدھر کی باتوں کا سلسلہ کچھ دیر اور چلتا رہا تو ڈر ہے کہ کہیں عوض سعید کی کتاب "خاکے" پر بھی کسی انعام کا اعلان نہ ہو جائے۔ لہٰذا انعام ملنے سے پہلے اس کتاب پر اظہار کر لیا جائے تو بہتر ہے، ورنہ بعد میں کسی کو اس کتاب میں کوئی خوبی نظر نہیں آئے گی۔

اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں شخصیات کے حوالے سے حیدر آباد

دکن کی ثقافتی فضا اور ادبی ماحول کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ ہم نے تو حیدر آباد دکن کو مرزا ظفر الحسن مرحوم یا پھر خواجہ حمید الدین شاہد کے حوالے سے دیکھا ہے۔ مرزا صاحب نے حیدر آبادی تہذیبی زندگی پر بہت سی یادگار تحریریں چھوڑی ہیں۔ خواجہ حمید الدین شاہد کو خدا سلامت رکھے کہ حیدر آبادی تہذیب کا چلتا پھرتا نمونہ ہیں۔ اس شہر بے مثال کے بارے میں اب عوض سعید نے ہماری معلومات میں اضافہ کیا ہے۔ ان کی کتاب پڑھتے ہوئے یہ احساس ہوتا ہے کہ قاری اپنے کلبۂ احزاں سے دور، حیدر آباد فرخندہ بنیاد کی گلیوں، کوچوں اور ادبی محفلوں کی سیر کر رہا ہے۔ کہیں کسی ہوٹل میں ادیب جمع ہیں اور کہیں کسی قیام گاہ پر محفل گرم ہے۔ غرض ہر طرف گہما گہمی دکھائی دیتی ہے اور زبان بھی وہی سنائی دیتی ہے جو حیدر آباد میں بولی جاتی ہے۔

عوض سعید نے جن لوگوں کے خاکے لکھے ہیں، ان میں بیشتر معروف ادبی شخصیات ہیں۔ مثلاً مخدوم محی الدین، ابراہیم جلیس، عالم خوندمیری، سلیمان ادیب، قاضی سلیم، اقبال متین، مغنی تبسم، جیلانی بانو، عزیز قیسی وحید اختر وغیرہ۔ ہم نے ان ادیبوں کے صرف نام سنے تھے، اب عوض سعید کی مہربانی سے انھیں ذرا قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تو جی خوش ہوا۔ بعض بالکل نئی اور دلچسپ باتیں بھی معلوم ہوئیں۔ مثلاً:

- **مخدوم محی الدین:** طبعاً بڑے سادہ مزاج تھے۔ چنانچہ جب کبھی ان کی چیزیں رسائل کی زینت بنتی تھیں تو وہ بلا جھجک بک اسٹال پر جا کر سارے پرچے خرید لیتے۔ ایسے وقت وہ بڑے معصوم لگتے۔ یہ معصومیت ہی دراصل ان کی شخصیت کی سب سے بڑی پہچان تھی...... مخدوم عرب نژاد تھے۔ ان کا خاندانی نام "ابو سعید محمد مخدوم محی الدین حذری" تھا۔ عربوں کی بے پناہ خوبیوں کے ساتھ ان کی ذات میں چند کمزوریاں بھی در آئی تھیں ..... ان کے جذباتی ہونے کا عکس بجا ان کی پُر جوش تقریروں میں کہیں نہ کہیں عیاں ہو جاتا تھا۔ تنقید سننے یا سہنے کا حوصلہ ان کی ذات میں ذرا کم کم ہی پایا جاتا تھا۔ وہ (کمیونسٹ) پارٹی سے بے حد اُتنے جڑے ہوئے تھے کہ ذرا بھی کسی نے چبھتا ہوا جملہ کسا، وہ آپے سے باہر ہو گئے۔ پھر انھیں ٹھنڈا کرنا مشکل تھا کہ وہ اکھڑ جاتے تھے۔ مجھے اور ینٹ کی وہ سلگتی شام آج بھی یاد ہے، جب انھوں نے غصے کے عالم میں اپنے ہی ایک ساتھی کے گال پر طمانچہ جڑ دیا تھا۔
- **قاضی سلیم:** جس زمانے میں وہ اورنگ آباد میں وکالت کیا کرتے تھے، انھی دنوں

اتفاق سے انور معظم سے ان کی مڈ بھیڑ ہوگئی۔ ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد جب انور نے ان سے پوچھا کہ وکالت کیسی چل رہی ہے تو انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا، خوب چل رہی ہے۔ آج ہی ایک آدمی کو چار سال قید کروادی ہے۔ پھر انور نے پوچھا وکیل کون تھا؟ تو انھوں نے کہا، میں تھا۔ انور نے حیرت سے پوچھا، چار سال کی سزا کیسے ہوگئی؟ انھوں نے جواب دیا، چار سال سے زائد ہو ہی نہیں سکتی تھی۔

* **مغنی تبسم:** انھوں نے اپنے لیے ایک شیڈول بنالیا ہے جو ہر سال تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ کبھی شاذ کو فیض پر فوقیت دے دی تو کبھی دبلے پتلے مصحف اقبال کو اچانک پہلوانوں کے اکھاڑے میں کھڑا کردیا۔ کبھی ایک کا ہاتھ تھاما تو کبھی دوسرے کا گریبان چاک کیا۔ کبھی کھائی میں گرے ہوئے کسی اَدھ موئے شاعر کو آواز دی تو دوسری طرف خاصے بھلے شاعر کو کنوئیں میں دھکیل دیا۔

* **وحید اختر:** اپنے آگے دوسروں کو ہیچ اور حقیر سمجھنے کا جذبہ وحید کے خمیر میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ اس کے ثبوت کے لیے کبھی آپ اس سے مل کر دیکھیے۔ وہ مصافحے کے دومنٹ بعد ہی فقرہ بازی پر اتر آئے گا۔ پہلے آپ کو خاص انداز سے دیکھے گا، پھر مسکرائے گا۔ (اگر آپ شاعر ہیں، اسے اپنا مجموعہ پیش کریں گے تو وہ کہے گا) ہم نے آپ کا مجموعہ بادلِ نخواستہ پڑھا ہے۔ ہمارا خیال ہے بعض کتابوں کی عدم اشاعت ہی میں ادب کی خدمت کا پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ آپ کی کتاب بھی اسی زمرے میں آتی ہے۔ آپ نے اپنی اوقات سے کہیں زیادہ پیسہ فضول اس مجموعے میں لگادیا۔ بہتر ہوتا کہ آپ اپنے لیے کچھ نئے کپڑے سلوا لیتے۔

اگر کوئی اس سے کہے کہ وحید اختر ہم نے آپ کا شعری مجموعہ خریدا ہے اور آج کل وہی زیر مطالعہ ہے۔ اس پر وہ خوش نہیں ہوگا کہ ایک کتاب فروخت ہوگئی اور نہ اس بھلے مانس سے وہ اپنی نظموں اور غزلوں کے متعلق پوچھے گا۔ اس کا جواب تو یہی ہوگا کہ آپ نے خواہ مخواہ ہمارا مجموعہ خریدنے کی حماقت کی۔ ہماری شاعری آپ کے پلّے پڑنے سے تو رہی۔

(۲۷ر نومبر ۱۹۸۶ء)

کلامِ بے نیام

ہندوستان سے دہشت گردی کی خبروں اور اردو کے ادیبوں کی آمد کا سلسلہ سال بھر جاری رہتا ہے۔ پہلی صورت میں ہندوستانیوں کے لیے اور دوسری صورت میں پاکستانیوں کے لیے ہم رمائے خیر کرتے رہتے ہیں۔ پاکستانیوں کے لیے اس بناء پر کہ وہ مہمان نوازی کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہوسکیں۔ یہ دعا ہم نے اس وقت بطورِ خاص کی جب کلام حیدری کا آمد آمد کا غل مچا اور کراچی کے بعض اخباروں کے ادبی صفحات پر موصوف کے اس جملے کو خوب اچھالا گیا کہ میں اپنی تلوار کو ہر وقت بے نیام رکھتا ہوں۔ ہمیں کلام حیدری سے زیادہ ان کی تلوار کے بے نیام دیکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ ہمارے لیے یہ بات تعجب خیز تھی کہ موصوف لکھتے وقت تو معانی کو لفظوں کے نیام سے باہر نہیں نکالتے اور چلتے پھرتے ہاتھ میں بے نیام تلوار رکھتے ہیں۔ شاید یہ عصائے پیری کی قسم کی کوئی چیز ہوگی جسے ضعفِ پیری کی وجہ سے استعمال کیا جاتا ہے۔ کلام حیدری کے ہاں ضعفِ پیری کا کوئی مسئلہ نہیں۔ ہاں ادبی ضعف کا سوال پیدا ہوسکتا ہے جس کا جواب حاصل کرنے کے لیے ان سے ملاقات کرنا ضروری تھا۔

پہلی ملاقات میں ہم نے کلام صاحب کو بغور دیکھا، لیکن ان کی شہرۂ آفاق تلوار کہیں نظر نہ آئی۔ خیال آیا کہ ممکن ہے کثرتِ استعمال سے گھس گھس کر اتنی مختصر ہوگئی ہو کہ جیب میں رکھی ہو۔ لیکن کلام صاحب اتنے دھان پان ہیں کہ ان کے لیے کسی جیبی تلوار کا بوجھ اٹھانا بھی مشکل نظر آتا تھا۔ بالآخر ہم سے رہا نہ گیا اور ہم نے پوچھ ہی لیا، ”جناب آپ کی وہ مشہورِ زمانہ تلوار کہاں ہے، جسے آپ ہمیشہ بے نیام رکھتے ہیں؟“ علی حیدر ملک صاحب نے ان کی طرف سے جواب دیا، ”اسلحے کے ساتھ سفر کرنے کی ممانعت ہے، اس لیے یہ تلوار وہیں چھوڑ آئے ہیں۔“ ہم نے عرض کیا، ”تو پھر اس کا نیام ہی لے آتے۔“ اس کا جواب خود کلام صاحب نے بہ انداز سوال عطا فرمایا، ”میں خود آگیا ہوں۔ کیا یہ کافی نہیں ہے؟“

بعد کی ملاقاتوں سے اندازہ ہوا، کلام صاحب کافی نہیں، کافی سے کچھ زیادہ ہی واقع ہوئے ہیں۔ ان کی زبان حقیقت ترجمان میں تلوار کی سی تیزی ہے۔ وہ جب گفتگو فرماتے ہیں تو شمشیرزبانی سے چاروں طرف کشتوں کے پشتے لگا دیتے ہیں۔

کلام صاحب کے نام اور کام سے ہم ایک عرصے سے واقف ہیں۔ وہ افسانہ نگار بھی ہیں اور رسالہ "آہنگ" (گیا) کے ایڈیٹر بھی..... ان کے افسانے ہم نے نہیں پڑھے۔ افسانے تو خیر ہم نے ان لوگوں کے بھی نہیں پڑھے جن کے مجموعوں پر ہمارے لکھے ہوئے دیباچے موجود ہیں۔

کلام صاحب کے اداریے اور تبصرے البتہ ہماری نظر سے گزرتے رہتے ہیں۔ اللہ اللہ! کیا طبیعت کی روانی ہے۔ وہ کہیں اور سنا کرے کوئی۔ تبصرہ نگاری کے وقت وہ بڑے سے بڑے ادیب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بلکہ نکال کر بات کرتے ہیں۔ سو میں سے ایک آدھ کتاب ہی ان کے معیار پر پوری اترتی ہے، بشرطیکہ اس سینکڑے میں ان کی اپنی بھی ایک آدھ تصنیف شامل ہو۔

کلام صاحب کا ہر اداریہ دو دھاری تلوار ہوتا ہے۔ ایک دھار سے موضوع اور دوسرے سے قاری گھائل ہوتا ہے۔ موضوع اس لیے کہ وہ بلا رُو رعایت اپنے خیالات پیش کرتے ہیں۔ قاری اس لیے کہ اس کے کمزور اعصاب ان خیالات کا بوجھ برداشت نہیں کر سکتے۔

ہمیں کلام صاحب کا وہ اداریہ اب تک یاد ہے جو انھیں نے انتظار حسین کے خلاف لکھا تھا۔ انتظار حسین کے خلاف یوں تو صفدر میر اور انیس ناگی نے بہت کچھ فرمایا ہے، مگر کلام حیدری کی بات ہی کچھ اور ہے۔ "آہنگ" کا مذکورہ اداریہ پڑھ کر ایسا محسوس ہوا تھا جیسے کلام حیدری تلوار سے گھاس کاٹ رہے ہوں۔ واضح رہے تلوار سے گردن کاٹنا آسان ہے، گھاس کاٹنا اسی طرح مشکل ہے جس طرح چاول پر قُل ہُو اللہ لکھنا۔

کراچی کے اخبار "جسارت" میں کلام حیدری کا ایک انٹرویو چھپا ہے۔ انٹرویو لینے والے نے پوچھا، آپ نے انتظار حسین کے خلاف اتنا سخت اداریہ کیوں لکھا؟ کلام صاحب نے اس کے جواب میں فرمایا، "انتظار حسین صاحب ہندوستان آئے تو پٹنہ بھی آئے، وہاں ان کی بڑی محبت سے خاطر واضع کی گئی۔ ہو سکتا ہے کہ وہ ان کے شایانِ شان نہ ہو۔ پٹنے سے جانے کے بعد انھوں نے حیدرآباد دکن کی کانفرنس میں جو خطبہ پڑھا اس میں پٹنے اور بہار کی تضحیک کی گئی تھی اور بڑی حقارت سے ان لوگوں کا ذکر کیا گیا تھا جو انتظار حسین کے پاس مشتاقانہ ملاقات کے لیے آئے

تھے۔ ظاہر ہے کہ انتظار حسین ابھی بہار کے بعض افسانہ نگاروں سے بلند درجے کے افسانہ نگار تو نہیں ہیں۔"

اس مکالمے کا آخری جملہ پڑھ کر، انتظار حسین کی جگہ اگر ہم ہوتے تو افسانہ نگاری کا شغل ترک کر دیتے۔ یا کم از کم اتنا ضرور کرتے کہ دو چار ایسے افسانے لکھ دیتے جو کلام حیدری کے معیار پر پورے اترتے۔ اس جملے کو پڑھ کر اگر انتظار حسین صرف عبرت ہی حاصل کر لیں تو بھی وہ خسارے میں نہیں رہیں گے۔

بات یہیں ختم نہیں ہوتی، کلام حیدری سے پوچھا گیا، بہار کے ان لوگوں کے نام بتایئے جو انتظار حسین سے بہتر افسانہ نگار ہیں؟ کلام صاحب نے اختر اور ینوی اور غیاث احمد گدی کے نام لیے۔ حیرت ہے کہ انھوں نے اپنا نام چھوڑ دیا حالانکہ انتظار حسین کو نیچا دکھانے اور شرمندہ کرنے کے لیے یہی ایک نام کافی تھا۔

انٹرویو لینے والے نے اپنی ناتجربہ کاری کی وجہ سے کلام حیدری کے فرمودات پر بالضرورت حیرت کا اظہار کیا تو دونوں میں مندرجہ ذیل گفتگو ہوئی:

سائل: غیاث احمد گدی یقیناً ایک اہم نام ہے، لیکن انتظار حسین سے ان کا کیا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ مجھے آپ کی اس رائے پر حیرت ہوئی۔

کلام حیدری: آپ کراچی میں پانچ سات سو افراد کا جلسہ بلایئے اور انتظار حسین کی حمایت میں اپنے یہاں کے کسی سب سے اچھے مقرر کو مدعو کیجیے اور ہندوستان سے حقیر کلام حیدری کو بھی بلا لیجیے۔ اس پر بھی بات ہو جائے گی۔

سائل: یہاں جلسہ بلانے کی کیا ضرورت ہے۔ آپ ہندوستان جا رہے ہیں وہاں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ سے مناظرہ کر لیجیے گا۔

کلام حیدری: اگر آپ کو ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اتنے پسند ہیں تو انھیں بلا لیجیے لیکن یہ احتیاط ملحوظِ خاطر رکھیے کہ کہیں وہ انور سجاد کو انتظار حسین سے بہتر افسانہ نگار نہ کہہ دیں۔ جب کہ خود انتظار حسین نے گورنمنٹ لائبریری پٹنہ میں نارنگ کے بارے میں کہا تھا کہ ان کی سمجھ میں افسانہ نہیں آتا ہے۔ اور میں نے انتظار حسین کی یہ بات چھپائی تھی۔ نارنگ نے انتظار حسین کو جو مرتبہ دے رکھا ہے، اس سے وہ شاید مطمئن نہیں ہیں۔

سائل: لیکن آپ تو شاید دونوں ہی سے مطمئن نہیں ہیں۔

کلام حیدری: میں انتظار حسین سے جتنا مطمئن ہوں، اتنا ہی نارنگ سے بھی ہوں۔

ان مکالموں میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ جب انتظار حسین نے گورنمنٹ لائبریری پٹنہ میں کلام حیدری کے کان میں رازدارانہ طور پر یہ کہا تھا کہ ڈاکٹر نارنگ کی سمجھ میں افسانہ نہیں آتا، تو کلام حیدری نے یہ بات چھپائی تھی، کسی دوسرے کو نہیں بتائی تھی۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ کوئی ایسی راز کی بات نہیں جو صرف انتظار حسین اور کلام حیدری ہی کو معلوم ہو۔ یہ راز ہر شخص کو معلوم ہے، یہاں تک کہ خود ڈاکٹر نارنگ بھی آگاہ راز ہیں۔ اور افسانوں اور افسانہ نگاروں پر مقالے لکھ لکھ کر دوسروں کو رازدار بناتے رہتے ہیں۔

جناب کلام حیدری بڑی خوبیوں کے آدمی ہیں۔ سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ صوبہ بہار میں وہ دبستانِ سرگودھا کی شاخ قائم کیے ہوئے ہیں۔ گویا "براتِ عاشقاں بر شاخِ آہو" کا چلتا پھرتا نمونہ ہیں۔ اس معاملے میں وہ بڑے با اصول ہیں۔ یہاں تک کہ اپنے رسالے "آہنگ" میں وہ کوئی ایسی تحریر شائع نہیں کرتے جو پہلے "اوراق" میں نہ چھپ چکی ہو۔ کراچی کے پروفیسر محمد رضا کاظمی نے کلیم الدین احمد کی تنقید نگاری پر اپنا مقالہ "آہنگ" میں اشاعت کے لیے بھیجا تھا۔ کلام صاحب نے یہ مقالہ واپس کر دیا اور کاظمی صاحب کو خط لکھا کہ اپنا مقالہ پہلے "اوراق" میں چھپوائیے تاکہ اس کا لائقِ اشاعت ہونا ثابت ہو سکے۔ کاظمی صاحب کا یہ مقالہ "اوراق" کے تازہ شمارہ میں شامل ہے۔ امید ہے اگلے مہینے "آہنگ" میں بھی شائع ہو جائے گا۔ اس کی خوشی میں کاظمی صاحب نے کلام حیدری کے اعزاز میں ایک شاندار ڈنر دیا جس میں دبستانِ سرگودھا کے سربر آوردہ رکن راغب شکیب بھی موجود تھے۔ کلام حیدری انھیں دیکھ کر بے حد خوش ہوئے اور بربنائے عقیدت یہ شرط لگا دی کہ پہلے راغب شکیب کھانا کھائیں گے اس کے بعد بعد دیگر شرکاء کھانے کو ہاتھ لگائیں گے۔ اس محفل میں کوئی ستم ظرف بھی تھا اس نے کہا: "اس کے بعد دیگر شرکاء کے لیے ہاتھ لگانے کو رہ ہی کیا جائے گا۔"

(۲۴ دسمبر ۱۹۸۶ء)

انشائیہ یا پادر ہوائیہ

بابائے انشائیہ ڈاکٹر وزیر آغا سے غیر مشروط نیاز مندی کے باوصف "انشائیہ" ہمارے گلے سے نہیں اترتا۔ خود ڈاکٹر وزیر آغا کے انشائیوں کو تو ہم اس لیے پڑھ لیتے ہیں کہ ہمارے پڑھے لکھے ہونے کا بھرم قائم رہ سکے، لیکن کسی دوسرے شخص کے انشائیے پڑھنے سے ہم اس لیے ڈرتے ہیں کہ کہیں اس شخص کے پڑھے لکھے ہونے کا بھرم نہ جاتا رہے۔ وجہ یہ ہے کہ ڈاکٹر وزیر آغا اپنے علم اور مشاہدے کے زور پر مضمون کی ہوا خوب باندھ لیتے ہیں، لیکن ہما شما تو بس ہوا ہی پھانکتے نظر آتے ہیں۔

آج کل انشائیہ نگاری کا بہت زور ہے۔ ہر وہ شخص جو صحیح اُردو کے چار جملے بھی نہ لکھ سکتا ہو، بڑی آسانی سے چار صفحوں کا انشائیہ لکھ لیتا ہے۔ یہ آسانی اس لیے پیدا ہوتی ہے کہ انشائیے کے دامن میں وسعت ہوتی ہو، موضوعات میں تنوع پایا جاتا ہے۔

رائی سے لے کر پہاڑ تک اور ماچس سے لے کر آتش زدگی تک، آپ کسی بھی موضوع پر کچھ بھی لکھ سکتے ہیں اور اُسے انشائیے کا نام دے سکتے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ آل پاکستان بار ایسوسی ایشن کے جنرل سیکرٹری جناب اسلام سلطانی بھی اپنے رسالے "سنگھار" کے اداریوں کو انشائیہ قرار دیتے ہیں۔

اخباروں اور رسالوں ہی میں انشائیے نہیں چھپ رہے، کتابی صورت میں بھی یہ جنس وافر نظر آتی ہے۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو پچھلے دو برسوں میں تین درجن سے زیادہ انشائیوں کے مجموعے شائع ہو کر منظرِ عام سے غائب ہو چکے ہیں۔ یہاں تک تو بات ٹھیک تھی، لیکن جب سے انشائیے پر تحقیقی و تنقیدی کتابیں شائع ہونا شروع ہوئی ہیں، صورتِ حال خاصی خطرناک ہو گئی ہے۔

پچھلے دو تین برسوں میں انشائیے پر جو کتابیں شائع ہوئی ہیں، ان میں سے پہلی "ممکنات

"انشائیہ" ہے جو مشکور حسین یاد کی تصنیف ہے۔ اس میں مصنف نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ انھوں نے اپنا سب سے پہلا انشائیہ اس وقت لکھا تھا جب وہ تیسری جماعت میں پڑھتے تھے۔ ہم نے اس موقف کی تائید میں عرض کیا تھا کہ یاد صاحب کا پہلا انشائیہ ہی نہیں، باقی تمام انشائیے بھی تیسری جماعت ہی کے زمانے کے لکھے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔

انشائیے پر دوسری کتاب ڈاکٹر انور سدید کی تھی۔ ڈاکٹر انور سدید محقق بھی ہیں اور صاحب علم بھی، نیز محنت اور علم کو صرف کرنے میں خاصے کشادہ دست بھی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے جتنی محنت اور جتنا علم انشائیے پر صرف کیا ہے، اگر اس سے کم محنت اور علم کسی معقول موضوع پر صرف کرتے تو ہم جیسے سادہ لوح قارئین ناکردہ گناہوں کی سزا سے بچ سکتے تھے۔ مطلب یہ کہ انشائیہ پڑھنے سے دنیا اور انشائیے پر تنقید پڑھنے سے عاقبت خراب ہوتی ہے۔

انشائیے کے بارے میں تیسری کتاب ڈاکٹر سلیم اختر کی ہے جو حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔ ویسے تو انھی دنوں ڈاکٹر صاحب کی ایک اور ضخیم کتاب "نفسیاتی تنقید" بھی چھپی ہے (جو ان کا پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے) لیکن یہ اہل علم کے کام کی چیز ہے۔ علمی اور نفسیاتی دونوں طرح کے مریضوں میں ہمارا شمار نہیں ہوتا، لہٰذا اس بھاری پتھر کو چھوڑ کر ہلکے پھلکے موضوع یعنی انشائیے تک محدود رہنا ہمارے اور ڈاکٹر سلیم اختر دونوں کے مفاد میں ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر ہمارے ان چند ادیبوں میں سے ہیں جو لکھنے پڑھنے کے معاملے میں خود کفیل ہیں۔ یعنی انھوں نے اتنا زیادہ لکھا ہے کہ اگر زندگی بھر اس کو پڑھتے رہیں تو انھیں کسی دوسرے مصنف کی کوئی تحریر پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن ڈاکٹر صاحب از راہ علم پروری ایسا نہیں کرتے۔ وہ اپنی تحریروں کی طرف مڑ کر بھی نہیں دیکھتے کہ ایک بار جو کچھ لکھ دیا پتھر کی لکیر بن گیا۔ جس طرح پرانی داستانوں میں مڑ کر دیکھنے والے پتھر بن جاتے تھے، کچھ اسی قسم کا اندیشہ یہاں بھی ہوگا۔ البتہ دوسروں کی تحریروں کو وہ بڑی محنت اور توجہ سے پڑھتے ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا اور ڈاکٹر انور سدید پر ان کی خاص نظر ہے، جسے عنایت کی نظر کہا جا سکتا ہے۔ ان دونوں کی شاید ہی کوئی تحریر ایسی ہوگی جو بار بار ڈاکٹر سلیم اختر کی نظر سے نہ گزری ہو اور ہر بار اس تحریر میں انھیں پہلے سے زیادہ غلطیاں نظر نہ آئی ہوں۔ بہ الفاظ دیگر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر سلیم اختر نے اپنی عمر عزیز کا ایک حصہ ڈاکٹر وزیر آغا اور ڈاکٹر انور سدید کے غلط نامے مرتب کرنے میں صرف کیا ہے۔ زیر نظر کتاب

"انشائیے کی بنیاد" میں بھی انشائیے سے زیادہ مذکورہ دونوں ڈاکٹروں کی بنیادیں کمزور کرنے کا فریضہ انجام دیا گیا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ زیر نظر کتاب اردو تنقید و تحقیق میں اہم اضافہ ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے اپنے موضوع سے متعلق مواد کی فراہمی میں خاصی محنت سے اور اس مواد کی چھان پھٹک میں بڑی دقت نظری سے کام لیا ہے۔ اس کے ابتدائی ابواب اگرچہ کہیں کہیں سے "آلودۂ ذاتیات" نظر آتے ہیں لیکن مجموعی طور پر ان میں انشائیے کے فنی اور تاریخی پہلوؤں پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ پہلے باب میں مغرب میں "ایسے" کی خصوصیات اور تاریخ کا بیان ہے۔ دوسرے میں سرسید اور ماسٹر رام چندر کے انشائیوں کا ذکر ہے۔ تیسرے باب میں "نیرنگ خیال" کے حوالے سے محمد حسین آزاد کا تذکرہ ہے۔ چوتھا باب سرسید کے معاصرین اور ان کے بعد کے اہل قلم کی تحریروں میں انشائیے کی روایت سے متعلق ہے۔ اگلا باب انشائیے کی اصطلاح کے بارے میں ہے کہ یہ اصطلاح کب وضع ہوئی اور مختلف ادوار میں کن کن معنوں میں استعمال ہوتی رہی۔ چھٹا باب انشائیے کی تکنیک کے متعلق ہے اور اس کے آخر میں انشائیہ نگاروں کے لیے ایک ہدایت نامہ بھی ہے جس میں اس قسم کی ہدایات ملتی ہیں:

۱۔ غیر ضروری طوالت سے بچو۔

۲۔ بور مت کرو۔

ہمارے خیال میں ڈاکٹر سلیم اختر کو ایک ہدایت نامہ انشائیے کے نقادوں اور محققوں کے لیے بھی مرتب کر دینا چاہیے جس میں اس قسم کی ہدایات ہوں:

۱۔ وقت کی قدر کرو۔

۲۔ کاغذ ضائع مت کرو۔

ساتویں باب کا موضوع ہے، "انشائیہ کیا نہیں ہے"۔ اس میں ڈاکٹر عبادت بریلوی کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ انشائیے کی حدیں غنایت سے جا ملتی ہیں۔ گویا انشائیہ پڑھنے کی نہیں، گانے جانے کی چیز ہے۔

اب تک اس کتاب میں دبستانِ سرگودھا سے چھیڑ چھاڑ ضمنی طور پر ہوتی رہی تھی، لیکن ساتویں باب میں معاملہ الٹا ہو گیا ہے، یعنی انشائیے کا ذکر چھیڑ چھاڑ کی حد تک ہے اور

دبستانِ سرگودھا اصل موضوع بن جاتا ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر انشائیے کی برائیاں گنواتے ہوئے مثالیں دبستانِ سرگودھا سے دیتے ہیں اور خوبیوں کی تلاش میں اس دبستان سے باہر نکل جاتے ہیں اور باہر جا کر بھی سوائے مشکور حسین یاد کے کوئی ان کے ہاتھ نہیں لگتا۔ یہ وہی مشکور حسین یاد ہیں جن کی کتاب ''ممکناتِ انشائیہ'' کا دیباچہ ڈاکٹر سلیم اختر نے لکھا تھا اور اب ڈاکٹر سلیم اختر نے ''عوضِ معاوضہ گلہ ندارد'' کے اصول کے تحت اپنی کتاب کا انتساب یاد صاحب کے نام کر دیا ہے۔ ''انشائیے کی بنیاد'' کے اس انتساب ہی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ انشائیے کی بنیادیں کتنی مضبوط ہیں۔

ڈاکٹر سلیم اختر نے اسی ساتویں باب میں، جو درا صل ''گلستان'' کے پانچویں باب کی طرح مصنف کی زندہ دلی کا آئینہ دار ہے، دبستانِ سرگودھا کے ایک رکن غلام جیلانی اصغر کی تعریف بھی کی ہے اور اس انداز میں..... ''غلام جیلانی اصغر صاحب اوراق میں چھپنے کے باوجود اچھے انشائیہ نگار ہیں۔ اس ''باوجود'' کا بھی جواب نہیں۔ مطلب یہ کہ اوراق میں چھپنے والا، اچھا لکھنے والا نہیں ہو سکتا، لیکن غلام جیلانی اصغر مستثنیات میں سے ہیں۔ حیرت ہے کہ ڈاکٹر سلیم اختر، جو خود ایک زمانے میں اوراق میں چھپتے رہے ہیں، اب اس حد تک سنگدل کیسے ہو گئے کہ انہیں اوراق میں چھپنے والے تمام ادیب غیر معیاری نظر آنے لگے۔

کتاب کے اگلے ابواب نفسیات، شخصیت، اُسلوب، تازگی، فکر، تنوع اور قاری کے حوالے سے لکھے گئے ہیں۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے ان مباحث پر خوب جم کر لکھا ہے۔ ان کا علم ان ابواب میں پوری طرح ظاہر ہوتا ہے۔ چودھواں باب ''انشائیے کا زوال'' ہے اور اس کے بعد ''انشائیہ کدھر.....'' کے عنوان کے تحت ''اُدھر'' یعنی دبستانِ سرگودھا کی طرف رُخ کر کے زوال کی نشان دہی کی ہے۔ کتاب کی جان اس کا آخری باب ہے، جس کا عنوان صحیح طور پر ''ناگفتنی'' رکھا گیا ہے۔ اس میں ڈاکٹر سلیم اختر نے ڈاکٹر وزیر آغا اور ڈاکٹر انور سدید کے بارے میں وہ سب کچھ کہہ دیا ہے جو کوئی دوسرا نہیں کہہ سکتا۔ انشائیہ نگاری کے کچھ نمونے ملاحظہ فرمائیے:

''ڈاکٹر وزیر آغا کی ذاتی کوششوں اور ان کے پالتو ناقدین کی سعیٔ بسیار کے باوجود بھی اس صنف کو درجۂ اعتبار نہ ملا۔''

''تنقید میں خاندانِ غلاماں کے بانی ڈاکٹر انور سدید کی قماش کے شخص سے غیر جانب داری پر مبنی تنقید کی دیانت کی توقع بے سود ہے۔''

اس قسم کی نثری نظمیں پڑھ کر خیال آتا ہے کہ کاش ڈاکٹر سلیم اختر جیسا صاحب علم و نظر انشائیے پر لکھتے ہوئے ایسا غیر سنجیدہ انداز اختیار نہ کرتا۔ لیکن ڈاکٹر صاحب بھی کیا کریں، موضوع ہی ایسا ہے کہ اس پر سنجیدگی سے کچھ لکھنا ممکن نہیں۔

اس کتاب کے ہر دوسرے صفحے پر ڈاکٹر وزیر آغا کا نام ملتا ہے اور بعض صفحوں پر تو یہ نام کئی کئی دفعہ درج ہوا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ ڈاکٹر سلیم اختر ایک طرف تو ڈاکٹر وزیر آغا کا نام بھی سننا گوارا نہیں کرتے اور دوسری طرف ان کے نام کی گردان بھی کیے چلے جاتے ہیں۔ ہمیں تو یہ کوئی نفسیاتی مسئلہ معلوم ہوتا ہے جسے کوئی ایسا نقاد ہی حل کر سکتا ہے جس نے نفسیاتی تنقید پر پی ایچ ڈی کے لیے مقالہ لکھا ہو۔

(۱۵ر جنوری ۱۹۸۷ء)

بابائے اُردو نوعمری میں انتقال فرما گئے تھے

"دروغ بر گردنِ راوی" کے مشہور مقولے سے ہم نے کبھی فائدہ نہیں اٹھایا، کیونکہ ہمارا اُصول یہ ہے کہ جب لکھنے والے کے پاس خود ایک عدد گردن موجود ہے تو اُسی کو استعمال میں لانا چاہیے، کسی دوسرے کی گردن پر بوجھ نہیں ڈالنا چاہیے۔ لیکن طاہر مسعود خاصے محتاط واقع ہوئے ہیں۔ وہ جو کچھ لکھتے ہیں، اس کی ذمہ داری راوی پر ڈال دیتے ہیں۔ اسی مناسبت سے انھوں نے اپنی نئی کتاب کا نام "بر گردنِ راوی" رکھا ہے۔

اس سے طاہر مسعود اور راوی دونوں کو فائدہ پہنچا ہے۔ طاہر مسعود کو یہ کہ ان کے لکھے پر کوئی باز پرس نہیں کر سکتا۔ راوی کا فائدہ یہ ہے کہ طاہر مسعود کے بارِ احسان سے اس کی گردن اس حد تک جھک گئی ہے کہ اس پر مزید بوجھ ڈالنے کی گنجائش نہیں رہی۔ یعنی اب کوئی راوی کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال نہیں کر سکے گا۔

مذکورہ پیراگراف کی آخری سطروں میں جو رائے ظاہر کی گئی ہے، وہ ہماری نہیں، استاد لاغر مراد آبادی کی ہے جس سے ہمیں بالکل اتفاق نہیں۔ طاہر مسعود نے محض آرائشِ بیان کی خاطر اپنی کتاب دروغ والے راوی سے منسوب کی ہے، ورنہ انھوں نے جو کچھ لکھا ہے، اسے سچائی کے سوا کوئی دوسرا نام نہیں دیا جا سکتا اور جس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ سیاستدانوں سے لے کر ایک کثیر الاشاعت اخبار کے مالکان تک، ان سے کبھی خوش نہیں رہے۔ اس اجمال کی تفصیل تو ہم آگے چل کر پیش کریں گے، پہلے طاہر مسعود کے بارے میں بزرگ کالم نگار نصراللہ خاں صاحب کی رائے سن لیجیے:

"جو لوگ امیر گھرانوں میں پیدا ہوتے ہیں، ان کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے منھ میں چاندی کا چمچہ لے کر پیدا ہوئے تھے۔ اسی طرح طاہر مسعود کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے ہاتھ میں ایک ادیب اور صحافی کا قلم لے کر پیدا ہوئے۔ طاہر کی عمر میں تو لوگ قلم پکڑنا سیکھتے ہیں لیکن طاہر اس نوعمری میں قلم پکڑنا سکھانے کے قابل ہو گیا...... اگرچہ طاہر کی کالم نویسی یا مزاح نگاری کی مدت مختصر ہے لیکن اس مختصر سی مدت میں انھوں نے بڑے بڑے کالم نویسوں سے اپنی کالم نویسی کا لوہا منوا لیا...... اُردو صحافت میں طاہر مسعود کا نام اور ان کے کالم مدتوں یاد رکھے جائیں گے۔"

نصراللہ خاں صاحب کی مذکورہ رائے پڑھ کر ہمیں بے حد خوشی ہوئی کہ یہ بزرگ اپنے [illegible] چھوٹوں کی حوصلہ افزائی کرنے میں بڑے فراخ دل واقع ہوئے ہیں۔ البتہ ہمیں اس سے اتفاق نہیں ہے کہ طاہر مسعود کو نوعمروں میں شمار کیا جائے۔ اب وہ ماشاءاللہ اتنی عمر کے ہو گئے ہیں جتنی عمر میں سکندرِ اعظم نے ساری دنیا کو فتح کر لیا تھا۔ ہم نے سنا ہے کہ جناب نصراللہ خاں کے نزدیک کسی کی نوعمری کا معیار یہ ہے کہ وہ غیر شادی شدہ ہو۔ اس معیار سے تو بابائے اُردو بھی نوعمری میں انتقال فرما گئے تھے۔ ان کے انتقال پر خان صاحب نے اپنے کالم میں یہ مشہور مصرعہ [illegible] لکھا ہوگا۔ ع

حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

زیرِ نظر کتاب "دروغ بر گردنِ راوی" طاہر مسعود کے مدتوں یاد رکھے جانے والے کالموں کا انتخاب ہے۔ یہ کالم ہم نے پہلے بھی پڑھے تھے اور اب دوبارہ پڑھ کر احساس ہوا کہ اگر طاہر مسعود انھیں کتابی صورت میں شائع نہ کرتے تو اپنے آپ ہی پر نہیں اُردو زبان پر بھی بڑا ظلم کرتے۔ کالموں کے ایسے مجموعے اُردو میں کم ہی شائع ہوئے ہیں (یہ جملہ لکھ کر ہم نے لاہور والوں سے انتقام نہیں لیا، بلکہ حقیقت حال عرض کی ہے۔ پچھلے دنوں ٹی وی پر کالم نگاری کے تعلق سے ایک پروگرام ٹیلی کاسٹ ہوا تھا۔ اس میں صرف لاہور کے کالم نگاروں کا ذکر تھا۔ گویا یہ جتانا مقصود تھا کہ فضول کام صرف لاہور میں ہوتے ہیں، کراچی میں نہیں ہوتے)۔

طاہر مسعود کے موضوعات میں بڑا تنوع پایا جاتا ہے۔ کہیں سیاست کاروں کا ذکر ہے اور کہیں [illegible] کاروں کا اور وہ بھی اس طرح کہ پتہ نہیں چلتا کون سیاست کار ہے اور کون خرکار۔ کہیں نوکر شاہی کا کچا چٹھا ملتا ہے اور کہیں معاشرے کی برائیوں کو موضوع بنایا گیا ہے۔ کہیں عوام کے مسائل [illegible] اٹھائے گئے ہیں اور کہیں خواص کے مشاغل پر۔ غرض کہ ایک دنیا ہے جسے طاہر مسعود نے اپنے

کالموں میں سمیٹ لیا ہے۔ لیکن اس خوبی کے ساتھ کہ ان کے بیان میں تلخی پیدا ہوتی ہے نہ یہ احساس کہ وہ اخبار کی روزمرہ ضرورت کو پورا کرنے کے لیے خانہ پُری کر رہے ہیں۔ بلکہ یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ کالم نہیں لکھ رہے ادب تخلیق کر رہے ہیں۔ خصوصاً ان کے وہ کالم جن میں افسانہ نگاری کا انداز اختیار کیا گیا ہے، اچھے خاصے افسانے معلوم ہوتے ہیں۔ اس قسم کے کالموں کو اگر طاہر مسعود الگ چھپوا دیتے تو یہ مجموعہ آج کل بہت سے افسانوی مجموعوں سے بہتر ہوتا۔

طاہر مسعود صرف طنز یا صرف مزاح سے کام نہیں لیتے، ان کے ہاں طنز اور مزاح ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ یعنی سوچنے اور ہنسنے کے کام بیک وقت انجام پاتے ہیں۔ اگر کالم میں یہ خوبی نہ ہو تو وہ محض لطیفے بازی بن جاتا ہے۔ اس بات کی وضاحت ہم ایک مثال سے کریں گے۔ ایک مرتبہ اخبارات میں وزیر خارجہ آغا شاہی کے استعفیٰ اور اداکارہ مسرت شاہین کے شعر کہنے کی خبریں ساتھ ساتھ شائع ہوئیں۔ طاہر مسعود کو یہ بتانا تھا کہ کسی وزیر کے آنے یا جانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا اور ادب کی موجودہ حالت اتنی ابتر ہے کہ کسی اداکارہ کے شعر کہنے سے اس ابتری میں اضافہ نہیں ہو سکتا۔ اس مصرعِ طرح پر انھوں نے یوں طبع آزمائی کی ہے:

”آج کے اخبار میں دو سنسنی خیز خبریں شائع ہوئی ہیں۔ پہلی تو یہ کہ وزیر خارجہ آغا شاہی مستعفی ہو گئے اور دوسری یہ کہ اداکارہ مسرت شاہین شعر کہنے لگیں۔ ہمیں معلوم نہیں کہ دونوں خبروں میں سے کون سی دوسری خبر بننے کا باعث ہوئی ہے۔ یعنی آغا شاہی، مسرت شاہین کے شعر کہنے کی اطلاع پا کر مستعفی ہوئے یا مسرت شاہین ان کے استعفیٰ کی اطلاع سن کر شعر کہنے لگیں۔ بہر حال اصل حقیقت کچھ بھی ہو، ان دونوں حادثوں کی پیشگوئی پروفیسر کوکب (منجم) سالِ نو کے آغاز ہی میں کر چکے تھے۔ پروفیسر صاحب کے بقول ۱۹۸۳ء میں پاکستان کا وقار بیرونی دنیا میں پہلے جیسا رہے گا اور ملک میں شاعری پر زوال آئے گا۔ شاعری پر زوال کی پیشگوئی سے ہم نے یہ مطلب نکالا تھا کہ مبارک احمد نثری نظم کی حمایت سے دست کش ہو جائیں گے، لیکن مسرت شاہین کے شعر کہنے کی خبر پڑھ کر ہم نے خدا کا شکر ادا کیا کہ پیشگوئی کا جو مطلب ہم نے سمجھا تھا، وہ غلط ثابت ہوا اور شاعری پر ابھی اتنا زیادہ زوال نہیں آیا ہے۔“

ایک کثیر الاشاعت اخبار کے مالکان طاہر مسعود سے جو ناراض ہوئے تھے، اس کی طرف ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں، اب اس کی تفصیل بھی سن لیجیے۔ ہوا یہ کہ ان لوگوں نے طاہر مسعود کو اپنے اخبار میں لکھنے کی دعوت دی۔ طاہر مسعود نے سوچا کہ اس طرح انھیں قارئین کا ایک بڑا حلقہ مل جائے گا، لہٰذا اس دعوت کو قبول کر لیا۔ ایک روز انھوں نے کسی سیاسی پارٹی کے ایک لیڈر کے بارے میں ایک کالم لکھا۔ اس پارٹی کے کارکن اخبار کے دفتر پہنچ گئے اور مالکان کو توڑ پھوڑ کی دھمکی دی۔ مالکان نے طاہر مسعود کو ہدایت کی کہ آئندہ اس پارٹی کے بارے میں کچھ نہ لکھا جائے۔ طاہر مسعود نے چند روز بعد ایک دوسری پارٹی کو ہدفِ تنقید بنایا۔ اس پارٹی کے کارکن بھی مشتعل ہو گئے اور اخبار کے دفتر کا گھیراؤ کر لیا۔ مالکان نے معافی مانگ کر فسادیوں کو رام کر لیا اور طاہر مسعود کو ایک اور ہدایت نامہ جاری کر دیا گیا۔ طاہر مسعود نے سیاسی پارٹیوں کو چھوڑ کر سرکاری اداروں کی طرف توجہ کی۔ ابھی ایک ہی ادارے کی خوش عنوانیوں پر اظہارِ خیال کیا تھا کہ ایک وزیر با تدبیر نے مالکان کو سرکاری اشتہارات بند کرنے کا مژدہ سنایا۔ اس کے بعد اس اخبار میں طاہر مسعود کے کالم چھپنے بند ہو گئے۔ طاہر مسعود نے وجہ پوچھی تو مالکان نے فرمایا، ”ہمارے سامنے دو ہی راستے تھے، یا تو اخبار بند کر دیا جائے یا آپ کا کالم۔“ طاہر مسعود نے برجستہ کہا، ”آپ اخبار بند کر دیتے تو بہتر تھا کہ کالم کے نہ چھپنے کا کوئی معقول جواز تو ہوتا۔“

(۲۹ر جنوری ۱۹۸۷ء)

ساقی فاروقی صرف اپنی عزت و آبرو کا خیال رکھتے ہیں

سنا ہے کہ ساقی فاروقی چند دنوں کے لیے کراچی آ رہے ہیں۔ انھوں نے لندن سے کراچی کے ایک دوست کو فون پر اس کی اطلاع دی تو اس نے کہا "میں آپ کی آمد کی خبر اخباروں میں چھپوا دوں گا تاکہ سب دوستوں کو اطلاع ہو جائے۔" ساقی نے کہا "ایسا ہرگز نہ کرنا ورنہ جس جس کو اپنی عزت و آبرو عزیز ہوگی، وہ کراچی سے چلا جائے گا اور میں دوستوں کی ملاقات سے محروم رہ جاؤں گا۔"

معلوم نہیں یہ واقعہ ہے، یا لطیفہ، لیکن یہ حقیقت ہے کہ ساقی فاروقی تقریر و تحریر میں صرف اپنی عزت و آبرو کا خیال رکھتے ہیں۔ وہ نغز گو شاعر ہی نہیں، صاحب اسلوب نثر نگار بھی ہیں۔ جن لوگوں کی نظر سے ان کے تنقیدی مضامین اور مراسلات گزرے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ ساقی کے تنقیدی خیالات میں ندرت اور گہرائی پائی جاتی ہے۔ وہ جن پاروں کو پرکھنے کے سلسلے میں روایتی نقادوں کی طرح سطح بیں نہیں ہیں، بلکہ ان میں ڈوب کر تہہ کی خبر لاتے ہیں۔ لیکن لطف یہ ہے کہ وہ خود ہی نہیں ڈوبتے، بہت سے دوسروں کو بھی ڈبو دیتے ہیں۔ ان کی شاید ہی کوئی تحریر ہوگی جس میں چار چھ عزت داروں کی پگڑی نہ اچھالی گئی ہو۔ مثلاً پچھلے دنوں لندن کے ایک شاعر بخش لائلپوری کے مجموعۂ کلام پر جو مختصر فلیپ انھوں نے لکھا، اس کی چھ سطروں میں چار شاعروں کو ٹھکانے لگایا گیا ہے۔ گویا وہ ڈیڑھ سطری شاعر کے حساب سے اپنا تنقیدی زور بازو آزماتے ہیں۔

بخش لائلپوری کے فلیپ میں انھوں نے لکھا ہے:

"۱۹۳۶ء والوں نے اپنے اردگرد بکھرے ہوئے مسائل کے اظہار کے لیے جو عوامی پیرایہ اختیار کیا تھا، اس کی یکسانیت اور بے تہی مجھے سخت ناپسند ہے۔ مگر میری پسند ناپسند سے ساحر لدھیانوی اور کیفی اعظمی کی پاپولیریٹی پر کوئی اثر نہیں پڑا، بلکہ انھی لوگوں کا لہجہ اور الفاظ مستعار لے کر ۳۵ سال (بلکہ ۴۰

سال) بعد بھی حبیب جالب اور احمد فراز جیسے لوگ اپنی ایک پرت کی شاعری کے بل بوتے پر مشاعرے لوٹتے نظر آتے ہیں۔ آپ سے اتنی درخواست ہے کہ اگر آپ مندرجہ بالا شاعروں کی شاعری سے شغف رکھتے ہیں تو پھر مسٹر بخش لائلپوری کا کلام بھی پڑھیے۔"

یہ فلیپ چھپ کر بھی غیر مطبوعہ رہا۔ بخش لائلپوری کا مجموعہ لندن ہی میں نقش و نگار طاق نسیاں ہو گیا۔ پاک و ہند میں کسی کی نظر سے نہ گزرا۔ ساقی فاروقی کو بخش لائلپوری یا ان کی شاعری کے ضائع ہونے کا اتنا افسوس نہ تھا جتنا اپنے فلیپ کے ضائع ہونے کا۔ لہٰذا انھوں نے اپنے نقصان کی تلافی کی یہ صورت نکالی کہ بخش لائلپوری کا فلیپ جمال احسانی کے نئے مجموعے "رات کے جاگے ہوئے" کے دیباچے میں شامل کر دیا۔ گویا ایک تیر سے چھ شکار کیے۔ ایک وہ جس پر فلیپ لکھا، چار وہ جن کا ذکر فلیپ میں ہے اور ایک وہ جس کی کتاب کے دیباچے میں یہ فلیپ اس طرح داخل کیا گیا جس طرح انشاءاللہ خان انشا کی کسی ہمعصر شاعر نے بحر ہزج میں بحر رمل ڈالی تھی۔

ساقی فاروقی نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ یہ بھی بتایا ہے کہ ان کے لکھنے کا..... "اثر یہ ہوا کہ دونوں جہاندیدہ عندلیب (جالب اور فراز جن پر ساٹھواں برس لگ چکا ہے یا لگ رہا ہے) سرمہ اور خضاب لگا کر آہ و زاریاں کرتے ہوئے پکڑے گئے۔ تیس تیس، چالیس چالیس سال تک جہالت کے زور پر شعر لکھنے کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ آدمی کو..... فرسودہ رومانی جذبات پر قناعت کرنی پڑتی ہے۔"

ہمارے خیال میں ساقی فاروقی نے حبیب جالب اور احمد فراز کے ساتھ بڑی زیادتی کی ہے۔ ان دونوں کے بارے میں یہ کہنا کہ انھوں نے جہالت کے زور پر شاعری کی ہے، ناقابل تسلیم ہے کیونکہ بیسویں صدی میں جہالت کے زور پر شاعری کرنے کے لیے بھی تھوڑا بہت پڑھا لکھا ہونا ضروری ہے، اور مذکورہ دونوں شاعر تو خدا کے فضل سے خاصے پڑھے لکھے ہیں اور انھوں نے اپنے ہی زور پر شاعری کی ہے۔ ساقی فاروقی کی طرح اپنے مداحوں شمس الرحمن فاروقی، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور محمود ہاشمی کے بہکانے میں آ کر یا حوصلہ افزائی کے نتیجے میں شاعری نہیں کی۔

ڈاکٹر نارنگ پر یاد آیا کہ جمال احسانی کی کتاب کے دیباچے میں ساقی نے انھیں بھی نہیں

بخشا۔ فرماتے ہیں ..... ”میں اپنے پیارے دوست گوپی چند نارنگ کی طرح جلد بازی سے کام لے کر صلاح الدین پرویز اور عزیزی افتخار عارف کی طرح جمال احسانی کو شرمندہ نہیں کروں گا کہ نارنگ کی طرح کھینچنے کا یارا مجھ میں نہیں۔ بعض تحریریں عجیب ہوتی ہیں کہ شاعر اور نقاد دونوں کی شرمندگی کا باعث بنتی ہیں۔“

صلاح الدین پرویز کو تو ہم نہیں جانتے لیکن ساقی فاروقی کے ”عزیزی“ کے بارے میں ہمیں علم ہے کہ لندن میں ان کے قیام کے بعد ساقی فاروقی نے ان سے جو تعلق قائم کیا تھا، وہ علامہ اقبال کی زبان میں کچھ اس قسم کا تھا: ع

آپ بھی شرمسار ہو، مجھ کو بھی شرمسار کر

اس کے ثبوت میں ساقی فاروقی کے اس مشہور زمانہ طویل خط بنام ”عزیزی“ کا حوالہ دیا جا سکتا ہے جس کی فوٹو اسٹیٹ نقلیں کثرت سے تقسیم کی گئی تھیں۔ اس خط کا شمار اُردو کے بہترین مکاتیبی ادب میں ہوتا ہے۔ خدانخواستہ اگر آنے والی نسلوں کا مذاق شعر تبدیل ہو جائے اور ساقی فاروقی اور ان کے ”عزیزی“ کو بطور شاعر فراموش کر دیا جائے تو مذکورہ خط کے کاتب اور مکتوب الیہ کی حیثیت سے ان دونوں کا نام پھر بھی باقی رہ جائے گا۔

معاف کیجیے گا، ادھر اُدھر کی باتوں میں ہم یہ بھول ہی گئے کہ ہمارا آج کا موضوع جمال احسانی کا نیا مجموعۂ کلام ”رات کے جاگے ہوئے“ ہے۔ پچھلے دس بارہ برسوں میں جن ڈیڑھ دو شاعروں نے اُردو غزل کو فکر و اسلوب کی تازگی سے روشناس کرایا ہے، ان میں جمال احسانی بھی شامل ہیں۔ ”ستارۂ سفر“ ان کا پہلا مجموعۂ کلام تھا جسے بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ دوسرا مجموعۂ کلام بھی ضرور مقبول ہوگا کہ اس میں اس قسم کے خوبصورت اشعار ہیں:

جو دل کے طاق میں تو نے چراغ رکھا تھا
نہ پوچھ میں نے اسے کس طرح ستارہ کیا

باخبر کر کے رہِ عشق کی منزل سے تجھے
فیصلہ چھوڑ دیا ہے تری آسانی پر

چلے تو ہو سفرِ عشق پر، خیال رہے
کہیں چڑھے گا یہ دریا کہیں پہ اترے گا

اس انتخاب کو ہم اتنا بڑھا سکتے ہیں کہ ہمارا کالم جمال احسانی کے مجموعے کا دوسرا ایڈیشن بن جائے۔ لیکن ہمارے ہاں شعری مجموعوں کے دوسرے ایڈیشن شائع ہونے کی روایت نہیں ہے، لہٰذا پڑھنے والوں سے درخواست ہے کہ مذکورہ تین شعروں ہی سے پورے دیوان کا اندازہ کر لیں۔

جمال احسانی کا پہلا مجموعہ ”ستارۂ سفر“ چار سال پہلے شائع ہوا تھا۔ گزشتہ چار برسوں میں جمال کی شاعری میں تو واضح ارتقاء نظر آتا ہے لیکن شاعرانہ عادات کچھ زوال پذیر دکھائی دیتی ہیں۔ مطلب یہ کہ پہلے مجموعے میں کسی کا دیباچہ تھا نہ فلیپ پر رائے دہندگان کی قطاریں تھیں، جو اس بات کی دلیل تھی کہ شاعر کو اپنے اوپر اعتماد ہے۔ تازہ مجموعے میں آٹھ افراد کی آراء تو فلیپ پر ہیں۔ دیباچہ نما دو مضمون شروع میں اور ایک آخر میں ہے۔ جمال کو ان سفارشی و تعارفی کلمات کی قطعاً ضرورت نہ تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دوسروں کی دیکھا دیکھی وہ بھی تعلقاتی تنقید کے بہتے دریا میں ہاتھ دھونے کے قائل ہو گئے۔ کاش ایسا نہ ہوتا!

فلیپ پر جن آٹھ حضرات کی رائیں درج ہیں، ان میں سے دو ایک کے سوا ہم نے کسی کا نام نہیں سنا۔ تحقیق سے معلوم ہوا کہ یہ سب نئے لکھنے والے ہیں جن کی عمریں ۱۸ سے ۲۵ سال کے درمیان ہیں۔ اس سے یہ دکھانا مقصود ہے کہ نئی نسل جمال احسانی کے بارے میں کیا رائے رکھتی ہے۔ نئے لکھنے والوں میں ۱۲ سے ۱۸ سال کی عمر کے لوگ بھی ہیں۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر ان کی رائیں بھی حاصل کر لی جاتیں۔ اس طرح یہ معلوم ہو جاتا کہ جمال احسانی کی شاعری پر جدید تر یا نومولود نسل کا کیا ردِ عمل ہے۔

یہاں ہمیں ایک لطیفہ یاد آ گیا۔ اس کا جمال احسانی سے تو کوئی تعلق نہیں ہے، لیکن یاد آ گیا ہے اس لیے سن لیجیے۔ ایک شاعر نے اپنے مجموعے پر ۲۵ نقادوں کی رائیں چھاپی ہیں۔ ایک معتقد نے ان سے کہا: ”اتنی بہت سی رائیں آپ نے چھاپ دیں، کچھ رائیں اگلے مجموعے کے لیے بچا لی جاتیں تو اچھا تھا۔“ شاعر صاحب نے فرمایا: ”اگلے مجموعے میں میں صرف اپنی رائے چھاپوں گا۔“ معتقد نے نہایت سادگی سے پوچھا: ”تو کیا اگلے مجموعے میں کلام دوسروں کا ہوگا؟“

(۱۲ فروری ۱۹۸۷ء)

لکھی ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ساقی کا مشاہدہ ہی نہیں، ملنے جلنے والوں کا حلقہ بھی خاصا وسیع ہے۔ ساقی کا جواب نہیں کہ اس نے کیسے کیسوں کی صحبت اٹھائی ہے۔"

ہم نے اوپر جو شعر لکھا ہے، اس کا دوسرا مصرع بھی ساقی کے حوالے سے خاصا مناسب حال ہے۔ پورا مصرع نہ سہی "سرچڑھے" والے الفاظ تو ساقی کے مزاج و کردار کی نہایت عمدگی سے عکاسی کرتے ہیں۔ ساقی جب کراچی میں تھے تو عمری کے جوش میں ہر وہ کام کر جاتے تھے جو کلاسیکی مزاج رکھنے والوں کو پسند نہیں آتا تھا۔ مثلاً ادبی محفلوں میں ساقی کا وجود دہشت گردی کی علامت تھا۔ وہ گالی گفتار سے شروع کرتے تھے اور غالب کے "دھول دھپا" والے شعر پر بات ختم کرتے تھے۔ ان کے اس قسم کے واقعات اب بھی بعض لوگوں، خصوصاً پروفیسر مجتبیٰ حسین کو اچھی طرح یاد ہوں گے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ ادبی نشستوں میں ساقی کو صدر بنا دیا جاتا تھا تاکہ وہ دیا اس تو کرسی صدارت ہی کا خیال کریں۔ لیکن ساقی انسانوں کا خیال نہیں کرتے تھے تو کسی کرسی کا کیا خیال کرتے۔ ایک دفعہ وہ حلقۂ اربابِ ذوق کی ادبی نشست کی صدارت کر رہے تھے۔ ایک نقاد نے ضرورت سے زیادہ تنقیدی زور آزمائی کا مظاہرہ کیا۔ ساقی کچھ دیر تو انھیں برداشت کرتے رہے اور پھر اچانک انھوں نے اعلان کیا: "حضرات! میں اس اجلاس کی کارروائی ختم کرتا ہوں۔" اس کے بعد انھوں نے مذکورہ نقاد کو مخاطب کر کے غیر ادبی زبان میں گفتگو کی۔ جب اپنے دل کی بھڑاس خوب اچھی طرح نکال چکے تو سامعین کو مخاطب کر کے کہا: "حضرات! میں اس اجلاس کی کارروائی دوبارہ شروع کرتا ہوں۔"

ساقی جب لندن چلے گئے تو کراچی کے ادبی حلقوں میں اطمینان کا سانس لیا گیا۔ اب ساقی صرف اسی کے لیے چمن سے نکل کر سرچڑھے والے پھول بنے جو قسمت کا مارا یہاں سے لندن جاتا۔ ساقی کے اس قسم کے کشتگانِ ناز میں افتخار عارف، احمد فراز اور حبیب جالب شامل ہیں۔ افتخار عارف شریف آدمی ہیں، کبھی کسی سے نہیں بگاڑتے اور ساقی کے ساتھ تو ان کا رویہ اس حد تک نیاز مندانہ تھا کہ انھوں نے ساقی کا ایک انٹرویو بھی لیا تھا جو "راز داں" کا جرابِ شمارے میں شامل ہے۔ لیکن افتخار عارف کو یہ نیاز مندی راس نہ آئی بلکہ خاصی مہنگی پڑی۔ جو کچھ ہوا اسے جو معلوم ہے انھیں بھی معلوم تھا، انھیں ہم اپنے کالموں میں وقتاً فوقتاً بتاتے رہے ہیں۔

فراز اور جالب کا قصور یہ ہے کہ یہ دونوں ایک پرت کی شاعری کرتے ہیں۔ یہ کوئی ایسا

ساقی کی شاعری ایک اچھا خاصا چڑیا گھر ہے

لندن والے ساقی فاروقی آج کل کراچی میں تشریف فرما ہیں۔ یہ کالم انھیں خوش آمدید کہنے کے لیے لکھا جا رہا ہے لیکن یہ ایسے وقت میں شائع ہوگا جب ساقی واپسی کے لیے پابہ رکاب ہوں گے۔ واپسی کے سفر میں ہماری دعائیں، نیک تمنائیں اور یہ کالم ان کے ساتھ ہوگا۔

عزت اسے ملی جو وطن سے نکل گیا
وہ پھول سرچڑھا جو چمن سے نکل گیا

یہ شعر ہم نے ہزار مرتبہ سنا ہوگا اور ہر مرتبہ ہمیں ہنسی آئی کہ وطن سے نکل کر کسی کو عزت کیسے مل سکتی ہے۔ دولت کی بات اور ہے کہ لوگ غیر ملکوں میں محنت مزدوری اور فاقہ کشی کر کے رقم پس انداز کر لیتے ہیں، مگر عزت تو ایسی چیز نہیں ہے جسے پس انداز کیا جا سکے۔ لیکن ساقی فاروقی نے ہمارے اس نظریے کو باطل کر دیا۔ اب ہم اسے تسلیم کرنے لگے ہیں کہ وطن میں اگر کوئی چیز کسی کے پاس نہ ہو تو وطن سے باہر جا کر وہ اسے حاصل کر سکتا ہے۔ ساقی فاروقی جب تک وطن میں تھے، ان کا حال وہی تھا جو ہمارا ہے۔ لیکن لندن کی ہوا انھیں ایسی راس آئی ہے کہ اب ان کا شمار ادبی عزت داروں میں ہوتا ہے۔

بلاشبہ وہ ان دو چار شاعروں میں سے ہیں جنھیں رجحان ساز کہا جا سکتا ہے۔ انھوں نے ن م راشد کی طرح روشِ عام سے ہٹ کر اپنا راستہ الگ نکالا ہے۔ ان کے اسلوب و اظہار میں تازگی اور نیا پن ہے اور فکر میں گہرائی۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ روایتی شاعری کے رسیا ساقی کی نظموں سے لطف اندوز نہیں ہو سکتے۔ لیکن ہم نے دیکھا ہے کہ کم از کم عنوانات کی حد تک پرانے وقتوں کے لوگ ساقی کی نظموں سے خاصے محظوظ ہوتے ہیں۔ ایک مرتبہ استاد لاغر مراد آبادی نے فرمایا تھا: "ساقی کی شاعری ایک اچھا خاصا چڑیا گھر ہے۔ اس نے مینڈک، سور، خرگوش، کتے، بلے اور بکرے وغیرہ پر خوب نظمیں

لازمی ہے کہ ان دونوں کے خلاف اعلان جنگ کر دیا جائے۔ خود ساقی فاروقی کے جگری دوستوں میں جمال پانی پتی جیسے غزل گو بھی ہیں جن کی شاعری میں سرے سے کوئی پرت ہی نہیں لیکن ساقی نے ان کے خلاف کبھی زبان نہیں کھولی۔

پچھلے دنوں لندن کی ایک محفل میں ساقی اور جالب کی ملاقات ہوئی۔ دونوں میں کچھ بے ادبی قسم کا تبادلہ خیال ہوا۔ ساقی جلال میں آگئے اور وہ تمام الفاظ استعمال کر ڈالے جو تحریر میں نہیں آسکتے۔ محفل میں ایک انگریز بھی بیٹھا تھا جو اُردو نہیں جانتا تھا۔ وہ حیرت سے ساقی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ساقی نے اس انگریز کو مخاطب کر کے کہا، "میں نے اب تک اُردو میں جو کچھ کہا ہے، تمہاری خاطر اس کا ترجمہ انگریزی میں کیے دیتا ہوں۔" اس کے بعد ساقی نے انگریزی میں بھی وہ تمام الفاظ استعمال کر ڈالے جو انگریزی کی لغات میں ملتے ہوں تو ملتے ہوں، کہیں اور دکھائی یا سنائی نہیں دیتے۔

لندن میں یوں تو ہندوستانی اور پاکستانی خاصی تعداد میں ہیں لیکن ساقی کے لیے "اپنی زبان" میں ان سے مکالمہ کرنا ممکن نہیں ہے کیونکہ یہ بچارے وہاں محنت مزدوری کرنے گئے ہیں نہ کہ شعر و شاعری۔ ساقی نے اپنا "شوقِ گفتار" پورا کرنے کے لیے نیا راستہ نکالا اور لوگوں کو خط لکھنے شروع کر دیئے۔ یہ خط کس قسم کے ہوتے تھے، اس کا اندازہ ساقی کے پہلے دو مجموعوں میں شامل دیباچہ نما مضمون "غیبت کا شامیانہ" سے ہوتا ہے جس میں ساقی نے اپنے بارے میں دوسروں کی رائیں درج کی ہیں۔ پروفیسر ممتاز حسین نے ساقی کو لکھا، "تم بیہودہ باتیں مجھے نہ لکھا کرو۔ یہ سب اپنے ہم سنوں کو لکھا کرو۔ میرا خط میرے لڑکے بھی پڑھ لیتے ہیں۔ بس اسے دھیان میں رکھو اور جو جی چاہے سو لکھو۔" باقر مہدی لکھتے ہیں، "تمہارا گالیوں سے لبریز خط ملا۔ گالیاں وہ لوگ لکھتے اور بکتے ہیں جو احساس کمتری میں بری طرح مبتلا ہوتے ہیں۔ تم مجھے بلاوجہ گالیاں کیوں دیتے ہو، اور آنجناب میں رعونت کس بات کی ہے جو زبان خراب کرتے پھرتے ہو۔"

لیکن ساقی کے سبھی مکتوب الیہ ایسے نہیں تھے جو اس کے خطوں سے لطف اندوز نہ ہوتے ہوں، بلکہ بعض کو تو گالیاں کھانے کی ایسی چاٹ لگی تھی کہ ساقی کا اگر کوئی خط شریفانہ ہوتا تو وہ شکوہ کرتے کہ ساقی نے ان کی خاطرداری میں کمی کر دی۔ مثلاً ساقی نے اسد محمد خان کے ایک خط کا یہ جملہ بھی شائع کیا ہے، "تم نے پچھلے خط میں مجھے گالیاں کیوں نہیں لکھیں؟"

خطوں میں گالیاں لکھتے لکھتے ساقی کو یہ سوجھی کہ کیوں نہ تنقید کو بھی روایت کے حصار سے باہر نکالا جائے۔ سو اس نے ایسے تنقیدی مضامین لکھنے شروع کر دیے جنھیں پڑھ کر ان لوگوں پر رحم آتا ہے جن کے بارے میں ساقی اظہارِ خیال کرتے ہیں۔ زہرا نگاہ کے پہلے مجموعۂ کلام "شام کا پہلا تارا" پر ساقی نے فنون میں جو خط نما مضمون لکھا تھا، اس کے بالکل شروع میں سردار جعفری کا ذکر ان الفاظ میں ہے:

> "گرد پوش پر سردار جعفری کی رومانی، مردہ اور بے معنی تحریر نہ کتاب سے انصاف ہے نہ شاعر سے۔ بالکل یہی کچھ وہ فہمیدہ ریاض کے لیے بھی لکھ چکے ہیں اور پروین شاکر کے لیے بھی کہہ چکے ہیں۔ ان کی نثر ان کی شاعری طرح بے اعتماد ہے۔ اگر آپ (زہرہ نگاہ) کا نام قرۃ العین یا مریم ہوتا تو وہ آپ کا رشتہ ایران اور فلسطین سے نکالتے اور بات کا بتنگڑ بناتے۔ ۱۹۴۰ء میں انھوں نے یہ لکھ کر اپنی شیلف پر رکھ لیا تھا کہ الف نے اپنی شاعری کا آغاز غزل/نظم سے کیا تھا جس میں جذبے اور احساس کی فراوانی تھی...... الف نظموں/غزلوں کی طرف مائل ہوا/ہوئی۔ اس شاعری میں آج کی بے چین دنیا کی بے چین روح ہے۔ ظلم کے خلاف احتجاج کی لے ہے۔ الفاظ نرم اور لطیف ہیں وغیرہ وغیرہ۔ الف کی جگہ کبھی فہمیدہ، کبھی ساحر، کبھی اختر الایمان اور کبھی زہرا کا نام ڈال دیتے ہیں اور پچھلے چالیس سال سے یہی مشغلہ اختیار کر رکھا ہے۔"

ممکن ہے بعض لوگ یہ سوچیں کہ سردار جعفری نے ساقی فاروقی کا ضرور کچھ بگاڑا ہوگا ورنہ ایسی باتیں ہرگز نہ لکھی جاتیں۔ عرض یہ ہے کہ جہاں تک بگاڑنے کا تعلق ہے، وہ ساقی ہی کا محبوب مشغلہ ہے۔ بچارے سردار جعفری کو کہاں فرصت کہ وہ اس قسم کے کام کریں۔ وہ تو زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتے ہیں کہ جو رائے انھوں نے زہرا نگاہ کے کلام پر دی ہے، اسی کو ساقی فاروقی کے کلام پر بحال کر دیں۔

(۲۶ فروری ۱۹۸۷ء)

اہلِ لاہور شخصی ترجیحات کی زد پر ہیں

آپ بیتی لکھنا آسان بھی ہے اور مشکل بھی۔ آسان اس لیے کہ جھوٹ بولنا بعض لوگوں کے لیے بائیں ہاتھ کا کام ہوتا ہے۔ مشکل اس لیے کہ سچ بولنا اور وہ بھی اپنے بارے میں، دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔

آپ بیتی میں کئی طرح کا جھوٹ سما جاتا ہے۔ ایک جھوٹ تو وہ ہے جو لکھنے والا دوسروں کے بارے میں بولتا ہے اور دوسرا وہ جو وہ اپنی ذات کے حوالے سے بولتا ہے۔ پہلے جھوٹ کی تردید کی کبھی نہ کبھی کوئی صورت نکل ہی آتی ہے، لیکن دوسری قسم کا جھوٹ پکڑنا بہت مشکل ہے تا آنکہ لکھنے والا ''حافظہ نباشد'' کے اصول کے تحت اپنے ایک جھوٹ کی تردید دوسرے جھوٹ سے نہ کر دے۔

آپ بیتیوں میں جھوٹ سے کام وہ لوگ لیتے ہیں جو خلقِ خدا کے درمیان اپنے آپ کو اونچے چبوترے پر بیٹھے ہوئے دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ ایسے لوگ عملی زندگی کی ناکامیوں اور مایوسیوں کو آپ بیتی کے ذریعے کامیابیوں اور کامرانیوں میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ اس طرح آپ بیتی حقیقت کی ترجمان نہیں رہتی محرومیوں کا ازالہ بن جاتی ہے۔

جن آپ بیتیوں میں سچ لکھا جاتا ہے، وہ دو طرح کی ہوتی ہیں۔ ایک تو وہ جن میں سیدھے سادے انداز سے زندگی کے حالات بیان کر دیے جاتے ہیں۔ دوسری وہ جن میں حالات کے ساتھ ساتھ لکھنے والا اپنے ذہنی ارتقا کی داستان بھی سناتا ہے۔ اس طرح آپ بیتی عام زندگی کے ساتھ ساتھ ذہنی زندگی کا آئینہ بھی بن جاتی ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کی آپ بیتی ''شام کی منڈیر سے'' اسی قسم کی آپ بیتی ہے۔ انھوں نے اپنی چونسٹھ برسوں کی زندگی کی روداد اس طرح لکھی ہے کہ ایک طرف تو وہ تمام حالات و واقعات سامنے آ جاتے ہیں جو اُن کے سلسلۂ روز و شب کی تشکیل کرتے ہیں، دوسری طرف یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ ذہنی طور پر انھیں کون کون سے

اور کس کس طرح کے سفر درپیش رہے۔

ہر انسان دو سطحوں پر زندگی بسر کرتا ہے۔ ایک سطح تو وہ ہے جو دوسروں کو نظر آتی ہے۔ دوسری سطح پر، یعنی باطنی سطح پر بسر کی ہوئی زندگی سے صرف متعلقہ شخص واقف ہوتا ہے۔ ''شام کی منڈیر سے'' انھی دونوں سطحوں پر بسر کی ہوئی زندگی کی روداد ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنے حالات نہایت دلچسپ پیرائے میں بیان کیے ہیں۔ یہ کتاب پڑھتے ہوئے ہمیں تو ایسا محسوس ہوا جیسے ہم ڈاکٹر صاحب کے ساتھ سفر کر رہے ہوں۔ ہاں کہیں کہیں یہ ساتھ چھوٹتا بھی رہا۔ ڈاکٹر صاحب جب نہایت دقیق اور رقیق قسم کے علمی موضوعات پر اظہارِ خیال کرتے ہیں تو اپنی بعض ذاتی مجبوریوں کی وجہ سے ان کے ارشادات سے مستفید ہونا ہمارے بس کی بات نہیں۔ اس لیے ہم ان صفحات سے آنکھیں بند کر کے گزر گئے جن میں زبان و مکان کی پیچیدہ گتھیوں کو سلجھایا گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو خدا نے بے پناہ علم سے نوازا ہے اور اس معاملے میں وہ خاصے فراخ دل اور کشادہ دست واقع ہوئے ہیں، اسی لیے کتاب میں انھوں نے علم کے موتیوں کو دونوں ہاتھوں سے لٹایا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ ہم نے ایک مرتبہ بھی ان موتیوں کو للچائی ہوئی نظروں سے نہیں دیکھا۔ یہ موتی جہاں جہاں گرے تھے، ہم نے وہیں رہنے دیے تاکہ ضرورت مندوں کے کام آئیں۔

اس کتاب سے ڈاکٹر وزیر آغا کے بارے میں بعض نئی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ انھوں نے اپنی ابتدائی نظمیں نصرت آرا نصرت کے فرضی نام سے چھپوائی تھیں۔ نسوانی نام سے نظمیں چھپوانے کا سبب یہ تھا کہ ڈاکٹر صاحب کے خیال میں...... ''مدیر حضرات نے شعرا کو گھاس نہیں ڈالتے۔ البتہ جب صنفِ نازک کی کوئی تحریر اُن کے سامنے آئے تو رعایتی نمبر دے کر شائع کر دیتے ہیں''...... یہ پرانے زمانے کی بات ہے، ورنہ آج کل کے مدیرانِ کرام کسی کو رعایتی نمبر نہیں دیتے۔ نئے شاعروں کو سالانہ خریدار بنا کر ان کا کلام شائع کر دیتے ہیں۔ اسی لیے تو ادبی رسالوں کی تعدادِ اشاعت کا اندازہ ان شائع شدہ غزلوں سے کیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے یہ انکشاف بھی کیا ہے کہ انھوں نے پہلا شعر اس وقت کہا تھا، جب وہ ساتویں جماعت میں پڑھتے تھے۔ شعر یہ ہے:

ابھی سر برہنہ تھا مسٹر نثار
ابھی سر پہ ٹوپی رکھے آ گیا

معلوم ہوتا ہے کہ چھٹی جماعت کے زمانے میں ڈاکٹر صاحب سے انور سدید کی دوستی نہیں تھی۔ ورنہ اس شعر میں ''مسٹر نثار'' کی جگہ ''انور سدید'' ہوتا۔

ڈاکٹر صاحب لاہور کے ادیبوں سے خوش نہیں ہیں۔ فرماتے ہیں...... ''اہلِ لاہور شخصی ترجیحات کی زد پر ہیں اور اسی بنا پر چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بٹ چکے ہیں۔ ان ٹولیوں میں بھی خلوص اور محبت کا وہ رشتہ نہیں جو شہر سے باہر کی مخلوق میں ہے۔ میں نے اکثر دیکھا کہ جہاں چار ادیب جمع ہوتے تو جملہ بازی کا مظاہرہ کرتے۔ گفتار کے جوہر دکھاتے، کالج کے لڑکوں کی طرح ایک دوسرے کے ہاتھوں پر ہاتھ مارے، قہقہے لگاتے اور ایک دوسرے کے نجی معاملات سے پوری واقفیت کا مظاہرہ کرتے یوں لگتا جیسے وہ یک جان سو قالب ہیں۔ مگر جیسے ہی ان میں سے کوئی رخصت ہوتا تو فوراً اس کی برائی شروع کر دیتے۔''

لاہور کے ادیبوں میں لاکھ برائیاں سہی، لیکن ہمیں تو ان کی یہ بات پسند آتی ہے کہ وہ اپنے کسی دوست کی برائی اس کی موجودگی میں نہیں کرتے۔ آدمی میں اتنا اخلاق تو ہونا چاہیے کہ کسی کے منھ پر اس کی برائی نہ کرے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو لاہور کے ادیبوں کے خوش اخلاق ہونے میں کوئی شبہ نہیں رہتا۔ خوش اخلاقی انسانی کردار کی بہت بڑی خوبی ہے، اس کی جتنی تعریف بھی کی جائے کم ہے۔

اس آپ بیتی میں بے شمار شخصیات سے ملاقات ہوتی ہے۔ یہ ملاقاتیں کہیں تو کئی کئی صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں اور کہیں ایک آدھ جملے میں معاملہ ختم کر دیا گیا ہے۔ مولانا صلاح الدین، شمس آغا اور اپنے والد مرحوم کے بارے میں ڈاکٹر صاحب نے تفصیل سے لکھا ہے۔ لیکن بیشتر لوگوں کا تذکرہ مختصر ہے۔ مثلاً ڈاکٹر عبادت بریلوی کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر عبادت بریلوی سے مراسم کا آغاز تو ان ایام ہی میں ہو گیا تھا جب میں نے ان کی زیرِ نگرانی پی ایچ ڈی کا تھیسس لکھنا شروع کیا۔ ''زیرِ نگرانی'' اس لیے کہ وہ یونیورسٹی کی طرف سے میرے نگراں مقرر ہوئے تھے، ورنہ میرا موضوع ان کے لیے اجنبی تھا، اس لیے وہ اس سلسلے میں میری

نگرانی کرنے سے معذور تھے۔''

ہمیں ڈاکٹر وزیر آغا کی اس رائے سے اتفاق نہیں ہے کہ ان کے پی ایچ ڈی کے مقالے کا موضوع ڈاکٹر عبادت بریلوی کے لیے اجنبی تھا، اس لیے وہ نگرانی سے معذور تھے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی جب اجنبی موضوعات پر ضخیم کتابیں لکھ سکتے ہیں تو ان کے لیے ڈاکٹر وزیر آغا کے مقالے کی نگرانی کرنا کون سا مشکل کام تھا۔

ڈاکٹر صاحب سے ہمیں ایک چھوٹی سی شکایت ہے کہ انھوں نے اپنی سابقہ کتابوں اور مضامین کے اقتباسات اس کثرت سے درج کیے ہیں کہ یہ آپ بیتی ان کی نگارشات کا انتخاب بن کر رہ گئی ہے۔ ہم جیسے کمزور اعصاب کے قارئین پر علم کا اتنا بوجھ نہ ڈالا جاتا تو اچھا تھا۔

علم کے ذکر پر ایک واقعہ یاد آ گیا، وہ بھی سن لیجیے۔ استاد لاغر مراد آبادی نے ڈاکٹر وزیر آغا کی آپ بیتی پڑھ رکھی ہے۔ ایک روز فرمانے لگے، ''ڈاکٹر صاحب بہت عالم فاضل آدمی ہیں لیکن ان کے نیاز مندوں میں بڑی تعداد آپ اور راغب شکیب جیسے معصوم لوگوں کی ہے۔ آخر اس کا سبب کیا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے علم کا ان کے نیاز مندوں پر کوئی اثر نہیں ہوا۔''

ہم نے عرض کیا، ''علم کوئی چھوت کی بیماری نہیں جو ایک سے دوسرے کو لگ جائے۔''

(۱۲/ مارچ ۱۹۸۷ء)

موصوفہ نے مجازی خدا کو مجازی شاعر بنا ڈالا

آج کل کے لکھنے والے دو طرح کے ہیں۔ ایک تو وہ ہیں جن کا ادب سے تعلق برائے نام ہے، یعنی نام کی خاطر ادیب بن جاتے ہیں۔ اتنا لکھتے نہیں جتنا اپنے ادیب ہونے کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں۔ بروشر چھاپ کر اشتہاروں سے کماتے ہیں اور پھر رونمائی کی تقریبوں میں یہ کمائی دونوں ہاتھوں سے لٹا دیتے ہیں۔ اپنے بارے میں دوسروں سے لکھوانے کے لیے طرح طرح کے جتن کرتے ہیں۔ در در کی گدائی کے بعد جب تعریفی تحریروں سے کشکول بھر جاتا ہے تو اسے صفحہ قرطاس پر الٹ کر اپنی ادبی خوش قامتی سے محظوظ ہوتے ہیں۔

ہمارے ایک دوست نے بہت سے کشکول یعنی بروشر جمع کر رکھے ہیں، ان کا ارادہ اس موضوع پر پی ایچ ڈی کرنے کا ہے۔ ان دوست نے ہمیں بتایا کہ ایک شاعر ایسا بھی ہے کہ اسے اپنے بروشر کے صفحات بھرنے کے لیے کوئی اور نہ ملا تو اپنی اہلیہ محترمہ کی رائے درج فرما دی جس میں موصوفہ نے "مجازی خدا" کو مجازی شاعر بنا ڈالا۔ اس لیے کہ حقیقی شاعر بنانا ان کے بھی بس میں نہ تھا۔

دوسری طرح کے لکھنے والے شہرت یا گمنامی کا خیال کیے بغیر اپنے کام میں مصروف رہتے ہیں۔ انھیں اس کی پروا نہیں ہوتی کہ ان کا نام اخباروں میں چھپتا ہے یا نہیں۔ ٹی وی کے مشاعروں میں پڑھنے یا سلطان جمیل نسیم کی طرح ٹی وی کے ڈراموں میں کام کرنے کا موقع ملتا ہے یا نہیں۔ یہ لوگ خاموشی سے ادب کی تخلیق میں منہمک رہتے ہیں۔ ایسے ہی لکھنے والوں میں ارشد میر کا بھی شمار ہوتا ہے۔ وہ گوجرانوالہ کے ممتاز وکیل ہیں اور نہایت فعال زندگی گزارتے ہیں۔ لیکن انھوں نے ادب کو اپنا مسئلہ نہیں بنایا، مشغلہ ہی رہنے دیا ہے۔ اس لیے کبھی کبھار لکھتے ہیں اور خوب لکھتے ہیں۔ طنز و مزاح ان کا میدان ہے اور اس میں ان کی کامیابی کا اندازہ اس سے کیجیے کہ شفیق الرحمن اور ضمیر جعفری ان کی تحریروں کے مداح ہیں۔ یہ دونوں بزرگ ادبی معاملات

میں مروت سے کام نہیں لیتے اور کسی کے بارے میں اول تو کلمۂ خیر کہتے نہیں، اور اگر کہتے ہیں تو بہت سوچ سمجھ کر۔

ادھر اُدھر رسالوں میں تو ہم ایک عرصے سے ارشد میر کے مضامین پڑھ رہے ہیں، لیکن انھیں یکجا پڑھنے کا موقع اب ملا ہے۔ حال ہی میں ان کے مضامین کا مجموعہ "دخل در معقولات" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ معلوم نہیں کہ ارشد میر کا کُل ادبی سرمایہ یہی ہے یا مضامین کا انتخاب کیا گیا ہے۔ کوئی بھی صورت ہو، یہ مجموعہ سراپا انتخاب ہے۔

ارشد میر نے اپنے مضامین کے لیے "خام مواد" ادب اور زندگی دونوں سے حاصل کیا ہے۔ ایک طرف تو انھوں نے چھینک، دیہاتی سائیکل، عینک، شوشہ اور تاش جیسے موضوعات پر لکھا ہے اور دوسری طرف "غالب کا بستر"، "بروشر" اور "منکہ ایک شاعر ہوں" جیسے دلچسپ طنز پارے ادب کے حوالے سے تخلیق کیے ہیں۔

غیر ادبی مضامین میں "چھینکیے ضرور مگر" ہمیں بہت پسند آیا۔ مصنف کا مشاہدہ بلکہ تجربہ کافی وسیع معلوم ہوتا ہے۔ اس مضمون کو پڑھ کر ہمیں ایسا محسوس ہوا، جیسے مصنف کی ساری زندگی چھینکتے ہی گزری ہے۔ چھینک کی اقسام کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

"مونچھوں کی طرح چھینکوں کے بھی کئی ڈیزائن ہیں۔ مثال کے طور پر ایک بے آواز چھینک ہوتی ہے جیسے ارسٹوکریٹ حضرات رومال میں سائیلنسر رکھ لیتے ہیں۔ پھر ایک لمبی گھروالی یا لگ ڈبل چھینک ہوتی ہے جو پوری اندرونی مشینری میں ہلچل مچا دیتی ہے، جیسے آپ کے اندر ڈائنامائٹ رکھ دیا گیا ہو۔ پھر وہ چھینک جو کھانسی کے پہلو بہ پہلو وارد ہو کر "من تو شدم تو من شدی" والی کیفیت پیدا کر دیتی ہے۔ اسے آپ اپنی سہولت کے لیے آرکسٹرا چھینک بھی کہہ سکتے ہیں۔ ویسے اگر چھینکوں کو کمپیوٹر سسٹم کے تحت مختلف خانوں میں بانٹا جائے تو اس کی چند ایک معروف اقسام، ناموں سے نہ سہی، اپنے لب و لہجہ، گھن گرج، اسلوب و آہنگ وغیرہ سے الگ الگ پہچانی جا سکتی ہیں۔"

لیکن ہماری دلچسپی کی چیز وہ مضامین ہیں جن میں ادب خصوصاً شاعری سے استفادہ کیا گیا ہے۔ "غالب کا بستر" ایک "تحقیقی" مقالہ ہے جس میں مصنف نے اس بستر کی ایسی ایسی خوبیاں

بیان کی ہیں کہ اگر مرزا یگانہ جیسے غالب کے مخالفین یہ مضمون پڑھ لیتے تو وہ غالب کو اس کی شاعری کی بجائے نہ سہی بستر کی وجہ سے ضرور شاعر مان لیتے۔ اس بستر کی خوبیاں پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں اور پڑھنے کے بعد قاری اس بستر کو اپنے استعمال میں لانے کا خواہاں ہوتا ہے۔

اس کالم کی ابتدائی سطور میں ہم نے بروشر کا ذکر کیا ہے۔ یہ باتیں ہم نے ارشد میر ہی کے ایک مضمون سے متاثر ہو کر لکھی ہیں۔ یہ بھی ایک طرح کا "تحقیقی" مقالہ ہے، جس میں مصنف نے بروشر کی ایجاد، استعمال اور اقسام وغیرہ کے بارے میں بہت ہی کام کی باتیں بتائی ہیں۔ مثلاً:

"کوئی مانے یا نہ مانے یہ امر واقع ہے کہ بروشر کھوٹے کھرے کی تمیز سے مستغنی ہے۔ اس میں جونپور کے قاضی کو بھی ارسطوئے زماں بنا کر دکھایا بلکہ منوایا جاتا ہے اور پھر اس کی برکت سے ہر کس و ناکس صاحب الرائے محقق اور بے بدل ناقد بن جاتا ہے جو اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے پولیس کے پیشہ ور گواہوں کی طرح چند رٹے رٹائے فقروں کی جگالی کر کے صنعتِ بروشر کو چار چاند لگانے کے لیے کوشاں ہے۔..... دیکھا جائے تو بروشر اور پیاز میں بھی حیرت انگیز حد تک مماثلت پائی جاتی ہے..... بروشر کے ورق الٹتے چلے جایئے پیاز کے چھلکوں والی کیفیت نظر آئے گی۔"

اس مجموعے کا سب سے دلچسپ مضمون "منکہ ایک شاعر ہوں" ہے۔ کپڑے کا ایک بیوپاری شاعر بن جاتا ہے، یہ مضمون اس کی آپ بیتی ہے۔ فنِ شاعری کی تکمیل کے لیے ان حضرت نے کیا کیا پاپڑ بیلے، اس کی تفصیل خاصی دلچسپ ہے:

"میں نے اس فن کی تکمیل کے لیے خوب ریاضت کی ہے۔ کھڈیوں اور مشینوں پر جا جا کر کاریگروں سے معلومات حاصل کیں۔ نومشقی کے زمانے میں یہ کھڈیاں میرے لیے بڑی مفید ثابت ہوئیں کیونکہ ان کی کھٹ کھٹ سے تقطیع میں آسانی ہو جاتی ہے..... مولانا روم کے متعلق مشہور ہے کہ چاندی کے ورق کوٹنے والوں کی آواز سن کر ایسا جذبہ طاری ہوا کہ وہیں دھمال کھیلنے لگے اور تمام شعری مشکلیں آسان ہو گئیں۔ تقطیع ویسے بھی بڑی مشکل چیز ہے، اس لیے مجھے اس کی ضرورت پیش آتی ہے تو اپنا مصرع گز کے فیتے سے ناپتا ہوں یا مشینوں کی

آواز سے درست کر لیتا ہوں۔"

یہ شاعر صاحب اپنے بارے میں مزید فرماتے ہیں:

"ہر بڑے شاعر کی طرح مجھے بھی شروع میں کم فہموں نے مہمل گو سمجھا۔ لیکن بعد میں یہی لوگ خود بخود گھٹنے ٹیک گئے کیونکہ اچانک بعض نقادوں کو میری شاعری پسند آ گئی اور انھوں نے میرے بارے میں کتابیں لکھ ڈالیں۔ چنانچہ نوبت بہ ایں جا رسید کہ..... پچھلے دنوں قتیل شفائی اور احمد فراز کے ساتھ مجھے بھی انگلستان مدعو کیا گیا تھا۔ اب تک دو درجن مقامات پر میری شامیں منائی جا چکی ہیں۔ بعض بد اندیش یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ شامیں میں خود منواتا ہوں اور اس کے لیے اخراجات اپنی گرہ سے دیتا ہوں۔ نسخہ دراصل یہ ہے کہ دوسرے شہروں کے ادیبوں اور شاعروں کی شامیں میں لاہور میں منوانے کا بندوبست کرتا ہوں، وہ لوگ میری شاموں کا دوسرے شہروں میں اہتمام کرتے ہیں۔"

لاہور میں یہ دستور ہو گا کہ شعرا کی شامیں ایک دوسرے کے خرچ پر منائی جائیں۔ کراچی کے شعرا یہ کام اپنے ہی خرچ اور اپنی ہی ذمہ داری پر کرتے ہیں۔

(۲۶/مارچ ۱۹۸۷ء)

نہایت عمدہ جی حضوریہ

ممتاز مفتی ۱۹۰۵ء میں پیدا ہوئے تھے۔ خدا کے فضل سے اب وہ بیاسی برس کے ہیں۔ یہ بیاسیواں برس ان کے لیے میٹھے برس کی طرح مبارک ثابت ہوا ہے۔ اس سال پے در پے اُن کی کئی کتابیں شائع ہوئیں۔ کراچی میں ایک شام بڑے پیمانے پر اُن کے ساتھ منائی گئی۔ اخباروں میں اس شام کی رودادیں اور مفتی صاحب کے انٹرویو تسلسل اور تواتر سے شائع ہوئے۔ ایسی اخباری تشہیر تو فلم اور کرکٹ والوں کو بھی شاذ و نادر ملتی ہے۔ سب سے زیادہ دھوم مفتی صاحب کے ایک مضمون اور ایک مراسلے کی ہوئی۔ مضمون وہ جو انھوں نے اپنے بارے میں مذکورہ شام میں پڑھا تھا۔ اس میں انھوں نے اپنے اوپر کئی نئے الزام عائد کیے اور بعض پرانے الزامات کی تصدیق کی۔ مراسلہ وہ جو سرگودھا کے رسالے "اردو زبان" میں چھپا ہے جس میں انھوں نے جناب احمد ندیم قاسمی کو مصرع طرح بنا کر ریختی کے انداز میں ایک غزل ارشاد فرمائی ہے۔

مفتی صاحب نے مذکورہ مضمون میں بتایا ہے کہ انھوں نے بچپن میں جس اسکول میں تعلیم حاصل کی ہے، اس کے ہیڈ ماسٹر اُن کے والد تھے، اس لیے وہ بغیر سفارش کے پاس ہو جایا کرتے تھے۔ ایسا ہی کچھ بعد کے زمانے میں بھی مفتی صاحب کے ساتھ ہوا۔ انھوں نے جس اسکول آف تھاٹ میں داخلہ لیا، اس کے ہیڈ ماسٹر قدرت اللہ شہاب مرحوم تھے۔ یہاں بھی بغیر سفارش کے مفتی صاحب کی تمام ضرورتیں پوری ہوتی رہیں۔ لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ دنیائے ادب میں مفتی صاحب کو، بقول خود بڑی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ کیونکہ یہاں سفارش کے بغیر کام نہیں چل سکتا تھا اور سفارش بھی جناب احمد ندیم قاسمی صاحب کی درکار تھی۔ مفتی صاحب نے غلطی یہ کی کہ قاسمی صاحب سے رابطہ قائم نہ کیا۔ مفتی صاحب فرماتے ہیں:

"اگر میں یہ غلطی نہ کرتا تو اپنے ادبی کیریئر میں اتنی ٹھوکریں نہ کھاتا۔ میری تحریروں کی اشاعت پر بین نہ لگتی، اپنی ہانڈی کے لیے در در دھکے نہ

کھانے پڑتے۔ اگر میں یہ غلطی نہ کرتا تو آج تک نہ جانے کتنے ایوارڈ حاصل کر چکا ہوتا۔ میرا نام ادبی بڑوں میں شامل ہوتا اور نام پیدا کرنے کے لیے اتنا کام نہ کرنا پڑتا۔"

بعض لوگوں کا خیال یہ ہے کہ مفتی صاحب کی یہ باتیں محض آرائش بیان کی حیثیت رکھتی ہیں۔ انھوں نے اپنے ادبی کیریئر میں ٹھوکریں ضرور کھائی ہوں گی، لیکن ان سے کہیں زیادہ ٹھوکریں "علی پور کا ایلی" پڑھنے والوں نے کھائی ہیں۔ یہ بھی درست نہیں کہ مفتی صاحب کی تحریروں پر کبھی کسی نے پابندی عائد کی۔ حالانکہ خود مفتی صاحب کا فرض تھا کہ وہ یہ دیکھتے کہ ان کی کون سی تحریر چھپنی چاہیے اور کونسی نہیں۔ خصوصاً وہ تحریریں جن میں قدرت اللہ شہاب جیسے نیک اور سیدھے سادے بندے کو ولی اللہ بنا دیا گیا تھا۔ یہ بھی درست نہیں کہ انھیں اپنی ہانڈی روٹی کے لیے در در کے دھکے کھانے پڑے۔ مفتی صاحب نے تو اپنی زندگی کا بڑا حصہ ایک ہی دروازے پر گزار دیا اور یہ دروازہ بیک وقت کئی سرکاری محکموں کی طرف کھلتا تھا۔

بعض لوگوں کے ان خیالات سے ہمیں اتفاق نہیں ہے۔ مفتی صاحب نے اپنی تمام پریشانیوں اور محرومیوں کا سبب جو احمد ندیم قاسمی کو بتایا ہے تو اس پر یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ خود ہمیں قاسمی صاحب سے بہت سی شکایتیں ہیں۔ مثلاً وہ اپنے نام سے ڈھیروں غزلیں، نظمیں اور افسانے چھپواتے رہتے ہیں، لیکن انھوں نے کبھی جھوٹے منہ بھی ہم سے یہ نہیں کہا کہ لو ایک آدھ نظم، غزل یا افسانہ تم اپنے نام سے چھپوا لو۔ حالانکہ ہم قاسمی صاحب کے پرانے نیاز مند ہیں۔ اگر ایک آدھ چیز ہمارے نام سے بھی چھپ جاتی تو قاسمی صاحب کے خزانے میں کون سی کمی آ جاتی؟

مفتی صاحب کی ایک بات البتہ ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔ کراچی کی شام والے مضمون میں انھوں نے واشگاف الفاظ میں یہ اعلان کیا ہے کہ "میں نہایت عمدہ جی حضوریہ ہوں۔" ایسی صورت میں وہ نہایت آسانی سے قاسمی صاحب سے قریبی تعلق قائم کر سکتے تھے۔ وہ چاہتے تو قاسمی صاحب کا "جی حضوریہ" بن کر اپنی محرومیوں کا ازالہ کر سکتے تھے۔ جہاں تک ایوارڈ حاصل کرنے اور غیر ملکی دورے کرنے کا تعلق ہے تو ہماری ناقص رائے میں یہ فوائد قاسمی صاحب کے ذریعے حاصل نہیں ہو سکتے تھے۔ اس لیے بیچارے قاسمی صاحب کبھی اُن لوگوں میں شامل نہیں رہے جو

دوسروں کو اس قسم کے فوائد پہنچا سکتے ہیں۔ یہ فوائد تو اسی چوکھٹ سے حاصل ہوتے تھے جس سے مفتی صاحب زندگی بھر وابستہ رہے۔ مفتی صاحب کے خواجہ تاش ابنِ انشاء مرحوم چالیس پچاس مرتبہ غیر ملکی دوروں پر گئے۔ جو شخصیت ابنِ انشاء کے دوروں کا انتظام کرتی تھی، وہ مفتی صاحب کے لیے بھی راستہ ہموار کر سکتی تھی۔

مفتی صاحب کی اصل شکایت یہ ہے کہ ان کے ناول "علی پور کا ایلی" پر آدم جی انعام نہیں ملا۔ اس انعام کا احمد ندیم قاسمی سے کوئی تعلق نہیں تھا، وہ اس انعام کے جج تھے نہ خانوادۂ آدم جی کے رکن تھے۔ انعامی کمیٹی کے سابق سیکرٹری جمیل الدین عالی نے کراچی کی مذکورہ شام میں مفتی صاحب کے سامنے اس راز کا انکشاف کیا تھا کہ مفتی صاحب کے ناول کو اس کی غیر معمولی ضخامت کی وجہ سے کوئی جج نہ پڑھ سکا، اس لیے اس پر انعام نہ مل سکا۔ قطع نظر اس سے کہ جج صاحبان اگر اس ناول کو پڑھ لیتے تو کیا نتیجہ نکلتا۔ یہ ناول شائع ہی انعام کے لیے کیا گیا تھا، اس لیے انعام نہ ملنے کا غم اب بھی چوتھائی صدی گزرنے کے بعد تازہ ہے۔

اس ناول کے ناشر مفتی صاحب کے گہرے دوست اشفاق احمد تھے۔ انھوں نے یہ ناول چھاپنے کے لیے بصرفِ زرِ کثیر اپنے گھر کے ایک کمرے میں پریس لگایا۔ ان کا خیال تھا کہ ناول پر انعام ملے گا تو ان کی رقم معہ منافع کے واپس آ جائے گی۔ لیکن رقم کے ساتھ ناول بھی ڈوب گیا۔ یہ ساری داستان خود مفتی صاحب نے اپنی کتاب "اوکھے لوگ" میں بیان کی ہے۔ فرماتے ہیں:

> "اس نے پبلشر بننے کی ٹھان لی۔ دساور سے چھپائی کی مشینیں آ گئیں۔
> گھر کے ایک کمرے میں انھیں فٹ کر دیا گیا۔ بانو قدسیہ سلائی کی مشین چھوڑ پرنٹنگ مشین پر بیٹھ کر کپڑے کی جگہ کاغذ چلانے لگی۔ میں نے اشفاق کو لاکھ سمجھایا کہ میاں تم میں بزنس مین نہیں ہے، پبلشر نہ بنو۔ لیکن اشفاق کو سمجھانا میرے بس میں نہیں...... جب کوئی چارہ نہ رہا تو میں نے اپنا جہازی ناول "علی پور کا ایلی" فائنٹ ختم کر دیا اور پبلشنگ کے لیے اشفاق کو تھما دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پبلشر کی کمر ٹوٹ گئی۔ چھپائی کی مشینیں اونے پونے پر بک گئیں اور بانو قدسیہ چھپائی کی مشین سے اٹھ کر پھر سے سلائی کی مشین پر جا بیٹھی اور کاغذ کی جگہ پھر سے کپڑا چلانے لگی۔"

ہم نے اس کالم کے آغاز میں مفتی صاحب کے بیاسیویں برس کو بیٹھا برس کہا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ وہ اس عمر میں بھی جوانی بلکہ نوجوانی کے زمانے جیسی باتیں کرنے میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ "اردو زبان" والے خط میں قاسمی صاحب کے بارے میں ان کی گل افشانیٔ گفتار کا اندازہ یہ ہے:

۱۔ ادبی سیاست میں کام نہیں نام چلتا ہے اور جناب قاسمی صاحب تو خالص نام ہی نام ہیں۔ یہ نام انھوں نے بڑی سوجھ بوجھ سے کمایا ہے۔

۲۔ جناب قاسمی صاحب جانے پہچانے اور مانے ہوئے ادبی وڈیرے ہیں اور وڈیرے دلیلیں نہیں سنتے، نہ ہی دلیلیں دیتے ہیں۔ وہ تو صرف حکم چلانا اور فیصلے دینا جانتے ہیں۔

۳۔ قاسمی صاحب کے ہاتھ بڑے لمبے ہیں۔

۴۔ احمد ندیم قاسمی ایوانِ ادب کے بہت بڑے سیاسی لیڈر ہیں۔ وہ ہمارے قائدِ ادب ہیں۔ انھوں نے ادب میں سیاست اور گروہ بندی کی بنیاد ڈالی ہے۔ وہ جسے چاہیں افسانہ نویس بنا دیں، جسے چاہیں شاعر بنا دیں۔

۵۔ تمام ادیب ان سے ڈرتے ہیں۔ اور تو اور محترمہ کشور ناہید بھی، جس کی جرأت اور دلیری کا چرچا ہے، ان سے خائف ہے۔ کشور نے مجھ سے کہا: "مفتی جی! میں کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہتی جس پر قاسمی صاحب ناراض ہو جائیں۔" فیض کو انھوں نے زندگی بھر زچ کیے رکھا۔ منٹو ظاہر کیا کرتا تھا: "کون؟ اس کی کیا پرواہ کرتا ہوں۔" مگر اندر سے ان سے دبتا تھا۔ رہا میں، میں تو ساری عمر تھر تھر کانپتا رہا۔ بھرا انتظار حسین ہے۔ قاسمی صاحب کا نام آ جائے تو سراسر احتیاط بن جاتا ہے۔ اشفاق احمد قاسمی صاحب کو خوش کرنے کے جتن کرتے رہے ہیں۔ وزیر آغا جو آج مونچھ کو تاؤ دیے پھرتا ہے، اس سے پوچھیے کہ ابتدائی دور میں کتنی مار کھائی ہے۔

ہم ان اقتباسات پر کوئی تبصرہ نہیں کریں گے، صرف اتنا عرض کریں گے کہ یہ سب کچھ پڑھ کر یقین نہیں آتا کہ مفتی صاحب بیاسی برس کے ہو گئے ہیں۔ ہمیں تو میر حسن کا یہ شعر ان کے حسبِ حال نظر آتا ہے۔

برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن
جوانی کی راتیں مرادوں کے دن

(۱۹ اپریل ۱۹۸۷ء)

فیض کی شاعری اور پاجامے کے حوالے سے فکر انگیز گفتگو

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہمارے پاس لکھنے کے لیے کوئی موضوع نہیں ہوتا۔ حد تو یہ ہے کہ نظیر صدیقی، سلطان جمیل نسیم اور مظفر علی خان منظر جیسے سدا بہار موضوعات بھی ساتھ نہیں دیتے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہم ناغہ کر جاتے ہیں۔ اس سے بعض لوگ خوش ہوتے ہیں اور بعض ناخوش۔ خوش وہ ہوتے ہیں جن پر ہم طبع آزمائی کرتے رہتے ہیں اور ناخوش وہ ہوتے ہیں جن کو یہ اندازہ نہیں ہے کہ ہر ہفتے کالم لکھنا بہت مشکل کام ہے۔ کالم کوئی غزل تو نہیں کہ پچھلے شاعروں کے لفظ دائیں بائیں کر کے دیوان تیار کر لیا جائے۔ اس کے لیے بہت کچھ پڑھنا اور سوچنا پڑتا ہے۔ تب نظر آتی ہے اک مصرع تر کی صورت۔ ڈاکٹر انور سدید کی طرح ہمارے پاس زرخیز ذہن ہے نہ گل ریز قلم کہ جب جی چاہا اور جو جی چاہا لکھ دیا۔ حشر کے دن عام لوگ تو فرشتوں کے لکھے پر پکڑے جائیں گے لیکن ڈاکٹر صاحب نے اتنا کچھ لکھا ہے کہ وہی ان کے لیے کافی ہوگا۔

اس ہفتے بھی ہمارا ارادہ ناغہ کرنے کا تھا کیونکہ بعد از خرابی بسیار جو موضوع ہاتھ آیا تھا وہ ان گیارہ عدد ہندوستانی شاعروں کا تھا جو پچھلے ہفتے کراچی کے بہت سے مشاعروں میں شرکت کے لیے تشریف لائے تھے۔ ان میں سے صرف جگن ناتھ آزاد اور خمار بارہ بنکوی کے نام ہم نے سنے تھے، باقی تو شاعر ہمارے لیے ہی نہیں، کبھی کے لیے اجنبی تھے۔ تحقیق سے معلوم ہوا کہ ان لوگوں نے ہندوستان سے پاکستان تک کے سفر کے دوران شاعری کو بطور پیشہ اختیار کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسے معصوم شعرائے کرام کے بارے میں کچھ لکھنے سے نہ لکھنا بہتر ہے۔

حسن اتفاق سے ایک محفل میں جگن ناتھ آزاد سے ملاقات ہوگئی۔ ان کے پاس رسالہ ''شب خون'' الہٰ آباد کا ایک شمارہ تھا جو ازراہِ کرم انھوں نے ہمیں عنایت کر دیا۔ اس رسالے میں ہمارے مطلب کے دو خط شائع ہوئے ہیں۔ ہمارے مطلب کے یوں کہ ان میں مکتوب نگاری سے زیادہ کالم نگاری کے تقاضوں کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ ان میں سے ایک خط احمد ہمیش کا ہے، جس

میں انھوں نے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے ایک مضمون ''نثری نظم کی شناخت'' کو پڑھ کر خود اپنی شناخت کرائی ہے۔ دوسرا خط احمد ہمیش کے خط کے جواب میں ہے، جس میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے احمد ہمیش کے عائد کردہ الزامات ہی کو نہیں، احمد ہمیش کو بھی رد کر دیا ہے...... لیکن ان دونوں خطوں سے پہلے آپ کو مشہور شاعر جمیل یوسف کا ایک خط بھی پڑھنا ہوگا جو انھوں نے راولپنڈی سے ہمارے نام لکھا ہے جس میں فیض احمد فیض کی شاعری اور پاجامے کے حوالے سے ''فکر انگیز'' گفتگو کی گئی ہے۔

(۱)

پچھلے دنوں فیض احمد فیض کی برسی کے موقع پر یہاں ایک دلچسپ تقریب منعقد ہوئی۔ تقریب منعقد کرنے والوں کا ارادہ تو یہ نہیں تھا کہ سامعین کی خوش طبعی یا دلچسپی کا بھی کوئی خاص اہتمام ہو، مگر فیض کی زندگی میں ان پر لکھی جانے والی کتاب ''ہم کہ ٹھہرے اجنبی'' کے مصنف جناب ڈاکٹر ایوب میرزا کی تقریر نے دلچسپی کا سامان بہم پہنچایا۔ ڈاکٹر ایوب میرزا نے سامعین کو بتایا کہ وہ فیض صاحب کے بہت قریب رہے ہیں۔ مرحوم کے آخری پندرہ بیس سالوں میں شاید ہی کوئی اور شخص ان کے اتنا قریب رہا ہو۔ فیض صاحب کے انتقال کے بعد ان کی بیگم ایلس فیض نے فیض صاحب کی خوابگاہ کا کمرہ مقفل کر دیا ہے کہ اب کوئی اس کمرے میں داخل نہ ہو۔ مگر ایوب میرزا صاحب چونکہ فیض مرحوم کے بہت قریب رہے ہیں، اس لیے پچھلے دنوں جب وہ لاہور ماڈل ٹاؤن میں فیض کے گھر گئے تو ایلس فیض نے بطور خاص ان کے لیے فیض صاحب کا کمرہ کھولا اور بعد اصرار انھیں اسی کمرے میں ٹھہرایا اور نہ صرف یہ بلکہ رات کو سونے کے لیے انھیں فیض صاحب کا شب خوابی کا لباس بھی دیا جو ایک قمیض اور پاجامے پر مشتمل تھا۔ ایوب میرزا صاحب نے بڑے فخر سے مجمع کو بتایا کہ وہ پہلے اور غالباً آخری شخص ہیں جن سے یہ خصوصی سلوک کیا گیا۔ صبح جب وہ چلنے لگے تو ایلس فیض نے وہ قمیض اور پاجامہ بھی انھیں تحفتاً پیش کر دیا۔ جو وہ بصد شکریہ اپنے ایک ساتھ لے کر آئے۔ بعد میں اپنے صدارتی خطبے میں بیگم ایلس فیض نے محفل کو بتایا کہ ایوب میرزا صاحب نے داستان کے لیے بات کچھ بڑھا کر پیش کیا ہے۔ فیض صاحب کا کمرہ مقفل نہیں ہے اور نہ کبھی ان کے انتقال کے بعد اسے مقفل کیا گیا۔ ہاں البتہ فیض مرحوم کا پاجامہ وہ شوق سے اپنے

ساتھ لے آئے ہیں۔

ہم تو سمجھ رہے تھے کہ ڈاکٹر ایوب میرزا صاحب نے فیض مرحوم کے قرب سے ان کی شاعری کا ادراک حاصل کیا ہوگا مگر معلوم ہوا کہ انھیں محض فیض صاحب کا پاجامہ حاصل ہوا ہے، وہ بھی ان کی زندگی میں نہیں ان کے انتقال کے بعد۔ ہم نے ذاتی طور پر فیض مرحوم کے بارے میں ڈاکٹر ایوب میرزا کی روایت کو شروع سے ہی کمزور روایت سمجھا اور دروغ برگردنِ راوی کہہ کر اس حکایت کو پڑھتے رہے جو ''ہم کہ ٹھہرے اجنبی'' میں بیان ہوئی ہے۔ اس دن بھری محفل میں بیگم ایلس فیض نے انکشاف کیا کہ ایوب میرزا کا بیان صداقت پر مبنی نہیں۔ اس ضمن میں بیگم ایلس فیض سے زیادہ معتبر گواہ بھلا کون ہو سکتا ہے۔

اس محفل میں فیض کے سوشلسٹ ہونے کے بارے میں بھی بہت سی باتیں کی گئیں مگر ان باتوں کا تذکرہ ایک پورے مضمون کا متقاضی ہے۔ میرا ذاتی موقف اس سلسلے میں یہ ہے کہ فیض اب انتقال فرما چکے ہیں اب ان کی شخصیت کا اور فکر کا تجزیہ صرف اور صرف ان کے کلام کی روشنی میں ہونا چاہیے۔ یہی ایک مستقل دستاویز ہے جو وہ اہلِ وطن کے حوالے کر گئے ہیں۔ ایلس فیض چونکہ شروع سے ہی کمیونسٹ پارٹی کی ممبر تھیں اس لیے فیض صاحب بھی یقیناً مروّت میں یا مجبوراً یہ کہ بیگم کی دلآزاری نہ ہو، چپکے چپکے ان کے ہم قدم رہے۔ ہر چند کہ انھیں لینن پرائز بھی ملا مگر میرے نزدیک تو فیض صاحب کا کلام سوشلزم کی چغلی نہیں کھاتا۔

آپ چاہیں تو اپنے قارئین سے استفادے کے لیے مندرجہ بالا خط شائع فرما دیں۔

والسّلام

آپکا۔ جمیل یوسف

(۲)

نارنگ صاحب نے اپنی دانست میں اپنے مضمون میں نثری نظم کی وکالت کی۔ لسانی ٹیکنیکل معلومات کی غیر متعلق بھرمار سے پڑھنے والوں کو مرعوب کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ مگر افسوس انھوں نے دانستہ اُردو نثری نظم کے اہم ناموں کو نظر انداز کیا ہے۔

نارنگ صاحب محقق ہیں مگر انھوں نے یہ زحمت گوارا نہیں کی کہ ماہنامہ ''نصرت'' لاہور کا

۱۹۶۲ء کا ایک شمارہ ڈھونڈ نکالتے، اس میں میری ایک نثری نظم ''گولائیوں میں'' شائع ہوئی تھی۔ اسی طرح اسی زمانے میں بلکہ عرصہ میں ''سویرا'' میں میری نظم شائع ہوئی تھی۔ پھر ''سات رنگ'' کراچی میں، پھر ''تلاش'' دہلی میں۔ جب کہ اعجاز احمد کی نثری نظمیں (جو نمائندہ نہیں) بہت بعد میں شائع ہوئیں۔

پھر ایک چیز ہوتی ہے انفرادی اُسلوب کی طاقت۔ جی ہاں! میں نے انفرادی اُسلوب کی طاقت کے اعتبار سے ۶۲-۱۹۶۱ء سے ۱۹۷۰ء تک مسلسل نمائندہ نثری نظمیں لکھیں اور یہ نثری نظمیں رسائل میں شائع ہوئیں۔ مثلاً ''لینڈ اسکیپ'' جیسی نمائندہ نثری نظم ساتویں دہائی میں ''الف خون'' میں شائع ہوئی۔ جب میں ایسی نثری نظمیں لکھ رہا تھا تو اس وقت میرے سوا اور کون لکھ رہا تھا؟ ذرا نارنگ صاحب دریافت تو کریں۔

قمر جمیل اور کشور ناہید نے تو بہت بعد کے حالات میں نثری نظم کے کیس کو نہیں اچھالا لیکن اس کے ساتھ ہی اگر غور کیا جائے تو بعد کے حالات میں جن شاعروں نے نمائندہ نثری نظمیں لکھی ہیں، ان میں سارہ شگفتہ (مرحومہ) اور ذیشان ساحل کے علاوہ کوئی اور نام قابلِ ذکر نہیں۔ افسوس کہ نارنگ صاحب نے ان ناموں کو بھی انتہائی غیر اہم انداز سے کئی ناموں کے ساتھ نتھی کر دیا ہے۔ بدمذاقی کا یہ عالم ہے کہ انھوں نے میرا نام ساتویں دہائی کے بعد کے نثری نظم کے شاعروں کے ناموں کے بعد کئی اور ناموں کے درمیان بریکٹ کیا ہے۔ معلوم نہیں انھیں میرا نام کیسے یاد رہا جب کہ ماہنامہ ''شاعر'' بمبئی کے ایک شمارے میں کہانی کے متعلق مضمون میں تو انھوں نے میرا نام سرے سے درج ہی نہیں کیا۔ ان کو غالباً اندازہ نہیں کہ اُردو نظم اور اُردو کہانی میں ایک محرک کی حیثیت سے میرا کنٹری بیوشن ہے، اسے آسانی سے کوئی نظر انداز کر کے گزر نہیں سکتا۔ ایک بات اور بھی ہے کہ مجھ میں تنقیدی مضامین لکھنے کی بھی صلاحیت موجود ہے اور اس معاملے میں میرا قلم بہت طاقت ور ہے۔ بلکہ ابھی میں زندہ ہوں ابھی میں اپنے خلاف ہونے والی ادبی حق تلفی کا مقابلہ کر سکتا ہوں۔

احمد ہمیش

(۳)

احمد ہمیش کی شکایت سر آنکھوں پر۔ اس شکایت کے پیچھے جو نفسیات ہے وہ خاصی دلچسپ ہے، یعنی میں بہت اہم شاعر ہوں، فلاں نقاد نے مجھے نظر انداز کر کے انصاف کا خون کیا ہے۔ بُرا ہو اس تنقید کا جو بھولے بھالے فنکاروں کو طرح طرح کی الجھنوں میں مبتلا کر دیتی ہے۔ میں احمد ہمیش کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ اگر تخلیق میں جان ہے تو نقاد لاکھ بُرا چاہے تو وہ تخلیق کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اور اگر تخلیق بے جان ہے، نقاد لاکھ بھلا چاہے، وہ اس میں جان نہیں ڈال سکتا۔ احمد ہمیش اہم فنکار ہیں تو مستقبل کا مورخ ان کی طرف توجہ کرے ہی گا، نہیں کرے گا تو اپنا ہی نقصان کرے گا۔ میری کوتاہی یہ ہے کہ جس مضمون کا انھوں نے ذکر فرمایا ہے اس میں نہ میں مورخ ہوں نہ محقق۔ یہ اعزاز انھوں نے خاکسار کو خواہ مخواہ عطا فرمایا ہے۔ شکایت ان کو مجھ سے نہیں، مجھ کو ان سے ہونا چاہیے کیونکہ مضمون کو غور سے پڑھنا تو درکنار، انھوں نے اس کے عنوان پر بھی توجہ کرنا پسند نہیں فرمایا۔ عام رویہ یہ ہے کہ لوگ محدب شیشہ لے کر تنقیدی مضامین میں اپنا نام ڈھونڈتے ہیں اور اگر نام نظر نہ آئے تو مضمون نگار اور ایڈیٹر کو کوسنا شروع کر دیتے ہیں۔

احمد ہمیش صاحب کی خدمت میں عرض ہے کہ اس مضمون میں میرا مسئلہ نثری نظم کے تاریخی ارتقا کو پیش کرنا ہے، نہ انفرادی شعرا کی کارگزاریوں کا تعین کرنا۔ اگر وہ ایسا سمجھتے ہیں تو یہ ان کی فیاضی ہے۔ مضمون کا عنوان تھا: ''نثری نظم کی شناخت''۔ یعنی نثری نظم کی پہچان کیا ہے اور اگر ہے تو اس کی ہیئتی تعریف کن بنیادوں پر کی جا سکتی ہے، وغیرہ۔ میرے حقیر خیال میں یہ تعریف لسانی بنیادوں ہی پر ممکن ہے۔ ہو سکتا ہے میں غلط ہوں۔ احمد ہمیش صاحب کو چاہیے کہ میرے معروضات کو غلط ثابت کریں۔ ان کی بات صحیح ہوگی تو میں شکریے کے ساتھ تسلیم کروں گا۔ لیکن علمی مسائل میں خالی جذباتیت سے کام نہیں چلتا۔ اگر کسی کو لسانی، ہیئتی امور سے الجھن ہوتی ہے تو ایسے لوگوں کی ذہنی صحت کے پیشِ نظر میں مضمون ہی میں عرض کر چکا ہوں کہ وہ اپنی طبعِ نازک پر زور نہ ڈالیں۔ کیا ضرور ہے کہ ہر شخص ہر بات کو سمجھے۔ وہ اپنی تخلیق میں لگے رہیں۔ ہم اپنے فضول کاموں میں لگے رہیں گے۔

احمد ہمیش صاحب کی یہ غلط فہمی بھی دور ہونا چاہیے کہ میرے مضمون میں نثری نظم کے

شاعروں کے نام تاریخی ترتیب سے آئے ہیں۔ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ یہ ترتیب ان کے ذہن میں ہو گی میرے ذہن میں نہیں، کیونکہ میرا یہ مسئلہ ہی نہیں۔ بے شک میں نے ان کی نظموں کو اقتباس نہیں کیا، لیکن اس کی یہ وجہ ہرگز نہیں کہ ان کی یا کسی ایسے شاعر کی جس کا کلام مقتبس نہیں ہوا، شاعری غیر اہم ہے بلکہ میں نے تو نثری نظم کے صنفی جواز سے بحث کرتے ہوئے صرف ان شاعروں کی نظموں کا تجزیہ کیا ہے جو پابند شاعری میں اپنی حیثیت مستحکم کر چکے ہیں اور اس کے باوصف انھوں نے شعری اظہار کے لیے نثری نظم کو بھی اختیار کیا ہے۔ میری ناچیز رائے میں احمد ہمیش جیسے شاعر کو یہ اصرار نہ ہونا چاہیے کہ اس کا شمار ایسے شاعروں کے ساتھ کیا جائے۔

گوپی چند نارنگ

(۱۲/اپریل ۱۹۸۷ء)

ایک پُرکشش متنازع شخصیت

کشور ناہید جہاں ایک طرف بے مثال شاعرہ ہیں، وہیں دوسری طرف ایک پُرکشش متنازع شخصیت بھی ہیں۔ ان کے گرد روایتوں کا ایک ایسا ہالہ نظر آتا ہے جس کی بنا پر انھیں ایک دیو مالائی کردار کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔ ان سے ان کے معاصرین کا رویہ عجیب و غریب ہے۔ ان کے بارے میں طرح طرح کی باتیں کی جاتی ہیں، لیکن کشور ناہید ان سب باتوں کی کوئی پروا نہیں کرتیں اور اپنے کام سے کام رکھتی ہیں اور کام یہ ہے: شعر کہنا، نثر لکھنا اور ان دونوں کی پیوندکاری سے نثری نظمیں تیار کرنا۔ گویا وہ کلامِ موزوں اور کلامِ ناموزوں دونوں میں طاق ہیں۔

کشور ناہید کی شاعری کی طرح ان کی باتیں بھی ہمیں بے حد پسند ہیں۔ بلکہ سچی بات یہ ہے کہ شاعری تو کبھی کبھی ہمارے سر کے اوپر سے گزر جاتی ہے، لیکن باتیں سر تک پہنچیں نہ پہنچیں دل پر ضرور اثر کر جاتی ہیں۔ خوش قسمتی سے پچھلے ایک ڈیڑھ مہینے میں کشور ناہید کے تین انٹرویو پڑھنے کو ملے ہیں۔ ایک ماہنامہ ''کتاب نما'' دہلی میں، دوسرا ڈیلی ''اسٹار'' کراچی میں اور تیسرا روزنامہ ''جنگ'' لاہور میں۔ یہ تینوں انٹرویو دلچسپ بھی ہیں اور فکر انگیز بھی۔ دلچسپ اس لیے کہ کشور ناہید کا اندازِ گفتگو بے باکانہ ہی نہیں والہانہ بھی ہوتا ہے۔ بلکہ کبھی کبھی جارحانہ بھی ہو جاتا ہے۔ فکر انگیز اس لیے کہ جب وہ ادب اور زندگی کے مسائل پر اظہارِ خیال کرتی ہیں تو خود ادب اور زندگی لاینحل مسئلے بن جاتے ہیں۔

یوں تو یہ تینوں انٹرویو اس لائق ہیں کہ ان سے لفظاً لفظاً استفادہ کیا جائے، لیکن کالم میں اتنی گنجائش ہے نہ ہم میں اتنا حوصلہ۔ بہر حال خاص خاص باتوں کا ذکر ہم کیے دیتے ہیں۔ خدا نے جنھیں وقت اور حوصلہ ہم سے زیادہ دیا ہے وہ اصل انٹرویو دیکھ لیں۔

محترمہ سے رائٹرز گلڈ اور اکادمی ادبیات کی کارکردگی کے بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے ان دونوں اداروں سے اپنی بے تعلقی کا اظہار نہایت حقارت سے کیا۔ جب انھیں یہ بتایا گیا

کہ دونوں ادارے ادیبوں کو انعامات سے نوازتے ہیں، اس لیے ان کے قیام سے ادیبوں کو فائدہ پہنچا ہے۔ محترمہ نے فرمایا: ''ویسے تو بہت سے لوگوں کو زکوٰۃ فنڈ سے بھی فائدہ پہنچا ہے۔ بہت سے لوگوں کو ہیروئن کی اسمگلنگ سے بھی فائدہ پہنچا ہے۔ اگر آپ کا ماٹو...... کسی قیمت پر بھی فائدہ ہے تو مجھے اس پر اعتراض نہیں۔''

گلڈ کا شمار تو خیر اب متروکاتِ سخن میں ہوتا ہے اس لیے اس کے انعامات کی اب کوئی اہمیت نہیں رہی لیکن اکادمی ادبیات کے انعامات کے بارے میں اس قسم کے اظہارِ خیال پر ہمیں عجب ہے۔ خاص طور پر یہ بات انتہائی قابلِ اعتراض ہے کہ ایک ادبی انعام سے حاصل ہونے والے فائدے کو اسمگلنگ کے فائدے سے تشبیہ دی جائے۔ اسمگلنگ کرنے والے سر ہتھیلی پر رکھ کر اپنا کام کرتے ہیں، جب کہ ادبی انعام حاصل کرنے والے خوبیِ قسمت یا خوبیِ روابط کی وجہ سے سرخرو ہوتے ہیں۔

محترمہ نے یہ بھی کہا کہ اکادمی ادبیات سینئر شاعروں کے مقابلے پر جونیئر شاعروں کو انعام کا اہل قرار دیتی ہے۔ اس وجہ سے ادب کے معیار کا خیال رکھنے والوں کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا واقعی ادب کو انعام ملتا ہے۔ اس کے جواب میں اکادمی ادبیات کے ہمدردوں کا بیان ہم تک پہنچا ہے کہ ادب کے معیار کا خیال تو وہ لوگ بھی نہیں رکھتے جو ادب تخلیق کرتے ہیں، صرف انعامات سے محروم رہنے والے ادب کے معیار کی بات کرتے ہیں۔ ہماری رائے میں اکادمی کے ہمدردوں کا جواب ادب کے معیار سے تو کیا، عام اخلاق کے معیار سے بھی گرا ہوا ہے۔ کشور ناہید نے اعتراض اس لیے نہیں کیا کہ پروین شاکر کی بجائے خود اُن کو انعام ملنا چاہیے تھا، بلکہ ان کا مقصد یہ ہے کہ انعام دیتے وقت کسی شاعر کی مجموعی کارکردگی کے ساتھ ساتھ اس کی عمر کا خیال بھی رکھنا چاہیے۔ ہماری رائے میں صرف عمر کا خیال رکھنا ہی کافی ہے کہ ۳۰،۲۵ سال سے زیادہ نہ ہو۔ مجموعی کارکردگی کی شرط غیر ضروری ہے کیونکہ ہمارے علم میں کوئی سینئر یا جونیئر شاعر ایسا نہیں ہے جو اپنی مجموعی یا جزوی کارکردگی کی وجہ سے انعام لے کر رسوا ہونا پسند کرے۔ اور اگر کارکردگی سے مراد مشاعروں میں شرکت ہے تو پھر یہ انعام ہر سال ان شاعروں کو ملنا چاہیے جو پانچ غزلیں لکھ کر پانچ سو مشاعرے بھگتا لیتے ہیں۔ مشاعروں کا ذکر آ گیا ہے تو یہ بھی سن لیجیے کہ کشور ناہید ان سے بھی خوش نہیں ہیں۔ فرماتی ہیں:

''مشاعرے کے ادارے کو مبتذل کرنے میں ہم شاعروں کا اپنا ہاتھ ہے..... مشاعروں میں ہمارے بہت سے شعرا گزشتہ تیس برس سے اپنا پرانا کلام سنا رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مشاعرے کا لطف کم ہو چکا ہے۔ ابلاغ کی ضرورت ہے کہ آپ ہر بار نئی بات کریں۔ ایک نیا پیغام دیں..... شاعروں نے بھی خود کو تولنا شروع کر دیا ہے اور یہ رویہ اختیار کیا ہے کہ انھیں کس مشاعرے سے زیادہ پیسے ملتے ہیں اور وہاں کھانا کیسا ملے گا۔''

قطع نظر اس سے کہ شاعروں نے مشاعرے ہی کو نہیں شاعری کو بھی مبتذل کرنے میں [illegible] کسر نہیں چھوڑی۔ محترمہ نے جو کچھ فرمایا ہے، ہمیں اس سے اتفاق نہیں ہے۔ شاعروں سے [illegible] رکھنا کہ وہ مشاعروں میں ایک ہی جیسا کلام سنانے کی بجائے ہر بار نئی بات کریں اور [illegible] دیں، ایک جائز مطالبہ ہے۔ شعرائے کرام کشور ناہید کی طرح خواتین کے حقوق کی جدو[illegible] حصہ تو نہیں لیتے جو اُن کے خیال میں غیب سے مضامین آئیں اور ان کے پاس نئی باتوں اور [illegible] پیغاموں کا ختم نہ ہونے والا ذخیرہ ہو۔ ان بے چاروں کے پاس تو ہجر و وصال اور لب [illegible] دو چار مضامین ہیں، انھیں کو الٹ پلٹ کر باندھتے کھولتے اور دوبارہ باندھتے ہیں۔ اس [illegible] کی ان سے توقع نہیں رکھنی چاہیے۔

محترمہ کشور ناہید کی یہ بات بھی ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ شعرا پیسوں اور کھانے [illegible] خیال چھوڑ دیں اور شاعری کے معیار کو بلند کریں۔ یہ نہایت عاقبت نااندیشانہ مشورہ ہے۔ [illegible] اور گویے وغیرہ بغیر بھاؤ تاؤ کے اپنی اہلیت تو کیا نااہلیت کا بھی مظاہرہ نہیں کرتے اور شاعر[illegible] سے یہ توقع رکھی جائے کہ وہ پیٹ پر پتھر باندھ لیں اور وہ بھی اس حالت میں جب کہ ان [illegible] چاروں کے ذہنوں پر پہلے ہی پتھر پڑ چکے ہوں۔

کشور ناہید کو یہ شکایت بھی ہے کہ ''بہت سے ایسے لوگ جو کچھ بھی نہیں ہوتے [illegible] شناخت کے لیے اپنے اوپر ادیب کا لیبل چسپاں کر کے اس مراعات یافتہ اور پُرکشش طبقے [illegible] شامل ہو جاتے ہیں اور کئی مفادات اور ترجیحات حاصل کرتے ہیں۔''

ہمیں معلوم نہیں کہ محترمہ نے ادیبوں کے طبقے کو ''مراعات یافتہ'' اور ''پُرکشش'' طبقہ کیوں کہا ہے۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے بعض لوگوں نے ادیب بن کر اکادمی ادبیات کے مطبوعات [illegible]

[illegible] ضرور لیے ہیں، ورنہ عام طور پر ہم نے اس طبقے کو پریشان حال ہی دیکھا ہے۔ [illegible] لیبل چسپاں کرنے والی بات، تو آج کل کے ادیب تخلیقی کاموں پر اتنی محنت بھی نہیں [illegible] لیبل چسپاں کرنے پر صرف ہوتی ہے۔ ظاہر ہے اس صورت میں اپنے اوپر ادب کا [illegible] کرنے والے اس کے مستحق تو ہیں کہ ان کی محنت کی داد دی جائے۔

[illegible] نے غیر ادیبوں کے ادیب بن جانے پر اظہار ناپسندیدگی کرتے ہوئے کہا:

''اس بدعنوانی پر بندھ باندھنے کی ضرورت ہے۔ سوشلسٹ ممالک اور [illegible] کی مثال ہمارے سامنے ہے کہ وہاں ہر اُس شخص کو جس کے ہاتھ میں قلم [illegible] یا کسی تک بند کو ادیب یا شاعر قرار دینا ممکن نہیں۔ وہاں کے ادیب کو [illegible]، ادبی قواعد و ضوابط اور ادبی محاکات کے بارے میں تین سالہ کورس [illegible] ہے۔''

[illegible] کی اس تجویز سے اتفاق نہیں ہے۔ ادیب یا شاعر بننے کے لیے امتحانات کی [illegible] نہایت نامناسب ہے۔ ہمارے ہاں ادب سے جو لوگ دلچسپی لیتے ہیں ان [illegible] قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ ان بے چاروں کو فرضی محبوب کی خاطر بے شمار [illegible] ہے، لہٰذا ان پر مزید کسی امتحان کا بوجھ لادنا صریحاً ناانصافی ہے۔

[illegible] کے معاملے میں اگر امریکہ یا سوشلسٹ ممالک کی تقلید کی گئی تو سوائے کشور [illegible] کوئی تین سالہ کورس پاس کر سکے۔ اس کا ناخوشگوار نتیجہ یہ ہوگا کہ دیگر اشیائے [illegible] شعر و ادب کے لیے بھی ہمیں دوسرے ملکوں سے امداد حاصل کرنے کی ضرورت [illegible] کے ایک ادب ہی کے معاملے میں خود کفیل ہیں۔ کشور ناہید چاہتی ہیں [illegible] جائے۔ خدا کے فضل سے ہمارے ملک میں ادب اتنی فراوانی سے پیدا ہوتا [illegible] اور غیر ممالک کو برآمد کر سکتے ہیں بلکہ فاضل ادیبوں سے بھی چھٹکارا حاصل کر [illegible]

[illegible] نے بہت سی باتیں اپنی ذات کے حوالے سے بھی کی ہیں۔ ان میں سے بعض [illegible] کی جا رہی ہیں۔ بلا تبصرہ اس لیے کہ کشور ناہید کی ہر بات پر تبصرہ کرنا ہمارے [illegible] کے بھی شایانِ شان نہیں کہ ان کی ہر بات پر تبصرہ کیا جائے۔

''ایک فقرہ، مجھے اس عمر میں بھی جس کے سننے سے کوفت ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ ہائے آپ کتنی اسمارٹ، کتنی ینگ لگ رہی ہیں۔ آپ اپنی عمر سے دس سال چھوٹی لگ رہی ہیں۔ میں جب یہ سنتی ہوں تو کہتی ہوں کہ مجھے اپنی عمر سے دس سال چھوٹا لگنے کا کوئی شوق نہیں ہے اور نہ بڑا لگنے کا مرض ہے۔ میری اپنی جو عمر ہے، وہ میں ہوں۔ تو جس فلرٹیشن کے شوق میں ہماری نسل کا ہر مرد مبتلا ہے، اس کی اپنی گرسنگی صرف لفاظی تک محدود ہے، تو وہ بھلا کیسے برداشت کر سکتا ہے۔ اس کے تجربے میں وہ باتیں نہیں ہیں جن کو بیان کرنے کی تھوڑی سی ہمت کرتی ہوں......''

''..... پہلے میں سمجھا کرتی تھی کہ عورت جب چالیس سال کی ہو جاتی ہے اس کے ساتھ دو تین باتیں ختم ہو جاتی ہیں۔ اس کے ساتھ اسکینڈل ختم ہو جاتے ہوں گے۔ دوسرے اس کی Sensation ختم ہو جاتی ہوگی۔ تیسرے یہ کہ لوگ قبول کر لیتے ہوں گے کہ ہاں بھئی یہ ایک فرد ہے، چلو بھئی اس کو مان لو۔ لیکن اب اندازہ ہوا پینتالیس برس کی ہو کے کہ جب تک سانس ہے، اس وقت تک ان ساری چیزوں کے ساتھ زندہ رہنا ہے۔''

(۷ رمئی ۱۹۸۷ء)

ترقی پسند مصنفین کون ہیں

ہماری یہ عادت ہے کہ کوئی اچھا شعر، وہ ہمارا ہی کیوں نہ ہو، نظر آ جائے تو ایک آدھ ہفتے تک ہم اس کے سحر میں گرفتار رہتے ہیں اور ہر ملنے والے کو کسی نہ کسی بہانے وہ شعر ضرور سنا دیتے ہیں۔ آج کل ہمارے دل و دماغ پر جس شعر کا قبضہ ہے، وہ یہ ہے۔

شکل ظاہر کچھ بھی ہو جائے وہی رہتے ہیں ہم
ہم کہیں بھی ہوں مگر امروہوی رہتے ہیں ہم

جب یہ شعر ہم نے استاد لاغر مراد آبادی کو سنایا تو پھڑک اٹھے، کہنے لگے، ''سہل ممتنع کی ایسی مثال نظر سے کم گزری ہے۔'' ہم نے پوچھا، ''سہل ممتنع کسے کہتے ہیں؟'' تو فرمایا، ''ویسے تو اس شعر کو کہتے ہیں جس کی نثر نہ ہو سکے، لیکن آپ نے جو شعر سنایا ہے، اس کے پیش نظر اب سہل ممتنع کی تعریف یہ ہوگی، ایسی نثر جسے شعر کے سانچے میں نہ ڈھالا جا سکے۔''

یہ بڑی فلسفیانہ بات تھی، ہماری سمجھ میں نہ آئی۔ خود لاغر صاحب کو بھی اندازہ نہیں تھا کہ وہ کیا فرما رہے ہیں، اس لیے ہم نے بات یہیں ختم کر دی اور لاغر صاحب کو یہ بھی نہ بتایا کہ یہ شعر کس کا ہے۔ وہ دوسرے مصرعے کے آخری ٹکڑے (مگر امروہوی رہتے ہیں ہم) سے یہی سمجھے ہوں گے کہ شعر مگر امروہوی کا ہے...... لیکن ہم اپنے قارئین سے کوئی بات چھپاتے نہیں، لہٰذا عرض ہے کہ یہ خوبصورت شعر حضرت رئیس امروہوی کا ہے اور پاکستان میں پہلی مرتبہ ہمارے کالم کے ذریعے منظر عام پر آ رہا ہے۔

دہلی سے ''یادوں کی پرچھائیاں'' نام کی ایک کتاب شائع ہوئی ہے، جس کے مصنف جناب رحمت امروہوی ہیں۔ جناب رئیس امروہوی نے اس کا دیباچہ لکھا ہے۔ جس کا آغاز مذکورہ شعر سے ہوتا ہے۔ مصنف اور دیباچہ نگار کے حوالے سے ہمارا خیال تھا کہ اس کتاب میں امروہے سے متعلق یادوں کی پرچھائیاں ہوں گی کہ یہ شہر دلپذیر ہمارے تہذیبی ثقافتی ماضی کا خوبصورت

مرقع ہے۔ لیکن پڑھی تو معلوم ہوا کہ اس کا تعلق احمد آباد سے ہے۔ جناب مصنف نے عمر کا بڑا حصہ احمد آباد میں گزارا ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے اس کی ادبی محفلوں، مشاعروں اور کانفرنسوں وغیرہ کی روداد لکھی ہے۔ اُن شعراء کے حالات اور انتخاب کلام بھی درج کیے ہیں جنھوں نے احمد آباد کی ادبی فضا کی تشکیل کی۔ یہ ایک دلچسپ کتاب ہے اور اس سے احمد آباد کے گزشتہ ۴۰، ۵۰ برسوں کی ادبی سرگرمیوں کا بھرپور اندازہ ہوتا ہے۔

جناب مصنف کا نام ہم نے پہلی مرتبہ اس کتاب ہی کے ذریعے سنا ہے، حالانکہ وہ بقول خود "ہندوستان گیر" شہرت کے مالک ہیں۔ وہ شاعر ہیں، لیکن ان کا کلام ہماری نظر سے نہیں گزرا۔ انھوں نے دوسرے شعرا کے بہت سے شعر اپنی کتاب میں درج کیے ہیں، لیکن اپنے کسی شعر کو اپنی نثر کے ساتھ پیش کرنے کے لائق نہیں سمجھا۔ معلوم نہیں، یہ انکسار ہے یا احتیاط۔ پہلی صورت میں وہ مبارکباد کے اور دوسری صورت میں وہ شکریے کے مستحق ہیں۔ یہ بات ہم نے اس لیے لکھی ہے کہ اس کتاب میں جناب مصنف نے جتنے شعر بھی درج کیے ہیں وہ جناب رحمت امروہوی کے مذکورہ شعر کی طرح سہل ممتنع کا نمونہ ہیں۔ یعنی شعر تو سہل ہیں، لیکن پڑھنے والے مشکل میں پڑ جاتے ہیں۔

جناب رحمت امروہوی کا تعلق انجمن ترقی پسند مصنفین سے ہے، حالانکہ اصولاً انھیں انجمن سادات امروہہ سے تعلق رکھنا چاہیے۔ ان کی ترقی پسندی کو ایک اور دیباچہ نگار، ڈاکٹر قمر رئیس نے ان الفاظ میں سراہا ہے:

"ان کی اس لگن اور حوصلہ مندی میں شاید انجمن ترقی پسند مصنفین کا بھی حصہ ہے، جس سے وہ اس زمانے سے وابستہ ہیں جب وارث علوی اس کے سیکریٹری ہوتے تھے۔ اس زمانے میں وارث علوی اپنی تحریروں اور تقریروں میں جس دیوانگی اور جوش سے ترقی پسندوں کے موقف کی حمایت کرتے تھے، اس کف در دہانی سے وہ اب اس کی مذمت کرتے ہیں۔ لیکن اس تحریک سے رحمت امروہوی کی وفاداری بشرطِ استواری رہی ہے، اس کے واضح نقوش ان کی عملی زندگی اور شاعری دونوں میں نظر آتے ہیں۔"

ہمیں معلوم نہیں تھا کہ وارث علوی کسی زمانے میں ترقی پسند بھی رہ چکے ہیں۔ ہم اکثر سوچتے تھے کہ ان کی تحریروں میں کہیں کہیں جارحیت کے جو عناصر ملتے ہیں اس کا سبب کیا ہے۔ اب یہ عقدہ کھلا کہ یہ ان کی ترقی پسندی کے زمانے کی باقیات ہیں۔ ویسے ڈاکٹر قمر رئیس کو اس سے آزردہ خاطر نہیں ہونا چاہیے کہ وارث علوی کے بچھڑ جانے سے ترقی پسندوں کے موقف کی تائید کرنے والوں میں ایک کی کمی ہو گئی ہے۔ بلکہ انھیں خوش ہونا چاہیے کہ ترقی پسندوں میں کم از کم ایک تو ایسا نکلا جس نے بالغ نظری کا ثبوت دیا۔ کف در دہانی سے ادب تخلیق کرنے سے بہتر ہے کہ کف در دہانی سے ایسا کرنے والوں کی مخالفت کی جائے۔ ادب آرائشِ گیسو یا جفت سازی کا پیشہ نہیں ہے جو اس کے لیے کوئی انجمن بنانے کی ضرورت ہو۔

رحمت امروہوی کو بھی اس کا بہت صدمہ ہے کہ وارث علوی نے انجمن ترقی پسند مصنفین سے علیحدگی کیوں اختیار کی۔ انھوں نے علوی کا ذکر قدرے "سخن گسترانہ" انداز میں کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

"وارث علوی کا چونکہ پیشہ ہی پڑھنا پڑھانا ہے اور اس پیشے کے لوگ بولتے کم اور لکھتے زیادہ ہیں۔ بولنے کا تو یہ عالم ہے کہ آپ ادب کا کوئی بھی موضوع انھیں دے دیجیے اور کہیے کہ وارث صاحب آپ کو دو گھنٹے بولنا ہے۔ یقین جانیے، ڈھائی گھنٹے تو ہو سکتے ہیں پورے دو گھنٹے ہرگز نہیں ہو سکتے...... وارث صاحب کسی زمانے میں کٹر ترقی پسند تھے...... اب وارث صاحب کے نظریات بدل چکے ہیں اور جب سے امریکہ کا دورہ کر کے آئے ہیں، اس میں کچھ سختی آ گئی ہے۔ ویسے یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ وارث صاحب آج جو کچھ ہیں، یہ سب انجمن ترقی پسند مصنفین کی دین ہے۔ بلکہ قلم چلانے کی تحریک اور قلم کو سلیقہ انجمن ہی سے ملا ہے۔ اس بات کا اعتراف وارث صاحب بھلے ہی نہ کریں، لیکن ان کا دل اس بات کی گواہی ضرور دے گا۔"

رحمت امروہوی کی آہ نیم شبی سننے کے بعد وارث صاحب کا دل ہی نہیں، ہم بھی اس کی گواہی دیں گے کہ وارث علوی کے پاس جو کچھ ہے، وہ انجمن ترقی پسند مصنفین کی دین ہے اور اب جو وہ اس انجمن کے خلاف ہیں تو اس کا سبب بھی یہی انجمن ہے۔ انھوں نے انجمن کو باہر سے نہیں اندر سے دیکھا ہے۔ اگر وہ انجمن کے سیکریٹری نہ ہوتے تو آج وہ بھی رحمت امروہوی کی طرح

قمر [illegible] سے نیک چلنی کا سرٹیفکیٹ لے کر گزر اوقات کرتے۔

۱۹۴۷ء میں احمد آباد میں ترقی پسند مصنفین کی جو کانفرنس ہوئی تھی، وہ زیرِ نظر کتاب میں اس کی روداد شامل ہے۔ یہ اتنی دلچسپ ہے کہ اسے اُردو کے مزاحیہ ادب میں گرانقدر اضافہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ سجاد ظہیر کی صدارت میں جو اجلاس ہوا، اس کا ایک منظر ملاحظہ فرمایئے:

"وحشی صاحب جب اسٹیج پر آئے تو حاضرین نے بہت ہا ہو کی اور خوب شور وغل مچایا۔ نفرین کے شور وغل سے تمام ہال گونج اٹھا...... حاضرین نے بجائے وحشی صاحب کی تقریر سننے کے اُن پر پھبتیاں کسیں، اسٹیج پر پیسے پھینکے اور زور زور سے آوازے کسنے لگے کہ لایئے حضرت آپ کون سی دوائی فروخت کرتے ہیں۔"

ہم نے استاد لاغر مراد آبادی کو یہ اقتباس پڑھ کر سنایا اور پوچھا، "یہ وحشی صاحب کون تھے اور اب کہاں ہیں؟" استاد نے فرمایا، "پہلے آپ یہ بتایئے کہ ترقی پسند مصنفین کون تھے اور اب کہاں ہیں؟"

(۲۵ رجون ۱۹۸۷ء)

ترقی پسندی کا مطلب یہ نہیں کہ
اتفاقی طور پر بھی اچھا شعر نہ کہا جائے

رفعت سروش گزشتہ ۴۵ برسوں سے شعر کہہ رہے ہیں۔ ان کے دس مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ گویا انھوں نے ایک ہاتھ سے لکھا اور دونوں ہاتھوں سے گنوایا یعنی چھپوایا ہے۔ یہ بات اس طرح بھی کہی جا سکتی ہے کہ رفعت سروش کا دریائے سخن غالب کے دریائے معاصی کی طرح [illegible] سے خشک نہیں ہوتا، اس میں پانی ہمیشہ سر سے اونچا ہی رہتا ہے۔ ان کا قاری یہ [illegible] کر سکتا کہ ع

ڈوبنے جاؤں تو دریا ملے پایاب مجھے

[illegible] اس کے برعکس وہ اس حد تک ڈوب جاتا ہے کہ کسی قسم کی شکایت کرنے کے قابل ہی [illegible]

رفعت سروش کی شاعری مقدار ہی کے معاملے میں نہیں، معیار کے اعتبار سے بھی قابلِ توجہ [illegible] ان کی نظمیں ہوں یا غزلیں، گیت ہوں یا منظوم ڈرامے، وہ شاعری کا عمدہ نمونہ ہیں۔ ان [illegible] سبھی مجموعے ہماری نظر سے گزرے ہیں اور ہم بلا خوفِ تردید یہ کہہ سکتے ہیں کہ انجمن [illegible] مصنفین سے وابستگی کے باوجود جن دو چار شاعروں نے شاعری کی آبرو کا خیال رکھا ہے، [illegible] رفعت سروش بھی شامل ہیں۔ نہ جانے علی جواد زیدی صاحب کو ہماری اس رائے کا کیسے علم [illegible] انھوں نے ہماری تائید ان لفظوں میں کی ہے:

"ترقی پسندی کے ابتدائی دور میں نظریاتی پہلو پر بہت زیادہ زور دیا گیا [illegible] کمال اور فنی پہلو دب گیا۔ اسی وجہ سے اس دور کی تخلیقات میں بڑی یک رنگی [illegible] وہ یکسانیت آ گئی۔ صرف چند لوگ تھے جن کی آواز ذرا مختلف تھی اور

ان پر اکثر اعتراض ہوتے رہتے تھے۔ اس مختصر سے گروہ نے ہار نہیں مانی۔ نہ اس نے بنیادی ترقی پسندی کو ترک کیا اور نہ تخلیقی تقاضوں سے چشم پوشی کی۔ اس گروہ میں رفعت سروش بھی شامل ہیں۔"

جناب زیدی کے ان ارشادات سے ضمنی طور پر یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ جہاں ترقی پسندوں کو دوسروں سے بہت سی شکایتیں تھیں وہاں اپنے بعض ساتھیوں سے یہ شکایت بھی تھی کہ وہ بھی کبھار اچھی شاعری کیوں کر لیتے ہیں۔

پچھلے چند برسوں سے رفعت سروش نثر کی طرف زیادہ مائل ہیں۔ انھوں نے اپنے لیے یاد نگاری کا شعبہ منتخب کیا ہے۔ تین ساڑھے تین سال پہلے ان کی کتاب "نقوشِ رفتہ" شائع ہوئی تھی، جس میں دلی کی یادیں تھیں اور بعض ادبی شخصیتوں کے خاکے تھے۔ ذوالفقار علی بخاری، نہال سیوہاری، شکیل بدایونی، ساحر لدھیانوی اور احتشام حسین وغیرہ سے متعلق یادوں کو انھوں نے بڑی خوبصورتی سے صفحۂ قرطاس پر منتقل کیا تھا۔ اب انھوں نے "بمبئی کی بزم آرائیاں" کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے جس میں قیامِ بمبئی کے تیرہ برسوں (۱۹۴۵ء تا ۱۹۵۸ء) کی روداد بیان کی گئی ہے۔ بلاشبہ یہ ایک نہایت دلچسپ کتاب ہے۔ اس سے رفعت سروش کے ذاتی حالات ہی معلوم نہیں ہوتے، بمبئی کے ادیبوں کے بارے میں بہت سی نئی باتیں بھی سامنے آتی ہیں۔

رفعت سروش نے قیامِ بمبئی کی تقریباً ساری مدت ایک چھوٹے سے کمرے میں گزاری، جسے بمبئی کی زبان میں "کھولی" کہتے ہیں۔ یہ چھوٹا سا کمرہ سات آٹھ افراد کا بیڈ روم بھی تھا، ڈرائنگ روم بھی، غسل خانہ بھی اور باورچی خانہ بھی۔ اکثر کئی کئی مہمان بھی اسی کمرے میں سما جاتے تھے۔ رفعت سروش نے، بقول خود، اپنی زندگی کے بہترین دن یہیں گزارے۔ اگر کبھی اتفاق سے انھیں عارضی طور پر کسی وسیع جگہ قیام کا موقع ملتا تو وہ اس خیال سے خوفزدہ ہو جاتے کہ کہیں وہ اس وسعت میں گم نہ ہو جائیں۔ اس کھولی میں رفعت سروش نے اپنے دوستوں (صفدر میر، خورشید الاسلام، جمیل الدین عالی وغیرہ) کے ساتھ شب بیداریاں بھی کیں۔ معلوم نہیں اس کی داد دوستوں کو ملنی چاہیے یا رفعت سروش کو۔ یہ بھی معلوم نہیں، یہ شب بیداریاں بر بنائے دوستی تھیں یا بر بنائے تنگیٔ جا!

رفعت سروش نے بمبئی میں اپنی ادبی زندگی بھی ایک کھولی ہی میں بسر کی جس کا نام انجمن

ترقی پسند مصنفین تھا۔ شروع شروع میں انھوں نے سردار جعفری کی ہدایت پر "ووٹ کس کو دیں" جیسے موضوعات پر طبع آزمائی کی لیکن ادب کو پروپیگنڈہ یا پروپیگنڈے کو ادب بنانے کا ہنر انھیں نہ آیا اور وہ ایک آدھ نظم لکھ کر تائب ہو گئے۔ لیکن ترقی پسندوں میں اٹھنا بیٹھنا جاری رہا۔ اکتوبر ۴۵ء میں حیدرآباد دکن میں ترقی پسندوں کی جو کانفرنس ہوئی تھی، اس میں انھیں بھی مدعو کیا گیا تھا۔ یہ وہی کانفرنس ہے جس کے بارے میں کرشن چندر نے "پودے" کے نام سے رپورتاژ لکھا تھا۔ اس میں انھوں نے رفعت سروش کو سرمئی کبوتر کا نام دیا تھا۔ گویا کبوتر جیسے رفعت پسند پرندے کو بھی انھوں نے ترقی پسند بنا ڈالا۔ رفعت سروش نے بھی اس کانفرنس کا آنکھوں دیکھا حال لکھا ہے جو اس قسم کا ہے:

"ایک صبح کو دیکھا کہ ڈاکٹر ملک راج آنند غسل خانے سے نہا کر مادر زاد ننگے چلے آ رہے ہیں۔ وہ اس یورپی تمدن کا مظاہرہ کر رہے تھے جہاں سے وہ حال ہی میں ہندوستان لوٹے تھے۔"

ممکن ہے بعض بدخواہ یہ کہیں کہ یہ یورپی تمدن کا نہیں، ترقی پسندی کا مظاہرہ تھا۔ ایسے بدظنوں کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ ترقی پسندی بجائے خود ایک لباس ہے جسے پہن کر آدمی کسی دوسرے لباس کا محتاج نہیں رہتا۔

بمبئی میں ترقی پسندوں کی سرگرمیوں کا مرکز ہفتہ وار تنقیدی نشستیں تھیں جن میں نظمیں، افسانے اور مضامین پڑھے جاتے اور ان پر تنقید ہوتی۔ یہ نشستیں سجاد ظہیر (بنّے بھائی) کے گھر پر ہوتی تھیں۔ ان میں علمی اور عملی دونوں طرح کے معاملات و مسائل پر توجہ دی جاتی تھی۔ مثلاً:

"جوش صاحب مستقل طور پر تو پونا میں رہتے تھے مگر کبھی کبھی بمبئی آتے اور اتوار ہوتا تو پی ڈبلیو اے کی میٹنگ میں ضرور آتے۔ چنانچہ ایک میٹنگ میں آئے تو اپنی برقع پوش محبوبہ کو بھی ساتھ لائے اور پورے موڈ میں اپنا کلام سنایا۔ محبوبہ کو اپنے ساتھ تخت پر بٹھا لیا۔ ان سے چہرے سے نقاب اٹھانے کو کہا اور خوبصورت تشبیہوں اور استعاروں سے بھرپور نظم سنائی، جس کا عنوان ہے، برقع بر افگن۔"

جوش صاحب کا ذکر آیا ہے تو ایک واقعہ بھی سن لیجیے جو رفعت سروش نے اصغری بیگم سحر کے

حوالے سے بیان کیا ہے۔

''ایک شام جوش صاحب نہا دھو کر باہر جانے کے لیے تیار ہوئے۔ سفید براق کرتا پاجامہ پہنا...... چلتے وقت اپنی بیوی سے کہنے لگے، ''اچھا بیگم، اب ہم جاتے ہیں، رات کو آئیں گے۔'' بیگم صاحبہ نے میاں کو آنکھ بھر کے اوپر سے نیچے تک دیکھا اور بولیں...... میں جانے دوں گی تمھیں گل چھرّے اڑانے...... اور یہ کہہ کر پان کا پورا اُگالدان جوش صاحب پر اس طرح مارا کہ شاعرِ انقلاب کا چہرہ، کرتا، پاجامہ سب پان کی پیک میں تر ہو گئے۔''

ظ۔ انصاری ہفتہ وار ادبی نشستوں کی جان تھے۔ ان کے بارے میں رفعت سروش لکھتے ہیں:

''ظ۔ انصاری ان دنوں انجمن کے جلسوں میں رونق اور تفریح کا سامان بنے تھے...... عام طور پر ظ۔ انصاری سب سے پہلے نکتچی قسم کا اعتراض کرتے۔ ان کی ڈگری ہے، اس کا الف زیادہ ہے، یہ مصرعہ یوں نہیں، یوں ہونا چاہیے...... بحث شروع ہو جاتی۔ جب دو چار آدمی بول چکتے تو سردار جعفری اپنے فیصلہ کن انداز میں مختصر تقریر کرتے...... اور یوں محفل کو اپنا ہمنوا بنا لیتے۔ لیکن ظ۔ انصاری آخر میں کہتے، مگر میرا اعتراض باقی ہے۔''

معلوم نہیں رفعت سروش کی یہ کتاب ظ۔ انصاری کی نظر سے گزری یا نہیں۔ اگر گزری ہے تو انھوں نے ضرور کہا ہوگا: ''اس کتاب میں کوئی حرف تو وزن سے نہیں گرا، پوری کتاب ہی معیار سے گری ہوئی ہے۔''

ممتاز حسین جب لکھنؤ سے بمبئی گئے، وہ بھی اسی کان نمک کا ایک حصہ بن گئے۔ رفعت سروش لکھتے ہیں:

''ان کی تنقید بہت گاڑھی اور ادق ہوتی تھی۔ بنّے بھائی اپنے مخصوص حتبسم انداز میں کہا کرتے تھے کہ ممتاز حسین ترقی پسندوں کا محمد حسن عسکری ہے...... اچھا ہوا کہ محمد حسن عسکری زندہ نہیں ہیں۔ یہ بات سن کر اگر وہ صدمے سے نہ مرتے تو خودکشی ضرور کر لیتے۔''

یوں تو یہ کتاب رفعت سروش کی زندگی کے واقعات پر مشتمل ہے۔ لیکن اس کے اصل ہیرو علی سردار جعفری ہیں۔ اس میں جہاں ان کی شادی خانہ آبادی کا ذکر ہے، وہیں ان کے حوالے سے ادب کی خانہ بربادی کا مفصل تذکرہ بھی ملتا ہے۔ پہلے شادی کا حال سنیے:

''۳۰ر جنوری ۱۹۴۸ء، بمبئی کی ایک نہایت خوشگوار شام...... ایک ایسی مبارک تقریب جس میں کمیونسٹ پارٹی کے اراکین کے علاوہ اُردو کے بیشتر ادیب، شاعر جمع ہیں...... احباب مبارکباد دے رہے ہیں، نئے جوڑے کو تحائف پیش کر رہے ہیں۔ میرا جی نے ایک نظم پڑھتے ہوئے نئے جوڑے کو ایک دلچسپ تحفہ دیا ہے۔ بک شیلف، لکڑی کے دو خوبصورت مینڈھے...... کیفی اعظمی نے تقریر کی اور کہا، میں نے سردار جعفری سے بہت کچھ سیکھا ہے، مگر ایک چیز میں نے انھیں سکھائی ہے، شادی کرنا...... آخر میں سردار جعفری کو بولنے کی دعوت دی گئی۔ وہ اپنی عادت کے برعکس کچھ محجوب سے ہیں اور کچھ یوں بات کرتے ہیں کہ میں آج پہلی بار بولنے میں جھجک محسوس کر رہا ہوں۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ یہ سلطانہ کی دوسری شادی ہے۔''

ادب کی خانہ بربادی کی تفصیل یہ ہے کہ جب سجاد ظہیر کے بمبئی سے چلے جانے کے بعد انجمن ترقی پسند مصنفین پر علی سردار جعفری نے قبضہ کر لیا......

''سردار کے ہاتھ انجمن کی زمام آتے ہی اس کے رنگ ڈھنگ بدلنے لگے اور آہستہ آہستہ وسیع النظری اور رواداری میں کمی آنی شروع ہوئی...... مقصدیت کی سلپ ہر تخلیق کے ماتھے پر چپکائی جانے لگی اور ادبی محاسن کو طاق پر رکھنے کا چلن شروع ہو گیا۔ سردار جعفری کی شہرت نے فراٹے بھرنے شروع کیے۔''

رفعت سروش نے ادبی بے ادبیوں کے بہت سے واقعات بیان کیے ہیں۔ خصوصاً کیفی اعظمی اور ساحر لدھیانوی کی معرکہ آرائی کا ذکر بہت تفصیل سے کیا ہے۔ ساحر اور کیفی گہرے دوست تھے۔ کسی ذاتی اور رومانی قسم کے معاملے میں اختلاف ہو گیا۔ یاروں نے اس اختلاف کو ہوا دی۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کے ایک جلسے میں ساحر نے کیفی کے خلاف ایک مضمون پڑھا۔

سردار جعفری نے اس کا جواب لکھا اور ساحر کو رجعت پسند قرار دیا۔ یہ مضمون بھی [illegible]
گیا۔ ساحر وہاں موجود تھے۔ انھوں نے علی سردار جعفری کو مخاطب کرکے کہا:

"اس مضمون سے آپ یہ ثابت کرسکتے ہیں کہ ساحر لدھیانوی گھٹیا [illegible]
ہے مگر اس سے یہ کہاں ثابت ہوا کہ کیفی اعظمی اچھا شاعر ہے۔"

رفعت سروش کا خیال ہے کہ ان تمام بے ادبیوں کے ذمہ دار علی سردار جعفری [illegible]
سے انھوں نے جعفری کے خلاف ایک طویل نظم لکھی جس کے آخری مصرعے یہ ہیں:

تجھ سا بے عمل شاعر
زندگی کا دشمن ہے
تجھ سا بے عمل شاعر
آدمی کا دشمن ہے

سردار جعفری کے خلاف اتنا کچھ لکھنے کے بعد بھی رفعت سروش ترقی پسند [illegible]
محسوس کرتے ہیں۔ اگر ترقی پسندی یہ ہے تو رجعت پسندی کیا ہوگی؟ دراصل رفعت [illegible]
کتاب علی سردار جعفری کی شہرت کو نقصان پہنچانے کے لیے لکھی ہے۔ ہمارے خیال [illegible]
جعفری کی شہرت کو نقصان نہیں پہنچا سکتا، اس کام کے لیے ان کی شاعری ہی کافی ہے۔

([illegible])

سفر آشوب یا صفر آشوب

[illegible] خیال ہے کہ "سیاح" اور "روسیاہ" میں صرف "ح" اور "ہ" کا فرق ہے۔
[illegible] جاسکتا ہے، اسے سیاح کہتے ہیں اور جب یہی شخص سفر سے واپس آکر کاغذ
[illegible] ہے تو "ح" اور "ہ" میں کوئی فرق نہیں رہتا...... لیکن حمزہ فاروقی کے
[illegible] وہ سفرنامہ لکھنے کے خیال سے سفر نہیں کرتے، سفر سے واپس آکر
[illegible] میں شریک کرنے کے لیے زحمت اٹھاتے ہیں۔ ایک مرتبہ ہم نے
[illegible] مشاہدات میں شریک کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ آپ ہمیں
[illegible] کہنے لگے: "اس طرح سفر بہت مہنگا پڑے گا۔" ہم نے عرض کیا،
[illegible] بہت مہنگی پڑتی ہے۔ ایک مرتبہ سفرنامہ زبانی سننا پڑتا ہے اور دوسری

[illegible] طبیعت پائی ہے۔ ایک طرف وہ دشتِ تحقیق میں آبلہ پائی کا
[illegible] ملکوں ملکوں گھوم پھر کر خدا کی قدرت کا تماشا دیکھتے ہیں۔ تحقیق
[illegible] کا متحمل نہیں ہوسکتا، اور گھومنے پھرنے والا تحقیق کے لیے
[illegible] حمزہ فاروقی یہ دونوں کام نہایت عمدگی سے انجام دیتے ہیں۔ وہ تحقیق
[illegible] ایک کمرے میں بند رہتے ہیں۔ باہر کی دنیا سے کوئی تعلق نہیں
[illegible] سودا سر میں سماتا ہے نگری نگری اس طرح پھرتے ہیں کہ گھر کا رستہ
[illegible] رہتے ہیں اور ان کے ہم جیسے نیاز مند بھی۔
[illegible] "سفرنامۂ اقبال" جیسی تحقیقی کتاب لکھی ہے جو اقبال پر کام کرنے
[illegible] ہے۔ ڈاکٹر جاوید اقبال نے اپنی کتاب "زندہ رود" میں جابجا اس کے
[illegible] ایک محقق نے اپنی ایک کتاب میں "سفرنامۂ اقبال" کے صفحوں کے

صفحے بلاحوالہ شامل کر لیے ہیں۔ یہاں تک کہ کتابت کی غلطیاں بھی اصل کے مطابق باقی رہنے دی ہیں۔ حال ہی میں حمزہ فاروقی نے "حیات اقبال کے مخفی گوشے" کے نام سے ایک ضخیم کتاب دو جلدوں میں لکھی ہے جس میں علامہ اقبال کے بارے میں بہت سا ایسا مواد جمع کیا گیا ہے جو عام نگاہوں سے اوجھل ہے۔ یہ کتاب عنقریب شائع ہوگی۔

موصوف اب تک دو درجن سے زیادہ ملکوں کی سیر کر چکے ہیں اور اس کے نتیجے میں تین سفرنامے وجود میں آ چکے ہیں۔ "زمان و مکان اور بھی ہیں" ان کا پہلا سفرنامہ تھا جس میں آٹھ ملکوں کی سیاحت کا تذکرہ تھا۔ پھر انھوں نے اسپین کے سفر کی روداد "آج بھی اس دیس میں" کے نام سے قلم بند کی اور اب ان کا تیسرا سفرنامہ "سفر آشوب" شائع ہوا ہے جس میں اردن، شام، ترکی، جرمنی، انگلستان، آسٹریا، ہنگری، رومانیہ، بلغاریہ، ایران، افغانستان اور فرانس میں گزارے ہوئے شب و روز کا تذکرہ ہے۔

تیسرے سفرنامے کے بارے میں کچھ عرض کرنے سے قبل بہتر ہوگا کہ حمزہ فاروقی کے پہلے سفرنامے کے دیباچے کا ایک اقتباس پیش کر دیا جائے۔ یہ دیباچہ موصوف کے ایک بے تکلف دوست نے لکھا ہے۔ فرماتے ہیں:

> "حمزہ فاروقی کی خواہش ہے کہ میں ان کے سفرنامے پر دیباچہ لکھوں۔ ان کے میرے درمیان جو بے تکلفانہ مراسم ہیں، ان کی بنا پر اگر وہ مجھ سے سفرنامہ لکھنے ہی کی فرمائش کرتے تو بہتر ہوتا، کیونکہ کسی دیباچے کا لکھنا، کتاب کے لکھنے سے زیادہ مشکل کام ہے۔ دیباچہ نگار کو بڑی محنت سے کتاب کی خوبیاں تلاش کرنی پڑتی ہیں اور بعض اوقات موجود نہ ہونے کے باوجود تلاش کر لی جاتی ہیں۔ لیکن خود مصنف کو اپنی تصنیف میں خوبیاں پیدا کرنے کے لیے کسی قسم کی محنت نہیں کرنی پڑتی۔ اس لیے کہ اتفاق حادثات میں نیت یا ارادے کو دخل نہیں ہوتا۔"

"سفر آشوب" پر کالم لکھتے ہوئے ہمیں کوئی دقت پیش نہیں آ رہی۔ کتاب کی خوبیاں بغیر کسی محنت اور تلاش کے ایک نظر میں معلوم ہو گئیں۔ یعنی یہ کہ کتاب اچھی ہے، طباعت صاف ستھری ہے، کاغذ طباعت سے پہلے بے داغ تھا اور اب داغدار ہو کر بھی اچھا لگتا ہے۔ موجد کا بنایا

ہوا سرورق جاذب نظر ہے۔ جلد سازی اتنی مضبوط ہے کہ قاری اگر کسی ذاتی پریشانی کی وجہ سے اسے تیسری منزل سے پھینک دے تو کتاب کی ظاہری حالت پر تو کیا، اس کے مطالب پر بھی کوئی اثر نہیں ہوگا۔

حمزہ فاروقی سفر پر کیوں نکلے اور پھر واپس کیوں آئے؟ اگرچہ کتاب میں ان رازوں سے پردہ نہیں اٹھایا گیا، لیکن ان دونوں مرحلوں کے درمیان انھوں نے اپنی آنکھوں سے جو کچھ دیکھا اس کی روداد پڑھ کر خوشی بھی ہوئی ہے اور افسوس بھی۔ خوشی اس لیے کہ حمزہ کا سفر مجموعی طور پر بہت اچھا رہا۔ دیکھنے کے لیے اچھے اچھے مناظر اور شکم پُری کے لیے عمدہ عمدہ کھانے انھیں افراط سے ملتے رہے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ حمزہ نے کئی جگہ بدذوقی کا ثبوت دے کر اپنے سفر کو ناخوشگوار اور سفرنامے کو غیر دلچسپ بنانے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً بوڈاپسٹ میں ایک ٹیکسی ڈرائیور لڑکی نے ریلوے اسٹیشن سے ہوٹل تک کا دوگنا کرایہ وصول کر لیا تو حمزہ فاروقی کو اس سانحے کا اتنا ملال ہوا کہ وہ جب تک بوڈاپسٹ میں رہے، وہاں کے لوگوں سے بلغاروی حسینہ کے رویے کی شکایت کرتے رہے۔ اس سے بھی تسلی نہ ہوئی تو وطن واپس آ کر سفرنامے میں ٹیکسی ڈرائیور لڑکی کے خلاف دل کی بھڑاس نکالی۔ حیرت ہے کہ اتنی معمولی بات پر حمزہ فاروقی اتنے زیادہ برہم کیوں ہوئے۔ اگر ان کی جگہ مستنصر حسین یا کوئی دوسرا پاکستانی سیاح ہوتا تو اس بلغاروی حسینہ کو نہ صرف دوگنا کرایہ دیتا بلکہ دل و جان بھی اسی کے حوالے کر دیتا۔ بلغاروی حسینہ بھی احساس تشکر کے تحت مسافر کو ہوٹل میں چھوڑنے کی بجائے اپنے گھر لے جاتی اور یوں سفرنامے میں کسی رومانوی ناول کے ۲۵، ۳۰ صفحات شامل ہو جاتے۔ حمزہ فاروقی کو چند ٹکوں کے ضائع جانے کا ملال تو ہے لیکن اس کا کوئی افسوس نہیں کہ ان کا سفرنامہ ایک دلچسپ رومانوی داستان سے محروم ہو گیا۔

اس سفرنامے میں ایسی اور بھی کئی خواتین اور مرد نظر آتے ہیں، جنھوں نے دوکانوں اور ہوٹلوں وغیرہ میں معمولی خدمات کے عوض ٹپ وصول کیے۔ ان سب کی مذمت میں ایک ایک دو دو صفحے ملتے ہیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ حمزہ فاروقی کسی کی تعریف نہیں کرتے۔ کم از کم ایک مثال ایسی ضرور ملتی ہے کہ موصوف نے کسی کی مدح میں پورا ایک پیراگراف لکھا ہو۔ یہ خوش نصیب ایک شامی بس کنڈکٹر تھا۔ اس نے کسی غلط فہمی کی وجہ سے یا بربنائے خلوص حمزہ فاروقی کو نہ صرف بس کا کرایہ معاف کر دیا بلکہ اپنی گرہ سے کافی بھی پلائی۔ حمزہ صاحب نے بس اور کافی کی بھی خاصی

تعریف کی ہے۔

''سفرِ آشوب'' سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جناب مصنف نیکی کر کے دریا میں نہیں ڈالتے بلکہ گرہ میں باندھ لیتے ہیں اور بوقتِ ضرورت اس نیکی سے مزید نیکیوں کی راہ ہموار کرتے ہیں۔ ایک مرتبہ کراچی میں ٹیکسیوں کی ہڑتال تھی۔ چند ترک سیاح ایک جگہ پریشان کھڑے تھے اور چاہتے تھے کہ کوئی کار والا رحم کھا کر انھیں ان کی قیام گاہ تک پہنچا دے۔ حمزہ صاحب سے ان سیاحوں کی بے بسی نہ دیکھی گئی۔ وہ انھیں ان کی قیام گاہ تک لے گئے۔ سیاحوں نے کرایا ادا کرنا چاہا لیکن حمزہ صاحب نے کہا کہ یہ تو میرا فرض تھا، کرایا کس بات کا......؟ سیاحوں نے خوش ہو کر اپنے نام، پتے اور ٹیلیفون لکھوا دیے اور کہا کہ کبھی استنبول آنے کا اتفاق ہو تو ہم سے ضرور ملیے گا۔ یہ رسمی کارروائی تھی لیکن حمزہ صاحب اپنے خلوص کا آلودۂ رسمیات نہیں ہونے دیتے۔ اپنی نیکی کا اثر دیکھنے کے لیے وہ استنبول جا پہنچے۔ ترک سیاحوں کو فون کر کے اپنی آمد کا مژدہ سنایا اور پھر اُن لوگوں نے حمزہ صاحب کی پُر تکلف دعوت کی۔ زیرِ نظر سفرنامے میں ترکوں کی مہمان نوازی پر خاصا زورِ قلم صَرف کیا گیا ہے اور قاری کو یہ باور کرایا گیا ہے کہ نیکی کبھی ضائع نہیں ہوتی۔

حمزہ فاروقی کا تاریخ کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ جب وہ کسی مقام کا تذکرہ کرتے ہیں تو اُس کے ساتھ ساتھ اس کے ماضی کے افسانے بھی چھیڑ دیتے ہیں۔ لیکن ماضی کا یہ تذکرہ قاری کی معلومات میں اضافے کے لیے نہیں، سفرنامے کو دلچسپ بنانے کے لیے ہوتا ہے۔ کہیں یہ احساس نہیں ہوتا کہ مصنف قاری پر اپنے سفر کے بوجھ کے ساتھ تاریخ کا بوجھ بھی لاد رہے ہیں۔ کسی کا قول برحق ہے کہ بُرا سفرنامہ تاریخ اور جغرافیے کا حصہ ہوتا ہے اور اچھا سفرنامہ ادب کا۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو زیرِ نظر سفرنامے میں ادب کا پلّہ بھاری نظر آتا ہے۔ ویسے بھی حمزہ فاروقی کا اندازِ بیان اتنا شگفتہ ہے کہ پڑھنے والا خدا کا شکر ادا کرتا ہے کہ مصنف نے اپنے سفر کی تکالیف کا انتقام قاری سے نہیں لیا۔

مجموعی طور پر یہ سفرنامہ ایک اچھی کاوش ہے۔ اس میں مصنف نے جا بجا مختلف شہروں اور اُن کے تاریخی آثار کے بارے میں معلومات کے انبار لگا دیے ہیں۔ جن لوگوں کو حصولِ علم سے دلچسپی ہو، انھیں یہ کتاب ضرور پڑھنی چاہیے اور جنھیں علم کا شوق فضول نہ ہو وہ بھی بلا خوف و خطر اس کتاب سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ کیونکہ جو علم جناب مصنف کا کچھ نہیں بگاڑ سکا، وہ ان کے قاری کو بھی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔

حمزہ صاحب کا سفر بڑی حد تک خوشگوار تھا، ایسی صورت میں سفرنامے کا نام ''سفرِ آشوب'' ناموزوں نظر آتا ہے۔ انھیں سفرنامے کے مطالب کے اعتبار سے نام تجویز کرنا چاہیے تھا۔ حمزہ صاحب کو چاہیے کہ اگر بفرضِ محال سفرنامے کے دوسرے ایڈیشن کی اشاعت کا امکان ہو تو اس کا نام تبدیل کر دیں۔ نئے نام کے انتخاب میں ہم ان کی مدد کر سکتے ہیں۔

دورانِ سفر حمزہ صاحب ہر جگہ ننانوے کے پھیر میں نظر آتے ہیں۔ مہنگائی کی شکایت بجا، مگر وہ تو جائز اخراجات بھی بادلِ نخواستہ برداشت کرتے ہیں۔ ہر جگہ ان کی خواہش ہوتی ہے کہ بغیر کچھ خرچ کیے ان کے سب کام ہوتے رہیں۔ ان کے مزاج کی اس خصوصیت کا تعلق کفایت شعاری سے ہے۔ کفایت شعاری اعداد و شمار کے بغیر ممکن نہیں اور اعداد و شمار میں صفر کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ لہٰذا ہم حمزہ صاحب کے سفرنامے کا نیا نام ''صفر آشوب'' تجویز کرتے ہیں۔

(۱۶ر جولائی ۱۹۸۷ء)

دو شذرات

افکار، کراچی

(۱)

نشانِ منزل

۲۷ راکتوبر کو ملک بھر میں انقلاب کی پہلی سالگرہ پورے شکوہ کے ساتھ منائی گئی۔ اس جشنِ مسرّت میں حکومت اور عوام برابر کے شریک تھے۔ قومی زندگی میں ایک سال یا بارہ مہینے کا مختصر سا عرصہ بظاہر کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ پاکستان کا اکتوبر انقلاب اس کلیے سے مستثنیٰ ہے...... گزشتہ گیارہ سال میں نو آزاد مملکتِ پاکستان غلط سیاست اور قیادت کے نتیجے میں کس کس طرح نت نئے خطرات سے دوچار ہوئی، کس کس انداز میں ملک میں ابتری اور انتشار پھیلا اور عوام کی روحانی، اخلاقی اور سماجی حالت بد سے بدتر ہوئی۔ اس کی تفصیلات کے اظہار سے کچھ حاصل نہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ حالات کا بدلنا اور اکتوبر ۵۸ء کے انقلاب کا رونما ہونا ناگزیر تھا۔ انقلاب آیا اور اپنے ساتھ امن، تعمیر اور خوش حالی کا دور دورہ لے کر آیا...... ایک سال کی حقیری مدت میں انقلابی حکومت نے کیا کچھ کیا...... سب جانتے ہیں۔ قائدِ اعظمؒ اور قائدِ ملتؒ کے بعد پہلی بار عوام پاکستان میں احساس بیدار ہوا ہے کہ وہ آزاد ہیں۔ آزاد ملک کے شہری ہیں اور آزاد شہری کی حیثیت سے ملک کی تعمیر، ترقی اور خوش حالی میں ان پر بھی حکومت کے دوش بدوش فرائض اور ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ فکر و نظر کی انقلابی تبدیلی ہی دراصل اس انقلاب کی روح ہے۔ احساس، بیداری جب ایثار، جہد و عمل اور فرض شناسی میں تبدیل ہو جاتا ہے تو ملک و قوم کی کایا پلٹ جاتی ہے۔ زندہ قومیں آگے بڑھتے ہوئے گھوم کر ماضی پر بھی نظر ڈال لیتی ہیں تاکہ بیتے ہوئے لمحوں کے گرم و سرد تجربات سے حال و مستقبل کی تعمیر میں مدد لی جا سکے۔ آیئے آج ایک زندہ اور بیدار قوم کی حیثیت سے ہم پھر عہد کریں کہ اپنی اور اپنے ملک کی تعمیر و ترقی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں گے۔ تاکہ جد و جہدِ آزادی اور حصولِ پاکستان کا مقصد پورا ہو سکے اور ۲۷ راکتوبر کا انقلابی دن،

عظیم و شاندار مستقبل کا نقیب بن سکے۔

جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی
روحِ اُمم کی حیات کشمکشِ انقلاب
(اقبال)

(۲)

بنیادی جمہوریتیں اور ادیبوں کے فرائض

انقلابی حکومت جس خلوص، لگن اور دیانت داری سے پاکستان اور پاکستانی عوام کی مسرّت اور خوش حالی کے لیے رات دن کام کر رہی ہے اس کی سچائی سے پاکستان کا بدترین دشمن بھی انکار نہیں کر سکتا۔ ایک سال کے مختصر سے عرصے میں ملک و قوم کی کایا پلٹ گئی ہے۔ زرعی اصلاحات سے لے کر مہاجرین کی آباد کاری تک، اور اقتصادی مسائل سے لے کر سماجی، معاشی اور معاشرتی مسائل تک ہر ہر پہلو پر صدرِ پاکستان اور اُن کے رفقائے کار کی گہری نظر ہے اور ضروری اصلاحات کے سلسلے میں ہر ممکن اقدامات کیے جا رہے ہیں۔

انقلابی حکومت کے ان گنت تعمیری کارناموں میں بنیادی جمہوریتوں کا انتخاب بھی سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ دنیا کی کسی فوجی حکومت نے اقتدار حاصل کرنے کے بعد کبھی اپنے اختیارات آسانی سے عوام کو منتقل نہیں کیے۔ لیکن پاکستان میں فوجی حکومت نے اس کلیہ کی نفی کرتے ہوئے ایک سال کے اندر اندر بنیادی جمہوریتوں کا اعلان کر کے اس حقیقت کو واضح کر دیا ہے کہ وہ نہ صرف جمہوری اقدار پر ایمان رکھتی ہے بلکہ عوام کو ہی طاقت کا سرچشمہ سمجھتی ہے، اور اس کی دانست میں صحیح جمہوری نظام وہی ہے جس میں عوام حکومت کے دوش بدوش حصہ لیں۔

بنیادی جمہوریتوں کے انتخابات اب صرف چند دنوں کی بات ہے۔ ان کے قیام سے شہروں سے زیادہ ملک کے دور دراز علاقے، دیہات اور قصبات مستفید ہوں گے۔ بد دیانت سیاست دانوں کی پیدا کردہ معاشرے کی خرابیاں اور برائیاں دور ہوں گی اور ملک ترقی اور خوشحالی کے راستے پر گامزن ہو جائے گا۔ دراصل بنیادی جمہوریتیں صحیح جمہوری نظام کی ابتدائی سیڑھی

ہیں...... یہ مرحلہ خوش اسلوبی سے سر ہو گیا۔ نیک نیت، وطن پرست، ایثار پسند اور عوام کے صحیح اور سچے نمائندے آپ نے انتخاب کر لیے تو سمجھئے کہ پاکستان میں آپ نے آئینی حکومت کی داغ بیل ڈال دی۔

اس موقع پر ادیبوں، شاعروں، فنکاروں اور دانشوروں پر بھی اہم ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ ملک کی تعمیر و ترقی اور مسرت و خوش حالی میں وہ برابر کے شریک ہیں۔ ادیب اور فن کار ملک و معاشرے سے علیحدہ کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ اچھا ادب عام انسانوں کے لیے حسن، نیکی، سچائی، امن اور مسرت کا پیغامبر بھی ہوتا ہے۔ بنیادی جمہوریتوں کی کامیابی دراصل جمہوری اصولوں کی کامیابی ہوگی۔ اس لیے ادیبوں اور فن کاروں کا فرض ہے کہ وہ اپنی بہترین صلاحیتوں کو کام میں لائیں اور عوام و خواص کو ان کی ذمہ داریاں پُر اثر انداز میں سمجھائیں، تاکہ اس عظیم اور تاریخی انقلاب کے مقاصد پایۂ تکمیل تک پہنچ سکیں۔

شاعری کا انسانی کمپیوٹر

کہا جاتا ہے کہ اگلے چند برسوں میں کمپیوٹر سے شاعری تخلیق کرنے کا کام بھی لیا جا سکے گا۔ اِدھر بٹن دبایا اور اُدھر مطلوبہ چیز برآمد ہوگی۔ شعرائے کرام غیر ضروری محنت سے بچ جائیں گے اور ان کا جو وقت شاعری میں صَرف ہوتا ہے، بہتر اور مفید کاموں میں صَرف ہونے لگے گا۔ مثلاً احمد فراز کو فیض کے رنگ میں غزل کی ضرورت ہوگی تو وہ فیض کے مجموعوں کو سامنے رکھ کر طبع آزمائی کرنے کی زحمت سے بچ جائیں گے۔ فیض کے سارے الفاظ، ترکیبیں، ردیفیں اور قافیے کمپیوٹر میں موجود ہوں گے۔ کمپیوٹر انھیں بالکل نئی ترتیب سے پیش کر دے گا۔ جو غزل برآمد ہوگی وہ فیض کے اصل کام سے کسی طرح کمتر نہیں ہوگی۔

اسی طرح قمر جمیل کو نثری نظمیں لکھنے کے لیے فرس نامۂ سعادت یار خان رنگین سے الفاظ اخذ کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ کمپیوٹر کے خزانے میں گھوڑوں کی اقسام اور ان کی عادات و حرکات سے متعلق متنوع مواد موجود ہوگا۔ قمر جمیل بٹن دباتے جائیں گے اور ضرورت کے مطابق نظمیں حاصل کرتے جائیں گے۔

عبدالعزیز خالد کے لیے کمپیوٹر کے خزانے میں فارسی، عربی اور ہندی کی تمام بڑی بڑی لغات کے الفاظ موجود ہوں گے۔ یہ کم پڑ جائیں گے تو عبرانی اور سنسکرت جیسی پرانی زبانوں کے الفاظ کام میں لائے جائیں گے۔ خالد صاحب دو چار نظموں ہی میں ان تمام الفاظ کو ختم کر دیں گے اس لیے ان پر پابندی لگائی جا سکتی ہے کہ ان کی کوئی نظم ۵ ہزار شعروں سے زیادہ کی نہ ہو۔

لیکن ایک شاعر ایسا ہے جو کمپیوٹر کا محتاج نہیں ہوگا۔ دراصل اس کے سامنے کمپیوٹر کی کوئی حیثیت نہیں۔ کمپیوٹر کے لیے ضروری ہے کہ اسے ایسا مواد مہیا کیا جائے جسے کام میں لایا جا سکے۔ لیکن اس شاعر کے پاس ہر طرح کا فاسد اور غیر فاسد اتنا مواد موجود ہے جو کبھی ختم نہیں ہو سکتا۔ ہماری مراد حضرت رئیس امروہوی سے ہے جو شاعری کا انسانی کمپیوٹر ہیں۔

پرانے شاعروں میں سے مصحفیؔ اور میر سوزؔ کے بارے میں مشہور ہے کہ اتنے زود گو تھے کہ بیک وقت کئی کئی شاگردوں کو مشاعروں کے لیے طرحی غزلیں لکھوا دیتے تھے اور اپنے لیے غزل بھی لکھتے جاتے تھے۔ ان دونوں کا ذریعۂ معاش یہی فن تھا۔ میر سوزؔ زیادہ سمجھدار تھے۔ وہ جو غزلیں شاگردوں کو عطا کرتے تھے، ان کی نقلیں اپنے پاس بھی رکھ لیتے تھے۔ جب وہ نواب مہربان خان رندؔ کے پاس ملازم ہوئے تو ہر روز ایک غزل انھیں لکھ کر دیتے تھے۔ یہی غزل اپنے دیوان میں بھی درج کر لیتے تھے۔ مہربان خان رندؔ کا دیوان مرتب ہوا تو معلوم ہوا کہ اسی دیوان کی ساری غزلیں کلیاتِ میر سوزؔ میں بھی موجود ہیں۔ جناب رئیسؔ امروہوی، مصحفیؔ اور میر سوزؔ دونوں سے بازی لے گئے ہیں۔ انھوں نے جتنا اپنے نام سے لکھا، اس سے کہیں زیادہ دوسروں کے لیے لکھا جو ہمیشہ کے لیے انھی کا ہو گیا۔ ایک روایت کے مطابق رئیس صاحب نے ڈیڑھ درجن سے زیادہ ناموزوں طبع لوگوں کو صاحبِ دیوان بنا دیا۔

یہ منظر تو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ حضرتِ رئیسؔ امروہوی حقہ سامنے رکھے اپنے مکان کے باغیچے میں بیٹھے ہیں۔ چاروں طرف ضرورت مندوں کا ہجوم ہے۔ ایک صاحب کو ان کے بیٹے کا سہرا اور دوسرے کو بیٹی کی رخصتی لکھوائی جا رہی ہے۔ تیسرے صاحب کے والد کی قبر کے لیے قطعۂ تاریخِ وفات نظم کیا جا رہا ہے۔ چوتھے صاحب کے بیٹے کے عقیقے کا منظوم دعوت نامہ تصنیف ہو رہا ہے۔ اسی دوران میں منظر علی خاں منظرؔ اپنی غزلیں لے کر آ گئے تو ان کی (یعنی غزلوں کی) نوک پلک بھی کسی جا رہی ہیں۔ یہ سب کام بیک وقت انجام دینا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔ مگر رئیس صاحب نہایت آسانی سے ناممکن کو ممکن بنا دیتے ہیں۔ حقے کا کش لگایا اور دو شعر سہرے کے لکھوا دیے۔ پھر کش لگایا اور رخصتی کا ایک شعر ارشاد فرما دیا۔ پھر قطعۂ تاریخِ وفات کے دو شعر لکھوائے۔ منظوم دعوت نامے کی تمہید بھی لکھوا دی۔ دو چار قسطوں میں یہ سب کام انجام پا گئے۔ کیا مجال ہے کہ رئیس صاحب ذرا سی بھی غلطی کر جائیں۔ یعنی سہرے میں قطعۂ تاریخِ وفات کا شعر شامل کر دیں یا رخصتی میں عقیقے کا۔ یہ شغل دن بھر رہتا ہے۔ ضرورت مندوں کے جانے کے بعد وہ اپنے لیے لکھتے ہیں۔

اپنے لیے بھی رئیس صاحب نے اتنا کچھ لکھا ہے کہ اُردو کے شاید ہی کسی دوسرے شاعر نے اتنا لکھا ہو۔ ایک درجن سے زیادہ کتابیں ان کی شائع ہو چکی ہیں اور غیر مدوّن کلام اتنا ہے کہ

درجنوں مجموعے تیار ہو سکتے ہیں۔ امریکہ کی لائبریری آف کانگریس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اگر اس کی کتابوں کو دس فٹ کی چوڑائی میں زمین پر پھیلا دیا جائے تو کئی ہزار میل لمبی سڑک تیار ہو سکتی ہے۔ اسی طرح اگر رئیس صاحب کے شعروں کو پھیلایا جائے تو کراچی سے امروہے تک کم از کم پانچ سڑکیں تیار ہو سکتی ہیں۔ ذرا تصور کیجیے، یہ سڑکیں کتنی عمدہ ہوں گی جنھیں بجری کی بجائے شعروں سے بنایا گیا ہوگا۔

رئیس صاحب کا اصل فن غزل گوئی ہے۔ یہ بات بلاخوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ انھوں نے جدید اُردو غزل کو فکر و فن کی جن نئی جہتوں سے آشنا کرایا ہے، وہ انھی کا حصہ ہیں۔ لیکن افسوس کہ ان کے اس کمال پر دوسرے کمالوں نے پردہ ڈال رکھا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ایک اخباری قطعہ نویس کی حیثیت سے تو وہ ہفت اقلیم میں مشہور ہیں، لیکن اُردو غزل کی تنقید و تاریخ پر لکھی گئی ایک دو کتابوں میں ان کا نام نظر نہیں آتا۔ اُردو کے نقادوں کی اس بے خبری پر حیرت بھی ہوتی ہے اور افسوس بھی۔

رئیس صاحب نے حالاتِ حاضرہ پر منظوم تبصرے لکھنے کا آغاز آج سے تقریباً نصف صدی قبل کیا تھا۔ روزنامہ ''جدت'' مراد آباد میں، جس کے وہ مدیرِ اعلیٰ تھے، ہر روز اُن کی ایک نظم شائع ہوتی تھی اور پھر جب ''جنگ'' جاری ہوا تو وہ ہر روز اس میں ایک قطعہ لکھنے لگے۔ یہ اردو صحافت میں بالکل ایک نیا تجربہ تھا جسے بہت پسند کیا گیا۔ ''جنگ'' اور رئیس صاحب کا قطعہ اس حد تک لازم و ملزوم ہو گئے ہیں کہ ''جنگ'' کا تصور خبروں کے بغیر تو کیا جا سکتا ہے، رئیس صاحب کے قطعے کے بغیر نہیں کیا جا سکتا۔ قارئین کی خاصی بڑی تعداد ''جنگ'' کو صرف قطعے کے لیے دیکھتی ہے۔ باقی قارئین اشتہاروں اور خواتین کی رنگین تصویروں کے لیے ''جنگ'' خریدتے ہیں۔

رئیس صاحب کی تقلید میں تقریباً ہر اُردو اخبار نے روزانہ قطعہ شائع کرنے کا اہتمام کیا۔ لیکن رئیس صاحب کے سامنے کسی کا چراغ نہ جل سکا۔ اپنی قطعہ نگاری پر سب سے اچھا تبصرہ خود رئیس صاحب نے کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

''روزانہ قطعہ کہتے وقت یہ احساس بھی نہ ہو سکا کہ کیا کہا جا رہا ہے۔ لیکن اب جو قطعات کی ترتیب و تدوین کے سلسلے میں اپنے نوشتہ ہائے قسمت اور

رشحاتِ قلم پر نظر ڈالی تو اندازہ ہوا کہ چپکے ہی چپکے، دیکھتے ہی دیکھتے کیسا عجیب، غریب کام (شاید کارنامہ) خود بخود انجام پا گیا ہے۔ یعنی میرے قصد، منصوبے اور خواہش کے بغیر عہد جدید اور عہد جدید کے پاکستان کی ایک ایسی منظوم تاریخ وجود میں آ گئی جسے کاغذوں اور کتابوں پر نہیں، ذہنوں اور روحوں پر لکھا گیا تھا۔"

یہی بات انھوں نے ایک قطعے میں بھی بیان کی ہے:

جو تاریخ آثارِ کہن ہے وہ کتاب
بے خطرۂ تنسیخ لکھی ہے میں نے
آئینۂ امروز ہیں میرے قطعات
اس عہد کی تاریخ لکھی ہے میں نے

قطعاتِ رئیس کا ایک مختصر انتخاب کوئی ۳۰ برس پہلے شائع ہوا تھا۔ پھر ۶۹ء میں دو جلدوں میں ۵۸ء تک کے قطعات شائع ہوئے۔ حال ہی میں دو اور جلدیں شائع ہوئی ہیں جن میں [illegible] تک کے قطعات شامل ہیں۔ اخبارات میں شائع شدہ وقتی موضوعات سے تعلق رکھنے والی تحریریں کتابی صورت میں چھپتی ہیں تو ان کی افادیت مشکوک ہوتی ہے۔ آج کے قاری کے لیے ان میں دلچسپی کا کوئی سامان نہیں ہوتا۔ رئیس صاحب کے قطعات اس کلیے سے مستثنیٰ ہیں۔ ان کے [illegible] چالیس چالیس برس پہلے کے قطعات بھی "تازہ" معلوم ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ رئیس صاحب کا ادبی اندازِ بیان اور طنزیہ پیرایہ، موضوع کی وقتی اور ہنگامی حیثیت کو دوام عطا کرتا ہے۔ مثلاً ادبی نوعیت کے دو قطعات ملاحظہ فرمائیے:

آج کل مفقود ہیں اہلِ کمال
کیوں طلب میں دوڑیے کیوں ڈھوپیے
اور جو ہیں مدعیِ فن وہ لوگ
یا گدائی پیشہ یا بہروپیے

وہ جس پہ ہیں اہلِ علم نازاں
خود جہل کا اک مظاہرہ ہے

شاعر ہے طوائف و مغنی
مجرے کا بدل مشاعرہ ہے

پہلا قطعہ ۶۰ء کا ہے اور دوسرا ۶۲ء کا۔ ان قطعات سے ۲۵ برس پہلے کے قاری کی طرح آج کا قاری بھی محظوظ ہو سکتا ہے۔

رئیس صاحب نے متعدد قطعات میں اور ان کے مجموعوں کے دیباچوں میں مارشل لاء کے خلاف [illegible] لکھا ہے۔ اس سے جی خوش ہوا۔ لیکن ایک دوست نے توجہ دلائی ہے کہ جن دنوں رئیس صاحب مارشل لاء کے خلاف قطعات لکھ رہے تھے، انھی دنوں انھوں نے "لالۂ صحرا" کے نام سے ایک مثنوی لکھی تھی جو دسمبر ۵۹ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس مثنوی کا خاتمہ ایوب خان کے "انقلاب" کی تعریف پر ہوتا ہے۔ اختتامی اشعار یہ ہیں:

یہ دیکھا کہ ہیں منقلب صبح و شام
نئی شان سے آ رہا ہے نظام
نظر، انقلابی اشارے لیے
نئے دور کے استعارے لیے
مگر صبرِ ایوب کام آ گیا
نظام اور تازہ نظام آ گیا
نئے ہم نیا دور نعرے نئے
نئے غلغلے اور نعرے نئے
یہ نعرہ کہ پائندہ باد انقلاب
یہی غلغلہ زندہ باد انقلاب

یقین نہیں آتا کہ یہ اشعار رئیس صاحب نے لکھے ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ مثنوی "لالۂ صحرا" کسی اور نے لکھی ہو اور غلطی سے رئیس صاحب کے نام سے چھپ گئی ہو؟

(یکم اکتوبر ۱۹۸۷ء)

نامۂ اعمال کا غیر محرف ایڈیشن

انجمن ترقی اُردو نے بزرگ ادیبوں کے ساتھ شامیں منانے کا ایک مفید سلسلہ شروع کیا ہے۔ اب تک ممتاز مفتی، ابوالفضل صدیقی مرحوم، مرزا ادیب، اشرف صبوحی اور احمد ندیم قاسمی کے ساتھ شامیں منائی جا چکی ہیں۔ حیرت ہے کہ انجمن والوں کی نظر جلیل قدوائی صاحب پر نہیں گئی جو اپنے ادبی کاموں اور عمر کے اعتبار سے بزرگی کی اس منزل پر ہیں کہ ان کے ساتھ ایک شام تو کیا، مسلسل کئی شامیں منائی جائیں تو بھی حق ادا نہ ہوگا۔

اگلے سال مارچ کے مہینے میں قدوائی صاحب اپنی زندگی کے چوراسی برس مکمل کر لیں گے۔ اتنے دنوں تک زندہ رہنا قدوائی صاحب کا کمال نہیں، اللہ تعالیٰ کا احسان ہے۔ قدوائی صاحب کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے ادبی اعتبار سے فعال اور بامقصد زندگی گزاری ہے۔ سولہ سترہ برس کی عمر میں انھوں نے لکھنے لکھانے کا جو سلسلہ شروع کیا تھا، وہ اب تک جاری ہے۔ گزشتہ ساٹھ برسوں میں انھوں نے دو درجن سے زیادہ کتابیں لکھی ہیں اور اگر غیر مدوّن تحریروں کو یک جا کیا جائے تو اتنی ہی کتابیں اور بھی چھپ سکتی ہیں۔ اگر ان کی تصانیف میں ان کے بعض مشہور زمانہ شاگردوں کو بھی شامل کر لیا جائے تو قدوائی صاحب کا تصنیفی و تالیفی کام اور زیادہ وقیع ہو جاتا ہے۔ جن دنوں وہ علی گڑھ یونیورسٹی میں استاد تھے، شان الحق حقی، سعادت حسن منٹو، اسرار الحق مجاز، علی سردار جعفری اور ڈاکٹر ابواللیث صدیقی ان کے شاگردوں میں شامل تھے۔ ذرا اندازہ کیجیے، جس کے شاگرد ایسے قد آور ہوں گے، وہ خود کس بلندی پر فائز ہوگا۔

یوں تو قدوائی صاحب نقاد، محقق، مترجم، افسانہ نگار اور نہ جانے کیا کیا کچھ ہیں، لیکن ہمیں ان کی شاعری بے حد پسند ہے۔ اس بات سے ہم بے حد متاثر ہیں کہ جیسی عاشقانہ یا بقول حسرت موہانی، فاسقانہ شاعری وہ پچاس ساٹھ سال پہلے کرتے تھے، آج بھی کرتے ہیں۔ مثلاً بہت دنوں پہلے کا اُن کا ایک شعر ہے۔

شوق کی میرے رعایت تھی جو منظور اُس کو
خود کو اس شوخ نے اک گلدستہ بنا رکھا تھا

اور تازہ ترین غزل کا ایک شعر بھی سن لیجیے۔

جب سے نہیں آغوش میں وہ جانِ تمنا
اک سِل ہے کہ ہر وقت کلیجے پہ دھری ہے

ہم نے حسرت موہانی کا جو نام لیا ہے، وہ بلا وجہ نہیں۔ قدوائی صاحب نے حسرت کے رنگ میں کامیاب شاعری کی ہے۔ ایک زمانے میں کلامِ جلیل پر کلامِ حسرت کا دھوکا ہوتا تھا اور اس کی داد علامہ نیاز فتح پوری نے بھی دی تھی۔ قدوائی صاحب کی پرانی اور نئی شاعری میں ہجر و وصال کی جو کیفیات نظر آتی ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ایک بھرپور زندگی گزاری ہے۔ لیکن اس شعر سے ایک دوسری صورتِ حال سامنے آتی ہے:

اک زندگی عمل کے لیے بھی نصیب ہو
یہ زندگی تو نیک ارادوں میں کٹ گئی

غیب کا حال تو خدا ہی جانتا ہے، ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ شعر بہت اچھا ہے۔

قدوائی صاحب کی تازہ ترین تصنیف ان کی آپ بیتی ہے جو ’’حیاتِ مستعار‘‘ کے نام سے شائع ہوئی ہے اور آج کے کالم کا یہی موضوع ہے۔ یہ مکمل آپ بیتی نہیں، ابتدائی اٹھارہ برسوں کی داستان ہے۔

آپ بیتی لکھنا بہت مشکل کام ہے۔ اس لیے نہیں کہ سچ بولنا پڑتا ہے، بلکہ اس لیے کہ [illegible] ’’دگر‘‘ کو سچ کے نام سے پیش کرنے کے لیے بڑی محنت کرنی پڑتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر آپ بیتیاں لکھنے والوں کے نامہ ہائے اعمال کا محرف ایڈیشن بن جاتی ہیں۔ عام کتابوں میں کاتب تحریف کرتے ہیں جس کی شکایت امیر لکھنوی نے اس طرح کی تھی:

لکھ رہے ہیں کچھ کے کچھ اشعار میرے اے امیر
کاتبوں نے میرے دیواں میں بہت تحریف کی

لیکن آپ بیتیاں لکھنے والے کاتبوں کے لیے تحریف کی گنجائش نہیں چھوڑتے۔ وجہ ظاہر ہے، ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ جس طرح وہ اپنے آپ کو خوبصورت نظر آتا ہے، ویسا ہی دوسروں کو بھی

نظر آئے، اور یوں خوبصورتی کے چکر میں اچھے اچھے اپنی صورت بگاڑ لیتے ہیں۔

قدوائی صاحب کی آپ بیتی میں اس قسم کی کوئی بات نظر نہیں آتی، بلکہ اس کے برعکس یہ احساس ہوتا ہے کہ انھوں نے کچھ ضرورت سے زیادہ ہی سچ بولنے کا اہتمام کیا ہے۔ سچ بھی ایسا کہ وہ لکھتے جا رہے ہیں اور پڑھنے والا شرماتا جا رہا ہے۔ قدوائی صاحب نے اس کتاب میں ایک جگہ لکھا ہے کہ اسکول کی طالب علمی کے زمانے میں انھیں فحش کتابیں پڑھنے کا چسکا پڑ گیا تھا۔ لیکن بعض ناگفتنی قسم کے نقصانات اٹھانے کے بعد انھوں نے اس شوق کو ترک کر دیا اور پھر زندگی بھر ''یادوں کی برات'' کے سوا کوئی فحش کتاب نہ پڑھی۔ ہاں جب وہ محکمۂ اطلاعات میں افسر تھے تو فحش...... کو مجبوراً یعنی فرضِ منصبی کے طور پر پڑھا کرتے تھے تاکہ انھیں ضبط کیا جا سکے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اگر ''حیاتِ مستعار'' قدوائی صاحب کی ملازمت کے زمانے میں چھپتی اور فرضِ منصبی کی ادائی کے دوران ان کی نظر سے گزرتی تو وہ یقیناً اس کتاب کو قابلِ ضبطی ٹھہراتے۔ ہماری رائے میں یہ محض مبالغہ آرائی ہے۔ ''حیاتِ مستعار'' میں دو چار جگہ فحاشی آ گئی ہے، ورنہ پوری کتاب کا فحاشی سے کوئی تعلق نہیں۔

استاد لاغر مراد آبادی فرماتے ہیں کہ قدوائی صاحب کو چاہیے تھا کہ دیباچے میں یہ بتا دیتے کہ کتاب کے فلاں فلاں صفحے پر فحاشی ہے، اس لیے نفیس طبع لوگ ان صفحوں کو نہ پڑھیں۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ احتیاط کسی طرح مناسب نہ تھی۔ اگر دیباچے میں فحش صفحات کی نشاندہی کر دی جاتی تو نفیس طبع لوگ صرف انھیں صفحات کو پڑھ کر کتاب ہاتھ سے رکھ دیتے۔ اب یہ ہوگا کہ قاری کتاب کو آخر تک کسی نہ کسی توقع پر پڑھ ہی لے گا۔

خیر یہ تو مذاق کی باتیں تھیں ...... ''حیاتِ مستعار'' ایسی کتاب نہیں ہے کہ اسے مذاق میں ٹال دیا جائے۔ یہ ایک نہایت اہم معاشرتی و تہذیبی دستاویز ہے۔ قدوائی صاحب نے اٹھارہ سال کی عمر تک کے اپنے واقعات بیان کرتے ہوئے اپنے عہد کی تہذیب و معاشرت کی جو تصویریں پیش کی ہیں، ان سے آج کے قاری کو بہت سی نئی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ قدوائی صاحب کے واقعاتِ زندگی سے زیادہ ان کے مشاہدات اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کی ابتدائی زندگی ویسے ہی گزری جیسے آج سے ۷۰، ۸۰ برس پہلے یوپی کے متوسط مسلم گھرانوں کے لڑکوں کی گزرتی تھی۔ لیکن ان کے مشاہدات میں جو تنوع پایا جاتا ہے، اس کی وجہ سے کتاب کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ انھوں نے گھر

کے اندر کی اور گھر سے باہر کی زندگی کو ایک ماہرِ فن کار کی طرح بیان کیا ہے۔ محرم کی مجلسیں ہوں یا سوز خوانی کی محفلیں، اونٹ یا بیل گاڑی کا سفر ہو یا میلے اور تہوار، ان سب کا بیان اس قدر مفصل ہے کہ پون صدی پہلے کی زندگی متحرک تصویروں کی صورت میں پڑھنے والے کی آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہے۔

اس کتاب میں بے شمار افراد کا ذکر ہے اور تقریباً ہر فرد کے حوالے سے اس دور کے معاشرے کے کسی نہ کسی پہلو کی تفصیلات سامنے آ جاتی ہیں۔ بعض مشہور لوگوں کا ذکر بھی ملتا ہے جیسے مولوی نورالحسن نیر (مؤلف نوراللغات)، عرش ملیح آبادی، جگت موہن رواں اناوی۔ ان سب کے بارے میں قدوائی صاحب نے بہت سی نئی باتیں بتائی ہیں۔ جن لوگوں کو اپنی قدیم تہذیب اور معاشرت سے دلچسپی ہو، انھیں یہ کتاب ضرور پڑھنی چاہیے۔ بلکہ قدوائی صاحب کے ساتھ اونٹ گاڑی کا سفر بھی کرنا چاہیے، جس کی تفصیل ان الفاظ میں پیش کی گئی ہے:

''اس سواری میں دو منزلیں ہوتیں، جیسی آج کل ڈبل ڈیکر بسوں میں ہوتی ہیں۔ کہا جاتا تھا کہ اونٹ گاڑی میں لوگوں کو بیٹھ یا لیٹ کر سوتے ہوئے سفر کرنے کی آسانی تھی مگر ہر گاڑی میں بیس پچیس مسافر کس طرح لیٹ اور سو سکتے ہیں، اس کا اندازہ کرنا مشکل نہیں ہے۔ اوپر کی منزل پر چٹائی اور بانس کے ایک بڑے سے خول کی شکل میں ایک گول چھت ہوتی اور لکڑی کے تختوں کو جوڑ کر جو سطح یا زمین بنائی جاتی اسی پر بیٹھ یا لیٹ کر سو سکتے تھے۔ پوری گاڑی کے چاروں طرف کپڑے لگے ہوتے۔ مگر مسافروں کی کثرت اور بہ حیثیت مجموعی گاڑی کے انجر پنجر ڈھیلے ہونے کے سبب راستے بھر اتنے ہچکولے اور دھکے لگتے کہ بس خدا ہی یاد آ جاتا اور اونگھتے ہوئے مسافروں کے ایک دوسرے سے ٹکراتے رہنے کے سوا سونے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ مزا یہ کہ آگے گاڑی بان کی جگہ پر اونٹ کے کھانے کے لیے نیم کی پتیوں کا ایک انبار ہوتا جو اندر مسافروں کے سونے اور بیٹھنے کی جگہوں تک پھیل جاتا۔ گاڑی اتنا شور مچاتی اور کھڑ کھڑ پھٹ پھٹ کرتی اس طرح چلتی کہ قلب و دماغ کا سکون غائب ہو جاتا ...... اگر گاڑی کی کھڑ کھڑاہٹ کے تسلسل میں کسی کی آنکھ جھپک جاتی تو گاڑی کے یکا یک رُک

جانے سے آنکھ کھل بھی جاتی اور معلوم ہوتا جیسے دماغ پر ہتھوڑا اچل رہا ہے۔ ہوش و حواس بحال ہونے پر پتا چلتا کہ سارے راستے اونٹ صاحب کو نیم کی پتیوں کی خوشبو نے بے قرار رکھا اور وہ چلتے چلتے رُک گئے ہیں اور اپنے راشن سے مستفید ہو رہے ہیں یا گاڑی کو سڑک کے ایک کنارے سرکا لے گئے ہیں جہاں کسی نیم کے درخت کی ٹہنی سے الجھے ہوئے ہیں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ تمام رات کے سفر کے بعد صبح کے وقت آپ کو معلوم ہوتا کہ ؏

پھر آ گئے وہیں پہ چلے تھے جہاں سے ہم

اس لیے کہ دورانِ سفر اونٹ صاحب نے الٹا گھوم کر اپنا راستہ بدل دیا اور گاڑی بان کی بے خبری میں سفرِ معکوس اختیار کر لیا تھا۔"

(۱۵ اکتوبر ۱۹۸۷ء)

ملفوظاتِ جمیلہ ہاشمی

محترمہ جمیلہ ہاشمی نے بتایا ہے کہ اس مرتبہ ان کا ناول "دشتِ سوس" اور ممتاز مفتی کا سفرنامہ "لبیک" دونوں انعامی مقابلے میں شامل تھے۔ انعام "لبیک" کو مل گیا۔ محترمہ فرماتی ہیں، "میں اس کا مطلب کیا لوں؟" مطلب یہ ہے کہ مفتی صاحب کو انعام ازراہِ ترحم ملا ہے۔ محترمہ کی خدمت میں عرض ہے کہ انعام دینے والے انعام ہی دے سکتے ہیں جرمانہ تو نہیں کر سکتے۔

جرمانے کے ذکر پر ہمیں استاد لاغر مراد آبادی کا ایک قول برحق یاد آ گیا۔ فرماتے ہیں: "یہ دن بھی ہمیں دیکھنا تھا کہ جن کتابوں پر جرمانہ ہونا چاہیے انھیں اب انعامات ملتے ہیں۔"

یہ عجب اتفاق ہے کہ جمیلہ ہاشمی اور ممتاز مفتی انعام کے لیے کتابیں ایک ساتھ داخل کرتے ہیں اور انعام انھیں دونوں میں سے کسی ایک کو مل جاتا ہے۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ یہ دونوں ایک ساتھ کتابیں داخل نہ کیا کریں تا کہ انعام کسی تیسرے مستحق کو مل جائے۔

ہماری اس بات سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ جمیلہ ہاشمی انعام حاصل کرنے کی شوقین ہیں۔ وہ ان باتوں سے بے نیاز ہیں۔ انھوں نے خود پانچ ہزار روپے کا ادبی انعام اپنے مرحوم شوہر کی یاد میں قائم کر رکھا ہے، جو ہر سال کسی نئے افسانہ نگار کے افسانوی مجموعے پر دیا جاتا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ محترمہ نے انعام کے لیے افسانہ نگار کے نئے ہونے کی قید اس لیے لگائی ہے کہ کہیں یہ انعام مفتی کو نہ مل جائے، اگرچہ یہ بات غلط ہے لیکن کوئی کسی کی زبان بند نہیں کر سکتا۔ بہرحال بوڑھوں کے دروازے بند کیے جا سکتے ہیں۔ لہٰذا ہماری تجویز ہے کہ محترمہ جمیلہ ہاشمی ایک ادبی انعام بوڑھے ادیبوں کے لیے بھی قائم کر دیں جو اسی سال سے زائد عمر کے ہیں اور باقاعدگی سے لکھ رہے ہیں۔ اس طرح یہ انعام ہر سال ممتاز مفتی کو مل جایا کرے گا۔ لیکن ہمیں امید نہیں ہے کہ محترمہ ہماری اس تجویز پر عمل کریں گی۔ وہ عالی صاحب جیسے لوگوں میں کیسے شامل ہو سکتی ہیں جو بقول محترمہ کے بڑھاپے کی وجہ سے ان کے چونچلے اٹھا رہے ہیں۔

محترمہ نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ "میں نے ممتاز مفتی سے زیادہ اور بہتر لکھا ہے۔" بہتر والے معاملے میں تو ہم کوئی رائے نہیں دے سکتے کیونکہ ہم میں اچھے برے کی تمیز نہیں ہے۔ لیکن زیادہ والی بات محلِ نظر ہے۔ ممتاز مفتی کا صرف ایک ناول "علی پور کا ایلی" اتنا ضخیم ہے کہ محترمہ کی تمام تصانیف کی مجموعی ضخامت بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ محترمہ کو شاید یاد نہیں رہا کہ جب یہ ناول طبع ہو رہا تھا تو کاغذ اور قاری دونوں نایاب ہو گئے تھے۔ کاغذ اس لیے کہ اسے اس کیم شحیم ناول کا بوجھ اٹھانا تھا، قاری اس لیے کہ اسے اپنی جان عزیز تھی۔

محترمہ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ میں چیلنج کرتی ہوں کہ کوئی "وشت سوس" کی دس سطریں بھی لکھ کر دکھا دے۔ ہم اس پر اس قدر اضافہ کریں گے کہ دس سطریں لکھنا تو بڑی بات ہے، ان دس سطروں میں جو کامے اور فل اسٹاپ درج ہوئے ہیں، کوئی انھیں کو ویسی ہی معنویت کے ساتھ استعمال کر کے دکھا دے تو ہم اسے صدارتی تمغائے حسن کارکردگی کا مستحق سمجھیں گے کہ اب یہ تمغا اسی قسم کے کارناموں پر ملتا ہے۔ مصنف جو کچھ لفظوں میں بیان کرتا ہے، اس سے کہیں زیادہ کاموں اور فل اسٹاپوں کے ذریعے معرضِ اظہار میں آتا ہے۔ بالکل ویسے ہی جیسے اسٹیج یا ٹی وی ڈرامے میں مکالمے سے زیادہ چہرے کے تاثرات اہمیت رکھتے ہیں۔

"اخبارِ خواتین" والے انٹرویو میں اور بھی بہت سے دلچسپ لیکن فکر انگیز اُمور زیرِ بحث آئے ہیں۔ جمیلہ ہاشمی انگریزی میں ایم اے ہیں، اس لیے فرماتی ہیں کہ جو انگریزی میں ایم اے نہیں وہ اچھا ادیب بھی نہیں ہو سکتا۔ محترمہ کی اس بات کو اگر مان لیا جائے (اور نہ ماننے کی کوئی وجہ بھی نہیں) تو پھر غالب، اقبال اور پریم چند جیسے اکابر کے بارے میں تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ ادب تخلیق نہیں کرتے تھے، گھاس کاٹتے تھے۔ اور غلطی سے گھاس منڈی جانے کی بجائے دنیائے ادب کی طرف آ نکلے۔

اگر ادیب ہونے کے لیے انگریزی کا ایم اے ہونا لازمی قرار دیا گیا تو پھر ادبی دنیا میں جمیلہ ہاشمی اکیلی رہ جائیں گی۔ ہمیں تو دور و نزدیک اُردو کا کوئی قد آور ادیب ایسا نظر نہیں آتا جو انگریزی میں ایم اے ہو، اور اگر ہو بھی تو اس نے فرسٹ ڈویژن حاصل کی ہو۔ ہم محترمہ سے گزارش کریں گے کہ اتنی سخت گیری اچھی نہیں کیونکہ ادب کو نصابِ تعلیم کے طور پر پڑھنے سے آدمی نقاد تو بن سکتا ہے تخلیقی ادیب نہیں۔

انٹرویو لینے والی خاتون نے جمیلہ ہاشمی سے پوچھا کہ انھیں اُردو کی کون سی کتاب سب سے زیادہ پسند ہے؟ اس کے جواب میں انھوں نے "چہرہ بہ چہرہ رو بہ رو" کا نام لیا۔ دوسرے نمبر پر ان کی پسندیدہ کتاب "آگ کا دریا" ہے۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ پہلی کتاب محترمہ کی اپنی تصنیف ہے اور دوسری قرۃ العین حیدر کی۔ یہ بات محترمہ کی انصاف پسندی کی دلیل ہے ورنہ ان کی دوسری پسندیدہ کتاب "وشت سوس" ہو سکتی تھی۔

قرۃ العین حیدر کے بارے میں وہ فرماتی ہیں، "وہ میری پسندیدہ رائٹر ہے۔ اب تو میری دوست بھی ہے مگر شروع میں میں ان کے افسانوں پر جان دیتی تھی۔ لفظ "مگر" کا استعمال جس فن کاران مہارت کے ساتھ کیا گیا ہے، اس کا جواب نہیں۔ اُردو کے تمام ادیب مل کر بھی اس "مگر" کو اس سے بہتر طور پر استعمال نہیں کر سکتے۔ اپنی دوست قرۃ العین کا ذکر انھوں نے ایک اور سلسلے میں بھی کیا ہے۔ فرماتی ہیں، "میری ہر کتاب کا رنگ مختلف ہے۔ جہاں کی کہانی ہے، وہیں کی زبان ہے۔ میں سمجھتی ہوں یہ بات قرۃ العین حیدر سمیت کسی بھی لکھنے والے کے یہاں نہیں ملے گی۔"

اور اب آخر میں انٹرویو کے دو اقتباسات بلا تبصرہ۔

تاریخی کرداروں پر ناول لکھنے کے سلسلے میں سوال کیا گیا، آپ نے متعلقہ کرداروں سے متعلق مقامات کو دیکھا ہے یا نہیں۔ جمیلہ ہاشمی کا جواب:

"کیا لوگ چاند تاروں پر گئے ہیں۔ آخر ان کے بارے میں بھی تو لوگ لکھتے ہیں۔ لکھنے کے لیے کیا وہاں جانا ضروری ہوتا ہے؟ لوگ دنیا کی سیر کر کے آ جاتے ہیں کیا لکھتے ہیں؟ بنگال میں لوگوں کے جھک ماری۔ کیا لکھا؟ میں نے ان کتابوں کو لکھتے ہوئے ان ممالک کے نقشے دیکھے۔ بغداد کا نقشہ میرے پاس تھا۔ اس کے شہروں، پہاڑوں اور دریاؤں کا بغور مشاہدہ کیا۔ ایران کا نقشہ چھ ماہ تک میرے کمرے میں لٹکتا رہا۔"

جمیلہ ہاشمی کی بعض تحریروں میں سکھوں کی معاشرت کی خوبصورت تصویریں ملتی ہیں۔ اس سلسلے میں وہ فرماتی ہیں:

"ہم امرتسر کے رہنے والے ہیں۔ سکھوں اور ہندوؤں کے ساتھ ہمارے گھریلو مراسم تھے۔ انسان جس ماحول میں آنکھ کھولتا ہے وہیں سے سیکھتا

ہے۔ ''لال آندھی'' سمیت میری کچھ کہانیوں خصوصاً ''آتشِ رفتہ'' پڑھ کر بہت سے لوگوں نے میرے بارے میں یہ رائے قائم کر لی کہ شاید میں بھی سکھ ہوں۔ ایک تقریب میں میں نے مزا لینے کی خاطر مستنصر حسین تارڑ کی بیوی سے کہا کہ میں خود سکھ ہوں مگر تم کسی کو بتانا نہیں۔''

(۱۹ نومبر ۱۹۸۷ء)

ملا دو پیازہ

سیلاب، زلزلے، قحط اور پلیگ وغیرہ نے جس طرح دنیا کے مختلف خطوں میں انسانی آبادی کو نقصان پہنچایا ہے، اسی طرح دنیائے ادب میں بھی آفاتِ ارضی وسماوی نے قیامتیں برپا کی ہیں۔ خدانخواستہ ہمارا اشارہ رائٹرز گلڈ یا انجمن ترقی پسند مصنفین کی طرف نہیں ہے، کیونکہ یہ ادارے تو خود ہی آفاتِ ارضی وسماوی کا شکار ہو کر گلدستۂ طاقِ نسیان بن چکے ہیں۔ ہماری مراد اُن اصناف ادب سے ہے، جن کے ذریعے ادب کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ پرانے زمانے میں ریختی تھی اور آجکل نثری نظم اور سفرنامہ ہیں۔ اس فہرست میں ہم انشائیے کو بھی شامل کر سکتے ہیں، لیکن اس صنف پر مشکور حسین یاد، ڈاکٹر انور سدید اور ڈاکٹر سلیم اختر کی ضخیم کتابوں کی اشاعت کے بعد کچھ اچھا نہیں لگتا کہ ہم اس انشائیے کو موضوعِ بحث بنائیں۔ یہ تینوں بزرگ اپنی تصانیف کے ذریعے صنف کو اتنا نقصان پہنچا چکے ہیں کہ اس پر اضافے کی گنجائش نہیں ہے۔

ہمارے خیال میں ادب کو سب سے زیادہ نقصان سفرناموں نے پہنچایا ہے۔ ہر وہ شخص جو ناول نہیں لکھ سکتا، سفرنامہ ضرور لکھتا ہے، اس لیے سفرنامہ لکھنے کے لیے اتنی لیاقت بھی درکار نہیں ہوتی جتنی نثری نظم لکھنے کے لیے ضروری ہے۔ گزشتہ پندرہ بیس برسوں میں جو سفرنامے لکھے گئے ان، دو چار کو چھوڑ کر باقی سب ایسے ہیں کہ انھیں پڑھ کر دنیا سے سفر کر جانے کو جی چاہتا ہے، لیکن چونکہ ہم نے اس لیے اختیار نہیں کیا کہ اس کا سفرنامہ نہیں لکھا جا سکتا۔

ایک زمانہ تھا کہ لوگ دور دراز مقامات کے سفرنامے لکھتے تھے، لیکن اب یہ حال ہے کہ بعض لوگ اپنے مکان کے ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں جاتے ہیں تو واپسی پر سفرنامہ ان کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ پچھلے ہفتے چند دنوں کے لیے ہم لاہور گئے تھے۔ وہاں جس سے بھی ملاقات ہوئی، اس نے سمجھا کہ ہم سفرنامہ لکھنے کے لیے آئے ہیں۔ بعض دوستوں نے تو اپنی تصویریں بھی عنایت کر دیں کہ اگر سفرنامہ باتصویر ہو تو ان تصویروں کو کام میں لایا جائے۔ یہ ساری

تصویریں ہم نے حسن رضوی کے حوالے کر دیں، تا کہ ان سے "جنگ" اخبار کے ادبی صفحے کی خالی جگہوں کو پُر کرنے کا کام لیا جائے۔

لاہور میں چند روزہ قیام کے دوران، جہاں بہت سے لوگوں سے مل کر خوشی ہوئی، وہاں عطاء الحق قاسمی سے ملاقات نہ ہونے کا افسوس ہے۔ جس روز ہم لاہور پہنچے، اسی روز وہ امریکہ روانہ ہو رہے تھے۔ فون پر مختصر گفتگو ہوئی۔ معلوم ہوا کہ انھیں تیس دن کے لیے امریکہ دیکھنے کی دعوت ملی ہے۔ فرمایا، "اس دعوت سے میں فائدہ اٹھا رہا ہوں۔" ہم نے عرض کیا، "اگر یہ دعوت نہ ملتی، تو بھی آپ فائدہ اٹھا لیتے، لیکن آپ کے امریکہ جانے کا اصل فائدہ تو امریکیوں کو ہوگا کہ وہ آپ کو دیکھ لیں گے۔" اس قسم کے دو چار جملوں کا تبادلہ ہوا اور ہم نے انھیں خوشی اور غم کے ملے جلے جذبات کے ساتھ رخصت کیا۔

خوشی اور غم کے حوالے سے ہمیں ایک لطیفہ یاد آ گیا ہے۔ اس کا اگرچہ عطاء الحق قاسمی سے کوئی تعلق نہیں لیکن اس سے پہلے کہ ہم دوبارہ اس لطیفے کو بھول جائیں، اسے صفحۂ قرطاس پر محفوظ کر دینا مناسب ہوگا۔ کراچی یونیورسٹی کے ایک سابق صدر، شعبۂ اُردو کو امریکہ کی کسی یونیورسٹی میں ایک سال کے لیے عارضی ملازمت ملی، تو ان کے طالب علموں نے انھیں الوداعی دعوت دی۔ اس دعوت میں تقریر کرتے ہوئے ایک شاگرد رشید نے کہا، "استادِ محترم کے امریکہ جانے کی ہمیں خوشی بھی ہے اور غم بھی۔ خوشی اس بات کی ہے کہ وہ امریکہ میں اُردو کی ترویج کا فریضہ انجام دیں گے اور غم اس بات کا کہ ایک سال بعد وہ واپس آ جائیں گے۔"

جن لوگوں سے لاہور میں ہماری ملاقات ہوئی ان میں سرفہرست ڈاکٹر تحسین فراقی ہیں۔ ہمارا زیادہ وقت انھی کے ساتھ گزرا۔ وہ بڑے باغ و بہار آدمی ہیں۔ زیادہ وقت پڑھنے لکھنے اور ہنسنے میں گزارتے ہیں۔ موجودہ صدی کے نصفِ آخر کے شروع میں پیدا ہوئے تھے، لیکن علم و فضل کی وجہ سے ایسا لگتا ہے، جیسے گزشتہ صدی کے نصفِ اوّل میں دنیا میں تشریف لائے ہوں۔ کسی ادبی گروہ میں شامل نہیں ہیں، اس لیے ڈاکٹر انور سدید کی موجودگی میں دبستانِ سرگودھا کی تعریف سن لیتے ہیں اور ڈاکٹر سلیم اختر کی موجودگی میں دبستانِ فنون کی، اور وہ بھی تائید میں بلا ہلا کر۔ ان دونوں کی عدم موجودگی میں ایک مرتبہ فرمایا، "افسوس کیسے کیسے پڑھے لکھے لوگ ادبی گروہ بندی کی وجہ سے ضائع ہو رہے ہیں۔" ہم نے عرض کیا، "اور ان کے ضائع ہونے میں جو کسر رہ گئی تھی، وہ

آپ پوری کر رہے ہیں۔"

لاہور میں آج کل مذکورہ دونوں دبستانوں کی جنگ زوروں پر ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا اور ڈاکٹر انور سدید کے خلاف ایک رسالہ شائع کیا گیا ہے، جو "سرمۂ مفتِ نظر" کی طرح تقسیم ہو رہا ہے۔ یہ رسالہ ہم نے ڈاکٹر سلیم اختر کے گھر پر دیکھا، بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ انھوں نے فخر و مسرت کے ساتھ دکھایا۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ بتایا کہ اس قسم کا ایک پمفلٹ، خود اُن کے خلاف بھی شائع ہو چکا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ ڈاکٹر صاحب سے زیادہ تر گفتگو دبستانوں ہی کے بارے میں ہوتی رہی۔ ایک موقع پر ڈاکٹر صاحب نے ہمیں مخاطب کر کے فرمایا، "ہمیں معلوم ہے کہ آپ ۷۵ فی صد ہمارے دشمنوں کے ساتھ ہیں اور ۲۵ فیصد ہمارے ساتھ۔ اس کے باوجود آپ سے محبت کا رشتہ ہے۔" اس کے جواب میں ہم نے عرض کیا، "انشاء اللہ یہ رشتہ، اس وقت بھی باقی رہے گا، جب خدانخواستہ آپ کے حصے کا ۲۵ فیصد بھی دشمنوں کے کھاتے میں چلا جائے گا۔"

ہم نے ڈاکٹر سلیم اختر سے پوچھا، آخر اس جنگ کا انجام کیا ہوگا۔ محقق بے مثال محمد اکرام چغتائی بھی شریکِ محفل تھے، کہنے لگے، صاحبو! آپ نے مصحفی کا تذکرہ ہندی تو پڑھا ہوگا۔ اس میں مصحفی نے مہلت اور محشر تخلص کے دو لکھنوی شاعروں کا حال لکھا ہے اور بتایا ہے کہ ان دونوں میں بڑا اختلاف ہو گیا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ ایک روز دونوں دریائے گومتی کے کنارے پہنچے اور تیغ آزمائی میں مصروف ہوئے۔ مہلت مارا گیا۔ مہلت کے وارثوں نے محشر کو قتل کر دیا اور یوں جھگڑا خوش اُسلوبی سے ختم ہوا۔" ہم نے چغتائی صاحب سے عرض کیا کہ محقق ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ آپ خوفناک واقعات سنا کر لوگوں کو پریشان کریں۔ خدا نہ کرے کہ ہمارے ممدوح قلم چھوڑ کر تلوار ہاتھ میں لیں۔

اکرام چغتائی بلاشبہ بے مثال محقق ہیں۔ انھوں نے اس کم عمری میں ایسے ایسے تحقیقی کارنامے انجام دیے ہیں کہ انھیں دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ ایسے ایسے نوادر ڈھونڈ نکالے ہیں کہ ان سے اُردو زبان و ادب کے بارے میں بہت سی نئی باتیں سامنے آتی ہیں۔ جتنا کام ان کا چھپ چکا ہے، اس سے کہیں زیادہ غیر مطبوعہ ہے۔ گزشتہ تین برسوں سے وہ واجد علی شاہ کے نام، ان کی بیویوں کے خطوط مرتب کر رہے ہیں۔

انھیں خطوں کے کئی غیر مطبوعہ مجموعے ملے ہیں۔ ان میں سے ایک "تاریخ مشغلہ" شائع

ہو چکا ہے۔ اکرام چغتائی نے جب ان خطوط پر، اپنی تحقیق کا حال سنایا، تو ہم نے عرض کیا، ''آپ نے واجد علی شاہ کی بیویوں پر کچھ زیادہ ہی تحقیق کر ڈالی۔ اتنی تحقیق تو ان پر خود واجد علی شاہ نے بھی نہیں کی تھی۔''

لاہور میں ایک اور محقق سے ملاقات ہوئی۔ ان کا نام صابر کلوروی ہے۔ نوجوان آدمی ہیں، لیکن غریق تحقیق۔ علامہ اقبالؒ سے انھیں خصوصی لگاؤ ہے۔ علامہ کے بے شمار غیر مدوّن خطوط تلاش کیے ہیں۔ دو سو کے قریب غیر مدوّن نظمیں بھی جمع کی ہیں۔ علامہ کسی زمانے میں فرضی ناموں سے، سیاسی موضوعات پر نظمیں لکھا کرتے تھے۔ صابر کلوروی نے ایسی ایک درجن نظمیں پرانے اخباروں سے ڈھونڈ نکالی ہیں۔ صابر صاحب کے پاس علامہ کی دو نادر بیاضیں ہیں، جو ہر وقت ان کے ساتھ رہتی ہیں۔ وہ جو بات بھی کرتے ہیں، انھی دونوں بیاضوں کے حوالے سے کرتے ہیں۔ اس بناء پر تحسین فراقی نے انھیں ''ملّا دو بیاضا'' کا خوبصورت نام دیا ہے۔

شاعرِ اعظم جناب عبدالعزیز خالد سے بھی ایک محفل میں ملاقات ہوئی اور ان کا کلام ان کی زبان سے پہلی بار سننے کا اتفاق ہوا۔ آج کل وہ نہایت عمدہ غزلیں کہہ رہے ہیں۔ شعر و شاعری کے شغل سے پہلے، کھانے کی میز پر اُن سے بات چیت رہی، سب کھانا کھا رہے تھے، لیکن خالد صاحب نے کسی چیز کو ہاتھ نہ لگایا۔ ہم نے اس کا سبب پوچھا تو فرمایا، ''میں صرف ایک وقت کا کھانا کھاتا ہوں۔'' اس پر ہم نے عرض کیا، ''اور جو آپ کا کلام پڑھتے ہیں، وہ دونوں وقت کھانا نہیں کھاتے۔''

سکندرِ اعظم نے ۳۳ برس کی عمر میں ساری دنیا کو فتح کر لیا تھا۔ اتنی ہی، بلکہ اس سے بھی کم عمر میں سراج منیر، علمی دنیا کو فتح کر چکے ہیں۔ غالب نے کہا تھا۔

سبزے کو جب کہیں جگہ نہ ملی
بن گیا روئے آب پر کائی

علم کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی واقعہ پیش آیا ہے۔ جب کوئی اس کا پرسانِ حال نہ رہا تو سراج منیر نے اسے اپنا لیا۔ اسی سے علم کی بے بسی اور بے کسی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ سراج منیر کے مضامین کا مجموعہ ''ملّتِ اسلامیہ، تہذیب و تقدیر'' حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ اس کا ایک نسخہ، از راہِ لطف و کرم انھوں نے عنایت فرمایا۔ کتاب کیا ہے، لباسِ حریر میں عروسِ جمیل ہے۔ جنھیں

پڑھنے سے دلچسپی نہیں، وہ بھی کتاب کو دیکھ کر عش عش کر اٹھتے ہیں۔ ایسی خوبصورت کتابیں اردو میں کم شائع ہوئی ہیں۔ سراج منیر جیسے نستعلیق آدمی کی کتاب نوری نستعلیق ہی میں چھپنی چاہیے تھی۔

ہم نے کتاب نہیں پڑھی اور مستقبل قریب میں ایسا کوئی ارادہ بھی نہیں ہے، کیونکہ ثقیل چیزیں ہمیں راس نہیں آتیں۔ دیباچے پر ایک نظر ہم نے ڈالی ہے، اس میں سراج منیر نے، پروفیسر مرزا محمد منور سے لے کر طاہر مسعود اور محمد سہیل عمر تک تقریباً دو درجن افراد کا شکریہ ادا کیا ہے۔ حیرت ہے کہ دو سو صفحے کی کتاب کے لیے دو درجن افراد کا احسان اٹھایا گیا ہے، حالانکہ بعض مصنف تو صرف ایک دو آدمیوں کا شکریہ ادا کر کے پانچ پانچ سو صفحوں کی کتابیں تیار کر لیتے ہیں۔

(۲۶ نومبر ۱۹۸۷ء)

فیض کا پاجامہ اور ترقی پسند مصنفین

شاہد علی خان کی ادارت میں ماہنامہ ''کتاب نما'' دہلی ہر مہینہ بڑی باقاعدگی سے شائع ہوتا ہے۔ یوں تو یہ ایک مختصر سا رسالہ ہے لیکن اپنے مندرجات کے اعتبار سے ایک بے مثال ادبی جریدہ ہے۔ اس میں پاک و ہند کے اہلِ قلم کی ایسی نگارشات شائع ہوتی ہیں جن کے مطالعے سے اُردو ادب کا قاری ہم عصر ادبی رجحانات اور ادب کی رفتار سے باخبر رہتا ہے۔ ''نگاہ تگ کا اجالا'' کے عنوان کے تحت طنزیہ و مزاحیہ تحریروں خصوصاً ادبی کالموں کا انتخاب شائع کیا جاتا ہے۔ اس انتخاب میں انتظار حسین اور خامہ بگوش کے کالم اکثر نظر آتے ہیں۔ ہم اپنا کالم چھپنے سے پہلے پڑھتے ہیں نہ بعد میں۔ کیونکہ آج کل کے ادیبوں کی طرح ہمارا مطالعہ خود اپنی تحریروں تک محدود نہیں ہے۔ لیکن جب ہمارا کوئی کالم ''کتاب نما'' میں چھپتا ہے تو ہم محض یہ دیکھنے کے لیے اسے ضرور پڑھتے ہیں کہ آخر اس میں ایسی کون سی بات ہے جو شاہد علی خان کی نگاہِ انتخاب اس پر ٹھہری۔ یہ خوشی کی بات ہے کہ خان صاحب کو ہمارے وہی کالم پسند آتے ہیں جو بیک وقت ترقی پسندوں اور غیر ترقی پسندوں کے معیار پر پورے اترتے ہیں۔ بس ایک ڈاکٹر محمد حسن انھیں ناپسند کرتے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کا ترقی پسندی کا معیار خانہ ساز ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اس مہینے کے ''کتاب نما'' میں ڈاکٹر محمد حسن کا ایک خط ایڈیٹر کے نام شائع ہوا ہے جس میں انھوں نے اپنے دلی رنج و غم کا اظہار اس طرح کیا ہے:

''شروع ہی سے دیکھتا ہوں کہ پاکستان سے ترقی پسندی اور ترقی پسندوں کی تضحیک کے مضامین ''کتاب نما'' میں باقاعدگی سے نقل ہوتے ہیں۔ اسی کے ساتھ وہاں کی ظلمت پسندی اور جماعت اسلامی کی ذہنیت کی آلودگی بھی احترام کی جگہ پاتی ہے۔ اس بار تو آپ نے فیض کے پاجامے پر انتظار حسین کا شاہکار نقل فرما کر کمال ہی کر دیا۔ ترقی پسندوں کو نوچنا کھسوٹنا پاکستان میں تو

مجبوری ہے، اس فیشن کو یہاں کے جریدے بھی اپناتے ہیں...... کیا ضرور ہے کہ ''کتاب نما'' پاکستانی مصنفین کی زبانی ترقی پسندوں کو گالیاں دیا کرے...... میں سخت احتجاج کرتا ہوں کہ آپ نے ''کتاب نما'' کو ترقی پسندوں ہی کے نہیں ترقی کے دشمنوں کے ہاتھوں میں دے دیا ہے۔ براہِ کرم پاکستان سے فضولیات کی درآمد کا سلسلہ بند کیجیے۔''

اگرچہ مکتوب نگار نے آخری سے پہلے جملے میں ''ترقی پسندوں'' اور ''ترقی کے دشمنوں'' کو ایک ہی معنوں میں استعمال کیا ہے لیکن اسے سہوِ قلم سمجھنا چاہیے۔ ڈاکٹر صاحب ترقی پسندی کے جس مقام پر فائز ہیں، وہاں سہوِ قلم کے سوا کسی اور چیز کی توقع نہیں رکھی جا سکتی۔ تاہم ہمارا مخلصانہ مشورہ یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب جب غصے میں کوئی چیز لکھیں تو اسے دوبارہ ضرور پڑھ لیا کریں تاکہ انھیں خود بھی معلوم ہو کہ ترقی پسندی کے زور میں وہ کیا کچھ لکھ گئے ہیں۔ بہر حال ان کا خط بہت مزے کا ہے جسے پڑھ کر ہم ایک آنکھ سے روئے اور ایک آنکھ سے ہنسے۔ رونے والی آنکھ کے سامنے ڈاکٹر محمد حسن کے ذاتی رسالے ''عصری ادب'' کے دو عدد پاکستانی اُردو ادب نمبر تھے اور ہنسنے والی آنکھ کے سامنے مذکورہ خط۔

شاہد علی خان کو ڈاکٹر صاحب مشورہ دے رہے ہیں کہ وہ پاکستان سے فضولیات کی درآمد کا سلسلہ بند کر دیں مگر یہ کام وہ خود ایک عرصے سے بڑے پیمانے پر انجام دے رہے ہیں۔ خان صاحب کو اس کام سے روکنے کی وجہ شاید یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب اس کاروبار پر اپنی اجارہ داری قائم رکھنا چاہتے ہیں۔

جن لوگوں کی نظر سے ''عصری ادب'' کے پاکستانی اُردو ادب نمبر گزرے ہیں، وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ڈاکٹر محمد حسن نے ترقی پسندی کے حوالے سے غیر ادب کو ادب بنا کر پاکستان کو ایک ادبی منظر نامہ پیش کیا ہے، اس کو پاکستانی ادب کے خلاف ''سازش'' قرار دیا گیا ہے۔ ہمیں اس سے اتفاق نہیں ہے کیونکہ ''سازش'' کے لیے سوچ بچار اور محنت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا معاملہ یہ ہے کہ دوسرے تیسرے سال پاکستان آتے ہیں، یہاں کی حکومت کے خلاف سیاسی نوعیت کی جو تحریریں ہاتھ لگتی ہیں، انھیں ادب بنا کر اپنے رسالے میں چھاپ دیتے ہیں۔ ان کی ترقی پسندی کا یہ عالم ہے کہ ایسی تحریروں بھی شائع کرتے ہیں جن پر بطور مصنف کسی کا نام نہیں ہوتا اور جن کے بارے میں گمان غالب یہ ہے کہ یہ خود ڈاکٹر صاحب کی طبع زاد

ہوتی ہیں۔ دراصل ڈاکٹر صاحب ذہن و مزاج کے اعتبار سے ادبی نہیں سیاسی آدمی ہیں، ان کی ترقی پسندی بلکہ ہوش مندی کا اندازہ اس سے کیجیے کہ وہ پاکستان میں مسجدوں کی کثرت کو قومی انتشار کا سبب بتاتے ہیں۔

ڈیڑھ دو سال پہلے ڈاکٹر محمد حسن نے ''عصری ادب'' کا پاکستانی اُردو ادب نمبر شائع کیا تھا۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے ہم نے عرض کیا تھا کہ ڈاکٹر صاحب کے ذہن میں پاکستان ادب کا جو تصور ہے وہ بہت عجیب و غریب ہے۔ ان کے نزدیک ہر وہ ادیب، ادیب نہیں جو مذہب کی باتیں کرے، نظریۂ پاکستان کا نام لے اور حب الوطنی کے جذبے سے سرشار ہو۔ ادیب صرف وہ ہے جو اشتراکی ہو یا اشتراکیت کی طرف جھکاؤ رکھتا ہو، مذہب سے بیزار ہو، سیاسی نعرہ باز ہو، ادب کے نام پر بے ادبی کا مرتکب ہو اور حکومتِ وقت کی مخالفت میں حکومت اور مملکت کے فرق کو نظر انداز کر دے اور پھر کسی غیر ملک میں سیاسی پناہ حاصل کر لے۔

ڈاکٹر صاحب پاکستان کے ہر اس ادیب کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں، جو اصطلاحی معنوں میں ترقی پسند نہیں ہے اور ہر اُس ''ترقی پسند'' کو ادیب قرار دیتے ہیں جس نے کچھ لکھنے کی تو کیا، کچھ پڑھنے کی بھی زحمت کبھی نہیں اٹھائی۔ حد تو یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کا ذوقِ ادب اس حد تک نکھرا ہوا ہے کہ وہ فیض احمد فیض اور صہبا لکھنوی کو یکساں اہمیت کے شاعر سمجھتے ہیں۔

اس پر تبصرہ کرتے ہوئے ہم نے ڈیڑھ سال پہلے عرض کیا تھا کہ ڈاکٹر محمد حسن نے ایک ہی سانس میں صہبا لکھنوی اور فیض کا نام لے کر صہبا کے ساتھ بڑی زیادتی کی ہے۔ فیض اچھے شاعر ضرور ہیں، لیکن انھوں نے صہبا کے معیار کا ایک شعر بھی نہیں کہا۔

انتظار حسین سے ڈاکٹر صاحب کو خاص دلچسپی ہے۔ ان کے بارے میں ڈاکٹر صاحب نے ایک مرتبہ لکھا تھا: ''انھوں نے اُردو ادب سے عقل اور معقولیت کو خارج کر کے عقل دشمنی اور ظلمت پسندی کو پُر کشش اور باوقار بنانے کی مہم چلائی ہے۔''

انتظار حسین کی اسی خارج شدہ عقل اور معقولیت سے کام لیتے ہوئے ڈاکٹر محمد حسن نے انتظار حسین کے اس کالم کو ''شاہکار'' قرار دیا ہے جس میں فیض کے پاجامے کا ذکر تھا۔ پاجامے کے مسئلے پر تو ہم بعد میں اظہار خیال کریں گے، فی الحال ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں عرض ہے کہ جس انتظار حسین کو آپ عقل دشمن اور ظلمت پسند قرار دیتے ہیں، اسے علی سردار جعفری ترقی پسند کہا

ہیں۔ یقین نہ آئے تو سردار جعفری کے رسالے ''گفتگو'' کا ترقی پسند نمبر دیکھ لیجیے جو ترقی پسند ادب کی نمائندہ تحریروں کا مجموعہ ہے۔ ان نمائندہ تحریروں میں انتظار حسین کا افسانہ ''کشتی'' بھی شامل ہے۔

پاجامے کا قضیہ یہ ہے کہ ڈاکٹر ایوب مرزا نے، جو فیض پر ایک کتاب ''ہم کہ ٹھہرے اجنبی'' کے مصنف ہیں، یومِ فیض کے جلسے میں فخریہ اعلان کیا تھا کہ بیگم فیض نے انھیں فیض کا ایک پاجامہ عنایت کیا ہے۔ اس پر انتظار حسین نے ایک کالم لکھا تھا جس میں انھوں نے ڈاکٹر ایوب مرزا کو مبارکباد دی تھی کہ وہ فیض کے دوسرے تمام معتقدوں سے بازی لے گئے۔ فیض کے سامان میں جو چیز سب سے زیادہ بامعنی تھی، وہ ان کو مل گئی۔ انتظار حسین چاہتے تو فیض کے سامان کی فہرست میں ان کی شاعری کو بھی شامل کر سکتے تھے۔ لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ اس کالم میں فیض کے خلاف کچھ تھا، نہ ترقی پسندوں کے خلاف۔ یہاں تک کہ فیض کے پاجامے کے خلاف بھی کوئی بات نہ تھی۔ پھر نہ معلوم کیوں ڈاکٹر محمد حسن اس کالم کی اشاعت پر چراغ پا ہوئے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ اپنے آپ کو اس پاجامے کا مستحق سمجھتے ہوں؟

اس صورت میں یہ تصور کرنا غلط نہ ہوگا کہ ڈاکٹر محمد حسن کو غصہ تو آیا تھا ڈاکٹر ایوب مرزا پر کہ انھوں نے موصوف کا حق غصب کیا، لیکن ترقی پسندی کے رشتے سے وہ ڈاکٹر ایوب مرزا کے خلاف کچھ نہیں کہہ سکتے تھے، اس لیے ''نزلہ برعضوِ ضعیف'' کے مصداق انھوں نے انتظار حسین کو برا بھلا کہہ ڈالا۔

ہم ڈاکٹر ایوب مرزا سے درخواست کریں گے کہ فیض کا پاجامہ اس کے اصل حقدار ڈاکٹر محمد حسن کے حوالے کر دیں۔ ڈاکٹر صاحب نے فیض پر سب سے زیادہ تنقیدی مضامین لکھے ہیں اس لیے ان کو یہ حق حاصل ہے کہ فیض کی سب سے بامعنی چیز ان کی تحویل میں رہے اور ہم جیسے نیاز مند اطمینان کا سانس لیں کہ ڈاکٹر صاحب اس پاجامے میں پھولے نہیں سماتے۔ اس موقع پر ہم مشہور شعر ضرور پڑھیں گے۔

بیکار مباش کچھ کیا کر
پاجامہ ادھیڑ کر سیا کر

کیونکہ کوتاہ نظر لوگ یہ سمجھیں گے اس شعر میں ترقی پسند تنقید پر تبصرہ کیا گیا ہے۔

(۱۷ دسمبر ۱۹۸۷ء)

ہدایت نامہ برائے گم کردگانِ جادۂ ادب

انیس ناگی رہتے تو لاہور میں ہیں، لیکن ان کے نام کا سکہ کراچی میں چلتا ہے۔ ان کے حق میں لکھنے کی تو خود ان کے اپنے سوا کوئی جرأت نہیں کر سکتا، لیکن ان کے خلاف جتنا کچھ کراچی والوں نے لکھا ہے، اگر اسے یکجا کیا جائے تو ایک ضخیم ہدایت نامہ برائے گم کردگانِ جادۂ ادب تیار ہو سکتا ہے۔ تعریف میں لکھی جانے والی تحریروں سے نہیں، مخالفت میں لکھی جانے والی تحریروں سے کسی شخص کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے انیس ناگی دنیائے ادب کی اہم شخصیت ہیں۔ اسی بنا پر ہمارا خیال تھا کہ جب بھی وہ کراچی تشریف لائیں گے، تو ان سے والوں کے نہ سہی، دیکھنے والوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ جائیں گے، جس طرح پچھلے دنوں بے نظیر بھٹو کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے لوگ بے چین تھے، اسی طرح انیس ناگی کو دیکھنے کے بے چین ہونے والوں کی کمی نہ ہوگی۔ لیکن افسوس کہ یہ سب کچھ نہیں ہوا۔ انیس ناگی پچھلے پندرہ دنوں سے کراچی میں ہیں اور اس طرح ہیں جس طرح بقول ولی دکنی سینے میں راز رہتا ہے۔ حد تو یہ کہ کراچی کی فرضی اور کاغذی انجمنوں نے بھی انیس ناگی کا کوئی نوٹس نہیں لیا، حالانکہ ان انجمنوں کا کام یہی ہے کہ بیرونی مہمانوں کے ساتھ شامیں منا کر اپنی زندگی کا ثبوت دیں۔

ہمیں جب معلوم ہوا کہ جناب انیس ناگی نے کراچی کی زمین کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے نوازا ہے، تو ہم ڈرتے ڈرتے ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ڈر اس بات کا تھا کہ اگر ان کی شاعری کی طرح ان کی شخصیت میں بھی ضرورت سے زیادہ جدیدیت ہوئی اور گفتگو میں فصاحت و بلاغت کی بجائے لسانی تشکیلات کی قسم کی کوئی چیز ملی تو ہم اس صدمے کو کیسے برداشت کریں گے۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ یہ خدشات نثری نظم کی طرح بے بنیاد ثابت ہوئے۔ جناب ناگی سے ملاقات ایک خوشگوار تجربہ تھی۔ ان کی شخصیت کے دلآویز، گفتگو کے فکر انگیز اور خاموشی کے معنی خیز ہونے میں انتظار حسین کو تو شبہ ہو سکتا ہے، مگر ہمیں نہیں ہوا۔ ہم سراپا گوش ہو کر ان کی گفتگو سے محظوظ

ہوتے رہے اور جب وہاں سے اٹھے تو ہمارے دل سے دعا نکلی کہ کاش اس شخص کی تحریریں بھی اس کی گفتگو کی طرح دلکش ہو جائیں۔

انیس ناگی سے ہم نے پوچھا کہ "افکار" کے ایک حالیہ شمارے میں احمد ہمدانی نے آپ کے بارے میں جو کچھ لکھا تھا، کیا وہ آپ کی نظر سے گزرا ہے؟ اس کے جواب میں انھوں نے فرمایا، "کون احمد ہمدانی؟" ہم نے عرض کیا، مشہور نقاد اور شاعر۔ فرمایا، "ہوں گے، مگر میں نے کبھی ان کا نام نہیں سنا۔" اس کے بعد ہم نے گفتگو کے دوران اتنی احتیاط برتی کہ میرؔ و غالبؔ کا نام بھی نہ لیا کہ کہیں انیس ناگی یہ نہ پوچھ بیٹھیں کہ کون میرؔ و غالبؔ؟

احمد ہمدانی کے مضمون کا ذکر ہم نے اس لیے کیا تھا کہ اس حوالے سے جدید ترین یعنی نئی شاعری کے بارے میں کچھ گفتگو ہو سکتی تھی۔ اس مضمون میں انھوں نے لکھا تھا:

> "کراچی اور لاہور میں جدیدیت کے بڑے بڑے کارخانے کھلے ہوئے ہیں۔ ان کارخانوں میں شاعری کی ٹکنالوجی مغرب سے درآمد کی جاتی ہے۔ اس ٹکنالوجی کو سامنے رکھ کر سخن سازی کی صنعت قائم کی جاتی ہے اور شعر و سخن کے مستری شاعری کی مشین کے پرزے اپنی زبان میں ڈھالنے شروع کر دیتے ہیں، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی تمام تر کوششوں کا نتیجہ بے کیف اور بے معنی الفاظ کی بھرمار کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر انیس ناگی اور ان کے ہم نواؤں کو پیش کیا جا سکتا ہے۔"

قطع نظر اس سے احمد ہمدانی نے متعصبانہ انداز میں "انیس ناگی اور ان کے ہم نوا" کے الفاظ اسی طرح استعمال کیے ہیں، جس طرح "پریم راگی اور ان کے ہمنوا" کے الفاظ ریڈیو والے استعمال کرتے ہیں، ہمیں احمد ہمدانی کے خیالات پریشان سے قطعاً اتفاق نہیں ہے۔ اول تو یہی بات درست نہیں کہ شاعری کی ٹکنالوجی مغرب سے درآمد کی جاتی ہے۔ اہل مغرب اخلاقی طور پر لاکھ خراب حال ہوں، لیکن ادبی طور پر اتنے پسماندہ نہیں ہیں کہ ان کی ٹکنالوجی لاہور اور کراچی والوں کے کام آ سکے۔ عیب کرنے کو ہنر چاہیے۔ یہاں والوں کے پاس ہنر تو ہے، لیکن عیب کرنے کا سلیقہ نہیں۔ مختصر یہ کہ جدید شاعری کی ٹکنالوجی خالص ملکی چیز ہے۔ اسے مغرب کی دین قرار دینا محض خوش فہمی ہے۔

احمد ہمدانی نے نئی شاعری کو بے معنی الفاظ کا مجموعہ قرار دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ انھوں نے

رائے قائم کرنے میں عجلت سے کام لیا ہے۔ اگر انیس ناگی کا مرتبہ نئی شاعری کا انتخاب ان کی نظر سے گزر جاتا، تو وہ ایسی نا منصفانہ رائے قائم نہ کرتے۔ یہ انتخاب اس وقت ہمارے سامنے ہے۔ اس میں ۱۹۶۰ء سے ۱۹۸۶ء تک کی نئی شاعری کی نمائندہ نظمیں شامل ہیں۔ ہم نے ان تمام نظموں کو غور سے پڑھا ہے۔ ہمیں ایک لفظ بھی ایسا نظر نہیں آیا، جو بے معنی ہو۔ نور اللغات اور فرہنگ آصفیہ میں نئی شاعری کے تمام الفاظ مل جاتے ہیں۔ اگر یہ الفاظ بے معنی ہوتے تو لغت نگار انھیں لغت میں کیوں شامل کرتے؟ احمد ہمدانی شاید یہ کہنا چاہتے ہیں کہ نئے شاعر لفظوں کو اس طرح استعمال کرتے ہیں کہ وہ بے معنی ہو جاتے ہیں، یہ بات بھی درست نہیں۔ قصہ یہ ہے کہ نئی شاعری پڑھتے ہوئے قاری خود اپنے آپ کو بے معنی سمجھنے لگتا ہے۔ ہمدانی صاحب پر یہ سانحہ گزرا ہوگا، جسے انھوں نے لفظوں کے بے معنی ہونے سے تعبیر کیا ہے۔

ہم یہاں تک لکھ چکے تھے کہ استاد لاغر مراد آبادی تشریف لائے۔ انھوں نے "نئی شاعری" کے انتخاب کی ورق گردانی کرتے ہوئے انیس ناگی کی ایک نظم کے تین مصرعے با آواز بلند پڑھے:

میں چار سمتوں سے پوچھتا ہوں
عناصروں کے تغیر سے یہ پوچھتا ہوں

اور فرمایا: "عناصر تو خود جمع ہے، یہ عناصروں کیا ہے؟"

ہم نے عرض کیا: "یہ جمع الجمع ہے۔"

"وہ کس قاعدے سے ہے؟"

"لسانی تشکیلات کے قاعدے سے۔"

"لسانی تشکیلات کیا ہوتی ہیں؟"

اس سوال پر ہمیں غصہ آ گیا۔ ہم نے عرض کیا: "حضرت! یہ میرؔ و غالبؔ کی شاعری نہیں ہے، نئے دور کے ایک اہم شاعر کی شاعری ہے۔ آپ کی سمجھ میں نہیں آئے گی۔" استاد لاغر مراد آبادی دراصل دبستانِ احمد ہمدانی سے تعلق رکھتے ہیں، اس لیے ہم نے نئی شاعری کا انتخاب ان کے ہاتھ سے لے کر انیس ناگی کا دیباچہ پڑھنا شروع کر دیا۔

یہ دیباچہ ان الفاظ سے شروع ہوتا ہے:

"گزشتہ ربع صدی میں نئی شاعری اور نثری نظم اُردو ادب میں ایک اہم

مسئلہ رہی ہیں۔ نئی شاعری کے مضمرات دور رس تھے۔ گزشتہ نسل کے شعراء کو یہ احساس تھا کہ ان کی شاعری بے وقت کی راگنی ہو چکی تھی...... چنانچہ انھوں نے ہر ادبی پلیٹ فارم کو نئی شاعری کے خلاف استعمال کیا۔ فیض، راشد، قیوم نظر، وزیر آغا، ظہیر کاشمیری، ناصر کاظمی، انتظار حسین، احمد مشتاق اور نہ جانے کون کون نئے شعراء پر ہزار لعنت بھیج رہے تھے۔ ان میں انتظار حسین پیش پیش تھے۔ وہ ہر شاعر پر پھبتی کستے اور نئے شعراء میں نفاق پیدا کرنے کی کوشش کرتے۔ انھیں غصہ یہ تھا کہ نئے شعراء نے ان کے مقابلے میں انور سجاد کی پشت پناہی کر کے اسے نئے افسانے کے اکھاڑے میں بھیجا تھا۔"

دیباچہ ان الفاظ پر ختم ہوتا ہے:

"یہ صنف (نثری نظم) رواج پا گئی تو کراچی اور لاہور کے بعض بوسیدہ شعراء نے اس کا جدِ امجد ہونے کا دعویٰ کیا، بالکل اسی طرح جیسے آج کل نئی شاعری کے انتخاب بھی روایتی شعراء کی جانب سے شائع ہو رہے ہیں، جو نئی شاعری کے خون کے پیاسے تھے، لیکن نئی شاعری کی مقبولیت دیکھ کر ادبی تاریخ میں اس کے مربی بن کر گوئے سبقت لے جانا چاہتے ہیں۔"

ہم نے دیباچے کے آغاز و اختتام کی عبارتیں درج کر دی ہیں۔ ان سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ آغاز و اختتام کے درمیان کیا کچھ ہوگا۔ انیس ناگی کو چاہیے کہ نئی شاعری کا انتخاب ہر ماہ چھاپا کریں۔ اس بہانے شاعری نہ سہی خریدار نثر تو پڑھنے کو مل جایا کرے گی۔

نئی شاعری کے انتخاب کی سب سے اہم خوبی یہ ہے کہ یہ نہایت عمدہ اور خوبصورت ٹائپ میں شائع ہوا ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ کتاب کا مسودہ خود انیس ناگی نے ٹائپ کیا ہے، جو اس بات کی دلیل ہے کہ وہ بہت اچھے ٹائپسٹ ہیں۔ اس پر ہمیں ایک واقعہ یاد آ گیا، جو ایک مرتبہ پہلے بھی ہم لکھ چکے ہیں۔ بلاتشبیہ عرض ہے کہ مشہور شاعر منظر علی خان منظر نے ایک مرتبہ دوستوں کو نہایت عمدہ شامی کباب کھلائے اور بتایا کہ یہ کباب انھوں نے خود بنائے ہیں۔ اس پر ایک دوست نے کہا، "جب آپ اتنے عمدہ کباب بنا لیتے ہیں تو پھر شاعری کیوں کرتے ہیں۔"

(۳۱ دسمبر ۱۹۸۷ء)

کھوٹے سکّے اور صنفِ فلیپ نگاری

آج کل بعض اہلِ ادب کچھ اصنافِ ادب کو مقبول بنانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں۔ ایک طرف انشائیے کو اُردو ادب کی آبرو بنایا جا رہا ہے، تو دوسری طرف اُردو شاعری کے مستقبل کا خواب نثری نظم میں دیکھا جا رہا ہے۔ جو انشائیے اور نثری نظم کو بھاری پتھر سمجھتے ہیں، انھوں نے نسبتاً ایک ہلکی صنف کا انتخاب کیا ہے جسے ہائیکو بھی کہا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ جس طرح پاکستان میں جاپان کی سوزوکی کار چل گئی اسی طرح جاپانی صنفِ سخن ہائیکو بھی چل جائے گی۔ دونوں چیزیں اگرچہ ہمیں اسمگل ہوتی ہیں لیکن سوزوکی کے ساتھ ہائیکو کا چلنا دشوار نظر آتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اوّل الذکر ایک کارآمد چیز ہے اور ثانی الذکر کے کارآمد ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ اس کا تعلق آمد کی بجائے آورد سے ہے۔

ایک صنفِ ادب ایسی بھی ہے جس کے لیے کوئی باقاعدہ تحریک نہیں چلائی جا رہی ہے۔ اس کے باوجود یہ صنف حیرت ناک حد تک ترقی کر رہی ہے۔ اس کا نام ہے فلیپ نگاری۔ کوئی بھی کتاب اٹھا کر دیکھیے اس کے فلیپ پر آپ کو چار چھ لوگوں کی ایسی تحریریں ضرور نظر آئیں گی جن میں کتاب اور مصنف دونوں پر مبالغے کا ملمع کیا گیا ہوگا۔ مصنف کے بارے میں عموماً اس قسم کی بات کی جاتی ہے کہ اگر موصوف پیدا نہ ہوتے تو ادب یتیم رہ جاتا۔ اور کتاب کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ اگر یہ لکھی نہ جاتی تو ادب میں ایسا خلا رہ جاتا جسے پُر کرنا ممکن نہیں تھا۔ یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے کہ آدمی اپنی جھوٹی تعریف سن کر خوش ہوتا ہے لیکن کسی کی جھوٹی تعریف لکھ کر خوش ہونا ایک سمجھ میں نہ آنے والی بات ہے۔

بہرحال اب جب کہ یہ صنف مقبول ہو چکی ہے تو یہ ضروری ہے کہ اس کی ہیئت میں کچھ نئے تجربے کیے جائیں۔ اس سلسلے میں نمونے کے کچھ فلیپ پیش خدمت ہیں۔ ان کے لکھنے والے بھی معروف ہیں اور جن کی کتابوں کے لیے فلیپ لکھے گئے ہیں، ان کے بھی معروف ہونے میں کوئی شک نہیں۔

ساقی فاروقی

یہاں افتخار عارف سلمہٗ شعر نہیں کہتے کلیشے کا کاروبار کرتے ہیں۔ کچھ فیض کی ترکیبات، کچھ میر انیس کی لفظیات اور کچھ یگانہ کی خرافات۔ یہ ہے اس عزیز کی شاعری کی کل کائنات۔ میں نے جو مقام اپنی شاعری کے ذریعے حاصل کیا تھا، اس نے وہی مقام اُردو مرکز کے ذریعے حاصل کر لیا۔ نتیجہ یہ کہ اس کے کلام پر فیض نے دیباچہ لکھا اور گوپی چند نارنگ نے تقریظ لکھی۔ فیض اپنی غلطی پر نادم ہونے کے لیے ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں، نارنگ موجود ہیں لیکن نادم ہونے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے کیونکہ انھیں ابھی لندن آتے جاتے رہنا ہے۔ نارنگ نے مجھ پر بھی ایک مقالہ لکھا ہے۔ میں نے شکایت کی: "بھائی! جس قلم سے تم نے افتخار عارف پر لکھا تھا، اسی آلودہ قلم سے مجھ پر بھی لکھ ڈالا۔" نارنگ نے جواب دیا، "یہ شکایت عارف افتخار کو ہونی چاہیے کہ میں نے پہلے تم پر لکھا اور پھر عارف پر۔" نارنگ کا یہ جملہ اگرچہ میرے خلاف جاتا ہے لیکن خوبصورت جملہ ہے۔ یہ سن کر جی خوش ہو گیا اور میں نے اس کا قصور معاف کر دیا۔ لیکن افتخار عارف کا قصور میں معاف نہیں کر سکتا۔ آخر یہ شخص شعر کیوں کہتا ہے؟

افتخار عارف

ساقی فاروقی مجھ سے عمر میں بڑے ہیں۔ عمر میں ہی بڑے ہیں شاعری میں نہیں۔ وہ راشدؔ اور فیضؔ سے تو بڑے شاعر ہو سکتے ہیں کیونکہ راشدؔ اور فیضؔ یہ صدمہ اٹھانے کے لیے دنیا میں موجود نہیں۔ میں دنیا ہی میں نہیں لندن میں بھی موجود ہوں جہاں پہلے ساقی کا سکہ چلتا تھا اور اب میرا چلتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نہ نکالا جائے کہ لندن میں صرف کھوٹے سکے چلتے ہیں۔ اس شہر میں تو اصل اور نقل دونوں ہی چل سکتا ہے، تو ہم دونوں کیوں نہیں چل سکتے۔

ساقی پہلے صرف اُردو میں شعر کہتے تھے لیکن اب انگریزی میں بھی طبع آزمائی کرنے لگے ہیں۔ اس دو عملی سے ان دونوں زبانوں کو جو نقصان پہنچا ہے اس کی تلافی یوں ہو جاتی ہے کہ انگریزی والے اُردو کا اور اُردو والے انگریزی کا شاعر سمجھتے ہیں اور جو اُردو اور انگریزی دونوں زبانیں جانتے ہیں۔ وہ اپنا گریبان چاک کر لیتے ہیں ساقی سے کچھ نہیں کہتے۔ وجہ ظاہر

ہے کہ گریبان چاک ہو جائے تو دوبارہ سیا جا سکتا ہے، عزت ایک مرتبہ چلی جائے تو دوبارہ [illegible] مشکل ہی سے بحال ہوتی ہے۔

ڈاکٹر انور سدید

ڈاکٹر سلیم اختر نقاد ہیں، افسانہ نگار ہیں، ادبی مورخ ہیں۔ گویا "ہر چند کہیں کہ ہیں [illegible] ہیں" کی تفسیر ہیں۔ جس زمانے میں یہ دبستان سرگودھا سے منسلک تھے، ان کے ادیب [illegible] میں کوئی شبہ نہ تھا اور اب ان کے ادیب نہ ہونے کا یقین ہے۔ دنیائے ادب میں شبے کو یقین [illegible] اور یقین کو شبے میں تبدیل ہوتے دیر نہیں لگتی کیونکہ ادبی رجحانات وقت کے ساتھ ساتھ [illegible] رہتے ہیں۔

ڈاکٹر سلیم اختر جب دبستان سرگودھا کے شجر سے پیوستہ تھے تو رجحان ساز تھے، اب [illegible] بریدہ ہیں تو کتاب ساز ہیں۔ میری دیکھا دیکھی انھوں نے بھی انشائیے پر ایک کتاب لکھی [illegible] خوبصورت صنف اس ظلم کے لائق نہ تھی۔ ہم نے انشائیے کی جو تحریک چلا رکھی ہے، ڈاکٹر سلیم [illegible] نے اپنی کتاب میں اس کا منفی انداز میں ذکر کیا ہے۔ یہ تنقید نہیں فتنہ پردازی ہے۔ اکادمی اد[illegible] اس قسم کے فتنوں کی سرکوبی کے لیے کچھ کرنا چاہیے۔ کم از کم تھانے میں رپٹ تو لکھا ہی دینی چا[illegible]

ڈاکٹر سلیم اختر

ڈاکٹر انور سدید ایک فرد کا نہیں مجموعۂ افراد کا نام ہے۔ موصوف ایک درجن سے [illegible] ناموں سے مختلف اخباروں میں کالم لکھتے ہیں جن میں سے کسی نہ کسی بہانے میرا ذکر ضرور [illegible] ہے۔ میں تو صرف اتنا کرتا ہوں کہ اپنے ہر مضمون میں ڈاکٹر صاحب کے بارے میں ایک [illegible] جملہ لکھ دیتا ہوں۔ اس کے جواب میں ڈاکٹر صاحب یہ کرتے ہیں کہ اپنے ہر مضمون میں ایک [illegible] جملہ موضوع سے متعلق لکھتے ہیں اور باقی سارا مضمون میرے بارے میں ہوتا ہے۔ اس سے [illegible] شہرت اور نیک نامی میں اضافہ ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو اتنا فائدہ ہوتا ہے کہ ان کے مضامین [illegible] تعداد میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

سنا تھا کہ سرگودھا کے مالٹے بہت شیریں ہوتے ہیں بلکہ "شیریں حلاوت" سے [illegible]

[illegible] ہیں۔ مگر یہ تلخ مالٹا پہلی دفعہ دیکھنے اور چکھنے میں آیا ہے۔

کشور ناہید

میں بچپن میں جس قسم کا کلام لکھ کر ضائع کر دیتی تھی، اسی قسم کا کلام یہ عزیزہ سنبھال کر رکھتی [illegible] چھپوا بھی دیتی ہیں اور پھر اس پر اکادمی ادبیات کا انعام بھی وصول کر لیتی ہیں۔ اکادمی [illegible] رقم کے ضائع ہونے پر تو میں خوش ہوں، لیکن ایک شاعرہ کے ضائع ہونے کا مجھے دلی [illegible] ہے۔ دنیا بھر میں ادبی انعامات کسی قلم کار کی عمر بھر کی کارکردگی کو سامنے رکھ کر دیے جاتے [illegible] ہمارے ملک میں ایسے لوگوں کو ملتے ہیں جن کا کوئی ماضی ہوتا ہے نہ مستقبل۔ بہر حال [illegible] دعا ہے کہ اس عزیزہ کا نام شاعری کے حوالے سے نہ سہی ٹی وی کے پروگراموں کے حوالے [illegible] تاریخ میں محفوظ ہو جائے، اور اگر یہ بھی نہیں تو پھر پچاس برس بعد جب لوگ صرف میری [illegible] گے تو میری اس تحریر کی وجہ سے موصوفہ کو بھی یاد کر لیا کریں گے۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی

[illegible] مراد آبادی اچھے شاعر ہیں۔ یعنی بڑے شاعر بھی ہیں اور اچھے شاعر بھی۔ بڑے اس [illegible] ہیں۔ اچھے اس لیے ہیں کہ بڑے ہیں۔ گویا اچھائی اور بڑائی ان کے ہاں لازم و ملزوم [illegible] اس اچھائی بڑائی کے معیار کا پیمانہ خود ان کی اچھی شاعری ہے۔ کیونکہ کسی دوسرے کی شاعری [illegible] سے معیار متزلزل ہو جاتا ہے یعنی گر جاتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ شاعری کا معیار گرنا [illegible]۔ ہاں شاعری خود گر جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن یہ سب فروعی باتیں ہیں۔ اصل [illegible] مراد آبادی غنائی شاعر ہیں، یعنی سازندوں کے بغیر ان کی شاعری سے محظوظ ہونا [illegible]۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ سازندوں کی ضروریات کو مدِنظر رکھ کر شعر کہتے ہیں۔ [illegible] مطلب کچھ ہو تو اس سے بڑی اور اچھی شاعری کے بڑے اور اچھے ہونے پر کوئی فرق نہیں [illegible] تصدیق زیرِ نظر مجموعۂ کلام سے کی جا سکتی ہے بشرطیکہ قاری کو اتنی فرصت ہو کہ وہ میری [illegible] کے لیے اس مجموعۂ کلام کو پڑھنے کی زحمت اٹھائے۔

(۷ رجنوری ۱۹۸۸ء)

دنیائے ادب کے ناخواندہ مہمان

ایک دن لاغر مراد آبادی کہنے لگے، "جب کرنسی نوٹ دھڑا دھڑ چھپتے ہیں تو افراطِ زر کا مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے، اور جب کتابیں دھڑا دھڑ چھپتی ہیں تو ادب افراط و تفریط کے مسئلے سے دوچار ہو جاتا ہے۔"

ہم نے عرض کیا، "ہم نہ مالیات کے ماہر ہیں نہ ادبیات کے، اس لیے آپ کا کلام بلاغت نظام سمجھ میں نہیں آیا۔"

فرمایا، "آپ کو اس سے تشویش نہیں ہوتی کہ کاغذ کی قلت کے باوجود کتابیں کثرت سے چھپ رہی ہیں۔ سادہ کاغذ سے بہت مفید کام لیے جا سکتے ہیں، لیکن جب کاغذ کو ضائع ہوتے دیکھتا ہوں تو دل دُکھتا ہے۔"

ہم نے لاغر صاحب کو ذرا چھیڑا، "حضرت! آپ تو ادب کے لیے اپنی عمرِ عزیز ضائع کر چکے ہیں، اگر دوسرے سادہ کاغذ ضائع کرتے ہیں تو آپ کو اس پر اعتراض کیوں ہے؟"

ان کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ میرزا یگانہ کے لہجے میں فرمایا، "مجھے اس لیے اعتراض ہے کہ آج کل کے بیشتر لکھنے والے ادبی دنیا میں ناخواندہ مہمان کی حیثیت رکھتے ہیں، ناخواندہ دونوں معنوں میں۔"

اس سے پہلے کہ ہم لفظ "ناخواندہ" کے دونوں معنوں پر غور کرتے لاغر صاحب نے ایک کتاب ہمارے سامنے رکھی اور یہ کہتے ہوئے چلے گئے کہ "اگر کبھی فرصت ملے تو اس کتاب کو دیکھ لیجیے گا، پھر آپ کو خود ہی معلوم ہو جائے گا کہ کتابوں کی اشاعت سے میں پریشان کیوں ہوں۔"

ہم نے اس کتاب پر نظر ڈالی تو آنکھیں روشن ہو گئیں۔ نہایت عمدہ آرٹ پیپر پر ہر صفحہ دو رنگوں میں چھپا ہوا۔ جتنے صفحے اتنے ہی مصوری کے شاہکار۔ دائیں طرف راتوں کی نیند حرام کر دینے والا تصویری خاکہ اور بائیں طرف مناسبت سے دن کا چین زائل کر دینے والی نظم۔ سرورق

ایسا رنگیلا اور بھڑکیلا کہ ڈائجسٹوں کے سرورق بھی اس کے سامنے پانی بھرتے نظر آتے ہیں۔ مصور نے ایک نہایت عمدہ خیال کو رنگوں میں قید کیا ہے۔ ایک خاتون کسی شاعری طرح آنکھیں بند کیے بیٹھی ہے، ایک تتلی اس کے ہونٹوں پر منڈلا رہی ہے۔ حلقوم کے قریب ایک پرندہ چونچ کھولے نغمہ سرائی میں مصروف ہے۔ جن لوگوں کا حیوانات کا مطالعہ اور مشاہدہ کمزور ہے، ان کے لیے فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ کوا ہے یا بلبل۔ بہرحال اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ان دونوں پرندوں میں سے ایک کا ہندی شاعری سے اور دوسرے کا اردو شاعری سے گہرا تعلق ہے۔

کتاب کو دیکھ کر آنکھیں روشن ہوئی تھیں، پڑھ کر کھل گئیں۔ مناسب ہوگا کہ اس موقع پر ہم بتا دیں کہ کتاب کا نام "طلسمِ خیال" ہے۔ اس نام سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ یہ کرشن چندر کی مشہور کتاب کا نیا ایڈیشن ہے۔ کرشن چندر کی روح تو پہلے ہی ایڈیشن پر شرمندہ ہو رہی ہوگی کیونکہ یہ نام اب مشتاق احمد قریشی کی ملکیت ہو گیا ہے کہ زیرِ نظر کتاب کے مصنف وہی ہیں۔

مشتاق احمد قریشی کو ہم اس حیثیت سے تو جانتے ہیں کہ وہ متعدد ڈائجسٹوں کے مدیر و ناشر ہیں، لیکن یہ معلوم نہیں تھا کہ اس خاکستر میں شاعری کی چنگاری بھی موجود ہے، اور شاعری بھی ایسی کہ اسے پڑھتے ہوئے ایک ہاتھ سے دل کو اور دوسرے ہاتھ سے دماغ کو سنبھالنا پڑتا ہے۔ دل کو اس لیے کہ مچل نہ جائے اور دماغ کو اس لیے کہ پھسل نہ جائے۔ یوں تو اس مجموعے کی تمام نظمیں ہمارے کالم کی شایانِ شان ہیں، لیکن کفایت شعاری کے خیال سے صرف ایک نظم بطور نمونہ کلام نقل کی جاتی ہے۔ اس کا عنوان ہے، "ہاں"۔

گلابی آنکھ میں ڈورے پڑے ہیں
پپوٹے بھی تو بوجھل ہو گئے ہیں
تمہارے حسن میں تابندگی ہے
ستاروں جیسی اس میں روشنی ہے
کشش ہے اور اس میں دلکشی ہے
یہ دل کا یہ تقاضا
اٹھا دیجیے بس اب پردہ حیا کا
ادا اک "ہاں" سے بن جائے گی دنیا

کہ ہوں میں جاں بلب اور لب ہیں تشنہ

اس نظم سے قارئین اندازہ کر سکتے ہیں کہ ہمارے شاعرِ محترم خیال و فکر کی جن بلندیوں پر تشریف رکھتے ہیں، وہاں تک پہنچنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔ اور اگر کوئی قسمت کا مارا اُن بلندیوں تک پہنچ بھی جائے تو پھر اس کا واپس آنا ناممکن ہے۔ اس نظم میں شاعر نے یہ اُچھوتا خیال پیش کیا ہے کہ اگرچہ وہ جاں بلب ہے لیکن کسی کی ذرا سی "ہاں" سے اس کی دنیا بن جائے گی۔ شاعر کو اس سے کوئی غرض نہیں کہ ہاں کرنے والے اور اس نظم کو پڑھنے والے، دونوں کی دنیا ہی نہیں عاقبت بھی بگڑ جائے گی۔

اس کتاب میں صرف شاعری نہیں اور بہت کچھ بھی ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ویسے تو اس کتاب کے مصنف مشتاق احمد قریشی ہیں لیکن جس طرح غالب کی تنخواہ میں ساہوکار تہائی کا شریک تھا، اسی طرح پچیس اہلِ قلم بھی اس کتاب کی تصنیف میں قریشی صاحب کے شریک ہیں۔ کتاب کے تقریباً ایک تہائی صفحات پر ان اہلِ قلم کی آرا اس طرح درج ہیں کہ ایک صفحے پر رائے ہے اور اس کے سامنے کے صفحے پر صاحب الرائے کی تصویر۔ اکثر تصویریں آرا سے بہتر ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ تصویریں دوسروں کی کھینچی ہوئی ہیں اور آرا خود اہلِ قلم نے لکھی ہیں۔ رائے دینے والوں میں ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر عبادت بریلوی، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر ابوالخیر کشفی، احمد ندیم قاسمی، اشفاق احمد، انتظار حسین، رئیس امروہوی، قتیل شفائی، سحر انصاری، مشفق خواجہ اور بہت سے دوسرے شامل ہیں۔ مشتاق احمد قریشی خوش قسمت ہیں کہ ان کے کلام کو جتنے نقادوں نے سراہا ہے، اتنے نوحہ گر تو غالب کے جنازے میں بھی شریک نہیں تھے۔

ان سب اہلِ قلم نے گواہی دی ہے کہ مشتاق احمد قریشی بہت اچھے شاعر ہیں۔ ہم اس پر صرف اتنا اضافہ کریں گے کہ مشتاق احمد قریشی نے جس قسم کی شاعری کی ہے اس کا معیار اتنا بلند ہے کہ مذکورہ بالا پچیس گواہ مشترکہ کوششوں سے بھی اس قسم کی شاعری نہیں کر سکتے۔ اسی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جن لوگوں کو خود اچھے شعر کہنے کا تجربہ نہ ہو، وہ اچھی شاعری کے بارے میں رائے دینے کے کس حد تک اہل ہو سکتے ہیں۔ رائے دینے والوں نے کیا کیا گل کھلائے ہیں، اس کا اندازہ ذیل کی مثالوں سے کیا جا سکتا ہے۔

"مشتاق احمد قریشی نے اُسلوب اور آہنگ میں وہ رجحان اپنایا ہے جسے جدیدیت کا نیا روپ کہہ سکتے ہیں۔" (ڈاکٹر ابواللیث صدیقی) لفظ جدیدیت کا استعمال لائقِ توجہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب لغت نگار ہیں، اس لیے انھیں حق ہے کہ کسی لفظ کو جن معنوں میں چاہیں استعمال کریں۔ بلکہ بغیر معنوں کے بھی استعمال کرنے کا حق رکھتے ہیں۔

"یہ نظمیں انسانی زندگی کے جذباتی نظام کے نشیب و فراز کی کہانیاں سناتی ہیں۔" (ڈاکٹر عبادت بریلوی) اس جملے میں کتابت کی غلطی نظر آتی ہے۔ قریشی صاحب کی شاعری میں وصل و ہجر کے بکھیڑوں کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اس مناسبت سے ڈاکٹر صاحب نے "مواصلاتی نظام" لکھا ہوگا۔ کاتب نے اصلاح دے کر "جذباتی نظام" لکھ دیا۔ قریشی صاحب کے کلام میں بھی کئی جگہ کاتب کی اصلاحیں نظر آتی ہیں۔ حیرت ہے کہ جس شہر میں حضرت رئیس امروہوی جیسا استادِ فن موجود ہو، اس شہر کا ایک شاعر کاتب سے اصلاح لے۔

"ان کے ہاں خیالات کا الجھاؤ ہے نہ اظہار کا ابہام۔" (ڈاکٹر وحید قریشی) ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں عرض ہے کہ جب خیالات ہی موجود نہ ہوں تو ان کے الجھاؤ کا سوال کہاں پیدا ہوتا ہے۔

"ان کی شاعری ہر اُس شخص کو پسند آئے گی جو جوانی کی دہلیز پر کھڑا زندگی کے رومان اور اس کی مہک سے تازہ دم ہو رہا ہے۔" (ڈاکٹر جمیل جالبی) دلچسپ بات یہ ہے کہ مشتاق احمد قریشی کی شاعری پر جن لوگوں نے رائیں لکھ کر اپنی پسندیدگی کی مہر ثبت کی ہے، وہ سب کے سب بڑھاپے کی دہلیز پر کھڑے ہیں۔

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اپنی رائے خود نہیں لکھی، بقول خود بھاگم بھاگ Dictate کرائی ہے۔ انھوں نے الگ سے ایک خط میں قریشی صاحب کو ہدایت کی ہے کہ کتابت توجہ سے کرائیں۔ قریشی صاحب نے اس پر اتنی توجہ کی ہے کہ کتابت سے متعلق ہدایت بھی ڈاکٹر نارنگ کی رائے میں شامل کر دی ہے۔ رائے کا یہی حصہ ایسا ہے جس میں کوئی معقول بات کہی گئی ہے۔

ڈاکٹر ابوالخیر کشفی لکھتے ہیں، "ان رومانی نظموں کے رنگ چیختے چلاتے اور کچے نہیں بلکہ وہ شوخ اور مسکراتے ہوئے آبی آبی رنگ ہیں۔" شاید انھیں آبی آبی رنگوں کی مناسبت سے ان کا ہی پانی پانی ہو جاتا ہے۔

مشفق خواجہ نے مشتاق احمد قریشی کی شاعری کو لوک گیتوں سے تشبیہ دی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ موصوف نے لوک گیت کبھی نہیں سنے۔ مشفق خواجہ کے ذکر پر یاد آیا کہ موصوف ہر مہینے دو چار کتابوں پر فلیپ ضرور لکھتے ہیں۔ ممکن ہے یہ ان کا ذریعۂ معاش ہو۔ ایک صاحب کی کتاب پر مشفق خواجہ کا فلیپ دیکھ کر استاد لاغر مرادآبادی نے صاحب کتاب سے کہا: "فلیپ نگار کا نام تو کبھی خود اس کے اپنے کام نہیں آیا۔ آپ اس سے کس طرح فائدہ اٹھائیں گے؟" انھوں نے جواب دیا: "آخر بازار میں کھوٹے سکے بھی تو چل جاتے ہیں۔"

(۱۴رجنوری ۱۹۸۸ء)

ترقی پسند، کاروبارِ ادب اور مالی منفعت

ہندوستان میں اور کچھ ہو نہ ہو، مزاح نگاری خوب زوروں پر ہے۔ مزاح نگار اس کثرت سے پیدا ہو رہے ہیں کہ سنجیدہ نگار آٹے میں نمک کے برابر رہ گئے ہیں۔ اور وہ دن دور نہیں جب آٹے میں نمک ملانے کا رواج بالکل ختم ہو جائے گا۔ حد تو یہ ہے کہ تنقید میں طنز و مزاح کا ایک الگ دبستان قائم ہو چکا ہے جس کے بانی وارث علوی ہیں...... وارث علوی یوں تو اپنے علم سے موضوع کو مجروح و مضروب کرتے ہیں، لیکن آلۂ قتل کے طور پر طنز و مزاح ہی کو کام میں لاتے ہیں۔

ڈاکٹر محمد حسن کے ایک مضمون سے اطلاع ملی ہے کہ ہندوستان کے ترقی پسند بھی ترقی کر کے اچھے خاصے مزاح پسند بن چکے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اُردو ترقی پسندوں کی کانفرنس منعقدہ دہلی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"اول تو اس کانفرنس کا افتتاح وزیر اعظم کے پیغام سے ہوا۔ اب اگر وزیر اعظم ہی ترقی پسندی کا امام ہے تو پھر انجمن کو ترقی پسندی کی الگ وزارت یا شعبے کے قیام کا مطالبہ کر کے اس کا ایک حصہ ہو جانا چاہیے تھا۔ پھر ظلمت پسندی کو بڑھاوا دینے کا شکوہ کس سے اور کیوں؟ خیر چھوڑیے یہ بھی ہوا، مزا یہ تھا کہ افتتاح خواجہ احمد عباس کو کرنا تھا، وہ کسی وجہ سے نہ پہنچ پائے۔ راستہ بھول گئے یا منتظمین نے انھیں گاڑی وقت پر نہ بھیجی۔ خیر یہ بھی ہوا، افتتاح فرمایا جناب آنند نرائن ملا نے، جنھیں سردار جعفری نے یہ کہہ کر متعارف کرایا کہ یہ انجمن ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس میں شریک تھے، اور حاضرین پر یہ اثر پڑا گویا ملا صاحب بھی انجمن کے بانیوں میں سے ہیں۔ ملا صاحب جب کھڑے ہوئے تو انھوں نے اس غلط فہمی کا ازالہ کر دیا۔ کہنے لگے، میں تو اودھ جم خانہ لکھنؤ میں ٹینس کھیلنے گیا تھا۔ سجاد ظہیر مجھے پکڑ لے گئے کہ چلو ایک ادبی جلسہ ہو رہا ہے، اس میں شرکت کر لو۔"

ملّا صاحب میں اور عام ترقی پسندوں میں فرق یہ ہے کہ وہ ٹینس کھیلنے آتے تھے اور بیکار کے لیے پکڑے گئے یعنی ترقی پسند بنا دیئے گئے۔ عام ترقی پسندوں نے ترقی پسندی ہی کو کھیل سمجھ رکھا ہے۔

ہندوستان میں مزاح کی ترقی یا ترقی پسندی تحریر تک محدود نہیں ہے۔ عملی طور پر بھی وہاں بہت کچھ ہوتا رہتا ہے۔ آئے دن طنز و مزاح کانفرنسیں اور مزاحیہ مشاعرے منعقد ہوتے رہتے ہیں۔ کئی شہروں میں زندہ دلوں نے اپنی انجمنیں بنا رکھی ہیں جن کی رکنیت مُردہ دلوں کو بھی بآسانی مل جاتی ہے۔ انجمن زندہ دلانِ حیدرآباد تو عالمگیر شہرت کی حامل ہے اور اب بمبئی میں بھی ایک ایسی انجمن بن گئی ہے جس کے صدر یوسف ناظم ہیں۔ گویا یوسف ناظم کی ذمہ داریاں دوہری ہو گئی ہیں۔ مصنف کی حیثیت سے وہ مضامین لکھ کر لوگوں کو ہنسائیں گے اور انجمن زندہ دلانِ بمبئی کے صدر کی کرسی پر بیٹھ کر دوسروں کو ہنسنے کا ایک اور موقع مہیا کریں گے۔

ہندوستان میں کتنے مزاح نگار ہیں، اس کا فیصلہ تو وہی کر سکتے ہیں، جنھوں نے وہاں کی مردم شماری کی رپورٹ دیکھی ہے۔ لیکن اتنا ہم نے بھی جانتے ہیں کہ ڈھنگ کے لکھنے والے صرف دو ہیں، یوسف ناظم اور مجتبیٰ حسین۔ افسوس کہ ان دونوں کی کوئی کتاب پاکستان میں شائع نہیں ہوئی۔ ہمارے علم کی حد تک ان کا کبھی کوئی مضمون بھی یہاں کے کسی رسالے میں نہیں چھپا۔ پاکستان میں ہندوستانی کتابوں کو بلا اجازت چھاپنے والے ناشروں کی کمی نہیں، حیرت ہے کہ کسی ناشر نے ان دونوں مقبول مصنفوں پر ہاتھ صاف نہیں کیا۔ شاید ناشروں کو یہ خوف ہو گا کہ ان دونوں کی کتابیں فروخت نہیں ہوں گی۔ ہم خوفزدہ ناشروں کو یقین دلاتے ہیں کہ پاکستان میں یوسف ناظم اور مجتبیٰ حسین کے بے شمار رشتہ دار ہیں جو ان کی کتابوں کو بڑی تعداد میں خرید لیں گے اور اگر کچھ بچ جائیں گی تو وہ بھی غیر فروخت شدہ نہیں رہیں گی۔ مذکورہ دونوں مصنفین اس سال کے وسط میں پاکستان آ رہے ہیں۔ غیر فروخت شدہ کتابیں یہ خود خرید لیں گے۔ ان دونوں کی تمام تصانیف نہ سہی، ایک ایک نمائندہ انتخاب ضرور چھپنا چاہیے تاکہ پاکستان کے اُردو خوانوں کو معلوم ہو کہ ہندوستان میں رشید احمد صدیقی اور کنہیا لال کپور کے بعد جو خلا پیدا ہوا تھا، اس کو پُر کرنے میں کیسے کیسے باکمال کام آئے ہیں۔

پچھلے دنوں حیدرآباد دکن میں مجتبیٰ حسین کی خدمات کا اعتراف کرنے کے لیے زندہ دلانِ حیدرآباد نے ایک جلسہ منعقد کیا تھا جس میں مجتبیٰ کی حسین شخصیت اور فن پر مضامین پڑھے گئے۔ مضمون نگاروں نے موصوف کی شخصی اور ادبی خوبیوں کو اس عمدگی سے اُجاگر کیا کہ جو خوبیاں موجود نہیں تھیں، وہ بھی تلاش کر لی گئیں۔ جلسے کے آخر میں خود مجتبیٰ حسین کو تقریر کی زحمت دی گئی۔ منتظمین و حاضرین جلسہ کا خیال تھا کہ مجتبیٰ حسین انکسار سے کام لیتے ہوئے کچھ اس قسم کی باتیں کریں گے کہ میں تو کسی قابل نہ تھا لیکن آپ نے میری عزت افزائی کی اور ذرّے کو آفتاب بنا دیا۔ آپ کا یہ احسان ہمیشہ میرے سر پر رہے گا۔ لیکن مجتبیٰ حسین تو کچھ اور ہی قماش کے آدمی نکلے۔ انھوں نے اپنی تقریر کا آغاز ان الفاظ سے کیا:

> ”جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں یہ تقریبِ سعید میری خدمات کے اعتراف میں منعقد کی جا رہی ہے اور آپ مجھ سے بہتر طور پر جانتے ہیں کہ اُردو طنز و مزاح کے فروغ کے لیے میری خدمات کتنی گراں قدر، بیش بہا، لاقیمت اور لاثانی ہیں۔ مجھے اپنی لازوال خدمات کے بارے میں اچھی طرح اندازہ ہے کہ انھیں رہتی دنیا تک نہ صرف یاد رکھا جائے گا بلکہ ادب کی تاریخ میں ان کا حال سیاہ روشنائی کے نہ ملنے کی صورت میں کم از کم سنہرے حروف میں تو ضرور لکھا جائے گا۔ سچ تو یہ ہے کہ آپ میری خدمات کے اعتراف کے لیے یہاں خواہ مخواہ ہی جمع ہو گئے ہیں۔ کیونکہ جب میں خود اپنی خدمات کا اعتراف کر رہا ہوں تو میری خدمات کے اعتراف کے لیے آپ کیوں اپنی خدمات پیش کر رہے ہیں۔“

کسی شریف آدمی کو سامنے بٹھا کر اس کی تعریف کی جائے تو وہ شرمندہ ہونے کے سوا کچھ اور نہیں کر سکتا، لیکن مجتبیٰ حسین نے اپنے مداحوں کی خدمات کا اعتراف اس انداز سے کیا ہے کہ وہ دیکھتے رہ جاتے ہیں اور کو تو کیا، خود مجتبیٰ حسین کو بھی منھ دکھانے کے قابل نہیں رہے۔

مجتبیٰ حسین کے اس اعلان کے بعد کہ وہ اپنی خدمات کے اعتراف کے معاملے میں خود کفیل ہیں، ہمارا خیال تھا کہ اب انھیں کوئی آئینہ دکھانے کی جرأت نہیں کرے گا۔ لیکن یوسف ناظم اس نکتے سے بخوبی واقف ہیں کہ کسی کی خدمات کا اعتراف کرنا اسے رسوا کرنے کے مترادف ہے۔ اس لیے انھوں نے رسالہ ”کتاب نما“ دہلی کے تازہ شمارے میں مجتبیٰ حسین کا ایک گوشہ مرتب کر کے شائع کرا دیا ہے۔ اس گوشے میں شمس الرحمٰن فاروقی، ڈاکٹر وحید اختر، ڈاکٹر شمیم حنفی

اور یوسف ناظم کے مضامین شامل ہیں۔ یہ مضامین دل لگا کر لکھے گئے ہیں، حالانکہ دہلی میں دل لگانے کے لیے مجتبیٰ حسین سے بہتر چیزیں بھی موجود ہیں۔

شمس الرحمٰن فاروقی نے مجتبیٰ حسین کی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے ان کے بعض ہم عصروں کی صلاحیتوں اور دلچسپیوں پر شبہ ان الفاظ میں کیا ہے:

"پچھلے بیس برسوں میں ہم نے بہت سے نئے ادیبوں سے توقعات وابستہ کیں اور ان میں سے اکثر نے بعد میں مایوس کیا۔ یہ بھی ہمارے زمانے کا المیہ ہے کہ لوگوں کے شعلے بہت جلد بجھ جاتے ہیں یا شاید اب کے لوگ کاروبار ادب میں روحانی اور داخلی منفعت کے بجائے شہرت اور مالی منفعت زیادہ تلاش کرتے ہیں۔ بات جو بھی ہو، میری کتابوں کی الماریاں ایسے مجموعوں سے بھری پڑی ہیں، جن میں شامل تحریروں کے لکھنے والے آج یا تو خاموش ہیں یا پہلے سے بھی بہت خراب لکھ رہے ہیں۔"

اس اقتباس کے آخری الفاظ قابل توجہ ہیں، "پہلے سے بھی بہت خراب لکھ رہے ہیں"۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ فاروقی نے ان لوگوں سے توقعات وابستہ کیں جنھیں اچھا لکھنے کی توفیق نہیں ہوئی۔ اس پر مستزاد یہ کہ فاروقی نے ان لوگوں کی کتابوں سے اپنی الماریاں بھر رکھی ہیں۔ موصوف ہمارے عہد کے ایک بڑے نقاد ہیں، اس لیے توقع تھی کہ ان کا کتب خانہ ان کے شایان شان ہوگا۔ اب کھلا کہ اچھا نقاد بننے کے لیے ضروری ہے کہ نہ صرف خراب کتابیں پڑھی جائیں بلکہ انھیں سنبھال کر بھی رکھا جائے۔

ڈاکٹر وحید اختر نے حیدرآباد (دکن) کو مجتبیٰ حسین کا شناس نامہ قرار دیا ہے اور اسی حوالے سے ان کی شخصیت اور فن کو دیکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"اگر مجتبیٰ کے انشائیوں، خاکوں اور سفرناموں کو بہ نظر غائر پڑھا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ ہر شخص، ہر واقعے اور ہر ادبی حادثے کو حیدرآبادی اُردو تہذیب کی عینک سے دیکھتے اور اسی سیر بین سے دوسروں کو دکھاتے ہیں۔ جاپان کے سفر کی روداد میں گو حیدرآباد براہ راست موضوع نہیں بنتا، تب بھی ایک حیدرآبادی بخوبی سمجھ سکتا ہے کہ اگر وہ دنیا کے کسی خطے کی سیر کو نکلے تو اسی نظر سے اسے دیکھے گا

جس نظر سے مجتبیٰ نے جاپان کو دیکھا اور بیان کیا۔ مجتبیٰ کی تحریروں میں حیدرآباد رچا بسا ہے لیکن اسی طرح جیسے پھول کی پتی میں خوشبو اور رنگ رچے بسے ہوتے ہیں۔"

حیدرآباد سے مجتبیٰ حسین کی محبت کا ہمیں ذاتی تجربہ بھی ہے۔ دو سال پہلے دہلی میں ان سے ملاقات ہوئی تو کہنے لگے:

"آپ نے ہندوستان کے کئی شہر دیکھے لیکن حیدرآباد نہیں دیکھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے کچھ نہیں دیکھا۔ آپ وہاں ضرور جائیے تاکہ آپ کو معلوم ہو کہ تہذیب اور شائستگی کسے کہتے ہیں۔ اخراجات کی فکر نہ کیجیے، ہوائی جہاز کا کرایہ ایک یتیم خانے سے دلوادوں گا۔ سیاست کے ایڈیٹر عابد علی خان کو فون کر دوں گا، وہ آپ کے قیام کا انتظام کر دیں گے۔ طعام کی آپ کو فکر نہیں کرنی چاہیے۔ حیدرآباد والے بڑے وضعدار ہیں، وہ کسی ضرورت مند کو بھوکا نہیں مرنے دیتے۔"

ہم نے اس پیشکش کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا، "دو ماہ کے مسلسل سفر کی وجہ سے اتنی تھکن ہو گئی ہے کہ مزید سفر میں جان کے زیاں کا اندیشہ ہے۔" اس کے جواب میں انھوں نے فرمایا، "اس کی بھی آپ فکر نہ کریں، شاہ نصیر دہلوی کے مزار کے پاس خاصی جگہ خالی ہے، کفن دفن پر بھی آپ کا کچھ خرچ نہیں ہوگا۔ میں ڈاکٹر مغنی تبسم کو فون کر دوں گا، وہ سب انتظام کر دیں گے، کہ اس قسم کے کاموں میں وہ بہت ماہر ہیں اور پھر یہ فائدہ بھی ہوگا کہ آپ کو اپنے ملک واپس جانے پر جو رقم خرچ کرنی ہے، وہ بچ جائے گی۔"

(۲۱ر جنوری ۱۹۸۸ء)

کلاسیکی شاعری کی بازیافت

جس زمانے میں ابن انشا مرحوم نیشنل بک کونسل کے سربراہ تھے، انھوں نے لوگوں کی عاداتِ مطالعہ کے بارے میں ایک سروے کرایا تھا۔ زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے ایک ہزار افراد سے سوال کیا تھا کہ آپ کیا پڑھتے ہیں۔ عام لوگوں کے جوابات تو عام قسم کے تھے کہ ہم ڈائجسٹ پڑھتے ہیں، اسلامی تاریخی ناول پڑھتے ہیں، کھانا پکانے کی [illegible] کتابیں پڑھتے ہیں۔ لیکن خاص لوگوں، یعنی ادب کے وابستگان یا پس ماندگان کے جوابات خاص الخاص قسم کے تھے۔ ان میں سے جو ہمیں یاد رہ گئے ہیں وہ آپ بھی سن لیجیے اور یہ دیکھیے کہ [illegible] ادب کیا کچھ پڑھتے تھے۔

ایک شاعر: صرف مشاعرے پڑھتا ہوں۔

ایک جدید شاعر: ہم عصر اور ہم عمر شاعروں کی کتابوں کے فلیپ پڑھتا ہوں۔

ایک نقاد: خود اپنی ہی تصانیف پڑھتا ہوں تاکہ کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ تنقید پڑھی نہیں جاتی۔

ایک ناول نگار: لکھنے ہی سے فرصت نہیں ملتی، پڑھنے کے لیے وقت کہاں سے آئے۔

ایک افسانہ نگار: افسانہ نگار کا کام مطالعہ نہیں مشاہدہ ہے۔

ادبی رسالے کا ایک ایڈیٹر: میرا کام رسالہ مرتب کرنا ہے۔ پڑھنا سالانہ خریداروں کا کام ہے۔

آپ ان جوابات کو ہمارے زورِ قلم کا نتیجہ نہ سمجھیے، ہم نے صرف اتنا کیا ہے کہ جواب دینے والوں کے نام ظاہر نہیں کیے کہ اہلِ نظر خود ہی پہچان لیں گے کہ کون سا جواب کس "مشہور" ادیب کا ہے۔ "مشہور" کا سابقہ ہم نے اس لیے استعمال کیا ہے کہ اب ادب میں بنیادی [illegible] شہرت کی ہے، باقی سب کچھ بے بنیاد ہے۔

اس صورتِ حال کا سب سے زیادہ افسوس استاد لاغر مرادآبادی کو ہے۔ ایک دن انھوں

[illegible] فرمایا: "آجکل کے ادیبوں کی حالت دیکھ کر دکھ ہوتا۔ کسی کو مطالعے کا شوق نہیں۔ کسی بھی نئے شاعر سے پوچھ لیجیے کہ اس نے مصحفی، قائم یا میر سوز کا کلام پڑھا ہے۔ کلام پڑھنا تو کجا، ان بے [illegible] نے ان کا نام بھی نہیں سنا ہوگا۔ میں جب استاد عبث امروہوی کی شاگردی اختیار کرنے [illegible] ان کی خدمت میں حاضر ہوا تھا تو انھوں نے شاگردوں کے رجسٹر میں نام مع ولدیت کا [illegible] کرنے سے پہلے شرط لگادی تھی کہ میں کم از کم ایک سو پرانے شاعروں کے دواوین کا مطالعہ [illegible] میں نے دو سال تک ان کے دواوین کا مطالعہ کیا۔ استاد کی خدمت میں حاضر ہوا تو انھوں [illegible] کلیات میر پڑھی؟ عرض کیا، ایک مرتبہ نہیں دو مرتبہ پڑھی۔ فرمایا، کون سا ایڈیشن؟ میں [illegible] کشوری ایڈیشن کا نام لیا تو انھوں نے غصے میں میرے بارے میں نا ملائم الفاظ استعمال [illegible] فرمایا، تو نے وقت ضائع کیا۔ نول کشوری ایڈیشن تو متن کے اعتبار سے غیر مستند [illegible] اس کا پڑھنا نہ پڑھنا برابر ہے۔ فورٹ ولیم کالج کا ایڈیشن پڑھ کر آؤ گے تو شاگردوں کے [illegible] نام لکھوں گا۔ میں نے بصد وقت یہ ایڈیشن حاصل کیا، اسے پڑھ کر شاگردوں کے رجسٹر [illegible] لکھوایا۔ ہمارے زمانے میں استاد ایسے تھے کہ شاگرد کو خاک سے پاک کر دیتے تھے۔"

[illegible] طویل بیان سن کر ہم نے کہا، "اور آج کل کے استاد آپ ہیں کہ خاک کو خاک ہی رہنے [illegible]"

"خاک کو خاک ہی رہنے پر اصرار ہو تو میں کیا کر سکتا ہوں۔" استاد نے فرمایا، "مجھ سے [illegible] تک ہو سکتا ہے کوشش کرتا ہوں کہ نئے شاعروں کو قدیم ادب کے مطالعے پر آمادہ [illegible] لیکن ہمارے نئے شاعر اپنے آپ کو پرانے شاعروں سے بہتر سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ [illegible] کو کیا معلوم کہ شاعری کیا ہوتی ہے۔ شعر تو ہم کہتے ہیں۔ اب بتائیے ایسے برخود غلط [illegible] کو کون سمجھائے۔"

استاد نے مزید فرمایا، "مطالعہ نہ کرنے کی وجہ سے ہمارے شاعروں میں ہزار طرح کے [illegible] جاتے ہیں۔ کوئی بحر رجز میں بحر رمل ڈال کے شعر کہتا ہے۔ کوئی لفظوں کو اپنے شعروں [illegible] جمع کر دیتا ہے جیسے ردی کی ٹوکری میں بیکار چیزیں ڈالی جاتی ہیں۔ اگر ان کو کسی غلطی [illegible] کہتے ہیں، ہم اسی کو درست سمجھتے ہیں۔ غلط کو درست سمجھنا ادبی اعتبار ہی سے نہیں [illegible] اعتبار سے بھی قابل افسوس ہے۔"

ہم نے استاد سے بصد ادب گزارش کی، "نئے شاعر پرانے شاعروں کو اس لیے نہیں پڑھتے کہ پرانے شاعروں کا کلام عام طور پر دستیاب نہیں ہوتا۔ بس ایک آپ کا کلام بازار میں ملتا ہے اور اسے وقت تک پڑھنا ممکن نہیں جب تک تائید ایزدی حاصل نہ ہو۔"

"میر اکلام نہ پڑھیں میر، قائم، مصحفی، مومن، ذوق، شیفتہ اور شاہ نصیر کو پڑھیں۔ خدا بخشے سید امتیاز علی تاج کو، انھوں نے بہت سے پرانے شاعروں کے دیوان شائع کر دیے تھے جو مجلس ترقی ادب لاہور کے گودام میں منوں اور ٹنوں کے حساب سے دستیاب ہیں۔"

ہم نے عرض کیا، "پڑھنے والے کے نازک کندھوں پر اتنا بوجھ لادنا مناسب نہ ہوگا۔ ضرورت اس کی ہے کہ پرانے شاعروں کا ایک انتخاب شائع کیا جائے۔"

استاد نے فرمایا، "یہ کام بھی ہو گیا ہے۔ کیا آپ کی نظر سے محترمہ ادا جعفری کی کتاب "غزل نما" نہیں گزری؟"

"یہ تو ان کا مجموعۂ کلام ہوگا۔"

"جی نہیں، یہ اردو کے کلاسیکی شاعروں کی غزلوں کا انتخاب ہے، اگر موقع ملے تو اسے ضرور دیکھیے۔"

استاد کی سفارش پر ہم عموماً کسی کتاب کو نہیں دیکھتے، مگر محترمہ ادا جعفری، کہ ہمارے عہد کی ایک بڑی شاعرہ ہیں، ان کا نام سن کر کتاب حاصل کرنی ہی پڑی۔ دیکھ کر جی خوش ہو گیا۔ اس انتخاب میں ۷۳ شاعروں کے کلام کا انتخاب ہے۔ پہلا شاعر قلی قطب شاہ ہے جو گولکنڈہ کا فرماں روا تھا اور جس کا یہ شعر مشہور ہے۔

پیا باج پیالہ پیا جائے نا
پیا باج یک پل جیا جائے نا

اور آخری شاعر میاں داد خاں سیاح ہے جو غالب کا شاگرد تھا اور جعلی سکے بنانے کے جرم میں چودہ برسوں کے لیے قید خانے بھیج دیا گیا تھا۔ سیاح بھلے سے جعلی سکے بناتا رہا ہو، لیکن شعر کھرے کہتا تھا۔ "غزل نما" سے ہمیں پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ یہ مشہور شعر اسی کا ہے۔

قیس جنگل میں اکیلا ہے مجھے جانے دو
خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو

محترمہ ادا جعفری نے یہ طریق کار اختیار کیا ہے کہ پہلے ہر شاعر کے مختصر حالات لکھے ہیں اور پھر انتخاب کلام درج کیا ہے۔ محترمہ کے اعلیٰ ذوق سخن کا اندازہ ہمیں ان کی شاعری سے تو تھا ہی، زیر نظر انتخاب سے اس کی مزید تصدیق ہو گئی۔ کتاب کے دیباچے میں محترمہ نے بڑی عمدہ بات کہی ہے کہ "مجھے تو ان اشعار کا انتخاب کرتے ہوئے کچھ ایسا احساس بھی رہا کہ یہ میر اور آج اکیسویں صدی کا اواخر تک سانس لینے والے ہر شاعر کا شجرۂ نسب ہے۔"

شاعروں کے اس شجرۂ نسب میں عام قاری کے لیے بھی بہت کچھ ہے۔ سب سے پہلی بات تو یہ کہ اس انتخاب میں گزشتہ تین صدیوں کے ایسے متعدد شعراء کا کلام مل جاتا ہے جنھوں نے اردو غزل کی آبیاری کی۔ دوسری بات یہ کہ کلام کا انتخاب کرتے ہوئے اس کا خیال رکھا گیا ہے کہ اگر شعر جہاں ایک طرف شاعر کے انفرادی رنگِ سخن کے آئینہ دار ہوں، وہیں دوسری طرف آج کے قاری کے مذاق و مزاج کے لیے اجنبی نہ ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کتاب کے ہر صفحے پر دامن کش دل شعر نظر آتے ہیں۔

اس صدی کے شروع میں مولانا حسرت موہانی نے اردو غزل کا ایک ضخیم انتخاب "انتخاب کلام" کے نام سے شائع کیا تھا جس میں ہر عہد کے اساتذہ اور ان کے شاگردوں کا کلام پیش کیا گیا تھا۔ یہ انتخاب اب نایاب ہے۔ سنا ہے کہ ہندوستان میں اسے تیرہ یا چودہ جلدوں میں دوبارہ شائع کیا گیا ہے۔ مولانا حسرت موہانی نے باقاعدہ منصوبہ بندی کر کے سالہا سال کی محنت کے بعد یہ انتخاب تیار کیا تھا۔ محترمہ ادا جعفری نے کسی قسم کی منصوبہ بندی نہیں کی، اس لیے کہ مولانا حسرت کی طرح بہت سے دواوین ان کی دسترس میں نہیں۔ انھوں نے یہ کیا ہے کہ جو دیوان جس ترتیب سے ان کے مطالعے میں آتے رہے، ان میں سے اچھے شعروں کا انتخاب کر دیا۔ یہ سلسلہ جاری ہے۔ ابھی اس انتخاب کی پہلی جلد شائع ہوئی ہے، شاید دس بارہ جلدوں میں یہ کام مکمل ہوگا۔ تب ہم کہہ سکیں گے کہ محترمہ ادا جعفری نے مولانا حسرت موہانی کی طرح اردو کی کلاسیکی شاعری کو محفوظ کرنے کا فرض ادا کیا ہے۔

(۴ فروری ۱۹۸۸ء)

سہیل عمر لفظوں سے قاری کو سنگسار کر دیتے ہیں

جو لوگ محمد سہیل عمر کی صوفیانہ مشغولیات، علمی مصروفیات اور ان کے رسالے ''روایت'' کے مندرجات سے غائبانہ واقفیت رکھتے ہیں، جب وہ پہلی مرتبہ ان سے ملتے ہیں تو ان کی کم سنی کو دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں۔ خود ہمارا حال یہ ہے کہ جب ان سے پہلی بار ملے تو انھیں محمد سہیل عمر کا صاحبزادہ سمجھے اور انھیں خاصی دیر تک سمجھاتے رہے کہ اے عزیز آپ کو بھی اپنے بزرگوار کی طرح پڑھنے لکھنے کے کاموں سے دلچسپی لینی چاہیے۔ ہماری نصیحتوں پر عمل کرنے کا وعدہ کرتے ہوئے انھوں نے جب انکشاف کیا کہ وہ خود ہی محمد سہیل عمر ہیں تو ہمیں حیرت بھی ہوئی اور شرمندگی بھی۔ حیرت اس پر کہ وہ اپنی عمر سے خاصے آگے نکل گئے ہیں، اور شرمندگی اس پر کہ انھوں نے ہماری نصیحتوں پر عمل کرنے کا وعدہ کر لیا۔ یہ وعدہ پورا کرنے کی خدا انھیں توفیق دے! اسی پہلی ملاقات کے بعد ہی ہم نے سہیل عمر کے بارے میں وہ کالم لکھا تھا جس کا عنوان غالب کا یہ مصرع تھا:

ع طفل خود معاملہ قد سے عصا بلند

اس حوالے سے سہیل عمر اور غالب دونوں کی شہرت میں اضافہ ہوا تھا۔

سہیل عمر نے یوں تو بہت سے اچھے اچھے کام کیے ہیں لیکن ان کا سب سے اچھا کام یہ ہے کہ دوسروں کو علمی کاموں پر اکساتے ہیں بلکہ ورغلاتے ہیں۔ انھوں نے بعض ایسے لوگوں کو بھی علمی کاموں پر لگا دیا ہے جو غیر علمی کام کرنے کی بھی صلاحیت نہیں رکھتے تھے، اس شغل کی وجہ سے وہ خود ذرا کم ہی لکھتے ہیں اور جب لکھتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے قاری کو سنگسار کر رہے ہوں۔ اُن کی تحریر کا ایک نمونہ ملاحظہ کیجیے:

''انسان اپنی ذات میں مجموعہ ہے جسم، نفس اور روح کا۔ نفس اصول حرکت و تغیر ہے۔ روح اصول سکون ہے اور غیر متغیر ہے۔ نفس کو ان تینوں میں ایک حصرف برزخیت حاصل ہے۔ روح کا تعلق نفس کی فاعلی جہت سے ہو تو خرد

پیدا ہوتی ہے اور اگر انفعالی جہت بروئے کار آئے تو عقل پیدا ہوتی ہے کیونکہ روح فی اصلہٖ العقل کا محل ہے۔''

اس اقتباس میں شاید عقل کے پیدا ہونے کی بات کی جا رہی ہے لیکن اس سنگین عبارت کو پڑھتے ہوئے عقل کے ماؤف ہونے کا احساس ہوتا رہا۔ اچھا ہی ہے کہ سہیل عمر کم لکھتے ہیں، اگر خدانخواستہ انھوں نے زیادہ لکھا ہوتا تو اکادمی ادبیات کو قارئین کی حفاظت کے لیے کوئی معقول انتظام کرنا پڑتا۔ یہ دوسری بات ہے کہ اکادمی معقول اور نامعقول کی بحث میں پڑے بغیر اپنے فرائض انجام دیتی ہے۔

سہیل عمر علمی ہی نہیں عملی آدمی بھی ہیں۔ اقبال اکیڈیمی کے ڈپٹی ڈائریکٹر کی حیثیت سے ان کی عملی صلاحیتوں کا بخوبی اظہار ہوا ہے۔ پہلے یہ کہا جاتا تھا کہ لاہور میں علامہ اقبال کے دو مزار ہیں، ایک تو وہ ہے جو بادشاہی مسجد کے صدر دروازے کے قریب ہے اور دوسرا وہ جسے اقبال اکیڈیمی کہا جاتا ہے۔ لیکن اب اقبال اکیڈیمی کو مزار نہیں کہا جا سکتا، یہ صوفی سہیل عمر کی خانقاہ ہے۔ گزشتہ تین برسوں میں اکیڈیمی نے خوبصورت اور خوب سیرت کتابیں بڑی تعداد میں شائع کی ہیں۔ اگر یہ کتابیں فروخت نہ ہوں تو بھی ان سے یہ مفید کام لیا جا سکتا ہے کہ مینار پاکستان کے قریب ہی ایک ''کتب مینار'' تعمیر کیا جا سکتا ہے۔ فن تعمیر کی تاریخ میں یہ پہلا موقع ہوگا کہ کسی عمارت کی تعمیر میں اینٹ یا پتھر کی بجائے کتابیں استعمال کی جائیں گی۔ دوسرے علمی اداروں کو بھی اس قسم کے تعمیری کام کرنے چاہئیں۔ جب کتابیں فروخت نہ ہوں تو ان کا کوئی دوسرا مصرف ضرور ہونا چاہیے۔

سہیل عمر کا تازہ ترین کارنامہ ''روایت'' کا سلیم احمد نمبر ہے جو دو ضخیم جلدوں میں شائع ہوا ہے۔ سلیم احمد ایک فرد کا نام ضرور ہے لیکن یہ فرد اپنی ذات سے ایک انجمن تھا۔ انجمن ہی نہیں چراغ انجمن افروز بھی۔ جوں جوں وقت گزرتا جا رہا ہے سلیم احمد کی کمی پہلے سے زیادہ شدت سے محسوس ہوتی ہے۔ سلیم احمد یوں تو پوری اُردو دنیا کی رونق تھے، لیکن شہر کراچی تو ان کے بغیر خانہ بے چراغ ہے۔ محمد صلاح الدین صاحب نے ٹھیک ہی تو لکھا تھا کہ وہ...... ''بجائے خود ایک ادبی تحریک تھے۔ ایک ادارہ اور انجمن تھے۔ انھوں نے سینکڑوں نوجوانوں کی تخلیقی صلاحیتوں کو جلا بخشی۔ ان کی تحریروں کو نکھارا اور سنوارا اور انھیں فن شعر گوئی کی تربیت دی۔ ان کا گھر ادب کی

تربیت گاہ تھی۔ انھوں نے اپنے مدرسہ شعر و ادب کے ذریعے تنہا وہ کام انجام دیا جو ہماری عالی شان درس گاہیں اور نامور ادارے بھی انجام نہیں دے پائے۔ ان کی علمی مجلس محض شعر و ادب کی محفل نہ تھی، زندگی کے ٹھوس سیاسی، معاشی، تعلیمی اور تہذیبی مسائل بھی یہاں زیرِ بحث آتے۔ ہر طبقۂ خیال اور ہر نقطۂ نظر کے لوگ یہاں جمع ہوتے اور آزادانہ تبادلۂ خیال کی کھلی فضا میں اظہار رائے کرتے۔"

سہیل عمر نے سلیم احمد کی شخصیت اور فن کی تفہیم کے لیے "روایت" کا سلیم احمد نمبر شائع کر کے محض ایک فرد کو خراجِ عقیدت پیش نہیں کیا بلکہ پورے ایک ادبی دور کی تاریخ ایک کر دی ہے۔ اس نمبر کے پہلے حصے میں شخصیت سے متعلق مضامین ہیں۔ سلیم احمد نے اپنے خاندان اور گھر کے حوالے سے وہ داستان سنائی ہے جو بھائی ہونے کی حیثیت سے صرف وہی سنا سکتے تھے۔ عزیز حامد مدنی، مظفر علی سید، نظیر صدیقی، ڈاکٹر اسلم فرخی اور انتظار حسین نے اپنی یادوں کے چراغ جلائے ہیں۔ ان سب نے اپنے اپنے زاویے سے سلیم احمد کی تصویر کشی کی ہے۔ یہ سب تصویریں مل کر سلیم احمد کی مکمل شخصیت کو سامنے لاتی ہیں۔ سلیم احمد کے بہت سے خطوط بھی شائع کیے گئے ہیں۔ ان سے وہ ایک صاحبِ طرز مکتوب نگار کی حیثیت سے متعارف ہوتے ہیں۔ ان خطوط میں ذاتی باتیں کم ہیں، ادبی مسائل پر گفتگو زیادہ ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ سلیم احمد کی ذاتی زندگی، ادبی زندگی میں اس طرح گھل مل گئی تھی کہ ادب ہی ان کی ذات بن گیا تھا۔ سلیم احمد کے کچھ نمائندہ کالم بھی "روایت" کے اس حصے میں شامل ہیں۔ ان کی کالم نگاری کے بارے میں طاہر مسعود نے ایک اچھا تجزیاتی مقالہ لکھا ہے۔

اس نمبر کا دوسرا حصہ سلیم احمد کی شاعری اور تنقید کے لیے وقف ہے۔ اس میں کلام اور تنقیدی مضامین کا انتخاب بھی ہے اور تقریباً ڈیڑھ درجن نقادوں کے مضامین بھی ہیں جنھوں نے سلیم احمد کے تخلیقی اور تنقیدی کاموں کا جائزہ لیا ہے۔

یہ نمبر اپنی گوناگوں خصوصیات کی بنا پر ہر اس شخص کی نظر سے گزرنا چاہیے جسے اُردو ادب کے جدید رجحانات سے دلچسپی ہے۔ سلیم احمد کے حوالے کے بغیر ان رجحانات کو سمجھنا ممکن نہیں۔

(۱۱ر فروری ۱۹۸۸ء)

صحافت اور گھوڑے کا اخلاق

مسعود حسن شہاب دہلوی بہاولپور کی معروف شخصیت ہیں۔ شاعر بھی ہیں اور صحافی بھی۔ ... سے تک تیل بیچنے کا کاروبار بھی کیا جو شاعری اور صحافت سے زیادہ منافع بخش تھا، لیکن تیل ... وہ لذت نہیں جو شاعری اور صحافت میں ہے، اس لیے اپنی اصل کی طرف لوٹ گئے۔ اب ماشاء ... شہاب شاعر بھی ہیں اور کامیاب صحافی بھی۔ لیکن ان جیسے شاعر اور صحافی ہمارے ملک میں ... ہیں۔ شہاب صاحب نے شاعری کے ذریعے اپنا کوئی ادبی مقام بنایا نہ صحافت کے ... جائیداد۔ دیانتداری کو شعار بنانے والوں کا یہی انجام ہوتا ہے!

شہاب صاحب کے شاعر بننے کا واقعہ دلچسپ ہے۔ ان کے گھر عورتوں کا مشہور ... صمت" آتا تھا، اُن کی نظر سے بھی گزرتا تھا۔ شہاب صاحب اس رسالے سے اتنے متاثر ... شاعری شروع کر دی۔ ہم نے یہ تو سنا تھا کہ بعض لوگ عورتوں کو دیکھ کر شاعر بن جاتے ... یہ پہلی مرتبہ سنا کہ عورتوں کے رسالے کو دیکھ کر بھی شاعری کی جا سکتی ہے۔

شہاب صاحب کے صحافی بننے کا واقعہ بھی خاصا دلچسپ ہے۔ انھوں نے اپنی ایک غزل "ساقی" ... کے لیے شاہد احمد دہلوی کو بھیجی۔ شاہد صاحب نے اس غزل کو ناقابلِ اشاعت قرار دے کر ... شہاب صاحب کو اس پر اتنا غصہ آیا کہ انھوں نے اسی وقت طے کر لیا کہ وہ خود ایک رسالہ ... گے تاکہ کم از کم ایک ایڈیٹر ایسا ہو جو ان کی غزل واپس کرنے کی جرأت نہ کر سکے۔

شہاب صاحب جو کچھ سوچتے ہیں اس پر عمل بھی کرتے ہیں۔ انھوں نے "الہام" کے نام سے ایک ... جاری کر دیا۔ کچھ دنوں میں انھیں اندازہ ہوا کہ ادب کے نام پر ایڈیٹر تو چل سکتا ہے، رسالہ نہیں چل ... انھوں نے رسالے کو چلانے کے لیے جو کچھ کیا اس کی تفصیل بھی انھیں کی زبانی سن لیجیے:

"۱۹۴۴ء میں "الہام" کی صوری و معنوی حیثیت میں تبدیلیاں کرنے کا ... کیا تاکہ رسالے سے کچھ منفعت کی صورت پیدا ہو سکے۔ اس غرض کے لیے

عام مذاق کے رنگین سرورق کے ساتھ فلمی ستاروں کی تصاویر اور بعض ہیجان انگیز مضامین شائع کرانے کا اہتمام کیا جس کے بعد پرچے کی سرکولیشن کہیں سے کہیں پہنچ گئی اور اشتہارات کی تعداد میں بھی معتد بہ اضافہ ہوا۔"

ہمیں یقین ہے کہ ہیجان انگیز مضامین کی اشاعت کے بعد رسالے کی سرکولیشن کی طرح اس کے قارئین بھی کہیں سے کہیں پہنچ جاتے ہوں گے!

اوپر کی سطروں میں ہم نے جو کچھ لکھا ہے اسے ہماری جولانی طبع کا نتیجہ نہ سمجھا جائے۔ یہ سب باتیں ہم نے شہاب دہلوی کی آپ بیتی "وادیِ جمنا سے وادیِ ہاکڑہ تک" سے اخذ کی ہیں۔ وادیِ جمنا سے مراد دہلی ہے اور وادیِ ہاکڑہ سے بہاولپور۔ ہاکڑہ ایک دریا کا نام ہے جو زمانہ قدیم میں بہاولپور کے قریب بہتا تھا اور اب خشک ہو چکا ہے۔ جمنا بھی ایک دریا کا نام ہے جو شہاب صاحب کی کتاب کی اشاعت سے پہلے تو موجود تھا، معلوم نہیں اب بھی موجود ہے یا خشک ہو چکا ہے۔ بہرحال ان دریاؤں کے خشک ہو جانے کی تلافی شہاب صاحب کی کتاب سے ہو جاتی ہے۔ انھوں نے اتنی رواں دواں نثر لکھی ہے کہ اس کے سامنے دریاؤں کی روانی ماند پڑ جاتی ہے۔ ہم نے ان کی کتاب ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالی اور اس مشکل میں پڑ گئے کہ اس کتاب کی کس بات کا ذکر اپنے کالم میں کریں اور کس کا نہ کریں۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسی دلچسپ کتابیں اردو میں کم لکھی گئی ہیں، مگر افسوس کہ ایسی کتابیں کم پڑھی جاتی ہیں۔ ہم نے کسی پڑھے لکھے آدمی سے اس کا ذکر نہیں سنا اور ہم بھی اس لیے ذکر کر رہے ہیں کہ ہمارا شمار پڑھے لکھوں میں نہیں ہوتا۔

اس کتاب کے دو حصے ہیں، ایک کا تعلق دہلی سے ہے اور دوسرے کا بہاولپور سے۔ شہاب صاحب نے اپنے زمانے کی ادبی و ثقافتی زندگی کی خوبصورت عکاسی کی ہے۔ اہل علم و ادب کے حوالے سے انھوں نے نہ صرف یہ کہ بیش بہا معلومات پیش کی ہیں، بلکہ ایسے بہت سے تاریخی واقعات کو بھی صفحہ قرطاس پر محفوظ کر دیا ہے جو شاید ہی کسی کو معلوم ہوں۔ مثلاً دہلی کی صحافت کا ذکر کرتے ہوئے اخبار "جنگ" کے بارے میں وہ لکھتے ہیں: "جنگ، محض کاروباری نوعیت کا اخبار تھا۔ یہ ایڈیٹوریل کا تکلف بھی نہیں کرتا تھا۔ میر خلیل الرحمٰن اشتہارات کے حصول کے لیے وقف تھے۔ میری ان سے اکثر ملاقات فلم پروڈیوسرز کے دفتر میں ہو جاتی تھی جہاں میں بھی اپنے اخبار کے لیے اشتہارات لینے جاتا تھا۔" اب صورت حال خدا کے فضل سے برعکس ہے، "جنگ" میں

اداریہ بھی ہوتا ہے اور اشتہار بھی۔ بس ذرا ان دونوں میں فرق کرنا مشکل ہوتا ہے۔

شہاب صاحب نے حکیم محمد سعید سے اپنی پہلی ملاقات کی روداد بہت دلچسپ پیرائے میں بیان کی ہے۔ شہاب صاحب نے اپنے اخبار کے لیے اشتہار مانگا۔ حکیم صاحب نے شربت روح افزا پر ایک نظم لکھنے کی فرمائش کر دی۔ شہاب صاحب کو پہلی بار معلوم ہوا کہ شاعری کا کوئی افادی پہلو بھی ہے۔ انھوں نے روح افزا کی تعریف میں نہایت شیریں نظم تصنیف کر ڈالی۔ حکیم صاحب نے اس نظم کو شہاب صاحب کے اخبار کے علاوہ دیگر اخباروں میں بھی چھپوایا۔ شہاب صاحب نے اس نظم کو اپنی زیر نظر کتاب میں بھی شامل کیا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ روح افزا میں بھیگی ہوئی اس نظم کو اپنے کالم میں نقل کریں، لیکن یہ خیال مانع ہے کہ اشتہار کی اجرت تو شہاب صاحب وصول کر چکے، ہم کس امید پر نظم کو نقل کرنے کی محنت کریں؟

پرانی یادوں کو تازہ کرتے ہوئے شہاب صاحب نے بتایا ہے کہ آج کل کے صحافی تو حکومت اور مشتہرین کے اشارے پر چلتے ہیں، لیکن پرانے صحافی اصولوں پر چلتے تھے۔ اس کی ایک مثال ملاحظہ ہو:

> "ایک زمانے میں عزیز حسن بقائی مدیر "پیشوا" سے سردار علی صابری کی کھٹ پٹ ہو گئی اور مقدمہ عدالت میں چلا گیا...... یہ دونوں صاحبان جامع مسجد سے ایک تانگے میں بیٹھ کر کچہری جاتے اور ایک ہی تانگے میں واپس آتے۔ راستے بھر ایک دوسرے سے کوئی بات نہ کرتے، لیکن جونہی تانگے سے اترتے تو دونوں ایک دوسرے کو بے نقط کی سناتے۔"

افسوس کہ آج کل وہ تانگے ہی نہیں رہے جن میں بیٹھ کر صحافی بااصول بن جاتے تھے۔ ہمارا خیال ہے کہ بااصول ہونے سے زیادہ یہ معاملہ وضع داری کا تھا۔ دونوں صحافی تانگے میں بیٹھ کر ایک دوسرے کو گالیاں اس لیے نہیں دیتے ہوں گے کہ کہیں گالیاں سن کر تانگے بان یا اس کے گھوڑے کا اخلاق خراب نہ ہو جائے۔ اپنے اخلاق کی انھیں اس لیے پروا نہیں ہوگی کہ وہ پہلے ہی خراب ہو چکا تھا۔

ایک زمانے میں ادبی محاذ پر دلی اور آگرے کا جھگڑا چلا تھا۔ شہاب صاحب نے اس کی روداد بھی درج کتاب کی ہے۔ عظیم بیگ چغتائی آگرے کے طرفدار تھے، انھوں نے لکھا تھا، "دلی کی [illegible] ہیروں نے ہی کی ہے اور کریں گے۔ میر خاص آگرے کے باشندے، آگرے میں

پیدا ہوئے، پلے بڑھے اور وہیں شاعری کی۔ دلی جو پہنچے تو کھٹ سے دہلوی۔ غالب خاص آگرے کے رہنے والے، دلی پہنچے، نوکری کی، کرائے کے مکان میں رہے اور کھٹ سے دہلوی۔ نذیر احمد بجنور کے رہنے والے، دلی آکر حاکم ادب ہوئے اور کھٹ سے دہلوی۔"

شہاب صاحب نے مرزا عظیم بیگ چغتائی کا مضمون اپنے اخبار میں چھاپا اور مرزا صاحب کے ہر دعوے کا ترکی بہ ترکی جواب لکھا۔ پہلے تو انھوں نے یہ بتایا کہ میر سے بہتر سودا تھے اور غالب سے بہتر مومن۔ مومن کے سامنے غالب کی غلط اردو، مہمل نویسی اور مسروقہ مضامین سب ہیچ پوچ ہیں۔ رہے ڈپٹی نذیر احمد تو ان سے بہتر مرزا حیرت دہلوی تھے جنھوں نے ڈپٹی صاحب کو ناکوں چنے چبوا دیئے تھے۔ ان ارشادات کے بعد یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ شہاب دہلوی نے بھی مرزا عظیم بیگ چغتائی کو ناکوں چنے چبوا دیئے۔

"وادیٔ جمنا سے وادیٔ ہاکڑہ تک" روایتی آپ بیتی تو نہیں ہے مگر پہلے خاندان اور خاندانی روایات کا تذکرہ ہوا اور پھر تعلیم کا۔ شہاب صاحب نے خاندان کے بعض سربرآوردہ افراد کا ذکر تو کہیں کیا ہے لیکن اپنی تعلیم کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ اور یہ بتانے کی ضرورت بھی نہیں تھی کہ شاعر اور صحافی ہونے کا مطلب ہی یہ ہے کہ آدمی تعلیم یافتہ ہے۔ شہاب صاحب نے داستان حیات کا آغاز اپنی شادی سے کیا ہے اور اس پر فخر کیا ہے کہ ان کی شادی ۱۹۴۷ء کے فسادات کے زمانے میں کرفیو کے دوران ہوئی اور باراتیوں کے لیے انھیں کرفیو پاس حاصل کرنے پڑے۔ اگر شہاب صاحب کی شادی قیام پاکستان کے بعد ہوتی تو وہ شاید اس پر فخر کرتے کہ ان کی شادی مارشل لاء کے دوران ہوئی۔ لیکن جس افتخار صرف انھی کو حاصل نہ ہوتا، کروڑوں افراد کی شادیاں مارشل لاء کے دوران ہو چکی ہیں، جس کے نتیجے میں پاکستان کی موجودہ آبادی کے ۹۰ فیصد حصے کا زمانۂ پیدائش مارشل لاء ہی کا زمانہ ہے۔

آخر میں ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے۔ شہاب صاحب نے ایک جگہ لکھا ہے کہ استاد سائل دہلوی نے شہاب صاحب کے لڑکپن میں ان کا ایک شعر سن کر پیش گوئی کی تھی کہ یہ لڑکا مستقبل میں شاعر بنے گا۔ ممکن ہے بعض سطح بیں لوگ یہ کہیں کہ استاد کی پیش گوئی غلط تھی۔ ایسے لوگوں کی تفہیم کے لیے عرض ہے کہ مستقبل کا مطلب ہے آنے والا وقت۔ خدا شہاب صاحب کو تا دیر سلامت رکھے اس پیش گوئی کے صحیح ثابت ہونے کے امکانات اب بھی اتنے ہی ہیں، جتنے پچاس برس پہلے تھے۔

(۱۸ فروری ۱۹۸۸ء)

اچھی تنقید خالی الذہن ہو کر ہی لکھی جا سکتی ہے

علی گڑھ کے رسالے "دائرے" کے بعض مضامین سے استفادہ کرنے کا ارادہ تھا، لیکن انتخاب بشیر بدر ہم پر اسی طرح چھا گئے جیسے وہ مشاعروں پر چھا جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ کچھ سخن ہائے ناگفتنی گفتہ ہو گئے اور کچھ سخن ہائے گفتنی ناگفتہ رہ گئے۔ خصوصاً بے مثال فکشن رائٹر قاضی عبدالستار کا انشائیہ اس لائق تھا اور ہے کہ اس پر تمام اہل ادب غور کریں۔ اگرچہ اب غور کرنا اہل ادب کے فرائض یا عادات میں شامل نہیں رہا، تاہم کبھی کبھی منہ یا ذہن کا مزا بدلنے کے لیے غور کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

"دائرے" کے مدیر نے یہ سوال اٹھایا تھا کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ ہمارا ادب معاشرے سے بے تعلق ہو گیا ہے اور ادیب اپنی داخلی دنیا کا اسیر بن چکا ہے۔ اس سوال کے جواب میں قاضی عبدالستار گرچہ تو نہیں برسے بھی ہیں۔ ان کے انشائیے کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے:

"تقسیم کے وقت اُردو ادب میں اہم بات یہ تھی کہ ہمارے کئی افسانہ نگار ایسے تھے جنھیں دوسری زبانوں کے افسانہ نگار ٹیکسٹ بک کی طرح پڑھتے تھے جیسے منٹو، بیدی، کرشن چندر، عصمت۔ اور بہت سے شاعر تھے جو رسائل میں اپنی تخلیقات شائع کراتے تھے جیسے جوش، فراق، جذبی، مجروح، اختر انصاری۔ میں وہ نام نہیں لینا چاہتا جو سکہ بند ہیں جیسے علی سردار جعفری۔ ایسے لوگ سازشی، گروہ بند اور پروپیگنڈے کے دیوانے ہیں۔ یہ اپنے ڈھول پٹواتے ہیں اور خود پیٹتے ہیں...... ترقی پسندی کی لیڈر شپ کی ایک حد تک بے حسی، گمراہی اور مفاد پرستی اور اپنی ذات کو نمایاں کرنے کے شوق نے ہماری تحریک کو زبردست نقصان پہنچایا...... علی سردار جعفری نے جس طرح ترقی پسندی کو ایکسپلائٹ کیا اس کو بہت حد تک پروفیسر عظیم، کرشن چندر، احتشام صاحب اور سبط بھائی Contain

کرتے رہے۔"

قاضی عبدالستار خود ترقی پسند ہیں، اس لیے ترقی پسندوں کے خلاف بولنے کا انھیں دوسروں سے زیادہ حق حاصل ہے۔ لیکن یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ جو بھی اُٹھتا ہے وہ علی سردار جعفری پر اپنا غصہ نکالتا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ ساقی فاروقی جیسا رجعت پسند بھی جب خط غبار میں کوئی تنقیدی مضمون لکھتا ہے تو روئے سخن سردار جعفری ہی کی طرف ہوتا ہے۔ جعفری صاحب کی ہمت کی داد دینی چاہیے کہ ان کا سینۂ بے کینہ بیک وقت اپنوں اور غیروں کے تیروں کا ہدف ہے۔ انھوں نے اس صورتِ حال کے خلاف کبھی صدائے احتجاج بلند نہیں کی۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ صدائے احتجاج بلند کرنے میں جو وقت صرف ہوگا، اسے کیوں نہ اسی کام میں لگایا جائے، جس کی وجہ سے ان کے حریف آتش زیر پا رہتے ہیں۔ گویا جعفری صاحب خود ہی مصروف نہیں رہتے، اپنے حریفوں کو بھی کام پر لگائے رکھتے ہیں۔ جملۂ معترضہ ہم نے ساقی فاروقی کو اس لیے رجعت پسند کہا ہے کہ وہ اپنی بدکلامی ہی پر فخر نہیں کرتے، دوسروں کی بدکلامی سے بھی محظوظ ہوتے ہیں۔

قاضی عبدالستار نے بزرگ ادیب آل احمد سرور کو بھی نہیں بخشا۔ فرماتے ہیں:

"آل احمد سرور کا بھی بڑا رول ہے، اُردو ادب کی تباہی میں۔ آل احمد سرور جب لکھنؤ میں تھے، تو ترقی پسند تھے، اس لیے کہ یوپی کا دارالحکومت تھا اور وہاں مذہب یا اسلام یا رجعت پرستی کی شمع جلا کر زندہ رہنا دشوار تھا، اس لیے ترقی پسند تھے، اپنے گھر پر جلسے کرتے تھے اور بڑے سرخا سرخ ترقی پسند تھے۔ یہاں (علی گڑھ) جب آئے تو ذاکر صاحب تھے، بشیر حسین زیدی تھے، رشید صاحب تھے۔ علی گڑھ کی جو ایک خاص لابی تھی، اس میں مقبول ہونے کے لیے یہ پہلا کام کیا کہ ترقی پسندی کو طلاق دی اور جدیدیت سے متعہ کر لیا۔ ۱۹۶۶ء میں یہاں جو سیمینار ہوا، اس میں سرور صاحب کی حیثیت سینگ کٹے ہوئے بچھڑوں میں شامل ہونے والے چالاک اور مفاد پرست بُل کی تھی۔"

سرور صاحب علی گڑھ یونیورسٹی کے سابق صدر شعبۂ اُردو ہیں۔ قاضی صاحب بھی اسی شعبے سے وابستہ ہیں، اس لیے اگر قاضی صاحب کی رائے اچھی ہوتی، تو ہمیں تعجب ہوتا۔ قاضی صاحب کا یہ قولِ فیصل تو ہم مان لیتے ہیں کہ اُردو ادب کی تباہی میں سرور صاحب کا بڑا رول

ہے۔ لیکن ہماری خاطر قاضی صاحب بھی یہ تسلیم فرما لیں کہ سرور صاحب نے اُردو ادب کو جو نقصان پہنچایا تھا، ترقی پسندی کو طلاق دے کر اس کی تلافی بھی کر دی۔ جب حساب برابر ہو گیا، تو پھر کیسا شکوہ، کہاں کی شکایت؟ قصہ یہ ہے کہ بہت سے ادیبوں نے ترقی پسندی کو فیشن کے طور پر اپنا لیا تھا لیکن جب وہ بالغ ہوئے تو راہِ راست پر آگئے۔ سرور صاحب تو خیر بہت بڑے ادیب ہیں، ہمیں تو کسی عام آدمی سے بھی یہ شکایت نہیں کرنی چاہیے کہ حضرت آپ کو بالغ ہونے کی کیا ضرورت تھی۔

نقاد ہونے کے لیے قاضی صاحب نے یہ شرط عائد کی ہے، "جس نے داستان کے دس سلسلے نہیں پڑھے، جس نے فسانۂ عجائب نہیں پڑھا، جس نے انیس و دبیر کے مرثیے نہیں پڑھے، جس نے فسانۂ آزاد اور میر امّن کو نہیں پڑھا، سودا کے قصیدے نہیں پڑھے، وہ ادب کی قدر کا اندازہ نہیں کر سکتا۔" قاضی صاحب پرانے زمانے کے آدمی معلوم ہوتے ہیں، وہ ادب کی قدر کا اندازہ کرنے کے لیے ادب کے گودام میں رکھے ہوئے پرانے اور کرم خوردہ مال کے مطالعے کو ضروری بتا رہے ہیں۔ نقادوں نے اگر پڑھنا شروع کر دیا اور وہ بھی قاضی صاحب کی فہرست کے مطابق، تو ان بیچاروں کی ساری زندگی تو اسی کام میں صرف ہو جائے گی، تنقید لکھنے کے لیے وقت کہاں سے آئے گا۔ قاضی صاحب سے گزارش ہے کہ وہ نقادوں کو کسی آزمائش میں نہ ڈالیں، جو کام وہ کر رہے ہیں، انھیں کرنے دیں، اور پھر یہ بھی تو دیکھنا چاہیے کہ جب ہمارے نقاد خالی الذہن ہو کر اچھی تنقید لکھ رہے ہیں تو پھر ان پر کلاسیکی ادب کے مطالعے کا بوجھ ڈالنے کی کیا ضرورت ہے۔

قاضی صاحب نے اپنے انشائیے میں علامتی اُسلوب اختیار کرتے ہوئے اُردو ادب کا بڑا المیہ پیش کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

"اُردو ادب کی تاریخ آپ کے سامنے ہے۔ کم از کم چالیس پچاس سال کی تاریخ تو آپ آسانی سے رسائل میں دیکھ سکتے ہیں۔ کیسے کیسے ادیب اور شاعر آئے اور کیسے کیسے طنطنے اور دھوم دھام سے آئے اور ایک دہائی گزری اور غائب۔ برسات ہوتی ہے ادب میں...... ادب میں جو برسات ہوتی ہے، وہ دہائی کی ہوتی ہے، دس برس کی۔ ہر برسات میں پانی برستے ہی کتنے مینڈک ٹر ٹر

کرنے لگتے ہیں، انھیں کے ساتھ دو چار، پانچ چھ کالے ناگ بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ اگلی برسات میں وہ کالے ناگ رہ جاتے ہیں اور مینڈکوں کی پوری فصل اللہ کو پیاری ہو جاتی ہے۔"

یہ نکتہ ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ اگر اُردو ادب میں صرف مینڈک اور صرف کالے ناگ پائے جاتے ہیں تو پھر قاضی صاحب جیسے شرفائے ادب کا مقام کہاں متعین ہوگا؟

آخر میں ایک ضروری وضاحت بھی کر دی جائے تو مناسب ہوگا۔ ہم نے قاضی صاحب کی زیرِ بحث تحریر کو "انشائیہ" کہا ہے۔ یہ تحریر اگرچہ انشائیے کی مروجہ تعریف پر پوری نہیں اترتی لیکن ہماری خود ساختہ تعریف کے عین مطابق ہے۔ ہمارے نزدیک انشائیہ اس تحریر کو کہتے ہیں جسے لکھنے کے بعد خود لکھنے والا حیران ہو کہ اس نے کیا لکھ دیا اور پڑھنے والا پشیمان ہو کہ وہ کیا کچھ پڑھ گیا۔

(۳۱ مارچ ۱۹۸۸ء)

پادرہوا شاعری کے دَور میں "آشوبِ ہوا"

اگر کوئی شخص بیک وقت شعر نگار، ڈراما نگار، سفرنامہ نگار اور کالم نگار ہو تو وہ ادب سے زیادہ [illegible] نظر آتا ہے اور عطاء الحق قاسمی تو نگار خانۂ رقصاں ہیں کہ آج چین میں ہیں تو کل امریکہ میں، کبھی فرانس، ہالینڈ اور جرمنی کی سیر ہو رہی ہے تو کبھی ترکی، افغانستان اور ایران کی۔ خلیج کی ریاستوں میں تو ان کا آنا جانا اس طرح رہتا ہے جیسے اپنے گھر سے نکلے اور ڈاکٹر انور سدید کے گھر جاتے ہیں۔ اگرچہ ان دونوں میں خیالات و نظریات نیز گردشِ حالات کی وجہ سے بعد المشرقین ہے لیکن مکان دونوں کے قریب ہیں تاکہ فریقین کو سرورِ خانۂ ہمسایہ سے محظوظ ہونے کا [illegible] ہے۔

پچھلے چھ مہینوں میں عطاء الحق قاسمی کم از کم چار مرتبہ دوبئی اور قطر وغیرہ کا چکر لگا چکے ہیں۔ [illegible] معلوم ہوا ہے کہ ان ریاستوں میں چونکہ ہر طرح کی کرنسی قبول کی جاتی ہے، اس لیے وہ نظر بچا کر اپنے نام اور کلام کا سکہ چلا آتے ہیں۔ نظام سقہ نے چمڑے کا سکہ چلایا تھا، عطا کے پاس [illegible] نام اور کلام ہے، سو اُن کے دارالضرب میں یہی سکے ڈھلتے ہیں۔ ایسی کم عمری میں اتنی ہر [illegible] ادا کاروں اور کھلاڑیوں میں تو دیکھی تھی، ادیبوں، شاعروں میں پروین شاکر کے بعد یہ مقام، خدا نظرِ بد سے بچائے، عطاء الحق قاسمی ہی کو ملا ہے۔

ہم نے عطاء کا کلام بدقسمتی سے سنا ہے نہ پڑھا ہے۔ لیکن جو لوگ اس آزمائش سے گزرے ہیں، وہ زبان سے تو کچھ نہیں کہتے، لیکن زبانِ حال سے "اک تیر میرے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے" کی تصویر بن جاتے ہیں۔ گویا عطاء الحق قاسمی شعر نہیں کہتے، تیر چلاتے ہیں۔ اُردو کا محاورہ "تکا چلانا" بھی ہے، لیکن یہ اس کا محل نہیں۔ سنا ہے ان کی غزلوں کا مجموعہ "آشوبِ ہوا" [illegible] نام سے شائع ہو رہا ہے۔ پادرہوا شاعری کے دَور میں "آشوبِ ہوا" کی اشاعت ایک دل [illegible] اقدام ہے۔ اس مجموعے کی اشاعت تک اگر ہم میں شعر فہمی کی صلاحیت باقی رہ گئی تو انشاء

اللہ ہم بھی عطا کی شاعری کے ہوا داروں یا ہوا خواہوں میں شامل ہونے کی سعادت حاصل کر لیں گے۔

جیسے ہم ایک میں مشاعرے پڑھ کر آتے ہیں تو عطاء سفرنامے لکھتے ہیں۔ گویا پڑھنے اور لکھنے کے کام ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ اسی بنا پر ان کا شمار پڑھے لکھوں میں ہوتا ہے۔ بیک وقت ان کے چار سفرنامے کتابی صورت میں زیرِ طبع ہیں۔ اس زیرِ طبع کو جولانیٔ طبع کا مترادف سمجھنا چاہیے، ورنہ کاغذ اور قاری دونوں کے لیے ایک وقت میں چار سفرناموں کا بوجھ اٹھانا ذرا مشکل ہوگا۔

عطاء کے سفرناموں کے جو حصے رسالوں اور اخباروں میں چھپے ہیں، ان کی بنا پر بلا خوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ عطا نے اُردو سفرنامے کو ایک نیا رنگ دیا ہے جو انھیں سے مخصوص ہے۔ وہ سفرنامے کے بہانے تاریخ یا جغرافیے کی کتاب نہیں لکھتے بلکہ منازل و مراحل کے باطن کا سراغ دیتے ہیں۔ وہ پامال راستوں سے بھی گزرتے ہیں تو انھیں اپنے منفرد زاویۂ نظر کے حوالے سے نیا پن عطا کر دیتے ہیں۔ ان کے سفرنامے اتنے دلچسپ ہوتے ہیں کہ قاری مسحور ہو جاتا ہے۔ عطا سفر سے واپس آ جاتے ہیں لیکن قاری کو واپسی کا راستہ نہیں ملتا۔ اس سے خدانخواستہ ہمارا مطلب نہیں کہ عطا کے سفرنامے گمراہ کن ہوتے ہیں، بلکہ مراد یہ ہے کہ جب قاری عطا کے سفرنامے پڑھتا ہے تو وہ کوئی اور کام کرنے کے قابل نہیں رہتا۔ خود ہمارا یہ حال ہے کہ جب بھی عطا اپنے کالموں میں کسی سفر کی روداد سناتے ہیں تو جی چاہتا ہے کہ مفت کے ٹکٹ پر ہم بھی دنیا دیکھ لیں لیکن ہم اکادمی ادبیات کے منظورِ نظر ہیں نہ حکومت کے پسندیدہ افراد کی فہرست میں شامل ہیں، ہمیں مفت کا ٹکٹ ملے تو کیوں؟

عطا کا اصل کارنامہ ان کی کالم نگاری ہے۔ اس وقت ہمارے اخباروں میں جو دو چار اچھے کالم نگار نظر آتے ہیں، ان میں عطا بھی شامل ہیں۔ جس اخبار میں وہ کالم لکھتے، وہ بھی اپنے اداریوں کی وجہ سے مقبول تھا، اب عطا کے کالموں کی وجہ سے مشہور ہے۔ جس روز عطا کا کالم شائع نہیں ہوتا اُس روز ردی والے بھی اخبار کو ہاتھ نہیں لگاتے۔ ہمارا تو یہ حال ہے کہ سب سے پہلے عطا کا کالم پڑھتے ہیں اور اس کے بعد "ضرورت ہے" کے اشتہارات۔ یہ فیصلہ ہم اب تک نہیں کر سکے کہ ہماری بیروزگاری عطا کی وجہ سے ہے یا ہم بیروزگاری کی وجہ سے عطا کے کالموں پر گزارا کرتے ہیں۔ بہر حال کچھ بھی ہو، عطا کے کالم ہمارے لیے عطائے خاص کا درجہ رکھتے ہیں۔

پچھلے ایک ہفتے سے عطا کے کالموں کا نیا مجموعہ "جرمِ ظریفی" ہمارے حق میں "جرمِ ضعیفی" کی سزا ثابت ہو رہا ہے۔ یعنی ہم نے اس کتاب کو پڑھنے کے سوا اور کام نہیں کیا۔ اب تک عطا کے کالموں کے تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں، روزنِ دیوار سے، عطائیے اور خند مکرر۔ مگر "جرمِ ظریفی" سب سے بازی لے گیا ہے۔ وجہ ظاہر ہے کہ مجموعہ اس زمانے کی تخلیق ہے جس میں عطا کی عمر اور فن دونوں میں پختگی آئی ہے۔ عمر میں پختگی کا ثبوت اس تصویر سے ملتا ہے جو کتاب کے سرورق پر چھپی ہے اور فن کی پختگی کا اندازہ کتاب کے متن سے ہوتا ہے۔

سو سے زائد کالموں کا یہ مجموعہ پڑھنے کے لائق ہے۔ سب سے پہلی چیز جو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے، وہ موضوعات کا تنوع ہے۔ سیاست، معاشرت اور ادب کے کیسے کیسے پہلوؤں پر عطا نے لکھا ہے! حیرت ہوتی ہے کہ اس شخص کا مشاہدہ کس غضب کا ہے۔ ہم آپ جن چیزوں پر سرسری نظر ڈال کر گزر جاتے ہیں، عطا ان کے حوالے سے مضامین نو کے انبار لگا دیتے ہیں۔ دوسری خوبی عطا کا شگفتہ اندازِ بیان ہے۔ کوئی جملہ ایسا نہیں جو شگفتہ بیانی کا آئینہ دار نہ ہو۔ یہاں تک کہ جہاں شگفتگی کی گنجائش نہیں ہوتی، وہاں بھی وہ پنجابی الفاظ کے استعمال سے جملے ہی کو نہیں، قاری کو بھی ہنسا دیتے ہیں۔

ایک زمانہ تھا کہ اُردو میں انگریزی الفاظ کثرت سے استعمال کیے جاتے تھے، اب بعض اہلِ قلم نے ان کی جگہ پنجابی الفاظ استعمال کرنے شروع کر دیے ہیں۔ اگر یہ سلسلہ بڑھ گیا تو وہ دن دور نہیں جب اُردو کتابوں کو سمجھنے کے لیے پنجابی کی ڈکشنری سے مدد لینے کی ضرورت ہوگی۔ اس معاملے میں ہماری ذاتی رائے یہ ہے کہ اُردو میں دوسری زبانوں کے الفاظ شامل کرنے کے لیے کسی باقاعدہ کوشش کی ضرورت نہیں۔ اُردو ایک وسیع المشرب زبان ہے، دوسری زبانوں کے الفاظ قبول کرنے میں بڑی فراخدل ہے۔ اسے اس کے حال پر چھوڑ دینا چاہیے۔ وقت کے ساتھ ساتھ وہ مقامی الفاظ، جو اس کے مزاج کے مطابق ہوں گے، اس کا حصہ بنتے جائیں گے۔

معاف کیجیے، ہم بھی استاد لاغر مراد آبادی کی طرح سنجیدہ ہو گئے۔ حالانکہ عطاء الحق قاسمی کی کتاب پر کالم تو کیا، تنقید لکھنے کے لیے بھی سنجیدگی کے بغیر کام چل سکتا ہے۔ ہاں تو عطا کی کتاب "جرمِ ظریفی" کی دو خوبیاں تو ہم نے اوپر بیان کر دی ہیں، تیسری خوبی یہ ہے کہ اس میں جو کالم شامل ہیں، وہ چھپے تو اخبار میں تھے، لیکن اخباری نہیں ہیں۔ انھیں بغیر کسی تکلف کے ادبی تحقیقات

کے زمرے میں رکھا جا سکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ''جرم ظریفی'' کالموں کا نہیں، طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ ان مضامین کی ادبی قدر و قیمت دائمی ہے۔ انھیں کسی بھی موسم اور کسی بھی زمانے میں یکساں دلچسپی کے ساتھ پڑھا جا سکتا ہے۔ عطا کا یہ بڑا کارنامہ ہے کہ انھوں نے ہنگامی موضوعات پر جو بھی لکھا، وہ ادب بن گیا۔

عطا کی کتاب کی چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں متعدد شخصیات کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اگر اس نوعیت کے کالموں کو کچھ طویل کر دیا جاتا تو یہ اچھے خاصے شخصی خاکے بن جاتے۔ موجودہ صورت میں بھی ان کالموں میں اچھے شخصی خاکوں کی بنیادی خصوصیات موجود ہیں۔ عطا کو شخصی خاکوں کی طرف باقاعدگی سے توجہ کرنی چاہیے۔ اس طرح ان کے نگارخانۂ فن میں ایک اور شمع روشن ہو جائے گی۔

عطا کی کتاب کی پانچویں خوبی یہ ہے...... معاف کیجیے، اگر ہم اسی طرح خوبیاں شمار کرتے رہے تو یہ سلسلہ ختم نہیں ہوگا۔ پڑھنے والے کہیں گے، دعوے تو کر رہے ہو دلیلیں کہاں ہیں۔ ہم عطا کے وکیل تو ہیں نہیں، جو دعوؤں کے ساتھ دلیلیں بھی پیش کریں۔ ہم نے کتاب پڑھی اور تاثرات قلم بند کر دیے۔ اگر کسی کو ہم سے اتفاق نہیں تو نہ ہو، ہمارے لیے یہ بہت ہے کہ عطا قاسمی ہم سے صد فی صد متفق ہوں گے۔

ہم نے کچھ عرصہ قبل عطا کی کسی کتاب پر کالم لکھا تھا۔ یہ کالم پنجاب یونیورسٹی کے بی اے کے نصاب میں شامل ہو گیا۔ امید ہے، ہمارا موجودہ کالم ایم اے کے نصاب میں شامل ہو جائے گا کیونکہ اس میں ہم نے عطا کی تعریف پہلے سے زیادہ اور دل لگا کر کی ہے۔

(۲۱ر اپریل ۱۹۸۸ء)

شاعری ایک غیر سنجیدہ عمل بن چکی ہے

''ایک ایسے زمانے میں جب شاعری ایک غیر سنجیدہ عمل بن چکی ہے، دلاور فگار کی شاعری پر مزاحیہ شاعری کا لیبل لگانا کچھ عجیب سی بات ہے۔ ہمیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ موجودہ زمانے کے بیشتر شعراء جو کچھ لکھ رہے ہیں، وہ اگر صد فی صد مزاح نہیں ہے تو مزاح سے ملتی جلتی کوئی چیز ضرور ہے۔ اسے پڑھتے ہوئے بے اختیار ہنسی آتی ہے۔ اس کے برعکس دلاور فگار کی ''مزاحیہ'' شاعری میں سنجیدگی کا عنصر کچھ اتنا زیادہ ہے کہ اسے پڑھتے ہوئے آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ خاص طور پر بعض شاعروں کے مجموعوں پر انھوں نے جو نظمیں لکھی ہیں، انھیں پڑھ کر دو مرتبہ آنکھوں میں آنسو آتے ہیں۔ ایک مرتبہ ان شاعروں کے احترام میں جن کے مجموعوں پر یہ نظمیں لکھی گئی ہیں اور دوسری مرتبہ خود دلاور فگار سے اظہارِ ہمدردی کے لیے کہ انھیں کیسے کیسے نازک مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔''

خدا جھوٹ نہ بلوائے، یہ اقتباس ہماری کسی تحریر کا نہیں ہے، استاد لاغر مراد آبادی کا نتیجۂ فکر ہے۔ انھیں جب معلوم ہوا کہ دلاور فگار کا نیا مجموعۂ کلام شائع ہونے والا ہے تو انھوں نے یہ رائے لکھ کر ہمارے حوالے کی اور فرمایا، دلاور فگار اگر چاہیں تو اس رائے کو اپنے مجموعے کے فلیپ پر شائع کر سکتے ہیں۔ ہم نے عرض کیا، ''دلاور فگار ان شاعروں میں سے نہیں ہیں جو اپنے کلام کے بارے میں فلیپ کے محتاج ہوں۔ وہ خود رائے اور خود کفیل شاعر ہیں۔ وہ اپنے کلام کے بارے میں خود ہی اچھی رائے رکھتے ہیں، اس لیے کسی دوسرے کی رائے کو وہ اہمیت نہیں دیتے۔'' لاغر صاحب نے جواب دیا، ''آپ ان سے بات تو کیجیے، شاید انھیں یہ رائے پسند آجائے۔''

اس سے پہلے کہ ہم دلاور فگار سے بات کرتے، ان کا نیا مجموعۂ کلام ''خدا جھوٹ نہ

بلوائے" شائع ہو گیا۔ لہٰذا ہم نے لاغر صاحب کی رائے اپنے کالم میں جھونک دی۔ اس لیے نہیں کہ ہم ان سے متفق ہیں، بلکہ اس لیے کہ ہمیں ان کی رائے سے سخت اختلاف ہے۔ اول تو یہی بات درست نہیں کہ آج کل شاعری ایک غیر سنجیدہ عمل بن چکی ہے۔ ہمارے خیال میں موجودہ دور میں شاعری نام کی کوئی چیز سرے سے موجود نہیں۔ جب کوئی چیز موجود ہی نہ ہو تو اس کے سنجیدہ یا غیر سنجیدہ ہونے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ یہ صحیح ہے کہ آج دیوان کثرت سے شائع ہو رہے ہیں، لیکن ان دیوانوں میں عمدہ کاغذ، روشن کتابت اور مصنف کی تصویر کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ ظاہر ہے کہ کاغذ، کتابت اور مصنف کی تصویر کو شاعری نہیں سمجھا جا سکتا۔

جناب لاغر کی اس بات سے بھی ہمیں شدید اختلاف ہے کہ دلاور فگار کی مزاحیہ شاعری میں سنجیدگی کا عنصر اتنا زیادہ ہوتا ہے کہ اسے پڑھ کر ہنسی کی بجائے رونا آتا ہے۔ ہمیں لاغر صاحب کی سخن فہمی پر رونا آ رہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے لاغر صاحب نے دلاور فگار کی نظموں کے صرف عنوانات پڑھے ہیں، نظمیں نہیں پڑھیں، ورنہ رائے قائم کرنے میں وہ اتنے غیر محتاط نہ ہوتے۔ بمبئی، رامپور اور حمید نظامی، جیسے عنوانات کو دیکھ کر لاغر صاحب نے سمجھا ہو گا کہ دلاور فگار شاعری سے مذاق فرماتے ہیں۔ کاش لاغر صاحب کو معلوم ہوتا کہ شاعری عنوانات میں نہیں عنوانات کے نیچے ہوتی ہے۔

یہ درست ہے کہ دلاور فگار نے کچھ کتابوں پر منظوم تبصرے لکھے ہیں، جن میں کتابوں اور شاعروں کی خوبیاں بیان کی گئی ہیں۔ لاغر صاحب کو اس پر اعتراض شاید اس لیے ہے کہ دلاور فگار نے تعریف میں مبالغے سے کام لیا ہے۔ لاغر صاحب کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ یہ اعتراض نہیں تعریف کا محل ہے۔ دلاور فگار داد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے ایسی کتابوں اور شاعروں میں بھی خوبیاں تلاش کر لیں جن میں کسی دوسرے کو کوئی خوبی نظر نہیں آئی۔

دلاور فگار کا تازہ مجموعۂ کلام (خدا جھوٹ نہ بلوائے) اس وقت ہمارے سامنے ہے۔ یہ مجموعہ ہمیں بے حد پسند آیا ہے۔ ایک تو اس لیے کہ سامنے کی باتوں کو نہایت شگفتہ انداز میں بیان کیا گیا ہے، دوسرے اس لیے کہ اس مجموعے کو پڑھتے ہوئے ہمیں اپنی کم علمی کا احساس نہیں ہوا۔ ہمیں وہ شاعری پسند نہیں جس سے محظوظ ہونے کے لیے علم و فضل کا سہارا لے کر غور و فکر کرنا پڑے۔ مولانا حسرت موہانی کی طرح ہمارا بھی یہی خیال ہے کہ شعر وہی ہے جو سنتے ہی دل میں

اتر جائے۔ گویا شاعر اور قاری دونوں کو ذہن پر زور نہ ڈالنا پڑے۔

یہ جو ہم نے عرض کیا ہے کہ دلاور فگار سامنے کی باتوں کو نہایت شگفتہ انداز میں پیش کرتے ہیں، تو اس کا مطلب یہ نہ سمجھیں کہ ان کے موضوعاتِ سخن غیر اہم ہیں، بلکہ مراد یہ ہے کہ جن باتوں کو اکثر ہم اور آپ نظر انداز کر دیتے ہیں، دلاور فگار ان سے ایسے ایسے نکتے پیدا کرتے ہیں کہ ان کے ذہن کی رسائی پر حیرت ہوتی ہے۔ مثلاً ایک مرتبہ اخبار میں خبر شائع ہوئی کہ کچھ عرصے بعد انسانی بیماریوں کے علاج کے لیے دواؤں کی بجائے موسیقی سے کام لیا جائے گا۔ دلاور فگار نے اس خبر سے متاثر ہو کر جو نظم لکھی ہے، اس کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے:

اک محقق نے نئی تحقیق فرما دی ہے آج
فن موسیقی سے بھی ممکن ہے انسانی علاج
اب مداوائے مرض ہو گا نئے انداز سے
اب ہوالشافی کی آواز آئے گی ہر ساز سے
تھرمامیٹر کی جگہ منھ میں لگا کر بانسری
ڈاکٹر دیکھے گا کیا حالت ہے اب بیمار کی
اس کو کہتے ہیں خدا کی دین، یہ ہوتی ہے دین
اب سول سرجن بنے گا جانشین تان سین
اب تو اخباروں میں شائع ہوں گے ایسے اشتہار
جملہ امراض خصوصی کی دوا طبلہ ستار

اس قسم کی بے شمار نظمیں زیرِ نظر مجموعے میں شامل ہیں۔ سماجی اور قومی مسائل پر بھی دلاور فگار نے خوب لکھا ہے۔ ان مسائل پر لکھتے ہوئے، وہ مزاح کے دائرے سے نکل کر طنز کی وادی میں نکلتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ان کے ہاں طنز سے زیادہ مزاح ملتا ہے، لیکن طنز جتنا بھی ہے اور جیسا بھی ہے، اپنی مثال آپ ہے۔ مثال کے لیے کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں، ان کا یہ مصرع

لے کے رشوت پھنس گیا ہے، دے کے رشوت چھوٹ جا

ضرب المثل بن چکا ہے۔

دلاور فگار کی بیشتر مزاحیہ تخلیقات کا "مواد" ادب سے حاصل کیا گیا ہے۔ ادبی موضوعات

پر انھوں نے بے شمار نظمیں لکھی ہیں اور ایسے ایسے پہلوؤں پر لکھی ہیں کہ اہل ادب کی تمام بے ادبیاں سامنے آجاتی ہیں۔ شاعر کیا کرتے ہیں، نقاد کیا نہیں کرتے، مشاعروں میں کیا ہوتا ہے، شاعری کس طرح وجود میں آتی ہے، متشاعر کسے کہتے ہیں۔ اس قسم کے بہت سے موضوعات پر دلاور فگار نے خوبصورت نظمیں لکھی ہیں۔ اس نوعیت کی نظموں میں سب سے عمدہ وہ ہے، جس میں ایک متشاعر اپنے فن کا مظاہرہ کرتا ہے۔ شادی کی محفل میں وہ اس قسم کے شعر پڑھتا ہے ؎

روئے حسیں پہ سہرے سے کیسی بہار ہے
اے موت آ بھی جا کہ تیرا انتظار ہے

کسی کی موت پر مرثیہ لکھتا ہے، تو وہ اس قسم کے شعروں پر مشتمل ہوتا ہے ؎

پیارے میاں چلے کہ قضا ان کو لے چلی
اچھا ہے خاندان کے سر سے قضا ٹلی

زیرِ نظر مجموعے میں چند غزلیں بھی ہیں، چند شعر سنئے:

لے کر برات کون سپر ہائی وے پہ جائے
ایسی بھی کیا خوشی کہ سڑک پر وصال ہو

وہ شے جن کے لیے جنت کو ٹھکرایا تھا آدم نے
وہ شے پھر ہو گئی خلد آشیانی دیکھتے جاؤ

ناپ کر دیکھا تو قد میں کچھ درازی آ گئی
تول کر دیکھا تو ہر انسان آدھا رہ گیا

(۵ مئی ۱۹۸۸ء)

پوسٹر لکھنے والے بھی ادیب ہیں

ڈاکٹر تحسین فراقی کا ارادہ تھا کہ وہ ”اردو ادب میں سراب گردی“ کے نام سے ترقی پسند تحریک کی تاریخ لکھیں گے، لیکن ڈاکٹر قمر رئیس کی کتاب ”ترقی پسند ادب، پچاس سالہ سفر“ کی اشاعت کے بعد انھوں نے یہ ارادہ ترک کر دیا ہے۔ ڈاکٹر تحسین فراقی کا کہنا ہے کہ جو کچھ وہ لکھنا چاہتے تھے، وہ سب کچھ اس کتاب میں ہے لہٰذا اس موضوع پر فی الحال کوئی نئی کتاب لکھنا تضیعِ اوقات ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ ڈاکٹر تحسین فراقی نے تضیعِ اوقات کے حوالے سے صرف اپنی مجوزہ کتاب کا ذکر کیا ہے، ترقی پسند تحریک کا نہیں۔ ورنہ کوتاہ نظر مخالفین تحریک کو اسی حوالے سے دیکھنے کے عادی ہیں۔

ڈاکٹر تحسین فراقی بھی کہتے ہیں کہ ترقی پسندی تو لکھنے والے کے اندر ہوتی ہے، یہ کوئی خارجی چیز نہیں ہے جس کے لیے انجمن سازی کی جائے۔ ادیب انجمن ساز ہو جائے تو ادب رخصت ہو جاتا ہے۔ یہ بات استاد لاغر مراد آبادی نے سنی تو فرمایا:

”انجمن سازوں کے پاس ادب ہوتا ہی نہیں جو اس کے رخصت ہو جانے کا اندیشہ ہو۔ فیض، کرشن چندر، بیدی اور احتشام حسین جیسے لوگ زندہ تھے تو ترقی پسندی کے کوئی معنی بھی تھے۔ اب تو چند پوسٹر لکھنے والے رہ گئے ہیں اور بڑی تعداد ان لوگوں کی ہے جو ان پوسٹروں سے دیواروں کو خراب کرتے ہیں۔“

لاغر مراد آبادی تو انجمن سازوں سے اس طرح ڈر گئے جس طرح کسی زمانے میں شرفا بال سازوں سے ڈرتے تھے۔ ہم نے فرمودات لاغر کی تشریح چاہی تو انھوں نے فرمایا:

”آج انجمن ترقی پسند مصنفین کے نام لیواؤں میں کوئی ڈھنگ کا لکھنے والا موجود نہیں ہے۔ زیادہ تعداد ایسے لوگوں کی ہے جنھوں نے کبھی کچھ نہیں لکھا۔ بقول ابن انشا قلم سے ازار بند ڈالنے کی لکڑی کا کام لینے والے ترقی پسند

ادیب بنے بیٹھے ہیں۔ ہر طرف گولڈن جوبلی ہو رہی ہے اور اس بہانے جو لوگ سامنے آ رہے ہیں ان کا ادب سے کوئی جائز تعلق نہیں۔ یہ لوگ لکھتے ہیں نہ پڑھتے ہیں، زبانی جمع خرچ پر گزارا کرتے ہیں۔ ادب کے نام پر ایسی بے ادبی پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آئی تھی۔ یہ لوگ زبان بھی غلط بولتے ہیں۔ کہتے ہیں انجمن ترقی پسند مصنّفین کے پچاس سال پورے ہو گئے حالانکہ کہنا یہ چاہیے کہ دن پورے ہو گئے۔"

حضرت لاغر مراد آبادی پیدائشی رجعت پسند ہیں، اس لیے ان سے ترقی پسندوں کے بارے میں کسی کلمۂ خیر کی توقع نہیں رکھنی چاہیے۔ کاش رجعت پسند حضرات انصاف سے کام لیں اور ترقی پسند تحریک کے صرف منفی پہلوؤں ہی کو نہ دیکھیں، روشن پہلوؤں پر بھی نظر ڈالیں۔ اور کچھ نہیں تو کم از کم یہ لوگ عاشور کاظمی اور ڈاکٹر قمر رئیس کی مرتبہ کتاب "ترقی پسند ادب۔ پچاس سالہ سفر" ہی دیکھ لیں۔

عاشور کاظمی سے ہم زیادہ واقف نہیں ہیں۔ بدقسمتی سے ہم نے ان کی کوئی تحریر بھی نہیں دیکھی، حالانکہ ہم عصر مطبوعہ اُردو ادب کا تقریباً نوے فی صد حصہ ہماری نظر سے گزرتا ہے۔ ممکن ہے عاشور کاظمی غیر مطبوعہ ترقی پسند ہوں یا عصری ادب کے اس دس فی صد حصے سے تعلق رکھتے ہوں جو ہماری نظروں سے اوجھل ہے۔ بہرحال انھوں نے اس کتاب کے شروع میں انجمن ترقی پسند مصنّفین کی گولڈن جوبلی کانفرنس (لندن) کی جو روداد لکھی ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ ایک اچھے رپورٹر ہیں۔ ترقی پسند ادیب ہونے کے لیے یہ سرمایہ بھی کافی سے زیادہ ہے۔

ڈاکٹر قمر رئیس صاحبِ نظر نقاد ہیں۔ ان کی علمی و ادبی خدمات کا دائرہ خاصا وسیع ہے۔ ترقی پسندی نے ان کو اتنا نقصان نہیں پہنچایا جتنا کراچی کے پروفیسر عتیق احمد کو۔ وجہ یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب پوسٹر لکھنے اور انھیں دیواروں پر لگانے کا کام خود نہیں کرتے، دوسروں سے لیتے ہیں۔ زیرِ نظر کتاب انھوں نے نہایت محنت سے مرتب کی ہے اور اس میں بہت سے ایسے مضامین جمع کر دیے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ترقی پسندوں نے ہمارے ادب کو کتنا "باثروت" بنایا ہے۔

یہ کتاب چھ حصوں پر مشتمل ہے۔ ابتدائی دو حصے فکری مباحث سے متعلق ہیں۔ تیسرے حصے میں ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، پریم چند، مجنوں گورکھپوری، ڈاکٹر عبدالعلیم، احتشام حسین اور

فیض احمد فیض کے وہ مقالے ہیں جو ترقی پسند فکر میں اساسی اور تاریخی اہمیت کے حامل ہیں۔ چوتھا حصہ برصغیر کے مختلف شہروں میں ترقی پسند تحریک کے کردار سے متعلق ہے۔ پانچویں حصے میں اصنافِ ادب کے حوالے سے ترقی پسند ادب کا جائزہ لیا گیا ہے۔ آخری حصے میں ان کتابوں کی فہرست ہے جن کا مطالعہ ترقی پسند تحریک سے آگاہی کے لیے ضروری ہے۔

اس کتاب میں شامل ہر مضمون کسی نہ کسی اعتبار سے اہمیت ضرور رکھتا ہے۔ مثال کے طور پر "ترقی پسند نظم" کے بارے میں ڈاکٹر عتیق اللہ کا مضمون ہی لے لیجیے۔ اسے پڑھ کر اور کچھ نہیں تو کم از کم عبرت ضرور حاصل کی جا سکتی ہے۔ موصوف نے جو کچھ لکھا ہے، اس کا ایک نمونہ ملاحظہ فرمائیے:

> "ترقی پسند شاعری میں موضوع برائے شاعری کی مثالیں بہ لحاظ کمیت کثیر ہیں اور بہ لحاظ کیفیت کم۔ بیشتر مثالوں میں وہ بے سلیقگی اور خروش مساوی کام کر رہا ہے جس کی محرک تو جوانانہ عاقبت نااندیشی ہے...... سلام مچھلی شہری، پرویز شاہدی، ظہیر کاشمیری اور وامق جونپوری جیسے کمتر تخلیقی ذہن کے شعرا ہی کے یہاں اس نوع کی شورش اور اختلال نہیں پایا جاتا بلکہ سردار جعفری، مجاز اور مخدوم تک کی اکثر نظموں کی متانت صرف اس لیے معرضِ خطر میں پڑ گئی کہ ان کے تجربات میں صلابت تھی نہ اظہار میں ضبط۔ حتیٰ کہ طنز کے رویوں میں بھی پھکڑپن حاوی ہے۔" (ص ۳۲۰)

اگر یہ باتیں رجعت پسند لکھتا تو اس کے خلوص پر شک کیا جا سکتا تھا، لیکن ڈاکٹر عتیق اللہ تو کارڈ کے مہدی ہیں، اس لیے مستند ہے ان کا فرمایا ہوا۔ بہرحال ڈاکٹر قمر رئیس کی ادبی دیانت قابلِ داد ہے کہ انھوں نے اپنی کتاب میں سچ کے اظہار پر کوئی پابندی نہیں لگائی۔

ترقی پسند مصنّفین گزشتہ پچاس برسوں میں کیا کچھ کرتے رہے اور ان کے باہمی تعلقات کیا تھے، اس کا اندازہ رفعت سروش کے اس اقتباس سے کیا جا سکتا ہے:

> "ادیبوں اور شاعروں کے ذاتی اور نجی زندگی کے اختلافات نے بھی انجمن کی ساکھ کو بعض دفعہ بہت نقصان پہنچایا...... ساحر لدھیانوی اور کیفی اعظمی ایک دوسرے کی دوستی کا دم بھرتے تھے، لیکن کسی ادبی معاملے میں نہیں بلکہ بالکل

ذاتی معاملے میں دونوں میں چشمک شروع ہو گئی۔ ساحر لدھیانوی نے کیفی کو نیچا دکھانے کے لیے اس کی ادبی شہرت کو داغدار بنانے کا منصوبہ بنایا اور ایک بھر پور مضمون رد کیفی میں قلم بند کیا...... انجمن ترقی پسند مصنفین کے جلسے میں وہ مضمون پڑھا...... اہلِ محفل میں مجموعی طور پر مضمون پر واہ واہ کی کچھ بحث ہوئی، خاص طور پر صاحبِ صدر (علی سردار جعفری) نے جوشیلی تقریر کی اور اُن تحریروں کا حوالہ دیا جو ساحر نے اپنے رسائل میں بحیثیت ایڈیٹر کیفی کی تعریف میں لکھی تھیں۔ ساحر نے برجستہ کہا کہ وہ میری ذاتی رائے نہیں تھی کمرشل نوٹ تھے...... انجمن کی اگلی نشست میں سردار جعفری نے ساحر کی شاعری پر مقالہ پڑھا۔ سردار کا مضمون ہی یک رخا تھا...... جب مضمون ختم ہو گیا تو ساحر لدھیانوی اپنے پورے قد کے ساتھ اٹھے اور بولے، جعفری صاحب! اس مضمون سے آپ یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ ساحر لدھیانوی گھٹیا شاعر ہے، مگر اس سے یہ کہاں ثابت ہوا کہ کیفی اعظمی اچھا شاعر ہے۔" (ص ۳۰۶)

اس کتاب کا سب سے دلچسپ مضمون "ترقی پسند تحریک اور کراچی" ہے، جو کراچی کے مشہور ترقی پسند پروفیسر عتیق احمد نے لکھا ہے۔ ہم تو پروفیسر کو نقاد سمجھتے تھے، لیکن یہ مضمون پڑھ کر اندازہ ہوا کہ ان کا اصل میدان افسانہ نگاری ہے اہلِ نظر جانتے ہیں کہ کراچی کی تہذیبی زندگی میں انجمن ترقی پسند مصنفین کو اتنی بھی اہمیت حاصل نہیں رہی جتنی اسلام سلمانی کی باربر ایسوسی ایشن کو حاصل ہے۔ اس کے باوجود پروفیسر صاحب نے کراچی کی مجہول الاحوال انجمن کو اقوام متحدہ کے پائے کا ادارہ بنا کر پیش کیا ہے۔

اس مضمون میں محمد حسن عسکری، ڈاکٹر محمد دین تاثیر اور صمد شاہین کو ترقی پسندوں کے خلاف سازشیں کرنے والوں میں شمار کیا گیا ہے۔ چلیے یہاں تک تو غنیمت ہے کہ یہ لوگ ترقی پسندوں سے نظریاتی اختلاف رکھتے تھے اور پروفیسر عتیق احمد کی خانہ ساز لغت میں "اختلاف" اور "سازش" مترادف الفاظ ہیں، لیکن حیرت ہے کہ انھوں نے ترقی پسندوں کے جدِ امجد ڈاکٹر اختر حسین رائپوری کو بھی نہیں بخشا اور ان کے مضمون "ادب اور احتساب" کو بنیاد بنا کر یہ فیصلہ صادر کیا ہے کہ ڈاکٹر صاحب بھی کسی "مجبوری" کے تحت ترقی پسندوں کے خلاف ہو گئے تھے۔ حالانکہ اس مگر

مگر مقالے میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جو ترقی پسند نظریات کے خلاف ہو۔ ڈاکٹر رائپوری کا قصور صرف اتنا ہے کہ انھوں نے مقالے کے آخر میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے اس فیصلے پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے جس کی رُو سے ممتاز شیریں، سعادت حسن منٹو اور بعض دوسرے اکابر کی تحریروں کو "ترقی پسند" رسالوں میں شائع کرنے پر پابندی لگائی گئی تھی۔

پروفیسر عتیق احمد نے اپنے مقالے کے آخر میں اپنا "ذکرِ خیر" بھی کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

"راقم الحروف اپنی پوری سعی اور دیانت کے ساتھ وفاداری بشرطِ استواری گزشتہ ۳۸ برسوں سے نبھا رہا ہے...... فارغ بخاری اور دو ایک دوستوں نے شدید لعن طعن کی تو "استعارہ" کے نام سے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ۱۹۸۱ء میں شائع کر دیا۔"

پروفیسر صاحب نے ٹھیک ہی لکھا ہو گا مگر ہم نے یہ سنا ہے کہ دوستوں کی لعن طعن کا واقعہ کتاب کی اشاعت سے پہلے کا نہیں، بعد کا ہے۔ واللہ علم بالصواب۔

(۲رجون ۱۹۸۸ء)

اہلِ تحقیق کو الگ سے مزاح لکھنے کی ضرورت نہیں

طنز و مزاح کانفرنس کے حوالے سے جن ہندوستانی ادیبوں نے کراچی کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے نوازا، ان سب پر اگر فرداً فرداً کالم لکھے جائیں تو اس کام کے لیے عمرِ نوح درکار ہوگی۔ بفرضِ محال اگر ہمیں عمرِ نوح مل جائے تو اس کے بھی ضائع ہو جانے کا اندیشہ ہے کیونکہ معزز مہمانوں کی خوبیوں کا ذکر کرنے سے پہلے ان خوبیوں کو تلاش کرنے میں جان کھپانی ہوگی۔ ہمیں اپنی جان کی تو پرواہ نہیں، لیکن معزز مہمانوں کے حوالے سے کسی کوشش میں ناکام ہونا ہمیں گوارا نہیں۔ بہرحال آدابِ میزبانی کے تحت کچھ نہ کچھ تو لکھنا ہی ہوگا۔ البتہ عرض ہے کہ بیشتر مہمانوں کا تعلق مرحوم ریاست حیدرآباد دکن سے ہے۔ لکھنؤ اور دہلی کی طرح اس خطے کا تعلق بھی ہمارے ثقافتی ماضی سے ہے۔ دکنی مہمانوں سے مل کر دکنی تہذیب اور وضعداری کی تصویر آنکھوں کے سامنے آ گئی۔ ایسا محسوس ہوا جیسے چار مینار، موسیٰ ندی اور ڈاکٹر زور والا حیدرآباد ہمیں کراچی میں ہے۔

مہمانوں میں ڈاکٹر حبیب ضیاء اور ڈاکٹر رشید موسوی جیسی پڑھی لکھی خواتین بھی شامل ہیں۔ یہ اس اعتبار سے منفرد ہیں کہ انھیں مزاح بھی عزیز ہے اور تحقیق سے بھی لگاؤ ہے۔ ہمارے علم کی حد تک ان کی ایک ایک مزاحیہ اور ایک ایک تحقیقی کتاب شائع ہو چکی ہے۔ چونکہ ہمارا علم ناقص ہے اس لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ مزاح کس کتاب میں ہے اور تحقیق کس میں ہے۔ اگرچہ اہلِ تحقیق کو الگ سے مزاح لکھنے کی ضرورت نہیں ہوتی اس کے باوجود ان خواتین نے ثابت کر دیا ہے کہ سنجیدہ اور غیر سنجیدہ کام بیک وقت انجام دیے جا سکتے ہیں۔ ڈاکٹر حبیب ضیاء نے دکنی قواعد پر تحقیق کی ہے اور ڈاکٹر رشید موسوی نے دکن میں مرثیہ گوئی اور عزاداری پر ضخیم مقالہ لکھا ہے۔ یہ دونوں کتابیں ہماری نظر سے گزری ہیں۔ یہ اتنی ثقیل ہیں کہ اب ہماری نظر اس قابل نہیں رہی کہ اس کے سامنے سے کوئی چیز گزرے۔

حمایت اللہ دکن کے مشہور شاعر ہیں اور اپنی بیگم ڈاکٹر رشید موسوی کے ساتھ بطور زادِ سفر تشریف لائے ہیں۔ گویا وجہ شہرت شاعری ہی نہیں بیگم کا علمی مرتبہ بھی ہے۔ حمایت اللہ دکنی زبان میں نہایت عمدہ مزاحیہ شعر کہتے ہیں۔ ان کی مزاحیہ شاعری کے عمدہ ہونے ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ ان کی اہلیہ نے مرثیے اور عزاداری کو موضوعِ تحقیق بنایا ہے۔

مصطفیٰ علی بیگ بھی شاعر ہیں۔ ان کی خوبی یہ ہے کہ اکبر الٰہ آبادی کی طرح اردو میں انگریزی الفاظ کی ملاوٹ سے شعر کہتے ہیں۔ پڑھتے بھی خوب ہیں، ہر غزل کے مزاج کے مطابق ترنم ہوتا ہے۔ گویا مزاحیہ شاعری کے افتخار امام صدیقی ہیں جنھوں نے غزل کی گائیکی میں بڑا نام پیدا کیا ہے۔ افتخار امام اور مصطفیٰ علی بیگ میں یہ قدر مشترک بھی ہے کہ یہ دونوں صرف اپنی غزلیں گاتے ہیں، دوسروں کی نہیں۔

مصطفیٰ علی بیگ اور حمایت اللہ مل کر مزاحیہ خاکے بھی پیش کرتے ہیں۔ ایسے ایسے سوانگ بھرتے ہیں کہ دیکھنے والے دیکھتے ہی رہ جاتے ہیں۔ اصل کام ان دونوں کا یہی ہے، شاعری کو اضافی خوبی سمجھنا چاہیے۔ یا پھر یہ بھی ممکن ہے اردو کے نوے فی صد شاعروں کی طرح یہ بھی شاعری کا سوانگ بھرتے ہوں۔

بمبئی کے فیاض احمد فیضی ایک نوجوان مزاح نگار ہیں۔ مگر یہ صرف نوجوان نہیں اور بہت کچھ ہیں۔ انھوں نے طنز و مزاح کانفرنس میں ایک خوبصورت مضمون ''پچھلوں میں رنگ بھرے'' پڑھ کر جو اثر قائم کیا تھا، اسے خود ہی اپنے ایک دوسرے مضمون کے ذریعے نہایت خوش اسلوبی سے زائل کر دیا۔ یہ مضمون بمبئی کی لڑکیوں کے بارے میں تھا جو غالب لائبریری کی اس تقریب میں پڑھا گیا تھا جو ہندوستانی مہمانوں کے اعزاز میں منعقد ہوئی تھی۔ اس مضمون میں فیضی صاحب نے بمبئی کی لڑکیوں کا اس انداز میں ذکر کیا ہے جیسے وہ کراچی پہنچ کر نوجوانی کی حدود میں داخل ہوئے ہوں اور اپنے بچپن کے بمبئی کی یادوں کو تازہ کر رہے ہوں۔

رسالہ ''شگوفہ'' حیدرآباد دکن کے مدیر مصطفیٰ کمال بھی مہمانوں میں شامل ہیں۔ وہ طنز و مزاح نہیں لکھتے، طنز و مزاح پر لکھتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں وہ نقاد اور ادبی مورخ ہیں۔ اپنے رسالے کے ذریعے طنزیہ و مزاحیہ ادب کی بڑی خدمت کر رہے ہیں۔ اس رسالے کا معیار خاصا اعلیٰ ہے کیونکہ کبھی کبھی اس میں ہمارے کالم بھی نقل ہوتے ہیں جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ نقل

کے لیے جتنی عقل کی ضرورت ہوتی ہے اتنی مدیرِ موصوف میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ ''شگوفہ'' کے کئی خاص نمبر شائع ہو چکے ہیں۔ ''ہندوستانی مزاح نمبر'' اور ''مجتبیٰ حسین نمبر'' ہماری نظر سے گزرے ہیں۔ مصطفیٰ کمال نے انھیں بڑی محنت سے مرتب کیا ہے۔ طنز و مزاح کانفرنس میں مصطفیٰ کمال نے ایک بڑا اچھا مقالہ دکن کے طنز و مزاح پر پڑھا۔ بعد کی محفلوں میں وہ مہمانوں کی طرف سے میزبانوں کا شکریہ ادا کرنے کا فریضہ انجام دیتے رہے۔ شکریہ وہ اس طرح ادا کرتے تھے جیسے اپنے سر سے کوئی بوجھ اتار کر سننے والوں کے سروں پر رکھ رہے ہوں۔

ہمارا ارادہ ''شگوفہ'' کے مجتبیٰ حسین نمبر پر تبصرہ کرنے کا تھا لیکن اب جب کہ خود مجتبیٰ حسین یہاں تشریف لے آئے ہیں تو کیوں نہ خود انھیں پر تبصرہ کر دیا جائے۔ سب سے پہلی بات تو یہ کہ وہ پاکستان میں بے حد مقبول ہیں، ان سے ملنے کے لیے لوگ اس طرح بے چین نظر آتے ہیں جیسے مجتبیٰ حسین ادیب نہ ہوں فلم اسٹار ہوں۔ ان کی طنزیہ و مزاحیہ تحریروں سے تو ہم واقف تھے لیکن شخصیت کے جادو سے پہلی مرتبہ آگاہی ہوئی۔ بڑے باغ و بہار آدمی ہیں۔ گفتگو ایسی دلچسپ ہوتی ہے کہ وہ کہیں اور سنا کرے کوئی۔ شفیقہ فرحت کا کہنا ہے کہ مجتبیٰ حسین اتنے خوش گفتار ہیں کہ وہ جھوٹ بھی بولتے ہیں تو سچ معلوم ہوتا ہے۔ ہم نے پوچھا، اور جب وہ سچ بولتے ہیں تو کیا محسوس ہوتا ہے؟ محترمہ نے فرمایا: ''اس کا ہمیں تو کیا خود مجتبیٰ حسین کو بھی تجربہ نہیں ہے۔''

مجتبیٰ حسین کی آٹھ دس کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ان میں شخصی خاکوں کے دو مجموعے اور ایک سفرنامہ ''جاپان چلو'' بھی شامل ہے۔ یہ ساری کتابیں خاصی مقبول ہوئی ہیں اور ان کے کئی کئی ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ مجتبیٰ حسین کی مقبولیت کا سبب، بقول ڈاکٹر مغنی تبسم، یہ ہے کہ وہ ''بنیادی طور پر ایک قصہ گو ہیں۔ ان کا موضوع انسان ہے اور وہ انسان کو سماج کے چوکھٹے میں دیکھتے اور پیش کرتے ہیں۔ انھیں واقعہ نگاری اور مرقع کشی میں کمال حاصل ہے۔ ان کا مشاہدہ جزئیاتی ہے اور اسی وصف کو کام میں لا کر کسی واقعے کے مضحک پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہیں۔ روزمرہ زندگی میں پیش آنے والے معمولی واقعات بھی ان کی نظر سے نہیں چوکتے۔ سماج کے مختلف طبقوں اور شعبوں سے تعلق رکھنے والے افراد کے طرزِ زندگی، ان کے مسائل اور ان کے مخصوص رویوں، عادتوں اور خصائل کا انھوں نے گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے۔ کسی واقعہ کو محسوس بنا کر پیش کرنا اور کسی کردار کی جیتی جاگتی تصویر کھینچ دینا مجتبیٰ حسین کے فن کا خاص وصف ہے۔''

ڈاکٹر مغنی تبسم صاحب نظر نقاد ہیں، اسی لیے انھوں نے یہ تو بتا دیا کہ مجتبیٰ حسین نے افراد کے طرزِ زندگی، مسائل، عادتوں اور رویوں کا مطالعہ کیا ہے۔ یہ نہیں بتایا کہ مجتبیٰ حسین کو کتابوں کے مطالعے سے بھی دلچسپی ہے یا نہیں۔ یہ ہم بتائے دیتے ہیں۔ چند روز ہوئے ہماری موجودگی میں ایک ہماری نقاد ان سے ملنے کے لیے آئے۔ مجتبیٰ حسین نے اپنی چند کتابیں انھیں پیش کیں۔ جواب نقاد نے بھی جوابی کارروائی کے طور پر اپنا نیا تنقیدی مجموعہ مجتبیٰ حسین کی نذر کیا۔ جب وہ چلے گئے تو مجتبیٰ حسین نے یہ تنقیدی مجموعہ ہمیں دے دیا اور کہا، ''اینٹ کا جواب پتھر سے دینا اچھی بات ہے لیکن نقاد صاحب نے کچھ ضرورت سے زیادہ بھاری پتھر لڑھکایا ہے، لہٰذا اس پتھر کو چوم کر چھوڑ دینا ہی بہتر ہے، ویسے بھی ہوائی جہاز کے سفر میں اتنی وزنی چیز کو ساتھ لے جانا مناسب نہ ہوگا۔''

یوسف ناظم بلاشبہ عمر اور فن کے اعتبار سے بڑے طنز و مزاح نگار ہیں۔ انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ سراپا انتخاب ہے۔ وہ ایسے ایسے موضوعات ڈھونڈ کر لاتے ہیں کہ ان کی تلاش پر حیرت ہوتی ہے اور ان موضوعات پر جس طرح وہ لکھتے ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا ذہنی افق بے حد وسیع ہے۔ وہ دیکھنے میں جتنے سنجیدہ نظر آتے ہیں، برتنے میں اتنے ہی اس کے برعکس ہیں۔ کبھی کبھی تو ان سے باتیں کرتے ہوئے خوف آتا ہے کہ نہ جانے کیا کچھ سننا پڑ جائے گا۔ ان کا کوئی جملہ بے مقصد نہیں ہوتا، کسی نہ کسی کی شامت اعمال کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ مجتبیٰ حسین اپنے بڑے بھائی کے سامنے سگریٹ نہیں پیتے۔ ایک محفل میں ان کے بھائی بھی موجود تھے، اس لیے مجتبیٰ حسین کو سگریٹ پینے کے لیے کئی مرتبہ کمرے سے باہر جانا پڑا۔ اس پر یوسف ناظم نے کہا، ''یہ اپنے بھائی کے سامنے سگریٹ نہیں پیتے لیکن اپنی کتابیں چھپوا کر انھیں پیش کر دیتے ہیں جو زیادہ شرمناک کام ہے۔''

یوسف ناظم کی تقریباً ایک درجن کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ۲۵ سال پہلے جب ان کا مجموعہ مضامین ''کیف و کم'' شائع ہوا تھا تو کرشن چندر نے اس کے دیباچے میں لکھا تھا:

> ''ان کی ظرافت کا معیار حقیقی، شائستہ اور مہذب ہے۔ جو بلند بانگ دیہاتی قہقہوں کے بجائے ہونٹوں پر مسکراہٹ لاتا ہے اور محظوظ ہونے کے بجائے خوش خنداں ہونے پر زیادہ زور دیتا ہے، اور اس طرح قاری کے ذہن کو غور و فکر کی طرف مائل کرتے ہوئے اس مرکزی بات کی طرف متوجہ کرتا ہے جو

فنی کے پردے میں کہی گئی ہے۔ اختصار کے فن میں وہ پطرس کے قریب ہیں اور اپنے اسلوب کے مزاج کے اعتبار سے رشید احمد صدیقی کے طرفدار نظر آتے ہیں۔ یہ دونوں مدرسۂ فکر ایک دوسرے سے اس قدر الگ الگ اور دور دور ہیں کہ حیرت ہوتی ہے کہ یوسف ناظم نے کیسے ان دونوں کی خوبیوں کو اپنی تحریر میں یکجا کر دیا ہے کہ وہ بالکل ایک نئی چیز معلوم ہوتی ہے۔"

یہ ۲۵ سال پہلے کی بات ہے۔ اس کے بعد تو یوسف ناظم نے فکر و فن کے اعتبار سے جو مرحلے طے کیے ہیں، ان کے پیش نظر وہ خود ایک مدرسۂ فکر بن گئے ہیں...... ہمیں یقین ہے کہ ہمارا یہ جملہ پڑھ کر مجتبیٰ حسین ضرور یہ کہیں گے کہ "فکر" کا لفظ "فکر و تشویش" کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔

(۲۳ جون ۱۹۸۸ء)

دُم ہلانا عاجزی اور اخلاق کا استعارہ ہے

خدا خوش رکھے مولانا کوثر نیازی کو کہ ادب اور سیاست کے کوچوں کی رونق انھی کے دم سے ہے۔ وہ ایک جمال دوست شاعر اور آمال دوست سیاستداں ہیں (کاتب صاحب آمال کو مال نہ لکھ دیں گے)۔ ان کی شاعری کیا ہے، عشق کا خزینہ ہے۔ سیاست کیا ہے، اخلاق کا دفینہ ہے...... (یہاں ہم نے لفظ "دفینہ" مدفن کے معنوں میں نہیں، خزانے کے معنوں میں استعمال کیا ہے)۔

جب بھی مولانا کا کوئی سیاسی بیان چھپتا ہے، ہم اس سے اور کچھ حاصل کریں یا نہ کریں، [illegible] ضرور حاصل کرتے ہیں اور جب ان کی کوئی کتاب ہماری نظر سے گزرتی ہے تو ہم نظر کے [illegible] کا شکوہ نہیں کرتے، بلکہ دل و دماغ کو جو سکون ملتا ہے، اس پر خوش ہوتے ہیں کہ اس [illegible] ادب میں خوش ہونے کے لیے یہی کچھ رہ گیا ہے۔

جب ہمیں معلوم ہوا کہ مولانا کی نئی کتاب "کوہ قاف کے دیس میں" چھپ گئی ہے تو ہم کتاب کا نام سن کر ہی خوش ہو گئے کہ ادب کے مولانا نے لمبا ہاتھ مارا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ کوہ قاف کی پریوں تک بھی ان کی رسائی ہو گئی۔ لیکن کتاب دیکھی تو معلوم ہوا کہ یہ تو روس کا سفرنامہ ہے [illegible] ایک صاحب قلب ونظر سیاح کا اعمال نامہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ یہاں ہمیں ایک واقعہ یاد آ گیا، [illegible] عرض ہے۔ ایک مشہور ادیب نے سفرنامہ لکھا اور اس کے نام کے بارے میں ہم سے مشورہ کیا۔ مصنف نے نام "ایک سیاح کا اعمال نامۂ سفر" تجویز کیا تھا۔ ہم نے مشورہ دیا، "نام طویل ہے، مختصر کر دیجیے۔ "سیاہ نامۂ اعمال" مناسب رہے گا۔"

مولانا کے سفرنامے پر کالم لکھنے کے لیے پر تول رہے تھے کہ مشہور ادیب حمزہ فاروقی کے [illegible] کی صورت اپنے تاثرات لکھ بھیجے اور یہ خواہش ظاہر کی کہ انھیں "تکبیر" میں شائع کر دیا جائے۔ "تکبیر" میں اس قسم کی تحریروں کی گنجائش اسی وقت نکل سکتی ہے جب وہ بطور اشتہار موصول ہوں۔ ظاہر ہے حمزہ فاروقی جیسے ممتاز ادیب سے یہ کہنا کہ وہ اپنی کسی تحریر کو اشتہار کی صورت میں

شائع کرائیں، نامناسب ہے۔ لہٰذا اس کے سوا کوئی چارہ نہیں، ہم اس تبصرے کو اپنے کالم میں جگہ دیں کہ ہمارا کالم فقیر کا کشکول ہے، جس نے جو دے دیا بخوشی قبول کر لیا۔ یہ ظاہر ہے کہ فقیر کے کشکول میں ہیرے موتی کوئی نہیں ڈالتا۔

پہلے حمزہ صاحب کا تبصرہ ملاحظہ فرمایئے۔ اس کے بعد ہم بھی کچھ عرض کریں گے۔

''مولانا کوثر نیازی پچھلے سال روس کے دورے پر گئے تھے اور اس سفر کا احوال پہلے تو ایک مقامی روزنامے میں شائع ہوا تھا، اب ان مضامین کو ''کوہ قاف کے دیس میں'' نامی کتاب کا روپ دیا گیا ہے۔ مولانا کے صدا بہار قلم سے روس کے بارے میں ایک عمدہ سفرنامہ عالم وجود میں آیا ہے۔

مولانا نیازی نے اس سفرنامے میں ایک مقام پر اپنے بارے میں تحریر فرمایا ہے: ''میں نے بھونرا بننے کی کوشش کی ہے جو پھولوں پر بیٹھتا اور ان کا رس سمیٹنے کی کوشش کرتا ہے۔'' مولانا کے بارے میں یہی بات اگر کوئی اور شخص کہتا تو ہم اسے کردار کشی کی مہم کا حصہ سمجھتے۔ لیکن اب تو کہا جا سکتا ہے کہ انواع و اقسام کے پھولوں کے ساتھ بھونرے جیسا تعلق رکھنا بھی کردار سازی کی مہم کا ایک حصہ ہے۔

آپ کو روس میں اسلام آزاد اور ترقی پذیر نظر آیا۔ بعض کوتاہ بیں حضرات کو مولانا کے اس بیان پر اعتراض ہے۔ حالانکہ یہ موقع اعتراض کا نہیں، اعتراف حقائق کا ہے۔ روس کے سرکاری علماء نے اسلام کو جس قدر آزاد اور مسلمانوں کو جس قدر رفتار پایا اس کی جھلک مولانا کو دکھا دی اور مولانا نے حق نمک ادا کرتے ہوئے وسط ایشیا میں دودھ اور شہد کی نہریں بہا دیں۔ مولانا غالباً یہ بھول گئے کہ وسط ایشیا کی مسلم ریاستوں میں انقلاب روس کے بعد مساجد اور مدارس کی تعداد عشر عشیر بھی نہیں رہی۔ لاکھوں مسلمان کمیونزم کے خلاف جدوجہد کے دوران شہید ہوئے۔

مولانا کے قلم معجز رقم نے اکثر مقامات پر پاکستانی حکمرانوں کی خبر لی ہے کہ ان ناہنجاروں نے روس کے جذبۂ خیر سگالی اور محبت کی قدر نہ کی۔ روسی حکمراں تو پاکستانیوں کی محبت میں مرے جا رہے تھے اور پاکستانی اس محبت کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ روسیوں نے تو ۱۹۷۱ء کی جنگ کے دوران بھارت کے ذریعے پھول بھجوائے تھے لیکن کم اندیش پاکستانیوں نے انھیں بم سمجھا جنھیں بھارتی طیارے محبت و خیر سگالی کے اظہار کے طور پر

پاکستان کے طول و عرض میں بکھیر رہے تھے۔

ہمیں یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ مولانا کی اعلیٰ ادبی صلاحیتوں کی قدر شناسی کا حق بھی روسیوں نے ادا کیا۔ ان کا فارسی زبان میں بے تکان تقریر کرنا اور بے لگام شاعری کرنا، وسط ایشیاء کے مسلمانوں کو بہت پسند آیا۔ اگر مولانا کچھ عرصہ وہاں مزید قیام کرتے تو بآسانی ملک الشعراء کے منصب تک پہنچ جاتے، لیکن وطن عزیز کی محبت انھیں کھینچ لائی۔ مولانا نے اس سفرنامے میں جا بجا اپنے کلام بلاغت نظام کے نمونے پیش کیے ہیں۔ خوبی یہ تھی کہ سفر روس کے دوران انھوں نے ایک نماز قضا نہ کی اور ایک بھی شعر موزوں نہ پڑھا۔ جہاں شاعری ان سے عاجز ہوئی وہاں نثری نظم سے کام چلایا۔ ہم نے ان کی شاعری میں معنی اور وزن تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہے۔

مولانا ماسکو میں قیام کے دوران انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز کی زیارت کی اور علوم شرقیہ کے ماہرین کو پاکستانی سیاست دانوں کے بارے میں اطلاعات بہم پہنچائیں۔ مولانا اس فن میں بے حد مہارت رکھتے ہیں۔ جب آپ جماعت اسلامی سے وابستہ تھے تو جماعت کے قائدین کے بارے میں اطلاعات حکومت کو فراہم کرتے تھے اور انھی خدمات کے صلے میں وزیر اطلاعات بنے تھے۔ اب ان کی خدمات کا دائرہ قومی سرحدوں کو عبور کر کے بین الاقوامی حدود تک آن پہنچا ہے۔ اللہ اور ترقی دے۔

مولانا روسیوں کی مہمان نوازی کے بے حد قائل ہیں کیونکہ روسیوں اور وسط ایشیا کے مسلمانوں نے انھیں کھانے کی میز پر داد شجاعت دکھانے کے لیے کوئی پابندی عائد نہ کی تھی۔ صرف ایک موقع پر آپ محظوظ نہ ہو سکے تھے جب ماسکو میں انھیں ایک ہندوستانی ریسٹوران میں کھانے کے لیے اپنی گرہ سے دام خرچ کرنے پڑے تھے۔ ڈالر خرچ کرنے کے بعد انھیں ہندوستانی کھانے میں خاک مزہ نہ آیا، ورنہ مولانا نے جس کے گھر کھایا اسی کا گن گایا۔ ہماری بات پر یقین نہ آئے تو سفرنامہ دیکھ لیجیے۔''

حمزہ صاحب کے تاثرات آپ نے پڑھے۔ انصاف کی بات یہ ہے کہ وہ مولانا کے سفرنامے سے انصاف نہیں کر سکے۔ لہٰذا ہم انصاف کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اس سفرنامے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ نہایت عمدہ کاغذ پر نوری نستعلیق میں چھپا ہے۔ جا بجا مولانا کی تصاویر نظر آتی ہیں جس کی وجہ سے کتاب مرقعِ بہزاد بن گئی ہے۔ اردو میں ایسی خوبصورت کتابیں کم چھپتی ہیں۔ ہم نے کتابوں اور انسانوں کے پرکھنے کا جو معیار اپنے ذہن میں قائم کر رکھا ہے، اس کے مطابق ہم یہ سمجھتے ہیں کہ جس کا ظاہر اچھا ہوگا، اس کا باطن بھی اچھا ہو گا۔ مولانا کی کتاب چونکہ ظاہری طور پر عمدہ ہے، اس لیے معنوی اعتبار سے بھی اس کے بلند پایہ ہونے میں شبہ نہیں کیا جا سکتا۔

روس میں مولانا کوثر نیازی کو پاکستانی اور بین الاقوامی سیاست کے ماہر کی حیثیت سے ہی نہیں بلکہ ایک صاحب طرز ادیب اور فیض احمد فیض کے پائے کے شاعر کے طور پر خوش آمدید کہا گیا۔ روس میں ان کی شہرت خود ان کے ورود سے پہلے پہنچ چکی تھی۔ وہ جہاں جاتے تھے، لوگ ان کے نام اور کام سے آشنا نکلتے تھے، اور کچھ نہیں تو لوگ ریڈیو پاکستان سے نشر شدہ مولانا کی تقریر کے حوالے سے بھی ان کو پہچان لیتے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ریڈیو پاکستان، پاکستان میں نہ سہی روس میں ضرور سنا جاتا ہے۔

روس میں مولانا کے نام کی کیا اہمیت ہے، اس کا اندازہ بلدیہ دوشنبہ کے میئر کے اس تقریر سے ہوتا ہے جسے مولانا نے بڑے فخر کے ساتھ اپنے سفرنامے میں درج کیا ہے۔ اس تقریر کا پہلا جملہ یہ ہے، "آپ کا نام ہمارے لیے روزِ عید سے کم نہیں۔" گویا اشتراکی قبضے کے بعد وسط ایشیا کے مسلمانوں کے لیے عید کی صرف اتنی اہمیت رہ گئی ہے جتنی مولانا کوثر نیازی کے نام نامی کی۔

اوپر ہم نے لکھا ہے کہ روس میں مولانا کو فیض احمد فیض کے پائے کا شاعر سمجھا گیا (افسوس کہ فیض صاحب ہمارے درمیان موجود نہیں ورنہ اپنی اس عزت افزائی پر ترکِ شعر کا مصمم ارادہ کر لیتے)۔ ہماری اطلاع کا مآخذ خود مولانا کا یہ بیان ہے کہ جب ماسکو ریڈیو کی اردو سروس کے لیے مس لڈمیلا نامی "خوش گفتار، سلیقہ مند اور شیریں لب و لہجہ رکھنے والی خاتون" انٹرویو لینے آئیں تو انھوں نے مولانا صاحب سے دو باتیں کہیں۔ ایک تو یہ کہ "اتنی اچھی اردو عرصۂ دراز کے بعد سننے کو ملی۔" جس کے جواب میں مولانا نے فرمایا، "یہ آپ کا حسنِ سماعت ہے۔" دوسری بات مس لڈمیلا نے یہ کہی، "جب کبھی فیض صاحب ماسکو آتے تھے تو ہم ان کی نئی غزلیں نشر کیا کرتے تھے پھر اب اتنے وقفے بعد ہم آپ کی نظم سنا رہے ہیں۔" جہاں مس لڈمیلا کا حسنِ سماعت داد کے

قابل ہے، وہیں ان کی سخن فہمی بھی تعریف کے لائق ہے کہ انھیں فیض کے بعد مولانا کوثر نیازی ہی ریڈیو ماسکو کے لائق نظر آئے۔

مذکورہ نظم کا قصہ یہ ہے کہ جب مولانا نے تاجکستان کا نورک پاور اسٹیشن دیکھا تو بقول خود ان کے ذہن میں شاعری کی سوئی ہوئی صلاحیتیں بیدار ہو گئیں اور انھوں نے فی البدیہہ ایک نظم لکھ ڈالی۔ قطع نظر اس سے کہ مولانا کے دو شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں اور ان کی اشاعت کے بعد شاعری کی سوئی ہوئی صلاحیتوں کا بیدار ہونا ایک حیرت انگیز واقعہ ہے، یہ نظم بذاتِ خود ایک ادبی معجزہ ہے کیونکہ اسے پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ مولانا کی شعر کہنے کی صلاحیتیں بیدار نہ ہوتیں تو وہ تب بھی اس قسم کی نظم بآسانی لکھ سکتے تھے۔ افسوس کہ طوالت کی وجہ سے اس نظم کو ہم اپنے کالم میں نقل نہیں کر سکتے، ورنہ قارئین خود اندازہ کر لیتے کہ مولانا سخن گو کی حیثیت سے کس اعلیٰ مقام پر فائز ہیں۔

مولانا سخن گو ہی نہیں، سخن فہم بھی ہیں۔ وسط ایشیا کے شاعروں کے منظوم اردو تراجم کا ایک مجموعہ تاشقند سے شائع ہوا تھا۔ اسے سامنے رکھ کر مولانا نے وہاں کے شاعروں کے کلام پر فکر انگیز تبصرے کیے ہیں۔ ایک شاعر کی نظم "مچھلی" کے بارے میں ہے۔ اس کا یہ شعر مولانا کو بہت پسند آیا:

دُم ہلاتی ہے آگے بڑھتی ہے
آگے بڑھتی ہے دُم ہلاتی ہے

مولانا فرماتے ہیں، "شاعر نے کتنا بڑا مضمون پیدا کیا ہے۔ دُم ہلانا عاجزی اور اخلاق کا نشان ہے۔ مچھلی آگے بڑھنے کے لیے یہی ہتھیار استعمال کرتی ہے۔"..... مس لڈمیلا نے شاید مولانا کی اسی قسم کی اردو دانی کی تعریف کی تھی۔ اردو میں دُم ہلانا خوشامد اور چاپلوسی کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے، ممکن ہے ۱۷ء سے پہلے کے جمہوری دور میں "دُم ہلانا" کو عاجزی و اخلاق کا مترادف قرار دیا گیا ہو۔

سفرنامے کے ایک خاصے طویل باب میں روسی رہنما گورباچوف کے حالاتِ زندگی تفصیل سے لکھے گئے ہیں جن کا مولانا کی سیر و سیاحت سے تو کیا، اشغال و اطوار سے بھی کوئی تعلق نہیں۔ گورباچوف ایک دہریہ ہے اور مولانا صاحب خدا کے فضل سے دیندار آدمی ہیں۔ ایک دیندار کے

دہریے کا اپنا آئینہ میں بنا کر پیش کرنا کوئی معمولی بات نہیں۔ بہرحال مولانا نے اِدھر اُدھر کے تشہیری مواد کو سامنے رکھ کر یہ باب اس طرح مرتب کیا ہے جیسے وہ گورباچوف کا، سرکاری سوانحی خاکہ لکھ رہے ہیں۔ اگر کبھی روسی سفارت خانے والوں نے اُردو داں طبقے کے لیے اپنے رہنما کا سوانحی خاکہ تیار کرایا تو مولانا کے لکھے ہوئے سوانحی خاکے سے بہتر نہیں ہو سکتا۔ کیا ہی اچھا ہو اگر مولانا صاحب گورباچوف کی مکمل اور مفصل سوانح عمری تحریر فرما دیں۔ اس کام کا انھیں خاصا تجربہ ہے جو ''دیدہ ور'' جیسی کتاب کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ گورباچوف کی سوانح عمری کا نام ''دیدہ ور نمبر۲'' رکھا جا سکتا ہے۔

(۱۳ جولائی ۱۹۸۸ء)

مصنف کی قیمت کم، کتاب کی زیادہ

ہم آج تک یہ مسئلہ حل نہیں کر سکے کہ میرزا ادیب کسی ایک شخص کا نام ہے یا بہت سے افراد کا۔ نصف صدی سے میرزا صاحب کی ایک ہی جیسی تصویریں چھپ رہی ہیں، بلکہ یہ کہیے کہ ایک ہی تصویر چھپ رہی ہے جو اُن کی جوانی کے زمانے کی ہے۔ اس تصویر کو دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ ''میرزا ادیب'' کے پردۂ زنگاری میں ایک ہی شخص کارفرما ہے، لیکن اس نام سے جو ایک گرس کتابیں چھپی ہیں، وہ موضوعات کے اعتبار سے اتنی متنوع ہیں کہ یقین نہیں آتا کہ یہ ایک ہی شخص کے قلم کا نتیجہ ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک ہی شخص رومانی کہانیوں، مختصر افسانوں، ڈراموں، ناولوں، شخصی خاکوں، سفرناموں، کالموں، تبصروں، تنقید پاروں، ترجموں اور بچوں کے لیے کتابوں کے ڈھیر لگا دے اور ساتھ ہی ان کا معیار اتنا اعلیٰ ہو کہ ہر تحریر پر ادبِ عالیہ کا گمان ہو۔ ادبِ عالیہ سے ہماری مراد یہ نہیں ہے کہ میرزا ادیب کی تحریروں پر ڈاکٹر عالیہ امام کی تحریروں کا گمان ہوتا ہے، بلکہ یہ عرض کرنا مقصود ہے کہ میرزا صاحب جو کچھ لکھتے ہیں وہ سراپا [illegible] ہوتا ہے۔

میرزا صاحب نے بڑے لوگوں کی سوانح عمریاں بھی لکھی ہیں، جن میں خود ان کی اپنی سوانح عمری بھی شامل ہے۔ یہ ''مٹی کا دیا'' کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ میرزا صاحب کی سوانح عمری کوئی دوسرا شخص بھی لکھ سکتا تھا، لیکن جس عقیدت اور احترام سے یہ کام خود میرزا صاحب نے انجام دیا ہے، اس طرح کوئی دوسرا انجام نہیں دے سکتا تھا۔ ایک مرتبہ ہم نے میرزا صاحب سے عرض کیا تھا کہ ہم آپ کی سوانح عمری لکھنا چاہتے ہیں۔ میرزا صاحب یہ سن کر خاموش ہو گئے۔ جس کا واضح اور صریح مطلب یہ تھا کہ وہ ہمیں اس کام کا اہل نہیں سمجھتے اور نہیں چاہتے کہ جن ہاتھوں سے کالم لکھے ہیں انھی آلودہ ہاتھوں سے ان کی سوانح عمری لکھیں۔

''اس واقعے کے کوئی دو مہینے بعد ''مٹی کا دیا'' شائع ہوئی تو یہ راز کھلا کہ واقعی اس کام کے

لیے میرزا صاحب سے زیادہ کوئی اور شخص موزوں نہیں ہو سکتا تھا۔ ہم اگر اُن کی سوانح عمری لکھتے تو کچھ سنی سنائی باتوں اور کچھ چشم دید وارداتوں کو سو ڈیڑھ سو صفحے میں قلم بند کر دیتے یا اگر بہت کوشش کرتے تو افواہوں اور لطیفوں کی مدد سے ڈھائی تین سو صفحات لکھ دیتے، لیکن چھ سات سو صفحات لکھنا میرزا صاحب ہی کے بس کی بات ہے۔ ''مٹی کا دیا'' اُردو کی چند بہترین خود نوشت سوانح عمریوں میں شمار ہوتی ہے۔ اس میں صرف ایک شخص کے حالاتِ زندگی ہی نہیں ملتے، بلکہ پورے ایک عہد کی علمی، ادبی اور تہذیبی زندگی بھی دکھائی دیتی ہے۔ میرزا صاحب نے جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، اسے صفحۂ قرطاس پر منتقل کر کے آنے والی نسلوں کے سامنے ایک مستند ادبی و تہذیبی دستاویز پیش کر دی۔

میرزا صاحب ہمارے ان ادیبوں میں سے ہیں جنھوں نے ادب کی خدمت صرف کتابیں لکھ کر نہیں کی، کئی اور طریقوں سے بھی ہمارے ادب کو نوازا ہے۔ مثلاً موجودہ دور کے بے شمار ادیبوں کی صلاحیتوں کو دریافت کرنے کا سہرا اُن کے سر ہے۔ وہ سترہ برس تک اُردو کے ممتاز رسالے ''ادبِ لطیف'' کے ایڈیٹر رہے ہیں۔ ''ادبِ لطیف'' اب بھی نکلتا ہے، مگر میرزا ادیب کی ادارت کے زمانے میں یہ محض کاغذی گھوڑا نہیں تھا، بلکہ ایک ادبی تحریک تھا۔ اُردو کے تمام بہترین ادیب اس میں لکھتے تھے۔ میرزا صاحب صرف ''بہترین'' اور ''بڑے'' ادیبوں کے شائق نہیں تھے، وہ نئے ادیبوں کو تلاش کرتے اور ''ادبِ لطیف'' کے ذریعے انھیں متعارف کراتے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو وہ میرزا کی بجائے ''میرزا ادیب گر'' کہلانے کے مستحق ہیں۔

میرزا صاحب بلاشبہ ہمارے مقبول مصنفوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کی شاید ہی کوئی کتاب ہوگی جس کے کئی کئی ایڈیشن شائع نہ ہوئے ہوں، بلکہ کبھی کبھی تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی کتاب کا پہلا ایڈیشن ختم بھی نہیں ہوتا اور دوسرا شائع ہو جاتا ہے۔ اگر ادبی انعامات کو مقبولیت کا معیار بنایا جائے تو اس اعتبار سے بھی میرزا صاحب پاکستان کے تمام ادیبوں سے آگے ہیں۔ انھیں درجنوں ادبی انعامات مل چکے ہیں۔ اسی لیے تو بعض حاسد یہ کہتے ہیں کہ ادبی انعامات میرزا صاحب کا ذریعۂ معاش ہیں۔

میرزا صاحب کے حُسنِ کارکردگی کا صدارتی تمغا بھی مل چکا ہے۔ اس تمغے سے ایک خوشگوار یاد وابستہ ہے کہ مشہور اداکارہ روحی بانو کو بھی میرزا صاحب کے ساتھ ہی صدارتی تمغا

ملا تھا۔ اس سال لاہور میں ان دونوں کے اعزاز میں ایک مشترکہ تقریب منعقد ہوئی تھی۔ یہ دونوں اسٹیج پر پھولوں کے ہار پہن کر بیٹھے۔ ایک ہندوستانی ادیب بھی ان دنوں لاہور میں تھے، وہ بھی اس تقریب میں شریک ہوئے۔ یہ صاحب پاکستانی ادیبوں سے اس حد تک نا آشنا تھے کہ ساتھ کی کرسی پر بیٹھے ہوئے ایک تماشائی سے پوچھا، ''اسٹیج پر موجود دونوں مہمانوں میں میرزا ادیب کون سے ہیں؟'' تماشائی نے جواب دیا، ''میں خود بھی یہی معلوم کرنے کے لیے اس تقریب میں آیا ہوں۔''

میرزا صاحب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ کسی ادبی گروہ میں شامل نہیں ہیں۔ وہ گروہ بندی پر یقین نہیں رکھتے۔ ان کا خیال ہے کہ ادیب کی شناخت اس کے گروہ سے نہیں، تحریروں سے ہوتی ہے۔ جہاں سے گروہ بندی شروع ہوتی ہے، وہاں سے ادب رخصت ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے پاکستانی ادیبوں کی اکثریت اس خیال کو پسند نہیں کر سکتی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ میرزا ادیب اکیلے نظر آتے ہیں۔ جو اپنی ذات سے ایک انجمن ہو، اسے ستائش باہمی کی انجمنوں کی کیا ضرورت ہو سکتی ہے۔

میرزا صاحب گزشتہ کئی برسوں سے ''نوائے وقت'' لاہور میں ہفتہ وار کالم لکھ رہے ہیں۔ کالم نگاری میں انھوں نے ایک نیا اُسلوب ایجاد کیا ہے۔ وہ عام کالم نگاروں کی طرح جملے بازی یا فقرے بازی کے قائل نہیں ہیں۔ وہ بلا ضرورت مزاح پیدا کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ وہ جو لکھتے ہیں، شائستہ پیرائے میں لکھتے ہیں، قاری کی معلومات میں اضافہ کرتے ہیں اور بعض اوقات تو اس حد تک اضافہ کر دیتے ہیں جو قاری کی عمر میں کمی کا سبب بن سکتا ہے۔

میرزا صاحب کے کالموں کا انتخاب ''اذکار و افکار'' کے نام سے حال ہی میں شائع ہوا ہے جو پانچ حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں اقبال اور اقبالیات پر اور دوسرے حصے میں ادبی، لسانی اور اخلاقی مسائل پر لکھا ہے۔ تیسرے حصے میں شخصیات کا تذکرہ ہے۔ چوتھے حصے میں کتابوں پر تبصرے ہیں۔ پانچواں حصہ ''متفرقات'' کا ہے۔ یہ پہلے چار حصوں کی طرح فکر انگیز نہیں، اس میں شگفتہ انداز کے کالم ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ عمدہ مزاح کسے کہتے ہیں۔ ہم نے سب سے پہلے اسی حصے کو پڑھا، کہ کالموں کے ذریعے علم حاصل کرنے کے ہم قائل نہیں ہیں۔ اس زمانے میں جب علم کے بغیر کام چل سکتا ہے تو میرزا ادیب کی زیرِ نظر کتاب کے پہلے چار

حصوں کو پڑھے بغیر بھی گزارا ہو سکتا ہے۔ کتاب کے آخری حصے کا سب سے اچھا کالم "سائیکل سے کار تک" ہے۔ اس میں میرزا صاحب نے نہایت خوبصورت انداز میں لاہور کے سائیکل سوار ادیبوں کا ذکر کیا ہے۔ ہم تو لاہور کے بیشتر ادیبوں کو "پیدل" سمجھتے تھے، لیکن مرزا صاحب نے اچھے اچھوں کو سائیکل پر بٹھا دیا ہے۔

کتاب صاف ستھری چھپی ہے لیکن قیمت بہت زیادہ ہے، ڈیڑھ سو روپے۔ یہ مانا کہ مہنگائی کا زمانہ ہے لیکن اتنی بھی مہنگائی نہیں ہے کہ میرزا ادیب کی کتاب ڈیڑھ سو روپے میں فروخت کی جائے۔ حیف صد حیف کہ میرزا صاحب خود تو سرمۂ مفت نظر بن کر بلا قیمت چشم خریدار پر احسان فرمائیں اور ان کی کتاب خریدار کو سرمہ در گلو کر دے۔ ہمیں اگر یہ کتاب مفت نہ ملی تو شاید ہم اس سے محروم رہتے۔ اب جب کہ ہم اسے پڑھ چکے ہیں تو جو چاہے اسے آدھی قیمت پر خرید سکتا ہے۔ اس پیشکش سے خود میرزا صاحب بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں کیونکہ سننے میں آیا ہے کہ جب ان کی کوئی کتاب چھپتی ہے، تو وہ دوستوں میں تقسیم کرنے کے لیے چار پانچ درجن نسخے خود خریدتے ہیں۔

(۲۱ رجولائی ۱۹۸۸ء)

شرفائے ادب کے ساتھ غیر شریفانہ رویہ

پچھلے چند برسوں میں ایک عجیب وغریب 'صنفِ ادب' بڑی تیزی سے مقبول ہوئی ہے۔ اس کا نام ہے، "انٹرویو"۔ جس اخبار رسالے کو دیکھیے اس میں انٹرویو دینے اور لینے والوں کی قطاروں کی قطاریں نظر آتی ہیں۔ جس طرح انشائیے کو فروغ دینے کے لیے دبستانِ سرگودھا نے، انگریزی کے لیے جاپانی سفارت خانے نے اور نثری نظم کے لیے انیس ناگی نے تحریکیں چلا رکھی ہیں، اس طرح کی کوئی تحریک "انٹرویو" کے لیے نہیں چلائی گئی، اس کے باوجود یہ صنفِ ادب ترقی کی منزلیں جس تیزی سے طے کر رہی ہے، اتنی تیزی سے مجموعی طور پر ہمارے ادب نے تنزل کی منزلیں بھی طے نہیں کیں۔ اس صنف کی وجہ سے انٹرویو لینے والوں کا ایک ایسا طبقہ وجود میں آ گیا ہے جس کا ادب سے صرف اتنا ہی تعلق ہے کہ وہ ادیبوں سے الٹے سیدھے سوال کرتے ہیں اور سوالوں کے الٹے سیدھے جواب حاصل کر کے چھاپ دیتے ہیں۔ سوال عموماً اس طرح کے ہوتے ہیں:

- آپ کو کون سا رنگ پسند ہے؟
- آپ کس طرح لکھتے ہیں، بیٹھ کر، کھڑے ہو کر یا لیٹ کر؟
- آپ رات کو کس وقت سوتے ہیں اور کیوں؟ خواب کیسے دیکھتے ہیں؟
- صبح اٹھنے کے بعد چائے پیتے ہیں یا لسی؟

ظاہر ہے اس قسم کے سوالوں کے جواب کیا ہوں گے۔ جب ادب سے سنجیدہ تعلق ختم ہو جائے اور معاملہ زبانی جمع خرچ تک محدود ہو جائے تو اسی قسم کی باتیں اچھی لگتی ہیں۔

انٹرویو بازی کسی حد تک ہمارے ادیبوں کے سر پر سوار ہے، اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ بعض ادیب اس کا بھی انتظار نہیں کرتے کہ کوئی ان کا انٹرویو لے۔ وہ خود ہی سوال قائم کرتے ہیں اور خود ہی ان کے جواب لکھ کر اپنی متعدد تصویروں کے ساتھ چھپوا دیتے ہیں۔ ایک صاحب کو

ہم جانتے ہیں ان کا کام ہی یہی ہے کہ وہ اخباروں کے دفتروں کے چکر لگاتے رہتے ہیں۔ کسی اخبار میں اپنی کتاب پر بقلم خود تبصرہ چھپنے کے لیے دیتے ہیں اور کسی میں اپنی کتاب کی رونمائی کی خبر مع تصویر۔ اور جب موقع ملتا ہے تو فرضی انٹرویو بھی چھپوا دیتے ہیں۔ ان صاحب نے ایک مرتبہ اپنی ایک کتاب پر ہم سے تعریفی فلیپ لکھوایا۔ ہم لکھنا نہیں چاہتے تھے لیکن روز روز کے تقاضوں سے تنگ آکر ہم نے فلیپ لکھ دیا۔ جب کتاب چھپ کر آئی تو اس پر کالم لکھ کر ہم نے اپنی سابقہ رائے کی تردید اور اصل رائے کا اظہار کر دیا۔ کالم دیکھ کر یہ صاحب ناخوش ہوئے اور ایک اتفاقی ملاقات میں شکایت کی: ”آپ کا کالم پڑھ کر بے حد تکلیف ہوئی ہے۔“ ہم نے عرض کیا، ”اسی سے اندازہ کر لیجیے آپ کی کتاب پر اپنا فلیپ پڑھ کر ہمیں کس حد تک تکلیف ہوئی ہو گی۔“ ...... یہ تو خیر ایک ضمنی بات تھی، بتانا یہ تھا کہ مذکورہ صاحب نے اپنا انٹرویو خود لینے کی جو روایت قائم کی ہے، وہ ہمیں اچھی لگی ہے۔ ان کی تقلید میں ہم نے بھی اپنا ایک انٹرویو سوال جواب کی صورت میں مرتب کیا ہے، جو پیش خدمت ہے۔

س: آپ کالم کیوں لکھتے ہیں۔ کوئی شریفانہ کام کیوں نہیں کرتے؟

ج: جب ہم شاعری کرتے تھے تو تب بھی لوگ یہی سوال کرتے تھے۔ شاعری کو چھوڑ کر افسانہ نگاری شروع کی تو اعتراض کیا گیا کہ آپ نے جھوٹ لکھنے پر کمر باندھ رکھی ہے۔ ہم نادم ہوئے اور تنقید نگاری شروع کر دی۔ اب یہ کہا گیا کہ جس کو کچھ لکھنا نہیں آتا وہ نقاد بن جاتا ہے۔ پھر ایک مشکل یہ آپڑی کہ بہت سے غزل گو اور افسانہ نگار ہم سے دیباچہ یا فلیپ لکھوانے کی فرمائشیں کرنے لگے۔ بلکہ بعض تو خود ہی دیباچہ یا فلیپ لکھ کر لے آتے اور ہم سے دستخط کرا لیتے۔ ایک صاحب نے انگوٹھا بھی لگوایا کہ کہیں ہم دستخط کر کے مکر نہ جائیں۔ ہمیں ہوش اس وقت آیا جب ایک صاحب نے دیباچے کے ساتھ دیوان لکھنے کی بھی فرمائش کر دی۔ آخر پریشان ہو کر ہم نے تنقید کو خیرباد کہا اور کالم نگاری شروع کر دی۔

س: کالم نگاری کب چھوڑنے کا ارادہ ہے؟

ج: اس کا وقت بھی بہت جلد آنے والا ہے۔

س: اس کی وجہ؟

ج: بہت سی وجوہ ہیں، جن میں سرِفہرست یہ ہے کہ ہم فرمائشوں سے تنگ آ گئے

ہیں۔ اہلِ قلم اپنی کتابیں بھیجتے ہیں اور ساتھ یہ فرمائش کرتے ہیں کہ کالم لکھ دیجیے۔ ہمارا کالم ہفتے میں ایک بار چھپتا ہے اور ایک ہفتے میں موصول کتابوں کی کم از کم تعداد ایک درجن ہوتی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ گیارہ مصنفین ہم سے ناراض ہو جاتے ہیں اور وہ ایک مصنف جس کی کتاب پر ہم لکھتے ہیں، وہ بھی خوش نہیں ہوتا۔

س: کیوں خوش نہیں ہوتا؟

ج: اس لیے کہ سچ سننے کے لیے کوئی تیار نہیں۔

س: آپ کو سچ بولنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟

ج: بُری عادتیں مشکل ہی سے چھوٹتی ہیں۔

س: آپ سے کوئی خوش بھی ہے؟

ج: جی ہاں! وہ دو چار لوگ خوش بھی ہیں جن کا ذکر ہم بار بار کرتے ہیں۔ مثلاً سلطان جمیل نسیم، منظر علی خان منظر، مولانا کوثر نیازی وغیرہ۔

س: یہ لوگ تو آپ کو کالم کے لیے خام مواد فراہم کرتے ہیں؟

ج: صرف ہمیں کو فراہم نہیں کرتے، عام لوگوں کے استفادہ کے لیے کتابی صورت میں بھی چھپواتے ہیں۔

س: ان لوگوں کو بھی آپ سے کوئی شکایت پیدا ہوئی؟

ج: سلطان جمیل نسیم اور منظر علی خاں کو بھی کبھی شکایت کا موقع مل جاتا ہے۔ اگر دو چار ہفتے کالم میں ان کا ذکر نہ آئے تو ناراض ہو جاتے ہیں اور ناراضگی کا اظہار یوں کرتے ہیں کہ آپ کے کالم میں جان نہیں رہی، بے کار موضوعات پر آپ بہت زیادہ لکھنے لگے ہیں۔

س: آپ کا کالم کون لوگ زیادہ پسند کرتے ہیں؟

ج: جن کے بارے میں ہم نے کبھی کچھ نہیں لکھا۔

س: اور سب سے زیادہ ناپسند کون لوگ کرتے ہیں؟

ج: جن کے بارے میں ہم لکھتے رہتے ہیں، اور وہ لوگ بھی ناخوش ہیں جن کی کتابوں کے باوجود ہم نے ان کے متعلق کبھی کچھ نہیں لکھا۔

س: اچھا جناب یہ بتایئے جمیل نظر کی کتاب ”مقدمہ سحر و ساحری“ آپ کی نظر سے

گزری ہے؟

ج: نظر ہی سے نہیں، سر سے بھی گزر گئی ہے۔

س: کیوں؟

ج: یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ یہ کتاب لکھی کیوں گئی۔

س: شہر میں تو یہ افواہ گشت کر رہی ہے کہ یہ کتاب آپ نے لکھوائی ہے اور اس کا ثبوت یہ دیا جاتا ہے کہ کتاب کا انتساب آپ کے نام ہے؟

ج: مصنف نے ہماری اجازت تو کیا ہمارے علم کے بغیر اپنی کتاب ہمارے نام منسوب کی ہے، جس کا سبب سوائے اس کے کچھ نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنی بدنامی میں ہمیں برابر کا حصہ دار بنانا چاہتے ہیں۔

س: اس کتاب کا مقصد تو اچھا ہے کہ وہ ادیب جو ہر وقت پبلک ریلیشنگ کے چکر میں رہتے ہیں ان کو راہِ راست پر لایا جائے؟

ج: مگر اس مقصد کے حصول کا جو طریقہ مصنف نے اختیار کیا ہے وہ صحیح نہیں۔ ادیبوں کے ذاتی حالات کے سلسلے میں نہایت نازیبا باتیں لکھی گئی ہیں۔

س: یہ آپ کا ذاتی خیال ہو سکتا ہے۔ کتاب کا دیباچہ شور علیگ جیسے معتبر اور بزرگ ادیب نے لکھا ہے۔ اگر ان کے نزدیک اس کتاب کا مواد قابلِ اعتراض ہوتا تو وہ دیباچہ کیوں لکھتے؟

ج: ممکن ہے شور صاحب نے پوری کتاب نہ پڑھی ہو۔ ادھر اُدھر سے دیکھ کر دیباچہ لکھ دیا ہو۔ اگر وہ پوری کتاب پڑھتے تو مصنف کو ضرور یہ مشورہ دیتے کہ شائستگی کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے۔

س: جن شاعروں پر اس کتاب میں خامہ فرسائی کی گئی ہے ان کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

ج: اس میں ایک درجن شاعروں کو موضوع بنایا گیا ہے۔ تین شاعر تابش دہلوی، راز اکبرآبادی اور شان الحق حقی اساتذۂ فن میں سے ہیں۔ ان کے بارے میں گستاخانہ تحریروں کا کوئی جواز نہیں۔ ان تینوں کے کلام پر مصنف نے اصلاح بھی دی ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ خود

موصوف کو اصلاح کی ضرورت ہے۔ سلیم احمد ہمارے عہد کی ایک بہت بڑی ادبی شخصیت تھے۔ ان پر لکھنے سے پہلے ضروری تھا کہ مصنف کچھ پڑھ بھی لیتے۔ حمایت علی شاعر، احمد ہمدانی، صہبا اختر اور رضی اختر شوق جیسے شاعرانِ نغز گو ہمارے ادب کی آبرو ہیں۔ ان کے تعلق سے مصنف نے جو کچھ لکھا ہے، وہ ادب نہیں، بے ادبی ہے۔ حنیف اسعدی بزرگ شاعر ہیں، نعت گوئی میں ان کا انداز منفرد ہے۔ مصنف نے ان کے ساتھ بھی بڑی زیادتی کی ہے۔

س: گویا بارہ میں سے نو شاعروں کے متعلق اس کتاب میں جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ آپ کے نزدیک قابلِ اعتراض ہے۔

ج: قابلِ اعتراض ہی نہیں، قابلِ افسوس بھی ہے۔

س: باقی تین شاعروں کے بارے میں اس کتاب میں جو کچھ لکھا گیا ہے، اس کے لیے آپ کیا کہتے ہیں؟

ج: یہ تینوں خود جمیل نظر کے پائے کے شاعر ہیں اس لیے ہمارے لیے کچھ کہنا مناسب نہ ہوگا۔

س: اس کتاب کے شروع میں ایک طویل تحریر "تحسین باہمی" کے عنوان سے ہے، یہ کیسی ہے؟

ج: جیسی پوری کتاب ہے، ویسی ہی یہ تحریر بھی ہے۔ اس میں ڈاکٹر فرمان فتحپوری اور ڈاکٹر جمیل جالبی جیسے قابلِ احترام نقادوں اور بعض دوسرے شرفائے ادب کے ساتھ غیر شریفانہ سلوک روا رکھا گیا ہے۔

س: گویا اس کتاب میں کوئی اچھی چیز نہیں ہے؟

ج: ایسا نہیں ہے۔ مصنف کی تصویر نہایت عمدہ ہے اور اس کے نیچے جو قطعہ ہے اس کا آخری مصرعہ بھی بہت خوب ہے۔

ع عکس سے اپنے شرمسار ہوں میں

جناب مصنف اپنے عکس سے اور ہم ان کی کتاب کے انتساب سے شرمسار ہیں۔ اگر وہ پوری کتاب ضائع نہیں کر سکتے تو کم از کم انتساب والا صفحہ ضرور ضائع کر دیں۔

(۱۱/اگست ۱۹۸۸ء)

رئیس امروہوی ایک دن میں ۴۷ شعر کہتے ہیں
غالب ۴۷ دن میں ایک شعر کہتے تھے

جناب رئیس امروہوی کے بارے میں ہم آج تک یہ طے نہیں کر پائے کہ وہ ایک فرد ہیں یا ادارہ۔ اخباروں میں ان کی جو تصویر چھپتی ہے، اس میں صورت ہی سے رئیس شیروانی سے بھی [illegible] معلوم ہوتا ہے کہ موصوف ہماری آپ کی طرح کے انسان ہیں، لیکن ان کے کلام نظم ونثر پر نظر ڈالی جائے تو یقین نہیں آتا کہ کوئی انسان اتنا کچھ لکھ سکتا ہے۔ صرف اخباری قطعات کو دیکھا جائے تو ان کی تعداد ۱۴ ہزار سے کم نہیں۔ گویا ۲۸ ہزار شعر۔ غزلوں، نظموں، مثنویوں اور دیگر اصناف سخن کے اشعار کی تعداد ۲ لاکھ سے کم کیا ہوگی۔ بے شمار مرنے والوں کی تاریخ ہائے وفات اور پیدا ہونے والوں کی تاریخ ہائے پیدائش کے قطعات، نیز سہروں اور دیگر فرمائشی نظموں کو بھی شاعری میں شامل سمجھا جائے تو شعروں کی تعداد ۵ لاکھ کے قریب ہو جاتی ہے۔ یہ تو مطبوعہ کلام ہوا، اتنا ہی غیر مطبوعہ کلام بھی ہے۔ کچھ دیوان چوری ہوئے، کچھ ضائع ہو گئے، بہت سا کلام خود رئیس صاحب نے ضائع کر دیا۔ بہت سا مارشل لا، والوں نے سنسر کر دیا۔ ایک زمانے میں رئیس صاحب اہل پر دوسروں کو شعر لکھ کر دیا کرتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ کراچی میں درجنوں ایسے شعراء موجود ہیں جو رئیس صاحب کی بدولت صاحب دیوان بن گئے۔ ان سب امور کے پیش نظر اندازہ یہ ہے کہ رئیس صاحب نے کم وبیش دس لاکھ شعر لکھے ہیں۔

اب ہم جناب جمیل الدین عالی کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے اعداد وشمار کے حوالے سے عرض کریں گے کہ رئیس صاحب کا سال پیدائش ۱۹۱۷ء ہے۔ خدا کے فضل سے وہ اکہتر برس کے ہیں۔ انھوں نے ۱۱ برس کی عمر میں شاعری شروع کی تھی۔ اس حساب سے ان کی مشقِ سخن کی عمر ۶۰ برس قرار پاتی ہے۔ ساٹھ برسوں کے دن اکیس ہزار ایک سو بیس ہوتے ہیں۔ دس لاکھ شعروں کو

ان دنوں کو تقسیم کیا جائے تو شعروں کی یومیہ اوسط ۴۷ ہوتی ہے۔ اتنے شعر روزانہ کہنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ غالب جیسا بڑا شاعر بھی رئیس صاحب کے سامنے نہیں ٹھہر سکتا کہ وہ ۴۷ دنوں میں بمشکل ایک شعر کہتا تھا۔

رئیس صاحب نے صرف شاعری نہیں کی، نثر بھی لکھی ہے۔ وہ روزنامہ "جنگ" سے وابستہ ہونے سے پہلے کئی اخبارات وجرائد کی ادارت کر چکے ہیں۔ ان میں انھوں نے بے شمار اداریے اور مضامین لکھے ہیں۔ بلکہ ایک دو جریدے تو ایسے بھی تھے جس کے تمام مشمولات از اول تا آخر رئیس صاحب کی خامہ فرسائی کا نتیجہ ہوتے تھے۔ اگر صرف "جنگ" ہی کے ہفتہ وار کالموں کا حساب رکھا جائے تو وہ دو ہزار سے زیادہ ہیں۔ پھر انھوں نے نفسیات، مابعد نفسیات، جنسیات، روحانیات، ہپناٹزم، جنات اور خرافات پر بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ ان کی تقریباً تین درجن کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن کے مجموعی صفحات ۱۰ ہزار سے زیادہ ہیں۔ اب آپ خود ہی فیصلہ کیجیے کہ کوئی ایک شخص اتنا کچھ کیسے لکھ سکتا ہے۔ یقیناً رئیس امروہوی ایک فرد کا نام نہیں، مجموعۂ افراد کا نام ہے۔ ایسا مجموعہ کہ ہر فرد اپنی ذات سے ایک انجمن ہے اور یہ انجمن بھی ویسی ہی فعال ہے جیسی انجمن [illegible] امروہہ۔

کثیر التصانیف مصنف ہونا کوئی ایسی خوبی نہیں جس کے لیے کوئی مصنف اپنی ساری عمر اور [illegible] اپنے کلام کا ایک چوتھائی حصہ ضائع کریں۔ اصل خوبی یہ ہے کہ جناب رئیس امروہوی بسیار نویس ہونے کے ساتھ ساتھ خوش نویس بھی ہیں۔ اس سے خدانخواستہ یہ مراد نہیں کہ وہ اپنی کتابوں کی کتابت بھی خود ہی کرتے ہیں، بلکہ یہ بتانا مقصود ہے کہ معیار کے اعتبار سے بھی ان کا کلام نظم و نثر اپنی مثال آپ ہے۔ وہ غزلوں میں ایک صاحبِ فکر شاعر نظر آتے ہیں اور نظموں میں صاحب نظر [illegible]۔ مجموعی طور پر وہ صفِ اول کے شاعر ہیں اور نثر میں بھی ان کا اندازِ نگارش منفرد ہے۔

ان کا ذخیرۂ الفاظ بے حد وسیع ہے۔ انھوں نے بہت سے ایسے الفاظ استعمال کیے ہیں جو اردو لغات میں نظر نہیں آتے۔ ذخیرۂ الفاظ کی وسعت کے اعتبار سے نظیر اکبر آبادی، میر انیس، [illegible] ظفر علی خاں اور جوش ملیح آبادی اُردو شاعری کے چار ستون ہیں۔ رئیس صاحب ان کے [illegible] قطب مینار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے جتنے الفاظ استعمال کیے ہیں، اتنے اردو کے کسی دوسرے شاعر کے ہاں نہیں ملتے۔ اس کا تازہ ترین ثبوت موصوف کا نیا مجموعۂ کلام "ضمیر

خامہ'' ہے جو گزشتہ مہینے شائع ہوا ہے اور اسی پر کچھ لکھنے کے لیے ہم نے یہ تمہید باندھی ہے۔

''ضمیر خامہ'' مثنویات و قصائد کا مجموعہ ہے۔ ان میں قدیم مثنویوں اور قصیدوں کی تمام فنی شرائط پوری کی گئی ہیں۔ لیکن موضوعات کا تعلق ہمارے آج کے دور سے ہے۔ پاکستان کی سیاست اور تاریخ کے بہت سے اہم واقعات کے بارے میں رئیس صاحب نے اپنے تاثرات کو طنزیہ انداز میں اس طرح قلم بند کیا ہے کہ اس سے ایک طرف ان کی قادر الکلامی کا اندازہ ہوتا ہے اور دوسری طرف اس بات کا کہ وہ کیسا گہرا سیاسی اور سماجی شعور رکھتے ہیں۔ ان کی مثنویوں میں دریا کی روانی ہے تو قصیدوں میں کنوئیں کی گہرائی، جس میں قافیے مینڈکوں کی طرح اچھلتے کودتے ہیں۔ رئیس صاحب کی قافیہ پیمائی بے مثال ہے۔ جہاں عام شاعروں کا قافیہ تنگ ہو جاتا ہے وہاں رئیس صاحب ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایسے قافیے لاتے ہیں کہ عقل حیران ہو جاتی ہے۔ الاٹ، ڈالر، جاٹ کے قافیے ہوں یا بگٹ، ٹانگ، مانگ کے یا بسنت، لڑنت، پڑھنت کے، ہر جگہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر قافیے کی تلاش نہیں کرتا بلکہ خود قافیہ شاعر کو تلاش کرتے ہوئے اس کے پاس آ جاتا ہے۔ انھوں نے امریکہ کی ''مدح'' میں ایک قصیدہ لکھا ہے، اس کے چند شعر سنیے:

سر سلامت ہے تو بجتی ہے کہیں جسم کی جڑ؟
جسم گیتی میں سَر امریکہ ہے ہم لوگ ہیں دھڑ
بخت لایا ہے تجھے حاتمِ مغرب کے حضور
دست سائل نہ بہک، دامن حسرت نہ سکوڑ
گو کہ ڈالر کے خزینے ہیں لبالب لیکن
فیض اٹھاتا ہے وہی شخص کہ ہو لم چھڑ
نسبت امریکۂ اعظم سے زمانے کو کہاں
وہ ہے کم خواب و حریر اور زمانہ گودڑ
اس کے خدام کی قسمت میں الوہی انعام
اس کے بدخواہ کی تقدیر میں غیبی تھپڑ

ایک طویل قصیدہ قائد اعظم کی شان میں ان کے یوم پیدائش پر لکھا ہے۔ اس کے آخری چند شعر یہ ہیں:

تو ہے اے قائد اعظم وہ سیاسی ساحر
کر سکے جس سے نہ افرنگ کے رستم بھی لڑنت
تیرے جوہر سے پریشان جواہر ساجری
تخت حیراں ترے اسرار سے گاندھی سا سنت
جھک گئے قائد اعظم تری عظمت کے حضور
آریہ ورت کے مندر کے مہادیر مہنت
یعنی راجندر و گوپال و پٹیل و نہرو
گاندھی و مالویہ، مہتہ و پرشوتم و پنت
ان گنت ہیں ترے اوصاف حمیدہ واللہ
تیرے اطوار گرامی کی نہیں کوئی گنت
مختصر یہ ہے کہ اے قائد اعظم ترے بعد
قوم اسی راہ میں جس کا نتیجہ بھکشت
ختم کر شکوۂ ارباب زمانہ کو رئیس
ورنہ تجھ پر کہیں کم بخت طمانچے نہ پڑنت

قصیدہ عید قربان کی تشبیب دیکھیے:

عشق پر وا ہیں رموز ازلی کے پھاٹک
عقل کی راہ میں حائل کئی دریائے اٹک
عشق نے ڈھونڈ نکالا دُرِ مقصودِ حیات
عقل اوہام کی کرتی ہی رہی چھان پھٹک
عقل کا حال ازل سے ہے کہ ٹک ٹک دیدم
عشق کرتا ہے درِ دوست پہ جا کر ٹک ٹک
عشق اور عقل میں کچھ ربط اگر ہے تو یہی
عقل کو کھٹکا ہے دماغوں کا دلوں کی یہ کھٹک

رئیس امروہوی قافیوں ہی کے نہیں ردیفوں کے بھی مزاج داں ہیں۔ دیکھیے کیسی کیسی

سنگلاخ زمینوں میں انھوں نے شعروں کی کاشت کی ہے:

ہے کراچی میں ہر اک طرزِ عمل کی مکھی
ہر موسم کی سیاست کی عسل کی مکھی
کیا قیامت ہے کہ اس شہرِ وبا پرور میں
حملہ آور ہوئی ہر دشت و جبل کی مکھی
ایک ہی ڈنک ہے، کوچک کہ کلاں تر و مگس
ایک ہی شان ہے، بھاری ہو کہ ہلکی مکھی
للہ الحمد کہ ہے دسترس شاعر میں
وہ قصیدے کا ہو مچھر کہ غزل کی مکھی

نا مکمل ہیں جو اس شہر میں گھر ۲/۴
غربا کیوں نہ ہوں پھر خاک بسر ۲/۴
کس کو اس شہرِ پُر آفات میں راحت ہو نصیب
جس میں آباد ہوں ہنگامہ و شر ۲/۴
لیڈروں میں ہے فقط ۱/۴ خلوص
اور دل میں طلبِ عہدہ و زر ۲/۴

(۱۸/اگست ۱۹۸۸ء)

کولھو کا بیل اور گونگی نظمیں

کسی فلاسفر کا قول ہے، یا ممکن ہے خود ہمارا ہی قول برحق ہو جو سہو کتابت سے کسی فلاسفر کے نام سے منسوب ہو گیا ہو کہ دنیا کا آسان ترین کام یہ ہے کہ آدمی ادیب بن جائے۔ ہر کام کے لیے تھوڑی بہت اہلیت و صلاحیت درکار ہوتی ہے، لیکن ادیب بننے کے لیے صرف کاغذ اور قلم کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ ظاہر ہے کہ کاغذ اور قلم بے ضرر چیزیں ہیں تا آں کہ انھیں استعمال نہ کیا جائے۔

معاف کیجیے یہ قولِ برحق نقل کرنے کے بعد ہم بھول گئے کہ اس سے ہمارا مقصد کیا ہے اور ہم کیا کہنا چاہتے ہیں۔ اقوالِ زریں نقل کرنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ان کے حوالے سے سلسلۂ کلام کو آگے بڑھایا جائے۔ لیکن افسوس کہ حافظے کی خرابی کی وجہ سے ہم اس بات کو یہیں ختم کرتے ہیں اور جناب منظور حسین یاد کے تازہ مجموعۂ کلام ”گونگی نظمیں“ کے بارے میں کچھ عرض کرتے ہیں۔ یہ مجموعہ ہم نے آج ہی ختم کیا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہم خود ہی ختم ہو گئے ہیں۔

یاد صاحب ہمارے صفِ اول کے لکھنے والے ہیں، ان کا دوسری یا تیسری صف سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ ایوانِ ادب میں ایک ہی صف ہوتی ہے اور سارے محمود و ایاز اسی صف میں کھڑے ہوتے ہیں۔ یاد صاحب محقق ہیں، نقاد ہیں، انشائیہ نگار ہیں، شاعر ہیں، اور شاعر بھی ایسے کہ کبھی سنجیدہ شاعری فرماتے ہیں اور کبھی مزاحیہ، لیکن قاری کی سہولت کی غرض سے وہ ان دونوں کے درمیان کوئی خطِ فاصل نہیں کھینچتے۔ ان کا بہترین کام یاد نگاری ہے۔ انھوں نے ایک کتاب لکھی ہے ”آزادی کے چراغ“، جو ۱۹۴۷ء کی قیامت خیزیوں کا چشم دید تذکرہ ہے۔ یوں تو اس موضوع پر اوروں نے بھی بہت کچھ لکھا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ”آزادی کے چراغ“ اپنے موضوع پر ایک بے مثل کتاب ہے۔ یہ اپنی نوعیت کی منفرد آپ بیتی ہے۔ ممکن ہی نہیں کہ کوئی اس کتاب کو پڑھے اور اس کی آنکھوں میں آنسو نہ آئیں۔ یہ کتاب پڑھنے کے بعد ہم اتنے رقیق

القلب ہو گئے ہیں کہ یاد صاحب کی ہر نئی کتاب پڑھ کر آبدیدہ ہو جاتے ہیں، حالانکہ یاد صاحب کی بیشتر کتابوں کا تعلق طنز و مزاح سے ہے اور یہ محض ہنسانے کے لیے لکھی گئی ہیں۔

"آزادی کے چراغ" کے بعد یاد صاحب اگر کوئی اور کتاب نہ لکھتے تو بھی ان کا نام اردو ادب میں ہمیشہ زندہ رہتا۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ادب میں ہمیشگی یا دوام کے قائل نہیں ہیں اسی لیے انھوں نے "یادوں کے چراغ" کے بعد تقریباً ایک درجن کتابیں تصنیف کر ڈالیں اور مزید ستم یہ کیا کہ چھپوا بھی دیں۔ "گونگی نظمیں" بھی ایک ایسی کتاب ہے جس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اسے بڑے اہتمام سے چھپوایا گیا ہے۔

کتاب کے نام سے تو واضح نہیں ہوتا کہ یہ کس قسم کی نظموں کا مجموعہ ہے، لیکن اندرونی سرورق پر یہ وضاحت کی گئی ہے ...... "۰ے، سے ۵ے، تک کی طنزیہ نظموں کا مجموعہ" وضاحت دیکھ کر جی خوش ہوا کہ اکبر الٰہ آبادی نہ سہی، دلاور فگار کے رنگ کا کلام تو دیکھنے کو ملے گا لیکن جب کتاب پڑھی تو مایوسی ہوئی۔ طنز کا تو دور دور تک نشان نہیں ملتا، ہاں غصے، جھلاہٹ اور جھنجلاہٹ کے آثار جابجا ملتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے جناب شاعر کاغذ پر اپنے خیالات نہیں، اپنے غصے کو منتقل کر رہے ہیں۔ شاعری ایسی ہے کہ شاعری کی معذرت معلوم ہوتی ہے۔ مثلاً ایک نظم ہے "حرام خوروں سے خطاب۔" اس کے چند شعر یہ ہیں:

ذرا نہ انسانیت دکھاؤ حرام خورو
ذرا نہ غیرت کے پاس جاؤ حرام خورو
حرام کھا کھا کے مثلِ خنزیر پل گئے ہو
ذرا تو شکل اپنی دیکھ پاؤ حرام خورو
خلوص و ایثار و جاں فشانی کی بات چھوڑو
حرام خوری کے گیت گاؤ حرام خورو

طنز تو بڑی بات ہے، ہمیں تو اس نظم میں مزاح بھی نظر نہیں آیا جو یاد صاحب کی عموماً شاعری میں ملتا ہے۔ معلوم نہیں موصوف نے اس کتاب کی بیشتر نظمیں کس پریشانی اور بے سروسامانی کے عالم میں لکھی ہیں کہ ان میں شائستگی بھی نہیں ملتی جو ادب تخلیق کرنے کی پہلی شرط ہے۔ مثلاً ایک نظم ہے "تعارف"۔ اس کے ہر بند کا اختتام اس مصرعے پر ہوتا ہے:

ع مگر یارو نہ ان کی دُم اٹھا کر دیکھنا ہرگز

معلوم نہیں یاد صاحب نے اس مجموعے کا نام "گونگی نظمیں" کیوں رکھا ہے حالانکہ یہ خاصی چیختی چنگھاڑتی نظمیں ہیں، بلکہ اس سے کچھ آگے کی کیفیت بھی ملتی ہے۔ مثلاً ایک نظم "میں یارو اکیلا" کے دو شعر ملاحظہ کیجیے:

میں یارو اکیلا کہاں ہنہنایا
میرے ساتھ سارا جہاں ہنہنایا
اٹھا کر جو سر ہم نے اک آہ کھینچی
بہت دیر تک آسماں ہنہنایا

جانوروں کی آوازوں ہی سے نہیں، خود جانوروں سے بھی شاعر کو بے حد دلچسپی ہے۔ بھانت بھانت کے جانوروں کا تذکرہ اس کثرت سے ملتا ہے کہ کتاب اچھا خاصا چڑیا گھر معلوم ہوتی ہے۔ بعض جانوروں پر پوری پوری نظمیں موجود ہیں۔ مثلاً ایک نظم ہے، "گدھوں کی مدح سرائی"۔ اس میں اس قسم کے شعر ملتے ہیں:

ہو دُم سے لٹکنے کی ہمیں خاص اجازت
بس چاہتے ہیں اتنی سی توقیر گدھوں سے
جاتے ہوئے کہتے ہیں قیامت کو ملیں گے
لکھوائیے باقاعدہ تحریر گدھوں سے

جناب شاعر نے ان شعروں میں اپنے پڑھنے والوں کو کیا پیغام دیا ہے یا کون سی دور کی کوڑی لائے ہیں، اس کا علم موصوف ہی کو ہوگا۔ کاش اس علم کو وہ عام کر دیتے تا کہ ان کی شاعری کی اہمیت پر پردہ نہ پڑا رہتا۔

ایک آزاد نظم "اپنے عہد کے کتے" ہے لیکن یہ اتنی زیادہ آزاد ہے کہ ہمارا پابند ذہن اس کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ ایک ایسی ہی آزاد نظم ہے "ہم بھیڑیں ہیں"۔ اس کے چار مصرعے بطور مثال نقل کیے جاتے ہیں:

ہم بھیڑیں ہیں
جس کا جی چاہے ہم کو مونڈ کے ننگا کر دیتا ہے

ہم چپکے سے منڈ جاتے ہیں
ننگے ہو جاتے ہیں

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یاد صاحب جب آزاد نظمیں لکھتے ہیں تو قید سے آزاد ہو جاتے ہیں۔

بندروں سے بھی جناب شاعر کو خاص دلچسپی ہے فرماتے ہیں:

ہر بام ہر منڈیر پہ بندر ہیں جلوہ گر
کیا سب قلندروں کا جنازہ نکل گیا

ایک نظم ''کولھو کے بیل'' کی مدح میں لکھی ہے۔ اس کا آخری شعر خوب ہے:

تیری آنکھوں پہ نہ ہو پٹی کبھی دیکھا نہیں
ہے ازل سے اے مرے مشکور تو کولھو کا بیل

جناب شاعر نے اپنے آپ کو کولھو کا بیل کہا ہے۔ کولھو کے بیل کی ایسی عزت افزائی اس سے پہلے شاید ہی کبھی ہوئی ہو۔

گھوڑوں پر یاد صاحب بے حد مہربان ہیں۔ ان سے متعلق نظم کا بھی ایک شعر سن لیجیے اور داد دیجیے کہ شاعر نے تخیل کے گھوڑے کس طرح دوڑائے ہیں:

جب مسلسل نظر آئی نہ بشر کی صورت
ایک دن بھاگ گئے شہر وفا سے گھوڑے

معلوم ہوتا ہے کہ گھوڑے اسی طرح بھاگ گئے ہوں گے جس طرح اس شعر سے معنی بھاگ گئے ہیں، مگر معنویت کے فرار کا یہ عالم ہر جگہ نہیں ہے۔ وہ نظم جس میں بکری اور بچھوے کا ذکر کیا ہے، خاصی بامعنی ہے۔ عنوان ہے ''اپنے اندر کے شاعر سے''۔

تم کیا خاک لکھو گے نظمیں
تم کیا خاک ہو گے شاعر
تم تو یار بہت بزدل ہو
تم تو یار بڑے کاہل ہو
بکری نے کب شعر کہے ہیں
بچھوے نے کب لکھی ہیں نظمیں

جب بکری اور بچھوے پر نظمیں لکھی جا سکتی ہیں تو یہ خود نظمیں کیوں نہیں لکھ سکتے۔ کم از کم ''کونجی نظمیں'' جیسی نظمیں لکھنا تو کچھ مشکل نہیں۔ بہر حال مذکورہ نظم پڑھ کر خوشی ہوئی کہ یاد صاحب کو اپنے اندر کا شاعر نظر آ گیا۔ اگر باہر بھی کوئی شاعر ہوتا تو وہ اس کی نشاندہی ضرور کرتے۔

جن دنوں یہ بحث چل رہی تھی کہ اُردو میں انشائیے کا ''موجد'' کون ہے تو یاد صاحب نے اس موضوع پر ایک کتاب ''ممکنات انشائیہ'' کے نام سے لکھی تھی جس میں انھوں نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ انشائیے کے موجد وہ خود ہیں کیونکہ انھوں نے پہلا انشائیہ اس وقت لکھا تھا جب وہ تیسری جماعت کے طالب علم تھے۔ اس پر ہم نے عرض کیا تھا کہ یاد صاحب کا دعویٰ بالکل درست ہے کیونکہ ان کے تمام انشائیے تیسری جماعت کے زمانے کے لکھے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ شاید یہ ''کونجی نظمیں'' بھی اسی زمانے کی یادگار ہیں۔

(۸ر ستمبر ۱۹۸۸ء)

تحقیق کے منشی تیرتھ رام

پچھلے دنوں انتظار حسین نے اپنے ایک کالم میں اس بات پر پریشانی کا اظہار کیا ہے کہ ہمارے ملک میں تھوک کے حساب سے اُردو کے پی ایچ ڈی پیدا ہو رہے ہیں جس کے نتیجے میں تحقیق کا معیار گر گیا ہے اور اب نئے بجٹ میں ہر پی ایچ ڈی کو ۱۵۰۰ روپے ماہوار اضافی الاؤنس دینے کا جو اعلان کیا گیا ہے، اس کی وجہ سے تحقیق کو مزید نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ کیونکہ ۱۵۰۰ روپے کے لیے ہر بوالہوس حسن پرستی کو اپنا شعار بنانے کی کوشش کرے گا۔

معلوم نہیں انتظار حسین کے دل میں تحقیق کے لیے ہمدردی کیوں پیدا ہو گئی۔ وہ افسانہ نگار اور ناول نویس ہیں، انھیں چاہیے تھا کہ پہلے اس طرف توجہ دیتے کہ اُردو میں ناول اور افسانے کے نام پر خرافات نگاری کا جو سلسلہ جاری ہے اس کی روک تھام کی جائے۔ اس کے برعکس انتظار صاحب اتنے فراخدل ہیں کہ جو خرافات نگار بھی ان کے در دولت پر دستک دیتا ہے، وہ اسے ایک عدد تعریفی سند لکھ کر دے دیتے ہیں۔

ہم اتنا ہی لکھ پائے تھے کہ استاد لاغر مراد آبادی تشریف لے آئے۔ انھوں نے اوپر کی سطریں پڑھیں اور فرمایا، ”خیریت تو ہے کہ آج آپ انتظار حسین سے اختلاف کر رہے ہیں۔ وہ تو آپ کے محبوب مصنف ہیں۔“ ہم نے عرض کیا، ”محبوب ہونے کا مطلب یہ تو نہیں کہ ان کی غلط باتوں کو برداشت کر لیا جائے۔“ اور پھر ہم نے انتظار حسین کا مذکورہ کالم لاغر صاحب کے سامنے رکھ دیا۔ انھوں نے کالم پڑھا اور فرمایا، ”انتظار صاحب نے کون سی غلط بات لکھی ہے۔ ان کا یہ کہنا صد فی صد درست ہے کہ پی ایچ ڈی کرنے والوں کی وجہ سے تحقیق کا معیار پست ہوا ہے۔“ ہم نے عرض کیا، ”کوئی ثبوت پیش کیجیے۔“ اس کے جواب میں لاغر صاحب نے ایک کتاب ہماری طرف بڑھا دی۔ ہم نے کتاب کو ادھر اُدھر سے دیکھا۔ صاف ستھری چھپی ہوئی کتاب تھی۔ کاغذ بھی اچھا، کتابت بھی عمدہ۔ ہم نے پوچھا، ”اس میں کیا خرابی ہے؟“ فرمایا، ”یہ پوچھیے اس میں

کون سی خرابی نہیں ہے۔ انتظار حسین نے جو کچھ کہا ہے، اس کی تصدیق کے لیے صرف یہی کتاب کافی ہے۔“

اس کے بعد استاد لاغر مراد آبادی سے اس کتاب کے بارے میں جو گفتگو ہوئی، وہ آپ بھی ملاحظہ فرمائیے:

لا: یہ کتاب جیسا کہ آپ نے دیکھا، اُردو شاعری میں ایہام گوئی کے بارے میں ہے۔ جناب محقق اس حد تک ناموزوں طبع واقع ہوئے ہیں کہ بے شمار شعر غلط نقل کیے ہیں۔ ہر صفحے پر ایک دو ناموزوں مصرعے نظر آتے ہیں۔ ایسے ناموزوں طبع محقق کو شاعری پر تحقیق نہیں کرنی چاہیے۔

ہم: ہمیں آپ سے اتفاق نہیں۔ آجکل کے تو شاعر بھی ناموزوں طبع ہوتے ہیں۔ اگر کسی بے چارے محقق نے ناموزوں مصرعے لکھ دیے تو اس میں اعتراض کی کیا بات ہے۔ محقق کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک کتاب سے مصرعے اٹھا کر دوسری کتاب میں رکھ دیتا ہے۔ نازک چیزوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے میں ٹوٹ پھوٹ کا امکان رہتا ہی ہے۔

لا: اس میں غلط بیانیاں بھی ہیں۔

ہم: ادب تو ہے ہی آرائش بیان کا نام۔ اگر کوئی محقق کسی بات کو آرائش بیان کی خاطر ایک خاص انداز سے لکھتا ہے تو اسے داد دینی چاہیے، آپ اعتراض فرما رہے ہیں۔

لا: تحقیق میں آرائش بیان کی گنجائش نہیں ہوتی۔ غلط بیانی کی ایک مثال دیکھیے۔ محقق صاحب فرماتے ہیں، شاہجہان نے شہر شاہجہان آباد کو ۱۰۵۴ھ میں آباد کیا تھا۔ حوالہ وہ ایک ایسی کتاب کا دیتے ہیں جس کے مصنف کا نام انھیں معلوم نہیں۔

ہم: ہو سکتا ہے، اس کتاب کا کوئی مصنف ہی نہ ہو اور یہ خود بخود وجود میں آ گئی ہو۔

لا: پہلے آپ پوری بات سن لیجیے۔ جناب محقق اسی پر اکتفا نہیں کرتے، کہتے ہیں، سرسید نے اپنی کتاب ”تذکرۂ اہل دہلی“ میں شاہجہان آباد کے آباد کیے جانے کا سال ۱۰۵۸ھ غلط لکھا ہے۔ اول تو یہی بات غلط ہے کہ سرسید نے ”تذکرۂ اہل دہلی“ نام کی کوئی کتاب لکھی تھی۔ یہ دراصل ان کی مشہور تصنیف ”آثار الصنادید“ کا ایک باب ہے جو قاضی احمد میاں

اختر جوناگڑھی نے اس نام سے چھاپا تھا۔ اگر محقق صاحب نے "آثار الصنادید" دیکھی ہوتی تو انھیں معلوم ہوتا کہ سرسید نے اس کتاب میں تفصیل سے لکھا ہے کہ ۱۰۴۸ھ میں قلعہ شاہجہان آباد کی تعمیر شروع ہوئی۔ جب یہ قلعہ تیار ہو گیا تو ۱۰۵۸ھ میں پہلی مرتبہ شاہجہان نے قلعے میں قدم رکھا۔ قلعے کی بنیاد پڑتے ہی شاہجہان آباد شہر بھی آباد ہونا شروع ہوا اور ۱۰۵۸ھ میں یہ شہر دارالسلطنت قرار پایا۔ یہ باتیں سرسید نے اپنی طرف سے نہیں لکھیں بلکہ قلعے کے ایک کتبے پر یہ تمام تفصیلات آج بھی موجود ہیں۔

ہم: کسی محقق کو تفصیلات میں جانے کی کیا ضرورت ہے۔ اس کا کام تو صرف اتنا ہے کہ سامنے کی دو چار کتابوں سے استفادہ کر کے ایک نئی کتاب لکھ دے۔

وہ: اگر محقق تن آسان ہو گا تو کام بگڑ جائے گا۔ جن محقق کا اس وقت ذکر ہو رہا ہے ان کی تن آسانی کا عالم یہ ہے کہ فارسی تذکروں سے براہِ راست استفادہ نہیں کیا، ان کے اردو ترجموں اور خلاصوں سے کام چلایا ہے۔ مثلاً ایک فارسی تذکرۂ شعرا ہے "معشوق" ... اس کا متن قاضی عبدالودود نے شائع کر دیا ہے۔ اس کا اُردو ترجمہ بھی شائع ہوا ہے۔ جناب محقق اس ترجمے سے کام چلاتے ہیں اور حوالہ اس طرح دیتے ہیں جیسے اصل فارسی تذکرہ ان کے سامنے ہے۔ جہاں کہیں انھوں نے کسی فارسی کتاب سے براہِ راست حوالہ دیا ہے، وہاں نقل کرنے میں غلطیاں کی ہیں۔ یہاں تک کہ نام بھی صحیح نہیں لکھے۔ مشہور فارسی تذکرہ نگار عوفی کو عرفی بنا دیا ہے جب کہ عرفی ایک دوسری شخصیت ہے۔

ہم: جناب یہ تو صریحاً زیادتی ہے کہ اُردو کے پی ایچ ڈی سے یہ توقع رکھی جائے کہ وہ فارسی دان بھی ہو۔ فارسی کا تو اب رواج اٹھ چکا ہے۔

وہ: قدیم اُردو ادب پر اس وقت تک تحقیق نہیں کی جا سکتی جب تک کہ محقق کو فارسی زبان پر عبور نہ ہو۔ تمام قدیم مآخذ فارسی میں ہیں۔

ہم: آجکل کے محقق کوئی حافظ محمود شیرانی یا قاضی عبدالودود تو ہیں نہیں کہ وہ فارسی بھی جانتے ہوں۔ اسی کو غنیمت جانیے کہ آجکل کے محقق اُردو جانتے ہیں۔

وہ: یہ بھی آپ کی خوش فہمی ہے۔ ہاں تو ذکر ہو رہا تھا ابہام گوئی والی کتاب کا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جناب محقق نے تحقیق اور نقل نویسی کو مترادف سمجھ لیا ہے۔ دوسری کتابوں سے نقل

دینا ہی اگر تحقیق ہے پھر کاتبوں کا شمار بھی محققوں میں ہونا چاہیے۔ اس کتاب میں شاید ہی کسی شاعر کا کلام اس کے دیوان سے حاصل کیا گیا ہو۔ دوسروں کی کتابوں میں جو کچھ مل گیا، اسی پر قناعت کر لی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جناب محقق کو یہ معلوم ہی نہیں کہ کن کن شاعروں کے دیوان چھپ چکے ہیں یا قلمی صورت میں کہاں کہاں محفوظ ہیں۔ دیوان یکرو کے بارے میں لکھا ہے کہ اسے ہندوستان میں ایک صاحب نے مرتب کر لیا ہے۔ حالانکہ اسے چھپے ہوئے کئی برس ہو چکے ہیں۔ اس سلسلے کا سب سے بڑا لطیفہ یہ ہے کہ شاہ عالم آفتاب کے بارے میں لکھا ہے کہ انھوں نے نثر میں ایک قصہ لکھا تھا جو اب نایاب ہے۔ حالانکہ یہ قصہ "عجائب القصص" کے نام سے کئی سال ہوئے لاہور سے چھپ چکا ہے۔ اس کا قلمی نسخہ بھی پنجاب یونیورسٹی لاہور میں موجود ہے۔ اتفاق سے جناب محقق بھی لاہور ہی میں تشریف رکھتے ہیں۔ اس سے ان کی بے خبری کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

ہم: یہ تو کوئی اعتراض کی بات نہیں۔ ہم کراچی میں رہتے ہیں، ہمیں یہاں کے کئی ادیبوں کی کتابوں کا تو کیا، خود ان کے موجود ہونے کا بھی علم نہیں۔

وہ: آپ کی لاعلمی اپنی جگہ، لیکن کسی محقق کو اس حد تک لاعلم نہیں ہونا چاہیے۔ ایک اور لطیفہ سنیے۔ کتاب کے صفحہ ۸۱ پر مشہور تذکرۂ شعراء "مجموعۂ نغز" کے مصنف کا نام لالہ سری رام لکھا ہے جب کہ اس کا نام قدرت اللہ قاسم ہے۔

ہم: ہو سکتا ہے قدرت اللہ قاسم ہندو سے مسلمان ہوا ہو اور اس کا سابقہ نام لالہ سری رام ہو۔

وہ: اس "ہو سکتا ہے" کا جواب نہیں۔ دلیل دینے کا یہ انداز ہمارے ممدوح نے بھی اختیار کیا ہے۔ محمد شاہ رنگیلے کے بیٹے احمد شاہ کو شاعر ثابت کرنے کے لیے فرماتے ہیں، چونکہ وہ مشہور شاعر اشرف علی خاں فغاں کا رضاعی بھائی تھا، اس لیے ضرور شعر کہتا ہو گا۔

ہم: تو کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ محقق حبس اور گرمی کی پروا کیے بغیر تحقیق کرتا رہے۔ محقق صاحب نے بہت اچھا کیا کہ ایسے خراب حالات میں کتاب تلاش نہ کی ورنہ ان کی صحت متاثر ہو سکتی تھی۔

وہ: موجودہ صورت میں کتاب پڑھنے والوں کی صحت متاثر ہوئی ہے۔

ہم: آپ نے اس کتاب کے بارے میں بہت کچھ بتا دیا، ذرا مصنف کا تعارف بھی تو کرا دیجیے۔

وہ: ان کا نام ہے ڈاکٹر ملک حسن اختر۔ کتاب میں شامل ایک اشتہار سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ڈیڑھ درجن تحقیقی کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان میں وہ مشہورِ زمانہ ”تاریخ ادب اردو“ بھی ہے جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ قدرت اللہ شہاب کا ناولٹ ”یا خدا“ بنگال کے قحط سے متعلق ہے، حالانکہ یہ تقسیم ہند کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔

ہم: ڈیڑھ درجن تحقیقی کتابیں لکھنا کوئی آسان کام نہیں۔ محقق صاحب کی ہمت کی داد دینی چاہیے کہ وہ تحقیقی کتابیں اسی تیز رفتاری سے لکھتے ہیں جس طرح تیرتھ رام فیروز پوری جاسوسی ناول لکھا کرتے تھے۔

وہ: موصوف واقعی اردو تحقیق کے تیرتھ رام فیروز پوری ہیں۔ ان کی ایک کتاب کے فلیپ پر یہ بھی لکھا ہے کہ انھوں نے اردو تحقیق میں حافظ محمود شیرانی کے کام کو آگے بڑھایا ہے۔ شیرانی صاحب کی روح کو شرمندہ کرنے کے لیے اس سے بہتر بات نہیں کہی جا سکتی۔

(۱۵ر ستمبر ۱۹۸۸ء)

سفرنامہ اور آشوبِ چشم

پروفیسر سید محمد عقیل ترقی پسند ہونے کے باوجود اچھے خاصے معقول آدمی ہیں۔ ترقی پسندی کو ان سے کوئی فائدہ پہنچا ہو یا نہ پہنچا ہو، انھیں ترقی پسندی سے یہ فائدہ ہوا ہے کہ اس کے حوالے سے لندن کی سیر کر چکے ہیں۔ ۱۹۸۵ء میں لندن میں ترقی پسند تحریک کی جو گولڈن جوبلی ہوئی تھی (جسے بعض عاقبت نااندیش ”برسی“ کہتے ہیں) اس میں انھوں نے شرکت کی تھی۔ اس کانفرنس کے بیشتر ہندوستانی اور پاکستانی شرکا خالی الذہن ہو کر گئے تھے اور خالی ہاتھ واپس آئے تھے۔ لیکن عقیل صاحب واپس آئے تو ان کے ہاتھ میں ایک عدد سفرنامہ تھا جو ”لندن او[illegible]“ کے نام سے شائع ہوا ہے۔ حال ہی میں یہ سفرنامہ ہماری نظر گزرا ہے اور ہم آشوبِ چشم میں مبتلا ہو گئے ہیں۔

خدانخواستہ اس سے مراد یہ نہیں ہے کہ اس سفرنامے کو پڑھنے کا نتیجہ آشوبِ چشم کی صورت میں ظاہر ہوا ہے، بلکہ عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آج کل کراچی میں آشوبِ چشم کی وبا پھیلی ہوئی ہے۔ پروفیسر عقیل کے سفرنامے کا جو نسخہ ہمارے زیرِ مطالعہ رہا ہے وہ ہم نے ایک ایسے صاحب سے مستعار لیا تھا جو اس وبا کا شکار ہو چکے تھے۔ جب یہ کتاب ہم تک پہنچی تو مرض کے جراثیم اس میں موجود تھے۔ ایک زمانہ تھا کہ کتابیں علم کے فروغ کا ذریعہ تھیں، آج کل امراض [illegible] کا وسیلہ ہیں۔

تین سال قبل ہم ہندوستان گئے تھے تو ہمارا ارادہ تھا کہ واپس آ کر ایک معرکہ آرا سفرنامہ لکھیں گے جس میں ہندوستان کے تاریخی جغرافیائی، سیاسی اور معاشرتی حالات کے ساتھ ساتھ ان سب لوگوں کا ذکرِ خیر ہوگا جنھوں نے ہمارے قیام و طعام کے سلسلے میں آسانیاں فراہم کیں اور [illegible] ہوئے۔ لیکن جب ہم وہاں سے رخصت ہونے لگے تو مشہور نقاد شمس الرحمٰن فاروقی نے کہا: ”چلتے وقت ایک وعدہ کیجیے۔“ ہم نے عرض کیا، ”ہمیں معلوم ہے کہ آپ کے ذہن میں کیا

ہے۔ آپ یہ وعدہ لینا چاہتے ہیں کہ ہم دوبارہ آپ کے ملک میں نہ آئیں۔" کہنے لگے، "ہرگز نہیں، آپ سو مرتبہ آئیے، بلکہ یہیں رہ جائیے۔ مگر وعدہ جو لینا ہے وہ یہ ہے کہ آپ اپنے ملک واپس جا کر سفرنامہ نہ لکھیے گا۔" ہم اس عجیب و غریب فرمائش پر حیران ہی نہیں، پریشان بھی ہوئے اور کہا، "ہم تو آدھا سفرنامہ ہندوستان آنے سے قبل لکھ چکے تھے۔ ہندوستان کے جغرافیائی اور تاریخی حالات سے متعلق ابواب مکمل ہیں۔" انھوں نے جواب دیا، "آپ ہندوستان کے تاریخی اور جغرافیائی حالات پر ایک کتاب ضرور چھپوا دیجیے لیکن اپنے سفر کے حالات نہ لکھیے۔" وجہ پوچھی تو خاموش رہے، جس کا مطلب واضح طور پر یہ تھا کہ سفرنگاری ایک شوقِ فضول ہے۔ ہر وہ شخص جو کچھ اور نہیں لکھنا جانتا، سفرنامہ لکھتا ہے یا نثری نظم۔

خوشی کی بات ہے کہ شمس الرحمٰن فاروقی نے جو مشورہ ہمیں دیا تھا، وہ پروفیسر سید محمد عقیل کو نہیں دیا، ورنہ اُردو زبان کا یہ ناقابلِ تلافی نقصان ہوتا کہ وہ ایک بہترین سفرنامے سے محروم ہو جاتی اور ہمیں یہ فائدہ ہوتا کہ آشوبِ چشم سے محفوظ رہتے۔ لیکن اُردو زبان کے فائدے کے سامنے ہمارے ذاتی نقصان کی کوئی اہمیت نہیں۔

بہر حال اب جب کہ پروفیسر عقیل کا سفرنامہ نہ صرف یہ کہ لکھا جا چکا ہے بلکہ شائع بھی ہو چکا ہے، شمس الرحمٰن فاروقی کے بعد از وقت مشورے یا مطالبے پر غور نہیں کرنا چاہیے بلکہ پروفیسر صاحب کو اس کی داد دینی چاہیے کہ انھوں نے ایک پامال موضوع پر نہایت عمدہ کتاب لکھ کر ثابت کر دیا ہے کہ اگر قلم میں توانائی ہو تو کچھ نہ لکھ کر بھی بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی نثر نہایت عمدہ ہے۔ پڑھنے والا اسی میں گم ہو جاتا ہے کہ انھوں نے کیسے عمدہ اُسلوب میں لکھا ہے، یہ نہیں دیکھتا کہ کیا لکھا ہے۔

پروفیسر صاحب کے اُسلوب نے ہم پر جادو کیا لیکن اتنا نہیں کہ ہم سفرنامے کے مطالب سے بے خبر ہو جاتے۔ سچی بات یہ ہے کہ اس کتاب کے مطالعے سے ہماری معلومات میں بیش بہا اضافہ ہوا ہے۔ مثلاً باقاعدہ تعلیم حاصل نہ کرنے اور نصابی کتابیں نہ پڑھنے سے ہمیں اس قسم کی باتیں معلوم نہیں تھیں:

- انگلستان میں ولی عہد سلطان پرنس آف ویلز کہلاتا ہے۔ دوسرے شہزادے ارل آف ونڈسر اور ڈیوک آف یارک کہلاتے ہیں۔

- ونڈسر کیسل ۱۰۷۰ء میں تعمیر ہوا تھا۔
- جنرل آرتھر ویلزلی نے نپولین کو ۱۸۱۵ء میں واٹرلو کے مقام پر شکست دی تھی۔
- آئفل ٹاور ۱۸۸۹ء میں تعمیر کیا گیا تھا۔
- نوترے ڈیم گرجا کی تعمیر ۱۱۶۳ء میں شروع ہوئی تھی۔
- ٹاور آف لندن ۱۰۸۱ء میں تعمیر ہوا تھا۔

اس قسم کی بے شمار معلومات اس سفرنامے کے صفحات پر بکھری ہوئی ہیں۔ جنابِ مصنف نے کوزے میں دریا بند کر دیا ہے، ورنہ ہماری سطح کے قارئین کو یہ معلومات حاصل کرنے کے لیے بے شمار کتابیں پڑھنی پڑتیں۔

اس سفرنامے میں خشک معلومات ہی نہیں، تر دامنی کی دلچسپ داستانیں بھی ہیں۔ مثلاً لندن میں ترقی پسندوں کی گولڈن جوبلی میں کیا کچھ ہوا، اس کی ایک جھلک ملاحظہ ہو:

"...... ہمارے بہت سے مندوبین صرف مشروبات کی طرف متوجہ تھے۔ وہ جو اُردو کا محاورہ ہے کہ مفت کی قاضی کو بھی حلال ہے، اس کا بڑا پُر لطف مظاہرہ ہو رہا تھا۔ عورتیں بھی ان رنگ رلیوں میں مصروف تھیں جن میں ہندوستان اور پاکستان دونوں جگہ کی خواتین شامل تھیں ...... ہندوستان اور پاکستان کی سرحدیں ٹوٹ چکی تھیں۔ کچھ لوگ چلّو میں اُلّو ہونے والے بھی بے دریغ جام پر جام لنڈھا رہے تھے کہ شاید اب اس کا موقع ملے یا نہ ملے۔"

عام لوگوں کے بارے میں تو سنا تھا کہ چلّو میں اُلّو ہو جاتے ہیں، لیکن ترقی پسندوں کے حوالے سے اس کا استعمال پہلی دفعہ دیکھا۔

پروفیسر عقیل کے سفر کا ایک اہم واقعہ یہ ہے کہ لندن میں ان کی ملاقات مشہور پاکستانی دانشور اور ادیب اشفاق احمد سے ہوئی۔ اس کی تفصیل بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے...... "اشفاق احمد بہت خاموش اور لیے دیے رہنے والے آدمی معلوم ہوئے ...... اشفاق احمد صاحب مجھ سے واقف تھے اور نہ انھوں نے مجھے قابلِ اعتنا سمجھا۔ بعد کو معلوم ہوا کہ وہ حکومتِ پاکستان کی طرف سے کسی بڑے عہدے پر مامور ہیں "صاحب" ہیں"...... ہمارا خیال ہے کہ پروفیسر عقیل نے غلطی سے اشفاق احمد کی بجائے کسی اور سے ملاقات کی ہوگی۔ ورنہ یہ ممکن نہیں کہ اشفاق احمد کسی محفل

میں ہوں اور خاموش رہیں۔ ہم نے بارہا انھیں ٹی وی کے پروگراموں میں دیکھا ہے۔ "وہ کہیں اور سنا کرے کوئی" والی کیفیت ہوتی ہے۔ اشفاق احمد نے ایسی باغ و بہار طبیعت پائی ہے کہ جہاں خاموشی سے کام چل سکتا ہو وہاں بھی گفتگو سے کام نکالنے کے عادی ہیں۔ قوالی کی محفلوں میں وہ داد اس طرح دیتے رہتے ہیں کہ قوالی پس منظر میں چلی جاتی ہے اور قوال، سامعین کا روپ دھار لیتے ہیں۔ رہی یہ بات کہ پروفیسر عقیل سے اشفاق احمد واقف نہیں تھے، تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ اشفاق احمد اپنے علاوہ کسی کو نہیں جانتے۔

لندن کا ایک اور واقعہ بھی بہت دلچسپ ہے۔ بہار کے مشہور ادیب وہاب اشرفی بھی ترقی پسندوں کی گولڈن جوبلی میں شریک ہوئے تھے۔ ایک محفل میں پروفیسر عقیل سے ان کی ملاقات ہوئی۔ حال پروفیسر صاحب کی زبان سے ملاحظہ فرمائیے:

"......قدرے خفگی کے انداز میں بولے۔ آپ کی تاریخِ ادبِ اُردو میں نے دیکھی ہے۔ اس میں بہت سی غلطیاں ہیں۔ پھر لپک کر بولے، آپ نے میرا تذکرہ اس تاریخ میں نہیں کیا۔ میں نے اُن سے کہا کہ بھئی آپ ابھی ماشاءاللہ لکھ رہے ہیں۔ کیا پتہ کب تک لکھیں اور کیا کیا لکھ جائیں۔ عموماً تاریخ میں اُن کا تذکرہ ہوتا ہے جو اپنی ادبی زندگی کی تکمیل کی منزل میں پہنچ چکے ہیں، یا پھر اُن کا تذکرہ جو قلم رکھ چکے ہیں۔ اور یہ واقعہ بھی ہے کہ وہاب اشرفی ابھی کافی زور شور سے لکھ رہے ہیں مگر میرے ان جملوں سے ان کی تسکین نہ ہوئی اور انھوں نے تقریباً دھمکی کے انداز میں کہا کہ میں بھی ایک تاریخ لکھ رہا ہوں اور اس کا جواب اس میں ہوگا (غالباً میرا تذکرہ اُس تاریخ میں نہ ہوگا) وہاب اشرفی بھی اس طرح کی باتیں مجھ سے نہ کرتے تھے۔"

اس اقتباس کا آخری جملہ قابلِ غور ہے۔ پروفیسر عقیل کو اس پر حیرت ہے کہ وہاب اشرفی نے پہلے بھی ان سے اس قسم کی باتیں نہیں کیں۔ لیکن ہمارے نزدیک اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں۔ بلکہ حیرت اس پر ہونی چاہیے کہ وہاب اشرفی نے یہ شکایت کیوں نہ کی کہ انسائیکلوپیڈیا بریٹینکا میں ان کے بارے میں کوئی مقالہ کیوں نہیں ہے۔ ترقی پسندوں کی گولڈن جوبلی تقریب میں شرکت کے بعد وہاب اشرفی کا یہ حق ہے کہ تاریخِ ادب ہی نہیں تاریخِ عالم بھی ان کے

تذکرے سے خالی نہ رہے۔

وہاب اشرفی کی یہ بات ہمیں پسند آئی کہ وہ پروفیسر عقیل کی تاریخِ ادب کے جواب میں خود اپنی ایک تاریخِ ادب لکھوا رہے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ ہر ادیب کو ایک عدد تاریخِ ادب خود لکھوانی چاہیے تاکہ اس کا نام اُس کی تخلیقات کی وجہ سے نہ سہی، تاریخِ ادب کی وجہ سے زندہ رہ جائے۔

(۲۲ر ستمبر ۱۹۸۸ء)

حفیظ جالندھری اور قدرت اللہ شہاب ایک ہی زلف کے اسیر تھے

بعض لوگوں نے قید خانوں میں قیام کی یادوں پر مشتمل کتابیں تو لکھی ہیں، لیکن ایوانِ صدر میں اسیری کے حالات کسی نے نہیں لکھے۔ یہ امتیاز جناب م۔ب۔ خالد کو حاصل ہے جنھوں نے ایوانِ صدر میں ۱۹۵۲ء سے ۱۹۶۸ء تک گزارے ہوئے دنوں کی روداد لکھی ہے جو حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔ کتاب کا نام ہے، ''ایوانِ صدر میں سولہ سال''۔ ان کے تین سربراہانِ مملکت (غلام محمد، سکندر مرزا اور ایوب خان) کس قماش کے آدمی تھے، ان کے گرد کیسا ماحول تھا؟ وہ قریب سے کیسے نظر آتے تھے؟ اس قسم کے سوالوں کے جواب اس کتاب میں موجود ہیں۔

غلام محمد مرحوم نے ایک مرتبہ ایوانِ صدر کے عملے کی کارگزاری پر ان خوبصورت الفاظ میں تبصرہ کیا تھا، ''میرا خیال تھا کہ یہاں ایک میں ہی احمق ہوں، لیکن میرے اردگرد مجھ سے بڑے احمق موجود ہیں۔'' م۔ب۔ خالد نے عملے کے ایک رکن کی حیثیت سے حماقتوں کی بعض داستانیں مزے لے لے کر بیان کی ہیں۔

مصنف کو غلام محمد سے بے حد عقیدت ہے جس کا اظہار اس کتاب میں جا بجا ہوا ہے۔ بعض اوقات تو یہ محسوس ہوتا ہے جیسے یہ کتاب غلام محمد سے عقیدت کے اظہار ہی کے لیے لکھی گئی ہے۔ اس کے باوجود غلام محمد کی جو تصویر ابھرتی ہے، وہ ایک ابنارمل انسان کی ہے جسے دیکھ کر خوف بھی آتا ہے اور ہنسی بھی آتی ہے۔ خوف اس لیے کہ وہ اپنے اقتدار کو قائم رکھنے کے لیے کسی بھی حد تک جا سکتا تھا، ہنسی اس لیے کہ اس کا ہر عمل مضحکہ خیز تھا۔

م۔ب۔ خالد نے غلام محمد کے بارے میں کئی دلچسپ واقعات لکھے ہیں۔ مثلاً ۱۹۵۵ء میں

جب ان کی بیماری سنگین صورت اختیار کر گئی تو انھوں نے کسی بقراط کے مشورے پر ایک حکیم صاحب کو لاہور سے طلب کیا۔ حکیم صاحب نے چڑوں کے مغز کا کشتہ تجویز کیا۔ بے شمار چڑے ذبح کیے جاتے رہے اور کشتہ تیار ہوتا رہا۔ بہت دنوں تک یہ علاج جاری رہا مگر مریض کو کوئی فائدہ نہ ہوا۔ بعد میں یہ انکشاف ہوا کہ ''چڑوں کے مغز کا کشتہ، جو لاٹ صاحب کے لیے تیار ہوا تھا، قبلہ حکیم صاحب خود استعمال کر رہے ہیں اور لاٹ صاحب کو ایسی ہی کوئی کشتہ نما چیز کھلائی جا رہی ہے۔''

اس کتاب سے غلام محمد کے جسمانی مریض ہونے ہی کا نہیں، ذہنی عوارض میں مبتلا ہونے کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ انھوں نے وزیر اعظم خواجہ ناظم الدین کو برطرف کرنے اور دستور ساز اسمبلی توڑنے کے جو ''عاقبت اندیشانہ'' اقدامات کیے اور جن کا خمیازہ پوری قوم کو بھگتنا پڑا، م۔ب۔ خالد کے نزدیک وہ صحیح اور برمحل اقدامات تھے۔ یہی نہیں، وہ فرماتے ہیں، ''غلام محمد ایک ایسا انسان تھا جو نگاہِ بلند اور جانِ پُرسوز کی دولت سے مالا مال تھا۔'' معلوم ہوتا ہے کہ اس ''نگاہِ بلند اور جانِ پُرسوز'' کا کچھ حصہ خالد صاحب کو بھی ملا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ غلام محمد کی کردار کشی اس لیے کی گئی کہ ان کی پیدائش پنجاب کی تھی لہٰذا اس ''جرم'' کی سزا انھیں بھگتنا پڑی۔

جناب مصنف نے غلام محمد کے علاوہ سکندر مرزا اور ایوب خان کا دور بھی دیکھا ہے اور ان دونوں کے بارے میں اپنے مشاہدات قلم بند کیے ہیں۔ ایک عرصے سے ان دونوں کی بھی ''کردار کشی'' ہو رہی ہے اور سکندر مرزا کی حد تک خود مصنف نے بھی اس کارِ خیر میں حصہ لیا ہے۔ غلام محمد کے بارے میں مصنف نے جو دلیل دی ہے، اس کے پیشِ نظر یہ عرض کرنا غلط نہ ہوگا کہ سکندر مرزا اور ایوب خان دونوں چونکہ پنجاب میں پیدا نہیں ہوئے اس لیے ان کی کردار کشی کا کوئی جواز نہیں ہے۔

خیر یہ تو سیاسی باتیں ہیں جو ہمارا موضوع نہیں۔ ہمیں تو زیرِ نظر کتاب کے اس حصے سے دلچسپی ہے جو ادیبوں کے بارے میں ہے۔ جناب خالد نے دورانِ ملازمت قدرت اللہ شہاب کے دفتر سے کاغذات ''حاصل'' کر لیے تھے۔ ان کے عکس کتاب میں شامل ہیں۔ ابنِ انشاء اور جاوید اقبال کے خطوں میں تو کوئی خاص بات نہیں، البتہ حفیظ جالندھری کے خطوط انشا پردازی کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ ایک خط میں قدرت اللہ شہاب کو لکھتے ہیں:

''صبح نماز کے بغیر تمہارا چہرہ میرے لیے صبح صادق ہوا کرتا تھا۔ سورج چاہے نہ چاہے، پر سورج سے روشنی پانے والے دور کے دیدار ہی سے خوش ہونے کے

لیے آنکھوں کے جھیکرے لیے پھرنے کے لیے مجبور ہیں۔ بہر صورت اب یہ ٹھیکرے بیکار معلوم ہوتے ہیں۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ ایسے کٹھن کٹھور بھی ہو سکتے ہیں۔ مجھے آپ کی پہلی ملاقات یا آپ کے چہرے پر اپنی پہلی نگار بار بار یاد آتی ہے۔ اس اقدام نے تو مجھے کہیں کا نہیں رکھا۔ مجھے کیا خبر تھی کہ اظہارِ محبت ایسے مردِ مطلق سے بھی نہیں کرنا چاہیے۔"

اُردو میں اس قسم کی رومانی شاعری تو ضرور ہوئی ہے، لیکن ایسی رومانی نثر شاید ہی کسی نے لکھی ہو۔ مانا کہ قدرت اللہ شہاب بڑے عہدے پر فائز تھے، لیکن دنیائے ادب میں حفیظ کا درجہ اس سے بہت بڑا ہے۔ افسوس کہ ایک بڑا شاعر ایک بڑے افسر کے سامنے "عاشق ناکام" بن کر رہ گیا۔

حفیظ کا ایک خط ایوب خاں کے نام بھی شامل کتاب ہے۔ اس کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"میں اپنے دل کے ہر قطرہ ہائے خون کو اور ان بوڑھی ہڈیوں میں جتنی بھی حرارت باقی ہے، ایوب خاں کے قدموں پر قربان کرنے کے لیے قسم کھا چکا ہوں۔"

اس قسم کا فیصلہ قدرت اللہ شہاب نے بھی کیا تھا۔ اس بات کا بڑا شہرہ ہے کہ شہاب صاحب نے بعض "ناگفتہ بہ" حالات کی وجہ سے ایوب خاں کے زمانے میں ملازمت سے استعفیٰ دے دیا تھا، مگر ایوب خاں نے اسے منظور نہیں کیا تھا۔ اس استعفیٰ کا متن زیرِ نظر کتاب میں شامل ہے اور پہلی مرتبہ منظرِ عام پر آیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شہاب صاحب ملازمت سے علیحدگی اس لیے چاہتے تھے کہ ایوب خاں سے مزید وابستگی کی راہ ہموار ہو۔ اس استعفیٰ کے آخر میں وہ لکھتے ہیں:

"گزشتہ ڈیڑھ سال جو میں نے جنابِ صدر کی خدمت میں گزارا ہے، وہ میرے کیریئر کا بہترین اور خوشگوار ترین عرصہ ہے۔ جنابِ صدر نے ملک میں نئی زندگی کا احساس پیدا کیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ میں الگ ہو کر اپنا اصل کام شروع کرنا چاہتا ہوں۔ اصل میں میرا مشن ہی جنابِ صدر کے افکار اور فلسفے کی تشریح ہوگا۔ سول سرونٹ کی حیثیت سے میں صرف عام قسم کا...... فائل ورک کر سکتا ہوں، الگ ہو کر میں ان کے افکار کو پھیلانے اور عام کرنے کے لیے کتابیں لکھ سکوں گا،

لیکچر دے سکوں گا۔"

حفیظ جالندھری ہوں یا قدرت اللہ شہاب سب ایک ہی زلف کے اسیر تھے۔

ایوب خاں کے زمانے میں ادیبوں کا کیا حال تھا، اس سلسلے میں خالد صاحب لکھتے ہیں:

"صدر کے رفاہی فنڈ کا چارج میرے پاس تھا۔ لہٰذا ادیبوں اور شاعروں کو حق خدمت ادا کرنے کا کام بھی میرے سپرد ہوا۔ یہ فریضہ میرے لیے ابتداً بڑا دلچسپ مگر بعد میں بڑا ابیزار کن ثابت ہوا۔ جن حضرات کا کلام بلاغت نظام اور نگارشات پڑھ کر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی، ان سے روابط بڑھے تو تصویر کا اصل رُخ سامنے آیا۔ اگرچہ یہ کوئی نیا تجربہ نہ تھا۔ اس سے پہلے ۱۹۶۰ء میں ایک معروف صحافی شاعر، ادیب اور مذہبی و سیاسی شخصیت نے اپنے ہفتہ وار جریدے کے لیے صرف ساٹھ ہزار روپے سکۂ رائج الوقت کے مفت نیوز پرنٹ کے عوض ایک مذہبی و سیاسی جماعت سے علیحدگی اختیار کر کے خود کو حوالۂ سرکار کر دیا تھا۔ یہ کارنامہ نواب صاحب کالاباغ کے ہاتھوں سرانجام ہوا تھا۔"

ساٹھ ہزار روپے کے عوض جس معروف شخصیت نے اپنی وفاداریاں تبدیل کیں، خالد صاحب نے اس کا نام نہیں بتایا۔ ممکن ہے بعض لوگوں کا دھیان ایک ایسے مولانا صاحبؒ کی طرف جائے جو کوثر و تسنیم میں دھلی ہوئی زبان بولتے اور لکھتے ہیں۔ لیکن ہمیں اس سے اتفاق نہیں کیونکہ ساٹھ ہزار روپے کی رقم بہت کم ہے، اتنی رقم میں تو کوئی وضعدار آدمی لباس بھی تبدیل نہیں کر سکتا، وفاداریاں کیا تبدیل کرے گا۔

ایک پیر صاحب جو بہت بڑے سیاستدان بھی تھے اور بہت بڑے صحافی اور ادیب بھی، ان کے بارے میں خالد صاحب نے یہ واقعہ سنایا ہے:

"یہ وزیر صاحب جو بعد میں وفاقی وزیر اور آخر میں سفیرِ کبیر اور بھٹو کی وزارتِ عظمیٰ کے دوران مشیر بنے، بڑے کائیاں تھے۔ غلام محمد سلیم شاہی جوتی پہنے ہوئے تھے۔ ان کا ذاتی خدمت گار قاسم اتارتا اور پہنایا کرتا تھا۔ مگر کیا مجال کہ وزیر صاحب نے قاسم کو ایک موقع بھی دیا ہو۔ وزیر صاحب تیر کی طرح کہیں نہ کہیں سے نکل آتے۔ گورنر جنرل صاحب کو جوتی پہناتے اور پھر اپنے دونوں ہاتھوں کی

انگلیوں کو بوسہ دیتے۔"

ان وزیر صاحب کی فراست کی داد دینی چاہیے کہ انھیں یہ معلوم تھا کہ "نگاہ بلند" اور "جاں پُر سوز" رکھنے والے "امیر کارواں" کو کس قسم کی باتیں پسند ہیں۔

اس کتاب میں قدرت اللہ شہاب کا ذکر جگہ جگہ ملتا ہے۔ اسے اگر "شہاب نامہ" کا دوسرا حصہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ مصنف کو شہاب صاحب سے بے حد عقیدت ہے۔ انھوں نے جو کچھ لکھا ہے، اس سے شہاب صاحب کی شخصیت کے کچھ نئے پہلو سامنے آتے ہیں۔ استعفیٰ والا واقعہ اوپر درج کیا جا چکا ہے۔ ایک اور دلچسپ بات یہ ہے کہ شہاب صاحب نے "شہاب نامہ" میں لکھا ہے کہ ایوب خاں کے زمانے میں ادیبوں کی "خرید و فروخت" کا جو کاروبار ہوا تھا، اس سے ان کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ لیکن م۔ ب۔ خالد کا بیان ہے کہ:

"صحافیوں اور کالم نویسوں سے رابطہ قائم کر کے ان سے خصوصی موضوعات پر مضامین لکھوانا اور انھیں حقِ خدمت ادا کرنا بریگیڈیئر ایف آر خان نے اپنے ذمہ لیا اور شاعروں یعنی ادیبوں سے کام لینا ایوانِ صدر میں قدرت اللہ شہاب کے سپرد ہوا۔"

اس دلچسپ کتاب کے مصنف پیشے کے اعتبار سے اسٹینوگرافر یعنی مختصر نویس ہیں۔ اس لیے ان سے یہ توقع تھی کہ وہ بیانِ واقعات میں مختصر نویسی کے فن کا مظاہرہ کریں گے۔ لیکن اس صلاحیت سے انھوں نے صرف اپنے نام کی حد تک فائدہ اٹھایا ہے اور محمد بشیر خالد کو م۔ ب۔ خالد کر دیا ہے۔ کتاب طولِ کلام کا شاہکار ہے۔ تکرارِ مباحث کے ساتھ ساتھ غیر ضروری تحریروں کو بھی فراخ دلی سے کتاب میں شامل کیا گیا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ ایک جگہ اسی کتاب کا ایک طویل اقتباس دوبارہ درج کیا گیا ہے اور وجہ یہ بتائی ہے کہ فلاں صفحے پر جو کچھ لکھا گیا ہے اُسے دوبارہ پڑھنا چاہیے۔ غیر ضروری تحریروں کی شمولیت کا اس سے اندازہ کیجیے کہ حنیف رامے کا سترہ (۱۷) صفحات کا ایک مطبوعہ مضمون اس کتاب میں شامل کیا ہے جیسے یہ کوئی نادر دستاویز ہو۔ بہر حال ان باتوں سے کتاب کی افادیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ عام قاری کے لیے اور ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے یہ کتاب عبرت حاصل کرنے کا ایک مؤثر ذریعہ ہے۔

(۲۹ ستمبر ۱۹۸۸ء)

رئیس امروہوی کی یاد میں

یقین نہیں آتا کہ اب وہ شخص ہمارے درمیان موجود نہیں رہا جس کا ہمارا چالیس برسوں کا ساتھ تھا۔ وہ ہم سے اتنا قریب تھا کہ ہماری عادات میں داخل ہو گیا تھا۔ روزانہ صبح اخبار میں رئیس امروہوی کا قطعہ پڑھنے کی ایسی عادت پڑ گئی تھی کہ ادارتی صفحے پر نظریں سب سے پہلے ان چار مصرعوں پر پڑتی تھیں جن میں حالاتِ حاضرہ کے کسی پہلو پر بلیغ تبصرہ ہوتا تھا۔ ان چار مصرعوں میں شاعری ہوتی تھی یا نہیں، یہ تو معلوم نہیں، لیکن ایسی کوئی چیز ضرور ہوتی تھی جو اچھی لگتی تھی۔ لیکن رئیس صاحب کی شخصیت کا صرف ایک پہلو ہے جس سے ان کی قادر الکلامی، طنازی اور سیاسی شعور کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کی شخصیت کی اور بھی بہت سے پہلو تھے۔ وہ ایک نغز گو شاعر اور ایک اچھے نثر نویس ہی نہیں تھے، بہت سے علوم و فنون پر بھی حاوی تھے۔ کراچی کی مجلسی زندگی کی وہ جان تھے۔ اگر ان کی قیام گاہ کو کراچی کا سب سے بڑا ادبی، تہذیبی اور ثقافتی مرکز کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ انھیں صرف کراچی ہی میں نہیں ساری اُردو دنیا میں احترام کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ وہ لوگ بھی، اور ایسے لوگ خاصی تعداد میں تھے جو اُن کے سیاسی نظریات سے اختلاف رکھتے تھے، ان کے علم و فضل اور شاعرانہ کمالات کے کھلے دل سے معترف تھے۔ معلوم نہیں ظالم قاتل نے اس شمعِ انجمن افروز کو کیوں بجھا دیا۔

رئیس صاحب سے ہماری نیاز مندی بہت پرانی تھی۔ گزشتہ ۱۷، ۱۸ برسوں میں ہم نے "جسارت" میں اور پھر "تکبیر" میں بار ہا ان کا ذکر کیا ہے اور ان کے بارے میں مستقل کالم بھی لکھے۔ رئیس صاحب ہمارا کالم باقاعدگی سے پڑھتے تھے، لیکن کبھی ایسا نہیں ہوا کہ انھوں نے ہماری کسی بات کا بُرا مانا ہو۔ ہماری سخن گسترانہ باتوں اور اختلافِ رائے کو انھوں نے ہمیشہ پسند کیا، صرف پسند ہی نہیں کیا، ہماری حوصلہ افزائی بھی کی۔ کبھی فون پر اور کبھی خط کے ذریعے۔ ہمارا تجربہ یہ ہے کہ بہت کم لوگوں میں، خصوصاً اُردو کے ادیبوں میں اتنا حوصلہ نہیں ہوتا ہے

کہ وہ اپنے بارے میں تعریفی کلمات کے سوا کچھ اور سن سکیں۔

رئیس صاحب کی جب بھی کوئی نئی کتاب شائع ہوتی تھی، وہ اس سے ہمیں ضرور نوازتے تھے اور اس پر ہمارے کالم کا انتظار کرتے تھے۔ ابھی پچھلے دنوں انھوں نے اپنی کتاب "ضمیر خامہ" مرحمت فرمائی تو ہم نے اس پر ایک کالم لکھا جو انھیں پسند آیا۔ یہ کالم پڑھ کر انھوں نے ہمارے نام ایک خط لکھا جس کا عکس شائع کیا جا رہا ہے۔ ساتھ ہی انھوں نے اپنی ایک کتاب "اچھے مرزا" بھی بھیجی۔ افسوس کہ "اچھے مرزا" پر کالم لکھنے سے پہلے ہمیں خود رئیس صاحب پر تعزیتی کالم لکھنا پڑ رہا ہے۔ "ضمیر خامہ" سے متعلق ہم نے اپنا کالم اب دوبارہ پڑھا تو جی چاہا کہ اس کا کچھ حصہ ہمارے قارئین بھی دوبارہ پڑھ لیں تا کہ یہ اندازہ ہو سکے کہ مرحوم نے اپنے خط میں جس بات کی داد دی ہے، وہ کیا تھی۔

"جناب رئیس امروہوی کے بارے میں ہم آج تک یہ طے نہیں کر پائے کہ وہ ایک فرد ہیں یا ادارہ۔ اخباروں میں ان کی جو تصویر چھپتی ہے، اس میں صورت شکل سے نہیں شیروانی سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ موصوف ہماری آپ کی طرح کے انسان ہیں، لیکن ان کے کلام نظم و نثر پر نظر ڈالی جائے تو یقین نہیں آتا کہ کوئی انسان اتنا کچھ لکھ سکتا ہے۔ صرف اخباری قطعات کو دیکھا جائے تو ان کی تعداد ۱۴ ہزار سے کم نہیں۔ گویا ۲۸ ہزار شعر۔ غزلوں، نظموں، مثنویوں اور دیگر اصناف سخن کے اشعار کی تعداد ۲ لاکھ سے کم کیا ہوگی۔ بے شمار مرنے والوں کی تاریخ ہائے وفات اور پیدا ہونے والوں کی تاریخ ہائے پیدائش کے قطعات، نیز سہروں اور دیگر فرمائشی نظموں کو بھی شاعری میں شامل سمجھا جائے تو شعروں کی تعداد ۵ لاکھ کے قریب ہو جاتی ہے۔ یہ تو مطبوعہ کلام ہوا، اتنا ہی غیر مطبوعہ کلام بھی ہے۔ کچھ دیوان چوری ہوئے، کچھ ضائع ہو گئے، بہت سا کلام خود رئیس صاحب نے ضائع کر دیا۔ بہت سا مارشل لا، والوں نے سنسر کر دیا۔ ایک زمانے میں رئیس صاحب اجرت پر دوسروں کو شعر لکھ کر دیا کرتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ کراچی میں درجنوں ایسے شعراء موجود ہیں جو رئیس صاحب کی بدولت صاحب دیوان بن گئے۔ ان سب امور کے پیش نظر اندازہ یہ ہے کہ رئیس صاحب نے کم و بیش دس لاکھ شعر

لکھے ہیں۔

اب ہم جناب جمیل الدین عالی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اعداد و شمار کے حوالے سے عرض کریں گے کہ رئیس صاحب کا سال پیدائش ۱۹۱۷ء ہے۔ خدا کے فضل سے وہ اکہتر برس کے ہیں۔ انھوں نے ۱۱ برس کی عمر میں شاعری شروع کی تھی۔ اس حساب سے ان کی مشق سخن کی عمر ۶۰ برس قرار پاتی ہے۔ ساٹھ برسوں کے دن اکیس ہزار ایک سو بیس ہوتے ہیں۔ دس لاکھ شعروں پر ان دنوں کو تقسیم کیا جائے تو شعروں کی یومیہ اوسط ۴۷ ہوئی ہے۔ اتنے شعر روزانہ کہنا کوئی آسان بات نہیں ہے۔ غالب جیسا بڑا شاعر بھی رئیس صاحب کے سامنے نہیں ٹھہر سکتا کہ وہ ۴۷ دنوں میں بمشکل ایک شعر کہتا تھا۔

رئیس صاحب نے صرف شاعری نہیں کی، نثر بھی لکھی ہے۔ وہ روزنامہ "جنگ" سے وابستہ ہونے سے پہلے کئی اخبارات و جرائد کی ادارت کر چکے ہیں۔ ان میں انھوں نے بے شمار اداریے اور مضامین لکھے ہیں۔ بلکہ ایک دو جریدے تو ایسے بھی تھے جس کے تمام مشمولات از اوّل تا آخر رئیس صاحب کی خامہ فرسائی کا نتیجہ ہوتے تھے۔ اگر صرف "جنگ" ہی کے ہفتہ وار کالموں کا حساب رکھا جائے تو وہ دو ہزار سے زیادہ ہیں۔ پھر انھوں نے نفسیات، مابعد النفسیات، جنسیات، روحانیات، ہپناٹزم، جنات اور خرافات پر بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ ان کی تقریباً تین درجن کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن کے مجموعی صفحات ۱۰ ہزار سے زیادہ ہیں۔ اب آپ خود ہی فیصلہ کیجیے کہ کوئی ایک شخص اتنا کچھ کیسے لکھ سکتا ہے۔ یقیناً رئیس امروہوی ایک فرد کا نام نہیں، مجموعۂ افراد کا نام ہے۔ اور اس مجموعے کا ہر فرد اپنی ذات سے ایک انجمن ہے اور یہ انجمن بھی ویسی ہی فعال ہے جیسی انجمن سادات امروہہ۔

کثیر التصانیف مصنف ہونا کوئی ایسی خوبی نہیں جس کے لیے کوئی مصنف اپنی ساری عمر اور ہم اپنے کالم کا ایک چوتھائی حصہ ضائع کریں۔ اصل خوبی یہ ہے کہ جناب رئیس امروہوی بسیار نویس ہونے کے ساتھ ساتھ خوشنویس بھی ہیں۔

اس سے خدانخواستہ یہ مراد نہیں کہ وہ اپنی کتابوں کی کتابت بھی خود ہی کرتے ہیں، بلکہ یہ بتانا مقصود ہے کہ معیار کے اعتبار سے بھی ان کا کلام نظم و نثر اپنی مثال آپ ہے۔ وہ غزلوں میں ایک صاحب فکر شاعر نظر آتے ہیں اور نظموں میں صاحب نظر طنز نگار۔ مجموعی طور پر وہ صفِ اوّل کے شاعر ہیں اور نثر میں بھی ان کا انداز نگارش منفرد ہے۔

ان کا ذخیرۂ الفاظ بے حد وسیع ہے۔ انھوں نے بہت سے ایسے الفاظ استعمال کیے ہیں جو اُردو لغات میں نظر نہیں آتے۔ ذخیرۂ الفاظ کی وسعت کے اعتبار سے نظیر اکبر آبادی، میر انیس، مولانا ظفر علی خاں اور جوش ملیح آبادی اُردو شاعری کے چار ستون ہیں۔ رئیس صاحب ان کے مقابلے پر قطب مینار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے جتنے الفاظ استعمال کیے ہیں، اتنے اُردو کے کسی دوسرے شاعر کے ہاں نہیں ملتے۔"

ایک مرتبہ ہم نے اپنے کسی کالم میں لکھا تھا کہ رئیس صاحب کا اصل فن غزل گوئی ہے۔ انھوں نے جدید اُردو غزل کو فکر و فن کی جن نئی جہتوں سے آشنا کرایا ہے، وہ انھی کا حصہ ہے لیکن افسوس کہ ان کے اس کمال پر ان کے دوسرے کمالوں نے پردہ ڈال رکھا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اخباری قطعہ نویس کی حیثیت سے تو وہ ہفت اقلیم میں مشہور ہیں لیکن اُردو ادب کی تاریخ [illegible] لکھی گئی ور جنوں کتابوں میں ان کا نام نظر نہیں آتا۔ اُردو کے نقادوں کی اس بے خبری پر حیرت [illegible] ہوتی ہے اور افسوس بھی۔ ..... رئیس صاحب کی غزلوں کی چند شعر سنیے۔ یہ وہ شعر ہیں جو کالم [illegible] وقت ہمیں یاد آئے۔

گردشِ وقت بھی آگے مجھے لے جا نہ سکی
تم جہاں چھوڑ گئے تھے میں وہیں ہوں اب تک

جنھیں نگارشِ لوحِ ابد کا دعویٰ ہے
فقط کتابتِ سنگِ مزار کرتے ہیں

جو نئی دنیا ابھی تخلیق کی منزل میں ہے
اس کا کربِ آفرینش بھی ہمارے دل میں ہے

گرا ہے شاخِ گل سے ایک پتا
کسی نے کیا مجھے آواز دی ہے

مجھ سے ہی طالبِ پرستش ہیں
میرے اصنام خود تراشیدہ

ڈھونڈتا پھرتا ہوں خود اپنی بصارت کی حدود
کھو گئی ہیں مری نظریں مری بینائی میں

(٦/١ اکتوبر ١٩٨٨ء)

دریا نوش پاکستانی شاعر

وزیا پرکاش سرورؔ تونسوی رسالہ "شمانِ ہند" دہلی کے ایڈیٹر ہیں۔ برسوں سردار دیوان سنگھ مفتون کے ساتھ کام کرتے رہے ہیں، اس لیے سردار صاحب کی بہت سی خوبیاں (اور خامیاں بھی) ان میں پائی جاتی ہیں۔ سردار صاحب کی مشہور کتاب "ناقابلِ فراموش" کے انداز میں سرور صاحب نے بھی اپنی یادداشتیں مرتب کی ہیں۔ یہ کتاب "یہ کوئے یار یہ انداز محرمانہ گزر" کے نام سے حال ہی میں دہلی سے شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب میں بے شمار ایسے دلچسپ اور عبرت انگیز واقعات ملتے ہیں جن سے انسانی فطرت کے عجیب و غریب راز سامنے آتے ہیں۔ خود سرورؔ صاحب بھی عجیب و غریب آدمی ہیں۔ مذہباً ہندو لیکن عملاً اتنے وسیع المشرب کہ مسلمان صوفیاء سے گہری عقیدت رکھتے ہیں اور اپنے بے شمار مقاصد کے حصول کا وسیلہ انھی صوفیاء کو قرار دیتے ہیں۔ مسلمانوں سے ایسی محبت کہ فخر سے کہتے ہیں کہ وہ اپنے ادارے میں مسلمانوں کے سوا کسی کو ملازم نہیں رکھتے۔ اپنے پرانے وطن ملتان اور اس کے نواحی علاقوں کو بڑی دلسوزی سے یاد کرتے ہیں۔ ان علاقوں کے ان مسلمانوں سے بھی انھیں بے حد عقیدت ہے جنھوں نے ۱۹۴۷ء کے ہنگاموں میں ہندو آبادی کی حفاظت کی۔ ان سب خوبیوں کے باوجود ہمیں سرور صاحب کی کتاب کے وہ حصے اچھے نہیں لگے جن میں بعض پاکستانی شاعروں کی "کردار کشی" کی گئی ہے۔ مثلاً اس کتاب کے صفحہ ۱۸۱ پر وہ لکھتے ہیں:

"پچھلے دنوں دہلی کلاتھ ملز کے مشاعرے میں ایک پاکستانی شاعر تشریف لائیں تو..... شراب نوشی کے باعث بے شک وہ بلبلِ ہزار داستان تو بن گئیں مگر افسوس کہ انھوں نے اپنے ملک کا وقار قائم نہ رکھا۔ پاکستان کے شاعر کئی ماہ ہندوستان میں رہے اور انھوں نے مشاعرے پڑھنے کے لیے ہر ممکن حربے استعمال کر کے دعوت نامے حاصل کیے اور بڑے طمطراق سے ہر مشاعرے میں یہ کہتے رہے کہ پاکستان میں ان کی ٹکر کا کوئی دوسرا شاعر نہیں ہے، مگر شراب نوشی کے لیے جو سفلہ پن، بے غیرتی اور گداگری انھوں نے فرمائی اُسے دیکھتے ہوئے بے شک اس کا یقین ہو گیا کہ ان اوصاف میں واقعی پاکستان کا کوئی شاعر ان کی ٹکر کا نہیں۔"

سرورؔ تونسوی صاحب کا بہت بہت شکریہ کہ انھیں پاکستانی شاعروں سے زیادہ پاکستان کے وقار کا خیال ہے۔ لیکن موصوف کو معلوم ہونا چاہیے کہ ہمارے جو شاعر ہندوستان جاتے ہیں، وہ واقعتاً ایسے ہی ہوتے ہیں کہ ان کی ٹکر کا کوئی شاعر پاکستان میں تو کیا ہندوستان میں بھی مشکل سے ملے گا۔ اسی لیے تو ہندوستانی شاعر ندا فاضلی نے ایک مرتبہ برسرِ مشاعرہ کہا تھا کہ پاکستان والے اپنے اچھے شاعروں کو تو چھپا کر رکھتے ہیں اور کوڑا کرکٹ ہندوستان بھیج دیتے ہیں۔ ایک مرتبہ پاکستان کی کرکٹ ٹیم ہندوستان میں کھیل رہی تھی۔ انھیں دنوں کچھ پاکستانی شاعر بھی وہاں مشاعرے پڑھ رہے تھے۔ اس پر ندا فاضلی نے ان الفاظ میں تبصرہ کیا تھا: "آج کل پاکستان کی کرکٹ ٹیم کے ساتھ کوڑا کرکٹ ٹیم بھی ہندوستان کا دورہ کر رہی ہے۔"

جناب سرورؔ نے شراب کے سلسلے میں پاکستانی شعرا کو سفلہ پن، بے غیرتی اور گداگری کا طعنہ دیا ہے۔ شاید موصوف کو یہ معلوم نہیں کہ یہ صفات ایسی نہیں ہیں جو شعرائے کرام کے لیے بدنامی کا باعث ہوں۔ ان صفات کی موجودگی پر ہمیشہ فخر کیا گیا ہے۔ مثلاً میر سوزؔ کا یہ شعر تو آپ نے سنا ہوگا۔

ساقی نے جام دے کر مجھے کر دیا خموش
آخر کو کام آ ہی گیا سفلہ پن مرا

یہاں سفلہ پن عیب نہیں خوبی ہے جس کا شاعر نے فخریہ ذکر کیا ہے۔
مومن خان مومنؔ فرماتے ہیں۔

لے شبِ وصلِ غیر بھی کاٹی
تو مجھے آزمائے گا کب تک

کیا اس سے زیادہ بے غیرتی کا تصور کیا جا سکتا ہے کہ شبِ فراق میں مر جانے والا شاعر "شبِ وصلِ غیر" ہنسی خوشی سے گزار دے۔
غالبؔ کا یہ شعر تو زبان زدِ خاص و عام ہے۔

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا جو میری شامت آئے
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے

جب غالب جیسا بڑا شاعر اپنا حلیہ ایسا بنا سکتا ہے کہ اس پر گدا کا گمان گزرے تو [illegible] ہمارے پاکستانی شاعروں نے کیا گناہ کیا ہے جو انھیں ہندوستان میں کشکول گدائی ہاتھ میں لینے سے روکا جائے۔

سرور تونسوی نے کسی پاکستانی شاعرہ کا نام لیے بغیر فرمایا ہے کہ وہ شراب نوشی کے باعث بلبلِ ہزار داستان تو بن گئیں لیکن انھوں نے اپنے ملک کا وقار قائم نہ رکھا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا کسی شاعرہ کا بلبلِ ہزار داستان بن جانا کوئی معمولی بات ہے، اور کیا بلبلِ ہزار داستان بن کر ملک کے وقار میں اضافہ نہیں کیا سکتا؟ جب سروجنی نائیڈو بلبلِ ہند بن کر ہندوستان کی عزت میں اضافہ کر سکتی ہیں تو پھر ہماری ایک شاعرہ بلبلِ ہزار داستان بن کر ہمارے ملک کے لیے عزت و وقار کا سبب کیوں نہیں بن سکتی؟

سرور تونسوی نے ایک جگہ (صفحہ ۳۲۱) اقبال سیمینار (۱۹۷۷ء) کے سلسلے میں لکھا ہے:

"پاکستانی وفد کے اراکین کو خوب دعوتیں دی گئیں۔ جہاں شرابِ ناب کے جام پر جام لنڈھائے جاتے رہے۔ بعض حضرات جناب کرشن موہن کی طرف سے دی گئی دعوت سے جاتے ہوئے سکاچ وسکی کی بوتلیں بھی چھپا کر ساتھ لے گئے۔ ایک صاحب تو بوتل کے منھ پر ڈھکنا لگانا بھی بھول گئے۔ جب شراب ان کے کوٹ کی جیب سے بہنے لگی تو کرشن موہن نے بوتل کا ڈھکنا دیتے ہوئے ان صاحب سے کہا، لیجیے بوتل کا منھ اس سے بند کر لیجیے ورنہ آپ کے کپڑے خراب ہو جائیں گے۔ ان دعوتوں کو دیکھ کر سمجھ میں آیا کہ پاکستان کے شعراء اور ادیب ادبی و ثقافتی وفود میں ہندوستان آنے کے لیے کیوں بے تاب ہوتے ہیں۔"

معلوم نہیں سرور تونسوی صاحب پاکستانی شاعروں کے پیچھے کیوں ہاتھ دھو کر پڑ گئے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ہاتھ بھی شراب سے دھوئے ہیں کہ شراب ہی کے حوالے سے وہ پاکستانی شاعروں کی کردار کشی کرتے ہیں۔ لیکن ہمیں تو مذکورہ واقعے میں کوئی ایسی بات نظر نہیں آتی جو پاکستانی شاعروں کے خلاف جاتی ہو۔ ساری غلطی کرشن موہن کی ہے۔ انھیں چاہیے تھا کہ پاکستانی مہمانوں کو

[illegible] کی بوتلیں خود پیش کرتے تاکہ وہ بغیر ڈھکنے کی بوتلیں جیب میں نہ رکھتے۔ جب ایک مہمان شاعر کے کوٹ کی جیب سے شراب بہہ نکلی تو کرشن موہن نے بوتل کا ڈھکنا پیش کر دیا تو کون سا تیر مارا۔ یہ [illegible] میزبان یوں کا فرض تھا کہ مہمان کی کپڑوں کو خراب ہونے سے بچاتے۔

سرور تونسوی نے اس پر بھی طنز کیا ہے کہ پاکستانی شعراء ہندوستان جانے والے وفود میں [illegible] کے لیے بے تاب ہوتے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں انھیں شراب بآسانی مل جاتی ہے۔ اطلاعاً عرض ہے کہ پاکستان میں شراب پر پابندی ضرور ہے لیکن آج تک شراب پینے والا کوئی پاکستانی پیاسا نہیں مرا۔ چور بازار سے آپ جتنی شراب چاہیں خرید سکتے ہیں۔ کسٹم والے بھی شراب کی جن بوتلوں کو قبضے میں کرتے ہیں، انھیں کاغذ پر تو ضائع کر دیا جاتا ہے لیکن بازار میں [illegible] داموں فروخت ہو جاتی ہیں۔ لیکن پاکستانی شاعر ایسے گئے گزرے نہیں کہ شراب جیسی حرام [illegible] چور بازار سے خریدیں۔ اسی لیے وہ جب ہندوستانی جاتے ہیں تو دامن تر کر لیتے ہیں۔ مفت کی شراب تو قاضی کو بھی حلال ہوتی ہے تو پھر ہمارے شاعروں کو کیوں اس رعایت سے محروم کر دیا [illegible]۔ امیر مینائی جیسے پاکباز شاعر نے بھی مفت کی پینے کو جائز قرار دیا ہے۔

گرہ سے کچھ نہیں جاتا ہے پی بھی لے زاہد
ملے جو مفت تو قاضی کو بھی حرام نہیں

لہٰذا پاکستانی شعراء اگر ہندوستان جا کر مفت کی پیتے ہیں تو وہ کوئی جرم نہیں کرتے۔ البتہ ہندوستانی میزبانوں کی کم ظرفی قابلِ افسوس ہے۔ پہلے تو ہمارے شاعروں کو مفت کی پلاتے ہیں اور پھر انھیں رسوا کرتے ہیں۔

جو پاکستانی ادیب اور شاعر ہندوستان جاتے ہیں وہ حکومت سے باقاعدہ اجازت لیتے ہیں۔ اکادمی ادبیات کی سفارش پر حکومت ان کے لیے این او سی جاری کرتی ہے۔ اس لیے یہ کہنا [illegible] ہوگا کہ اب تک جو شعرائے کرام ہندوستان کا سفر کر چکے ہیں، ان کے اعمال کی ذمہ داری حکومت پر ہے۔ جہاں حکومت نے یہ ذمہ داری اٹھائی ہے، وہاں اگر وہ ایک زحمت اور بھی [illegible] تو اچھا ہوگا کہ پاکستانی شاعروں کی مفت کی شراب کی فراہمی پاکستانی سفارت خانے کی طرف سے کی جائے۔ اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ ہندوستانی میزبان جیب میں رکھی ہوئی کھلی بوتلوں کا ڈھکنا پیش کر کے ہمارے جلیل القدر شاعروں کو ممنونِ احسان نہیں کر سکیں گے۔ اس مقصد کے

لیے دہلی میں پاکستانی سفارت خانے میں پریس سیکرٹری اور کمرشل سیکرٹری کی طرح ایک عہدہ "بوتل سیکرٹری" کا بھی ہونا چاہیے۔

سرور تونسوی نے اپنی کتاب میں صرف پاکستانی شاعروں کو دادِ سخن نہیں دی، ہندوستانی شاعروں کی شراب نوشی کے بھی بہت سے واقعات بیان کیے ہیں اور بتایا ہے کہ وہ اس شوق کو پورا کرنے کے لیے کیا کیا جتن کرتے تھے یا کرتے ہیں۔ مشہور شاعر نریش کمار شاد کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

"نریش کمار شاد دانشوری کی مضبوط قدروں کا مالک تھا مگر شراب نوشی کی لت کے باعث اسے خودکشی کرنی پڑی، یا خودکشی کے پردے میں وہ موت سے ہم کنار کر دیا گیا۔ شاید ہی دلّی کا کوئی ایسا کھاتا پیتا آدمی ہوگا جس کے ہاں نریش کمار شاد نے یہ کہہ کر روپیہ نہ اینٹھا ہو کہ اس کا اکلوتا بیٹا موت کا شکار ہو گیا ہے ...... لہٰذا اس کے کفن دفن کے لیے مدد کی جائے۔ اور اس قابلِ عبرت جھوٹ سے حاصل کیا ہوا روپیہ شراب نوشی کی نذر ہوتا۔"

ہندوستان کے ایک "گلوکار" شاعر آغا امیر قزلباش کے بارے میں سرور تونسوی نے یہ واقعہ لکھا ہے:

"...... پیچھے سے آغا امیر قزلباش نے ہانپتے ہوئے آواز دی، سرور صاحب! ایک منٹ کے لیے میری بات سنیے۔ دیکھا تو قزلباش کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں ..... عرض کیا کہ فرمایئے کیا بات ہے۔ کہنے لگے کہ میرے لڑکے کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے اور ڈاکٹر اس کی ڈریسنگ کر رہا ہے، اسی وقت دس روپے چاہئیں۔ اسی وقت دس روپے ان کی خدمت میں پیش کر دیے گئے۔ تھوڑی دیر بعد خیال آیا کہ ابھی تو اس کی شادی ہی نہیں ہوئی تو لڑکا کہاں سے آ گیا۔ دوسرے دن پتا چلا کہ یہ ڈراما محض شراب کی لت پوری کرنے کے لیے کیا گیا تھا۔"

اس واقعے سے ثابت ہوتا ہے کہ آغا امیر قزلباش "گلوکار" ہی نہیں اچھے خاصے "اداکار" بھی ہیں۔

(۱۳/اکتوبر ۱۹۸۸ء)

سنگِ لرزاں کا ستون

شام کو جب سورج غروب ہوتا ہے تو صرف یہی احساس نہیں ہوتا کہ ہم سب کی زندگیوں میں سے ایک ایک دن کم ہو گیا، بلکہ اس کا افسوس بھی ہوتا ہے کہ ملک میں موجود کاغذ کے ذخیرے میں سے سینکڑوں رم کاغذ بھی ضائع ہو گیا۔ یہ وہ کاغذ ہے جس پر سفرنامے چھپتے ہیں۔ سفرناموں کا کچھ ایسا رواج ہوا ہے کہ ایک سفرنامے کی سیاہی ابھی خشک نہیں ہوتی کہ دوسرے سفرنامے کی سیاہی اشاعتی افق پر پھیل جاتی ہے۔ معلوم نہیں سفید کو سیاہ کرنے کا یہ سلسلہ کب تک جاری رہے گا۔ ہمیں تو اس کے ختم ہونے کے آثار نظر نہیں آتے۔ بلکہ صورت حال مزید خراب ہوتی دکھائی دیتی ہے، جس کا ثبوت یہ ہے کہ راغب شکیب کا سفرنامہ بھی شائع ہو گیا ہے۔

اس سے پہلے کہ بات آگے چلے، یہ بتا دینا ضروری ہے کہ راغب شکیب کون ہیں، کیا ہیں اور کیوں ہیں؟ راغب صاحب ایک زمانے میں سرگودھا میں رہتے تھے اور غزلیں کہتے تھے۔ ویسی ہی غزلیں جیسی میر تقی میر کے فرزند میر کلو عرش کہا کرتے تھے اور جن کی بنا پر میر صاحب نے صاحبزادے کو دھمکی دی تھی کہ اگر تم نے غزل گوئی ترک نہ کی تو میں تمھیں عاق کر دوں گا۔ لیکن راغب شکیب خوش قسمت ہیں، انھیں غزل گوئی کی بنا پر یا پاداش میں دبستانِ سرگودھا نے اپنے حلقۂ عاطفت میں لے لیا اور وہ ادب کے اس قصرِ چہل ستون کی رونق بن گئے۔ اسی لیے تو کہا جاتا ہے کہ دبستانِ سرگودھا کے ۳۹ ستون سنگِ مرمر کے ہیں اور ایک سنگِ لرزاں کا ہے۔ راغب شکیب کو سنگِ لرزاں کا ستون اس لیے کہا گیا ہے کہ وہ مشاعرے میں جب کلام سناتے ہیں تو ان پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے حالانکہ یہ حال سامعین کا ہونا چاہیے۔

ایک عرصے تک راغب شکیب سرگودھا میں شاعری کرتے رہتے۔ جب یہ محسوس کیا گیا کہ ان کی شاعری خود ان کے لیے یا دبستانِ سرگودھا کے لیے ذریعۂ عزت نہیں بن سکتی تو انھیں دبستانِ سرگودھا کے ترجمان "اردو زبان" کا مدیر مقرر کر دیا گیا۔ اس رسالے سے انھیں ملک گیر

بلکہ ہنگامہ خیز قسم کی شہرت حاصل ہوئی اور وہ باقاعدہ ایک ''ادبی شخصیت'' بن گئے۔ ہمارے ملک میں ادبی شخصیات اسی طرح بنتی اور بگڑتی ہیں۔ بلکہ بننے سے پہلے ہی بگڑ جاتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ادبی شخصیت بن جانے کے بعد راغب صاحب کے لیے ننکانے سرگودھا میں رہنا ممکن نہ تھا۔ اس لیے وہ اپنا ادبی سفینہ لے کر کراچی چلے آئے کہ یہ شہر ایک بحر بیکراں کے کنارے آباد ہے۔ اب وہ کئی برس سے کراچی ہی میں رہتے ہیں اور دبستان سرگودھا کے مفادات کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا اور ڈاکٹر انور سدید جب کراچی تشریف لاتے ہیں تو ان کی دیکھ بھال بھی راغب صاحب ہی کے ذمے ہوتی ہے۔

کراچی میں مستقل طور پر آباد ہونے سے قبل ایک مرتبہ راغب صاحب نے سرگودھا سے کراچی تک کا سفر کیا تھا۔ یہاں کے ادیبوں سے ملاقاتیں کی تھیں اور ادبی محفلوں میں شرکت کی تھی۔ بسوں میں لٹک کر شہر کی سیر کی تھی جس طرح وہ دبستان سرگودھا سے اٹک کر دنیائے ادب کی سیر کر رہے ہیں۔ اس واقعے کو تو کراچی والے بھول گئے لیکن راغب صاحب نے اپنے سفر کی ایک ایک بات کو یاد رکھا اور پھر ان باتوں کو قلم بند بھی کر لیا۔ اگر معاملہ یہیں تک رہتا تو غنیمت تھا۔ ان کا قلمی سفرنامہ کسی لائبریری میں محفوظ ہو جاتا اور سو سال بعد کوئی محقق اس کی گرد جھاڑ کر یہ تحقیق کرتا کہ راغب صاحب کو کراچی کا سفر کرنے اور پھر سفرنامہ لکھنے کی ایسی کیا مجبوری تھی۔ بہر حال اطمینان و مسرت ہے کہ راغب صاحب نے جرأت سے کام لے کر اس سفرنامے کو ''سفر ہم سفر'' کے نام سے چھپوا دیا ہے۔ جرأت کی داد ہم نے اس لیے دی ہے کہ راغب صاحب اس سفرنامے کے مصنف ہی نہیں ناشر بھی ہیں۔ انھوں نے زر کثیر صرف کر کے اسے چھاپا ہے۔ کیا گھر پھونک تماشا دیکھنا جرأت کی بات نہیں ہے؟

راغب صاحب کو ایک اور بات کی داد بھی دینی پڑتی ہے کہ انھوں نے سفرنامہ لکھنے کے لیے ایک طویل سفر اختیار کیا۔ وہ چاہتے تو سرگودھا سے کوٹ اڈو تک کا سفرنامہ بھی لکھ سکتے تھے کہ یہ بستی کراچی کی نسبت سرگودھا سے قریب ہے۔ لیکن ان کی مہم جو طبیعت تن آسانی کی تہمت اٹھانے پر آمادہ نہ ہوئی۔ انھوں نے ایک دور دراز مقام یعنی کراچی کو بذریعہ ریل اپنی منزل قرار دیا۔

سفر کے دوران ریل جن شہروں سے گزری، ان شہروں کے ادیبوں اور ادبی اداروں کے بارے میں راغب صاحب نے بیش بہا معلومات اپنے سفرنامے میں جمع کر دی ہیں۔ مثلاً

فیصل آباد، ٹوبہ ٹیک سنگھ، خانیوال، ملتان، بہاولپور، خانپور اور حیدرآباد سندھ کے ریلوے اسٹیشنوں سے گزرتے ہوئے ان شہروں کے ادیبوں کا اس والہانہ انداز سے ذکر کیا ہے جیسے وہ ریل میں سفر نہیں کر رہے، ادیبوں کی ڈائرکٹری مرتب کر رہے ہیں۔ یہی نہیں، ریلوے اسٹیشنوں کے قرب وجوار کے مقامات بھی راغب صاحب کی نظر التفات سے محروم نہیں رہے۔ ملتان ریلوے اسٹیشن کے حوالے سے انھوں نے جب ملتان کے ادیبوں کے بارے میں کئی صفحات سیاہ کر دیے تو انھیں خیال آیا کہ ملتان سے ایک سڑک کوٹ اڈو کی طرف جاتی ہے اور دوسری ڈیرہ غازی خان کی طرف۔ اس خیال کے آنے کی دیر تھی کہ راغب صاحب نے عالم خیال میں بیک وقت ان دونوں سڑکوں پر چلنا شروع کر دیا اور ان دونوں بستیوں کے ادیبوں سے اپنے قارئین کی ملاقات کرا دی۔

سفر کے دوران راغب صاحب ریل پر سوار تھے لیکن خود ان پر ادب سوار تھا۔ ظاہر ہے ایسی حالت میں سونے کا موقع کہاں مل سکتا تھا۔ لیکن نیند تو سولی پر بھی آ جاتی ہے۔ ادب کی خدمت کرتے کرتے ایک مرتبہ راغب صاحب کی آنکھ لگ گئی تو خواب میں بھی وہ ادبی دنیا کی سیر کرتے رہے۔ ریل میں جو خواب انھوں نے دیکھا وہ سرگودھا میں ساقی فاروقی کی آمد سے متعلق تھا۔ اس خواب میں ساقی فاروقی نے راغب شکیب سے جو گفتگو کی، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ساقی فاروقی لوگوں کو ڈرانے کے لیے ان کے خوابوں میں بھی آ جاتے ہیں۔ اس خواب کی تفصیل پڑھ کر خیال آتا ہے کہ کہیں پورا سفرنامہ ہی تو خواب میں نہیں لکھا گیا۔ لیکن ایسا نہیں ہے، اس کے کچھ حصے راغب صاحب نے عالم بیداری میں بھی لکھے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس سفرنامے کو پڑھتے دوران قاری کو نیند آ جاتی ہے۔

راغب صاحب نے سفرنامہ لکھنے کے لیے کراچی کا سفر چھ سات سال پہلے کیا تھا۔ یہ بات ...سا لکھی ہے ورنہ پورے سفرنامے میں راغب صاحب نے کہیں نہیں بتایا کہ یہ سفر انھوں نے کب کیا تھا۔ یہاں تک کہ یہ بھی نہیں بتایا کہ یہ واقعہ زمانہ قبل مسیح کا ہے یا بعد کا۔ ہمارے قیاس کی بنیاد اس پر ہے کہ اس سفرنامے میں بعض ایسے ادیبوں کا ذکر ہے جو راغب صاحب کی فتح کراچی کی مہم کے وقت زندہ تھے اور اب انتقال فرما چکے ہیں۔ قطع نظر اس سے کہ ان کے انتقال کا سبب کیا تھا۔ یہ بات خاصی دلچسپ ہے کہ راغب شکیب نے مرنے والوں کی موت پر غم

سے زیادہ، اس بات پر خوشی کا اظہار کیا ہے کہ مرحومین سے ان کی ملاقات ہوگئی۔ اگر وہ کچھ عرصہ
پہلے انتقال کر جاتے تو راغب صاحب اُن سے ملاقات کی خوشی حاصل نہ کر سکتے تھے۔ ہمیں
راغب صاحب سے دلی ہمدردی ہے کہ بہت سے ادیب، ان سے ملاقات کے بعد، اب تک زندہ
ہیں۔ ورنہ ان کے سفرنامے میں خوشی کا اظہار زیادہ بڑے پیمانے پر ہوسکتا تھا۔

کراچی تشریف لانے کے بعد راغب صاحب جن ادیبوں سے ملے، ان میں سے بیشتر
ایسے ہیں کہ ان کے نام ہم نے پہلی اور آخری مرتبہ اسی سفرنامے میں دیکھے ہیں۔ ایک ہم ہی کیا،
کراچی کے بہت سے لوگوں کے لیے یہ نام نئے ہوں گے۔ لیکن اپنی اپنی پسند اور اپنی اپنی نظر کی
بات ہے۔ اگر موصوف نے مجنوں گورکھپوری، ابوالفضل صدیقی (جو اس وقت زندہ تھے)، ڈاکٹر
اختر حسین رائپوری، پروفیسر احمد علی، پروفیسر ممتاز حسین اور شان الحق حقی جیسے بہت سے اکابر سے
ملاقات نہیں کی تو اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ انھوں نے عمداً ایسا کیا ہوگا۔ ممکن ہے راغب
صاحب نے ان بڑے ادیبوں کے نام ہی نہ سنے ہوں۔ یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ راغب صاحب کا
سفرنامہ اُن کی واقفیت ہی کا نہیں، عدم واقفیت کا بھی آئینہ دار ہے۔

راغب صاحب کی ایک خوبی کی داد دینی پڑتی ہے کہ کراچی میں ان کے سامنے ادیبوں نے
ایک دوسرے کے خلاف جو کچھ کہا، وہ انھوں نے درج گزٹ کر دیا۔ سفرنامے کے تقریباً ہر صفحے پر
کسی نہ کسی ادیب کے بارے میں ایسی باتیں لکھی ہیں، جو اس ادیب ہی کے نہیں شائستگی کے بھی
خلاف ہیں۔ محترم احمد ندیم قاسمی اور اُن کے حلقے کے ادیبوں کے خلاف تو اس کثرت سے لکھا
ہے کہ پڑھنے والا پریشان ہو جاتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ دبستان سرگودھا کے وابستگان کا یہ ادبی و قومی
فرض ہے کہ وہ جوابی کارروائی کے طور پر نہ سہی، از راہ تفنن طبع، دبستان فنون کے اراکین کے
خلاف لکھیں، لیکن اتنا زیادہ نہ لکھیں کہ دبستان فنون کے اراکین کے ساتھ پڑھنے والوں کو ہمدردی
پیدا ہو جائے۔ لہٰذا ہماری دلی ہمدردیاں ڈاکٹر سلیم اختر اور عطاء الحق قاسمی وغیرہ کے ساتھ ہیں۔
اس کے ساتھ ہی سفرنامے میں کچھ لوگوں مثلاً ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر انور سدید اور مشفق خواجہ کی
تعریف بھی جگہ جگہ کی گئی ہے۔ ہماری دلی ہمدردیاں ان تینوں کے ساتھ بھی ہیں کہ راغب صاحب
کی حد سے بڑھی ہوئی تعریف ان کے ممدوحین کے حق میں مضر ثابت ہوسکتی ہے۔

(۲۰/ اکتوبر ۱۹۸۸ء)

مسٹر دہلوی نیکی دریا میں ڈالنے کی بجائے مطبع میں بھیج دیتے ہیں

ابھی مشکل سے ایک مہینہ بھی نہیں گزرا ہوگا کہ ایک روز مسٹر دہلوی کا فون آیا کہ ایک نئی
کتاب شائع ہو رہی ہے، اس کے لیے ہم چند سطریں لکھ دیں۔ ہم نے ہنس کر کہا، جہاں آپ نے
اپنے لیے پوری کتاب لکھی ہے، چند سطریں ہماری طرف سے بھی لکھ لیجیے۔ فرمایا، یہ کیسے ہوسکتا
ہے، آپ کی رائے چاہیے جو آپ ہی دے سکتے ہیں۔ عرض کیا، ہم میں آپ میں اختلاف رائے تو
نہیں، ہماری طرف سے آپ جو کچھ لکھیں گے، وہ ہماری رائے کے عین مطابق ہوگا۔ کہنے لگے،
اس پر کیا بحث کی جائے، آمنے سامنے بیٹھ کر بات ہوگی، مسودہ بھی آپ کو دکھا دیا جائے گا۔
لیکن وہ خود تو نہیں آئے، اُن کی خبر آگئی...... ۱۱/ اکتوبر کے اخباروں سے معلوم ہوا کہ اب وہ
ہمارے درمیان نہیں رہے۔ یہ خبر ایسی اچانک تھی کہ یقین نہ آیا۔ لیکن ہمارے یقین نہ کرنے سے
کیا ہوتا ہے۔ جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا تھا۔

مشتاق احمد چاندنا عرف مسٹر دہلوی مزاحیہ شاعر کی حیثیت سے مشہور تھے۔ لیکن حقیقت یہ
ہے کہ انھیں صرف مزاحیہ شاعر سمجھنا ان کے مقام و مرتبہ سے ناانصافی ہے۔ انھوں نے نہایت اہم
اور سنجیدہ موضوعات پر شاعری کی ہے۔ وہ ہنسی ہنسی میں بہت سی کام کی باتیں کہہ جاتے تھے۔
معاشرتی زندگی کی ناہمواریاں ہوں یا سیاسی زندگی کے تضادات، ادبی دنیا کی بے حسی ہو یا صحافتی
بے راہ روی، ان سب خرابیوں پر ان کی گہری نظر تھی۔ وہ اسی صورت حال کے نوحہ گر تھے۔
یہ نوحہ گری طنز و مزاح کے پیرائے میں تھی تاکہ ان کے خیالات دوسروں تک بآسانی پہنچ جائیں۔
یہ نوحہ گر ایسا تھا کہ رونے رُلانے سے پہلے ہنستا ہنساتا تھا!

مسٹر دہلوی صرف دوسروں پر ہی وار نہیں کرتے تھے، اگر ان کے طنزیہ تیروں کا ہدف خود
اپنی ذات ہوتی تھی تو بھی وہ کسی قسم کی مروّت سے کام نہیں لیتے تھے۔ یہی نہیں، وہ اپنے

کشادہ دل تھے کہ اپنے اوپر ہر طرح کی تنقید نہ صرف برداشت کر لیتے تھے بلکہ لکھنے والے کو داد بھی دیتے تھے۔ ورنہ اب تو یہ عالم ہے کہ ہمارے ادیبوں کی سماعت پر تعریف کے سوا دوسری ہر بات گراں گزرتی ہے۔ ہم نے کئی مرتبہ اپنے کالموں میں ان کے بارے میں سخن گستری بھی کی اور حاشیہ سازی بھی، لیکن اُن کی پیشانی پر بھی کوئی شکن نہ آئی۔ جس محبت سے پہلے دن ملے تھے، اسی محبت سے وہ آخر تک ملتے رہے۔

مرحوم کی نثری تصانیف علمی و ادبی اعتبار سے خاصی بلند پایہ ہیں۔ بہت سے ادبی اور سماجی مسائل پر انھوں نے فکر انگیز مقالات لکھے ہیں۔ پاکستان کے معاشی مسائل پر تو ایک مستقل تصنیف ''مکالماتِ سقراط'' ماہرینِ معاشیات سے بھی داد حاصل کر چکی ہے۔ چار سال پہلے جب یہ کتاب شائع ہوئی تھی تو ہم نے اس پر ایک کالم لکھا تھا۔ چونکہ اس کالم میں مرحوم کی بعض خوبیوں کا بھی ذکر ہے، اس لیے اس کے کچھ اقتباسات ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں۔

مسٹر دہلوی بڑے وضع دار آدمی ہیں۔ ان کی وضعداری کا ایک ثبوت تو یہ ہے کہ ۳۰، ۴۰ سال پہلے لکھنے کا جو شوق پیدا ہوا تھا، اسے اب تک نبھائے چلے جا رہے ہیں۔ نثر بھی لکھتے ہیں اور شعر بھی کہتے ہیں۔ ہمیں ان کی مزاحیہ شاعری بے حد پسند ہے۔ ہمیں ہی نہیں اکبر الٰہ آبادی کو بھی بہت پسند ہے۔ ''کلیاتِ اکبر'' اٹھا کر دیکھ لیجیے، جگہ جگہ مسٹر دہلوی کے رنگ میں شعر ملیں گے۔ مسٹر دہلوی کا پیشہ تجارت ہے اور وہ خاصے خوش حال ہیں۔ اگر وہ چاہتے تو شاعری سے بہتر کوئی مشغلہ بھی اختیار کر سکتے تھے، لیکن انھیں اپنی بہتری کا نہیں، ہمیشہ دوسروں کی بہتری کا خیال رہتا ہے۔ دوسروں کی بہتری سے مراد دوسروں کی اصلاح۔ مسٹر دہلوی جو کچھ لکھتے ہیں اصلاحی نقطۂ نظر سے لکھتے ہیں۔ اس لیے ہم ان کے لکھنے کے شوق کو ان کی نیکی سمجھتے ہیں۔ عام لوگ ''نیکی کر دریا میں ڈال'' پر عمل کرتے ہیں۔ مسٹر دہلوی دریا میں ڈالنے کی بجائے مطبع میں بھیج دیتے ہیں جہاں سے وہ کتابی صورت میں منظرِ عام پر آتی ہے۔

مسٹر دہلوی کی وضعداری کا دوسرا ثبوت یہ ہے کہ وہ ہر چوتھے یا پانچویں سال ایک کتاب ضرور لکھتے ہیں...... کتاب لکھنا کوئی مشکل کام نہیں کہ یہ کام تو لاغر مراد آبادی اور انجم اعظمی بھی کر لیتے ہیں۔ مسٹر دہلوی کا کارنامہ یہ ہے کہ ان کی ہر کتاب فنِ طباعت کا شاہکار ہوتی ہے۔ وہ کتاب کی تصنیف سے زیادہ کتاب کی ظاہری شان و شوکت پر توجہ دینے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ اس

سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ ان کی کتاب ادب کی تاریخ کے ساتھ ساتھ طباعت کی تاریخ میں بھی سنگِ میل ثابت ہوتی ہے۔

مسٹر دہلوی کی تازہ کتاب، جس کا نام آپ کو ابھی کچھ دیر بعد معلوم ہوگا، طباعت کے اعتبار سے بے مثال ہے، جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے، یہ نوری نستعلیق میں چھپنے والی پہلی کتاب ہے۔ یہ اتنی دیدہ زیب ہے کہ نوری نستعلیق کے حُسن کا بھرپور اندازہ پہلی مرتبہ اس سے ہوتا ہے...... اگر کبھی نوری نستعلیق کی تاریخ لکھی گئی تو اس کتاب کو بطور حوالہ پیش کیا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ کسی کتاب کا حوالہ بن جانا کوئی معمولی بات نہیں۔

مسٹر دہلوی کی وضعداری کا تیسرا ثبوت یہ ہے کہ وہ جب کوئی کتاب لکھتے ہیں تو اس کے ساتھ دو تین درجن افراد میں بھی لکھنے لکھانے کا شوق پیدا کر دیتے ہیں۔ ان کی ہر کتاب پر متعدد دیباچے ہوتے ہیں جن میں ایک ہی بات کو مختلف انداز سے ذہن نشین کرایا جاتا ہے اور کبھی تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ قاری ان دیباچوں کو پڑھ کر اتنا علم حاصل کر لیتا ہے کہ اصل کتاب پڑھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

یہ ساری تمہید اس لیے لکھی گئی ہے کہ مسٹر دہلوی کی تازہ ترین کتاب ''مکالماتِ سقراط'' اس وقت ہمارے سامنے ہے۔ کتاب کے نام سے ہم یہ سمجھے کہ مصنف نے سقراط کی زبان و بیان کی غلطیاں نکالی ہوں گی، کیونکہ اس سے پہلے موصوف جوش صاحب کی زبان کی غلطیاں نکال چکے ہیں۔ لیکن پھر خیال آیا کہ سقراط نے تو کوئی کتاب ہی نہیں لکھی تھی۔ اس لیے مسٹر دہلوی نے سقراط کی زبان و بیان کی نہیں، خیالات و نظریات کی غلطیوں کی تفصیل پیش کی ہوگی۔ دوسروں کے خیالات و نظریات پر تنقید کرنے میں یہ آسانی ہے کہ نقاد کو زیادہ محنت نہیں کرنی پڑتی۔ دوسروں کا ہر خیال اور ہر نظریہ خود بخود غلط ثابت ہوتا چلا جاتا ہے۔ لیکن جب ہم نے زیرِ نظر کتاب کا مطالعہ کیا تو معاملہ بالکل مختلف نظر آیا۔ سقراط سے مراد وہ مشہور فلسفی نہیں جسے زہر کا پیالہ پینا پڑا تھا، بلکہ وہ شخص ہیں جن کا گزارا چائے کی پیالی اور نہاری پر ہے۔ یعنی مسٹر دہلوی خود سقراط کے روپ میں جلوہ گر ہوئے ہیں۔ بقول خود، وہ اپنے حلقۂ احباب میں سقراط کے نام سے پہچانے جاتے ہیں۔ سقراط کو سزا کے طور پر زہر کا پیالہ پینا پڑا تھا۔ اگر آج وہ زندہ ہوتا تو اپنی خوشی سے زہر کا پیالہ پی لیتا تاکہ اس کے نام کے دو افراد کی موجودگی غلط فہمیوں کا سبب نہ بنتی۔

مسٹر دہلوی نے اپنے اور سقراط کے درمیان جو مماثلتیں بیان کی ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ بہت زیادہ بولنا دونوں کی عادت ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ دونوں میں لکھنے کے سلسلے میں مماثلت نہیں پائی جاتی، ورنہ ہمیں اصلی سقراط کی بھی بہت سی کتابیں پڑھنی پڑتیں۔

سقراط پر ہمیں رشک آتا ہے کہ اس نے ایک کتاب بھی نہیں لکھی، لیکن اس کا شمار دنیا کے بڑے مفکروں میں ہوتا ہے۔ دوسری طرف ہمارے بعض ادیب ہیں جو نہایت غور و فکر کے بعد درجنوں کتابیں تصنیف کرتے ہیں اور ان کا شمار مفکروں میں تو کیا جلد سازوں میں بھی نہیں ہوتا۔

"مکالماتِ سقراط" کا موضوع معاشیات ہے۔ کئی دن تک ہم فیصلہ نہ کر سکے کہ اس کتاب کو پڑھنا چاہیے یا نہیں۔ تامل کی وجہ یہ تھی کہ مسٹر دہلوی شاعر ہیں اور شعرا ہر موضوع کے ساتھ وہی سلوک کرتے ہیں جو اب تک ان کے روایتی محبوب کے ساتھ ہوتا چلا آیا ہے۔ ایک دن ہم کتاب کی طباعت سے محظوظ ہو رہے تھے کہ نظر اس عبارت پر پڑی:

"جہاں تک معاشیات سے متعلق ہمارے علم کا سوال ہے تو ہمیں بخوبی علم ہے کہ ہم کتنے پانی میں ہیں۔ بے شک ہم تاجر برادری کے فرد ہیں لیکن کیماڑی کے پل پر بیٹھ کر سمندری مچھلیوں کا شکار کھیلنے والے کو وھیل مچھلی کے شکار کی باریکیوں کا جتنا علم ہو سکتا ہے، اتنا ہی علم ہمیں بھی معاشیات کا ہے۔"

ہم نے سوچا کہ جو شخص اتنی دیانتداری سے اپنے علم کا اعتراف کر رہا ہے، اس کی کتاب ضرور پڑھنی چاہیے تاکہ اس کے بیان پر مہر تصدیق ثبت کی جا سکے۔ کتاب پڑھی تو نتیجہ یہ نکلا کہ ہم باوجود کوشش کے مسٹر دہلوی کی اس رائے سے متفق نہ ہو سکے کہ "ان کا معاشیات کا علم واجبی سا ہے۔" ہمیں یہ کتاب پڑھ کر حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی۔ حیرت اس پر کہ مسٹر دہلوی نے خلافِ توقع ایک فکر انگیز کتاب لکھ ڈالی، اور خوشی اس پر کہ اب فکر انگیز کتابیں لکھنا بھی ان کے لیے مشکل کام نہیں رہا۔

مسٹر دہلوی کی یہ کتاب انتہائی خشک موضوع پر ہے لیکن اندازِ بیان اتنا دلچسپ ہے کہ موضوع کی خشکی سے پڑھنے والے کا جی نہیں گھبراتا۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ موضوع کی خشکی دور دور تک نظر نہیں آتی۔ جناب سقراط کے دلچسپ مکالمے معاشی مسائل کو حل کرتے چلے جاتے ہیں۔ کہیں کہیں ان مکالموں میں اشفاق احمد کی "توتا کہانی" کے مکالموں کا انداز بھی آگیا ہے۔ [illegible]

[illegible] اہلِ فہم نہیں ہوتے۔

یہ کتاب معاشی مسائل سے متعلق معلومات کا خزینہ ہے۔ مسٹر دہلوی نے دریا کو کوزے میں بند کیا ہے۔ ہمارے ملک کے معاشی مسائل پر ان کی نظر بہت گہری ہے اور انھوں نے نہایت عمدگی سے ہمارے معاشی وسائل اور ان کی منصوبہ بندی کے تضاد کو ظاہر کیا ہے۔ نیز افراطِ زر اور بیرونی قرضوں کی صورت میں نازل ہونے والی مصیبتوں کے اسباب و نتائج پر روشنی ڈالی ہے۔ انھوں نے ان طریقوں پر بھی بحث کی ہے جن پر عمل کر کے ہم ملکی پیداوار کو بڑھا سکتے ہیں اور اخراجات کو گھٹا کے معاشی استحکام حاصل کر سکتے ہیں۔

مسٹر دہلوی کا کمال ہے کہ انھوں نے زبان و بیان کی شگفتگی کا ایسا جادو جگایا ہے کہ معمولی ذہانت کا آدمی بھی اس کتاب کو پڑھ کر معاشی مسائل سے آگاہ ہو جاتا ہے۔ ہماری ہی مثال لیجیے۔ اس کتاب کے مطالعے سے پہلے ملکی معاشیات کے بارے میں ہماری معلومات نہ ہونے کے برابر تھیں، لیکن اب ہم بہت کچھ جاننے کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔ اس مسائل پر جو شخص چاہے ہم سے گفتگو کر سکتا ہے۔ یہاں تک کہ ہم مسٹر دہلوی سے بھی گفتگو کے لیے تیار ہیں کہ ان کا سارا علم اب ہمارے پاس ہے۔ اگر وہ سقراط ہیں تو ان کی کتاب پڑھ کر ہم بھی بقراط بن چکے ہیں۔

اس کتاب پر پندرہ اہلِ علم کے دیباچے ہیں۔ سولھواں خود مصنف نے لکھا ہے۔ ہمارا یہ مقالہ اس کتاب کے بارے میں سترھویں تحریر ہے۔ لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے اس کتاب کو کم از کم سترہ آدمیوں نے ضرور پڑھا ہے۔ اردو کی اگر کسی کتاب کو اتنے قاری بھی مل جائیں تو سمجھنا چاہیے کہ اس کا شائع ہونا بیکار نہیں گیا۔ لیکن ہماری خواہش ہے کہ اس کتاب کو زیادہ سے زیادہ مقبولیت حاصل ہو اور ہر وہ شخص اس کا مطالعہ کرے جسے ملک کے معاشی مسائل سے دلچسپی ہے۔

امید ہے مسٹر دہلوی آئندہ بھی اس قسم کی کتابیں لکھتے رہیں گے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ مزاحیہ شاعری ترک کر دیں۔ یہ کام بھی انھیں کرتے رہنا چاہیے کہ ان کی مزاحیہ شاعری ان کی نظموں سے بہتر ہوتی ہے۔

(۲۷/اکتوبر ۱۹۸۸ء)

ادبی اثاث البیت کی چوری

ہم تو سمجھتے تھے کہ پاکستان ہی میں تحقیق کا حال پتلا ہے کیونکہ بعض ''محقق'' غلط بھی
لگا کر ان بلندیوں تک پہنچ جاتے ہیں جہاں سے انھیں حافظ محمود شیرانی اور قاضی عبدالودود بھی
نظر آتے ہیں۔ لیکن ہندوستان میں صورتِ حال پاکستان سے بھی زیادہ تشویش ناک ہے۔ کچھ
عرصہ پہلے سنا تھا کہ داغ دہلوی پر ایک صاحب نے ''تحقیق'' کر کے پی ایچ ڈی کی
جب ان کا مقالہ چھپا تو معلوم ہوا کہ یہ امیر مینائی پر ڈاکٹر ابو محمد سحر کے مقالے کا چربا ہے۔
نے جہاں جہاں امیر مینائی کے شعر لکھے تھے، مقالہ نگار نے وہاں داغ کے شعر لکھ دیے
ہوا کہ اصغر گونڈوی پر ایک محترمہ نے پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھا اور اس میں دوسروں کے چراغ
چراغ جلانے کے بجائے دوسروں کے چراغ کو اپنا چراغ بنا لیا۔ اب یہ اطلاع ملی ہے
تہمینہ اختر نے علی عباس حسینی پر جو تحقیقی مقالہ لکھا ہے، اس میں مظہر امام کے ایک مقالے
داخل دفتر کر لیا گیا ہے۔ ہفتہ وار ''کوہسار'' بھاگل پور کے ایڈیٹر مناظر عاشق ہرگانوی
تہمینہ اختر اور مظہر امام کی تحریروں کے اقتباسات ایک دوسرے کے بالمقابل شائع کر کے
کیا ہے کہ مظہر امام کے ساتھ بڑا ظلم ہوا ہے۔ ان کا ادبی اثاث البیت چوری ہو گیا ہے۔

ہمیں مظہر امام سے دلی ہمدردی ہے کہ انھوں نے نثر میں جو ایک آدھ چیز
تھی، وہ بھی چوری ہو گئی۔ مظہر امام کے ساتھ یہ پہلا ادبی سانحہ نہیں ہے۔ اس سے قبل بھی
گزر چکی ہے کہ انھوں نے بڑی مشکلوں سے آزاد غزل ایجاد کی اور بڑی محنت
ہر دلعزیز بنایا۔ لیکن یار لوگ اس ایجاد کا سہرا اپنے سر باندھنے پر مصر ہو گئے۔ بہر حال مظہر
غالب کی طرح رہزن کو دعائیں دینی چاہئیں کہ ان کے پاس جو کچھ تھا، وہ چوری ہو گیا
حفاظت کے خیال سے جاگنے کی ضرورت نہیں رہی۔ اب وہ آرام سے پاؤں پھیلا کر
اس معاملے کا ایک اور پہلو بھی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ مظہر امام نے ڈاکٹر تہمینہ اختر کی

اڑا کر صاف کیا ہو۔ بظاہر اس کا امکان نظر نہیں آتا کیونکہ مظہر امام کا مضمون پہلے چھپا تھا اور تہمینہ اختر
کا مقالہ بعد میں۔ لیکن مظہر امام جیسے نکتہ سنج اور ذہین ادیب سے یہ بعید نہیں ہے کہ روزِ ازل جب
ادیبوں میں مضامین تقسیم ہو رہے ہوں تو انھوں نے ڈاکٹر تہمینہ اختر کے مقالے کو اڑا لیا ہو۔ غالب
کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی واقعہ پیش آیا تھا۔

غالب کے ہاں بہت سے ایسے شعر ملتے ہیں جن کے مضامین پرانے شاعروں کے ہاں
موجود ہیں۔ اس وجہ سے غالب پر سرقے اور توارد کا الزام لگایا گیا۔ غالب نے اپنی صفائی میں
ایک قطعہ فارسی زبان میں لکھا۔ اس فارسی قطعے کو ہم کیا نقل کریں کہ ہمارا کالم سلطان جمیل نسیم، منظر
علی خان منظر اور راغب شکیب جیسے مشہور ادیب بھی پڑھتے ہیں لہٰذا اس قطعے کا آزاد اردو خلاصہ
پیش کیا جا سکتا ہے۔

> ''میرے شعروں میں ہزاروں بلند معنی پائے جاتے ہیں جو اہلِ ذوق کو پسند ہیں
> اور جو مٹھاس میں شہد سے بڑھ کر ہیں۔ اگر پرانے شاعروں کے ہاں کوئی ایسا
> مضمون مل جائے جو میرے کسی شعر میں موجود ہو تو یہ نہ سمجھو کہ اس سے میری غزل
> کا حسن زائل ہو گیا۔ اگر ایسا ہو تو یہ میرے لیے شرم کی بات ہے۔ لیکن پرانے
> شاعروں کے لیے یہ فخر کا مقام ہے کہ وہ اپنی فکرِ رسا کی کوشش سے اس بلندی تک
> پہنچ گئے جہاں تک میری رسائی ہے۔ مجھ پر توارد کا گمان نہ کرو بلکہ یقین کرو کہ
> ازل کے روز جب مضامین تقسیم ہو رہے تھے، چور میرا مال چرا کر لے گیا۔''

گویا غالب نے جن پرانے شاعروں کے مضامین اڑائے تھے، الٹا انھیں بیچاروں کو چور بنا
دیا۔ مگر بات یہیں ختم نہیں ہوتی۔ ڈاکٹر عندلیب شادانی کی تحقیق یہ ہے کہ غالب نے مذکورہ قطعے کا
مضمون بھی چوری کیا ہے۔ نویں صدی ہجری کے مشہور ایرانی ادیب ملا حسین واعظ کاشفی نے اپنی
کتاب ''لطائف الطوائف'' میں یہ واقعہ بیان کیا ہے کہ ایک شاعر نے ہرات کے بادشاہ کی شان
میں قصیدہ پڑھا۔ قصیدے کا ایک شعر مشہور شاعر خاقانی کے ایک شعر کا سرقہ تھا۔ بادشاہ نے شاعر
سے کہا ''یہ مضمون تو خاقانی باندھ چکا ہے۔'' شاعر نے جواب دیا، ''خاقانی نے میرا مضمون چرا لیا۔''
بادشاہ نے پوچھا، ''وہ کیسے؟ خاقانی تو آپ سے پہلے کا شاعر ہے۔'' شاعر نے کہا، ''ازل
میں خدا نے جو مضامین شعر میرے لیے مخصوص کیے تھے انھیں خاقانی نے چرا لیا اور اپنے نام

سے منسوب کر دیا۔"

ہمیں خطرہ ہے کہ کوئی دوسرا ڈاکٹر عندلیب شادانی یہ ثابت نہ کر دے کہ ڈاکٹر تہمینہ اختر اور مظہر امام دونوں نے کسی تیسرے سے سرقہ اٹھایا ہے۔

ڈاکٹر تہمینہ اختر کے ممتحنوں میں پروفیسر آل احمد سرور بھی شامل تھے۔ ایڈیٹر "..." نے جب انھیں صورت حال سے مطلع کیا تو جواب میں انھوں نے فرمایا:

"میں نے ڈگری کی سفارش ضرور کر دی تھی مگر شرط یہ لگائی تھی کہ جب تک بعض ضروری اصلاحات نہ کی جائیں مقالہ شائع نہ ہو..... آپ نے لکھا ہے کہ یہ کتاب پوری کی پوری سرقہ ہے۔ یہ بات میرے علم میں نہ تھی۔ ویسے بھی یہ آسان کام نہیں ہے کہ مطبوعہ مضامین کی ورق گردانی کر کے یہ اندازہ لگایا جائے کہ ان سے استفادہ ہوا ہے یا نہیں۔"

سرور صاحب نے بجا فرمایا کہ ممتحن کا کام یہ نہیں ہے کہ وہ یہ دیکھے کہ مقالہ سرقہ ہے یا نہیں۔ وہ تو صرف یہ دیکھتا ہے کہ جو کچھ لکھا گیا ہے وہ درست ہے یا غلط۔ سونا بازار سے خریدا جائے یا چوری کیا جائے، وہ ہر حال میں سونا ہی رہتا ہے۔

ہندوستان میں تحقیق کی زبوں حالی کا اندازہ شمس الرحمٰن فاروقی کے ایک مضمون سے ہوتا ہے جو انھوں نے ماہنامہ "کتاب نما" دہلی کے تازہ شمارے میں لکھا ہے۔ اس میں انھوں نے یہ واقعہ بیان کیا ہے:

"ایک صدر شعبہ نے مجھ سے بیان کیا کہ ایک طالب علم ان کے پاس پی ایچ ڈی میں داخلے کا فارم منظوری کے لیے لایا۔ موضوع تھا، "قمر رئیس"۔ استاد نے پوچھا، بھائی تم قمر رئیس کے کس پہلو پر کام کرو گے۔ طالب علم نے کچھ سوچ کر کہا، "قمر رئیس بہ حیثیت شاعر"۔ کیسا موضوع رہے گا؟ صدر شعبہ کا بیان ہے کہ میں نے فوراً منظوری دے دی۔ کیا کرتا پی ایچ ڈی کی ڈگری نوکری کے لیے ضروری ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ مقالہ کسی قابلِ ذکر موضوع پر ہو اور اس میں قابلِ مطالعہ باتیں لکھی جائیں۔"

قطع نظر اس سے کہ شمس الرحمٰن فاروقی دراصل یہ بتانا چاہتے ہیں کہ قمر رئیس کیا اور

شاعری کیا، لیکن ضمنی طور پر انھوں نے یہ بھی بتا دیا ہے تحقیق بیروزگاروں کا مشغلہ ہے۔

پی ایچ ڈی کے مقالے کس طرح لکھے یا لکھوائے جاتے ہیں، اس کی تفصیل ہندوستان کے مشہور مزاحیہ شاعر رضا واہی نقوی نے اپنی ایک نظم میں پیش کی ہے جو ماہنامہ "شگوفہ" حیدر آباد دکن کے تازہ شمارے میں شائع ہوئی ہے۔ یہ نظم آپ بھی ملاحظہ فرمائیے:

پیش رفت اُردو ادب کی تیز کرنے کے لیے
خشک ہوتے کھیت کو زرخیز کرنے کے لیے
جامعہ کے چند استادوں کو سوجھی دور کی
من چلوں میں کھول ڈالی ایک نئی انڈسٹری
اس نئی انڈسٹری میں تھیسس ڈھلنے لگیں
اور ریسرچ اسکالروں کی گاڑیاں چلنے لگیں
ایسے ایم اے پاس لڑکوں کی بھی قسمت کھل گئی
اہلیت جن کی کلرکوں کے برابر بھی نہ تھی
ان کو نقلی ڈاکٹر بننا سکھانے کے لیے
خود مقالے لکھ کے پی ایچ ڈی بنانے کے لیے
فیس استادوں نے رکھی فی مقالہ دس ہزار
فیس سے سودا پٹ گیا، بیڑا ہوا جھٹ اس کا پار
دے کے پیسے ختم ہو جاتا ہے شاگردوں کا کام
حضرت استاد کرتے ہیں بقیہ انتظام
اکسٹرنل ممتحن کے پاس جب تھیسس گئی
پیروی جا جا کے خود گائڈ نے اس کے گھر پہ کی
وائی وا کے واسطے آیا جونہی اگزامنر
ہوٹلوں میں اس کو کھلوایا گیا لنچ اور ڈنر
ہو کے ممنون کرم اس کو وہی کرنا پڑا
حضرت استاد نے جو کچھ اشاروں میں کہا

جامعہ سے دوسرے ہی روز ڈگری مل گئی
کیکلس کی شاخ میں گویا کلی سی کھل گئی

نسل کیوں بیچے کوئی پڑھ لکھ کے اردو فارسی
مل ہی جائے گی کسی کالج میں اس کو نوکری

اس مقالہ ساز صنعت سے ہے دہرا فائدہ
ایک کو اجرت ملی اور ایک روزی سے لگا

نسل نو کو درس کیا دیں گے یہ نقلی ڈاکٹر
کس کو فرصت ہے جو اس نکتے پہ ڈالے اک نظر

کس نے تحقیقی مقالہ لکھا کس کے نام سے
کون دلی جا کے پوچھے گا یہ مالک رام سے

(۱۰ نومبر ۱۹۸۸ء)

انصاف پسندی ظاہر ہے اور سخن فہمی مشکوک

ہمارے عام ادیبوں کا کاروبار طبع کی روانی پر چلتا ہے کہ کبھی کبھار کچھ لکھ لیا اور پھر ایک طویل مدت اس کے محاسن بیان کرنے میں گزار دی۔ لیکن ڈاکٹر انور سدید کو خدا نے طبع کی روانی کے ساتھ ساتھ قلم کی روانی بھی عطا کی ہے۔ وہ اتنی آسانی اور ایسی فراوانی سے لکھتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ اگر ان کے اخباری کالموں ہی کو سامنے رکھا جائے جو ایک درجن سے زیادہ فرضی ناموں سے شائع ہوتے ہیں، تو ان میں استعمال ہونے والے کاغذ سے دبستان سرگودھا کے تمام دوستوں، بہی خواہوں اور نوحہ گروں کے لیے کاغذی پیرہن تیار کرائے جا سکتے ہیں۔ چونکہ ڈاکٹر انور سدید کے بیشتر کالم دبستانِ فنون کے خلاف ہوتے ہیں، اس لیے کاغذی پیرہن کے استعمال کا فائدہ ہوگا کہ اس دبستان کے خلاف مہم زور شور سے چلائی جا سکے گی۔ کاغذی پیرہن والے جب سڑکوں پر سے گزریں گے تو دیکھنے والوں کو ایک نظر میں معلوم ہو جائے گا کہ دبستانِ فنون کے جرائم کی فہرست کیا ہے۔

مگر یہ تو مذاق کی باتیں تھیں، سنجیدہ بات یہ ہے کہ "افکار" کے تازہ شمارے میں ڈاکٹر انور سدید کا ایک خط شائع ہوا ہے جس میں وہ فرماتے ہیں:

"میں ۴ دسمبر ۱۹۸۸ء کو اپنی زندگی کے ساٹھ سال پورے کر لوں گا اور ملازمت سے ریٹائر ہو جاؤں گا۔ ملازمت میں توسیع کے امکانات موجود ہیں لیکن میں ان سے استفادہ نہیں کر رہا۔ ایک غیر سرکاری ادارے میں موجودہ مشاہرے پر شرکت کی دعوت ملی ہے لیکن میں نے اسے قبول نہیں کیا۔ اب ارادہ ہے کہ اگر زندگی تھوڑی سی مہلت دے تو کچھ کتابیں پڑھ لوں اور کوئی کتاب میرے ساتھ گفتگو کرنے لگے تو اس بات چیت کو لکھتا جاؤں...... میں پورے اطمینان قلب سے ایک نئی اور آزاد زندگی کی ابتدا کر رہا ہوں۔"

ہم ڈاکٹر صاحب کو ان کی ساٹھویں سالگرہ پر پیشگی مبارکباد دیتے ہوئے عرض کریں گے کہ وہ صد و بیس سال سلامت رہیں اور خوب جی بھر کے کتابیں پڑھتے رہیں اور ان سے جو باتیں ہوں قلمبند کریں۔ ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد عموماً باتیں کرنے کے لیے آدمی نہیں ملتے، اس لیے کتابوں سے باتیں کرنے کا مشغلہ نہایت مناسب رہے گا۔ اس کا ایک ضمنی فائدہ یہ بھی ہے کہ کتابیں غلط باتیں سن کر خاموش رہتی ہیں، کوئی جواب نہیں دیتیں۔

ہم نے ڈاکٹر صاحب کو درازیٔ عمر کی جو دعا دی ہے، اس پر ایک واقعہ یاد آ گیا جو بلا تبصرہ عرض ہے:

"ایک مرتبہ مہاتما گاندھی نے اعلان کیا کہ وہ ۱۲۵ برس تک زندہ رہیں گے۔ اس پر بابائے اردو مولوی عبدالحق نے انھیں ایک خط میں لکھا کہ میری بھی دعا یہی ہے کہ آپ ۱۲۵ برس تک زندہ رہیں تاکہ آپ نے اب تک جو غلطیاں کی ہیں، ان کی تلافی کے لیے مناسب وقت مل سکے۔"

یہ واقعہ سنانے سے خدانخواستہ ہمارا مطلب یہ نہیں ہے کہ ڈاکٹر انور سدید اب تک غلطیاں ہی کرتے رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اب تک انھوں نے ایسے بڑے بڑے ادبی کام انجام دیے ہیں جن کو اردو ادب کا مورخ (بشرطیکہ وہ ڈاکٹر سلیم اختر نہ ہو) کبھی فراموش نہیں کر سکے گا اور اب تو خود ڈاکٹر صاحب نے اردو ادب کی تاریخ لکھ دی ہے جو عنقریب شائع ہونے والی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اس زیر طبع تاریخ ادب میں ڈاکٹر صاحب کی خدمات کا ذکر سنہرے لفظوں میں ہوگا اور ڈاکٹر سلیم اختر کو اس کے کسی حاشیے میں بھی جگہ نہیں دی جائے گی، حالانکہ سلیم اختر صاحب اس کے مستحق ہیں کہ ان کا ذکر کم از کم غلط نامے میں ضرور ہو۔

ڈاکٹر سلیم اختر کے ذکر پر یاد آیا کہ حال ہی میں اقبال اکیڈمی نے ڈاکٹر انور سدید کی کتاب "اقبال کے کلاسیکی نقوش" کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا ہے۔ اس کے فلیپ پر ڈاکٹر سلیم اختر کی رائے درج ہے جس میں نہایت مبالغے کے ساتھ کتاب اور صاحبِ کتاب کی تعریف کی گئی ہے۔ یہ رائے دیکھ کر ہمیں بے حد خوشی ہوئی کہ بالآخر دونوں میں صلح ہو گئی۔ لیکن یہ خوشی عارضی تھی۔ ایک واقف کار نے بتایا کہ یہ رائے اس زمانے کی یادگار ہے جب دونوں ڈاکٹروں میں گہری دوستی تھی۔ اب ڈاکٹر سلیم اختر اس رائے کو گناہ کا درجہ دیتے ہیں اور اس گناہ سے تائب ہو چکے ہیں۔ اب اس

رائے کچھ اور ہے جس کا اظہار وہ اپنی تحریروں میں گاہے گاہے کرتے رہتے ہیں۔ بہرحال اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ڈاکٹر انور سدید ایسے غیر منصف مزاج نہیں ہیں کہ ڈاکٹر سلیم اختر کے لکھے ہوئے ہزاروں صفحات میں سے انھیں چند سطریں بھی پسند نہ ہوں۔ ان چند چیدہ سطروں کو انھوں نے اپنی کتاب کے فلیپ کی زینت بنا کر وسیع القلبی کا ثبوت دیا ہے۔

ڈاکٹر انور سدید اپنی گوناگوں ادبی صلاحیتوں کی وجہ سے ہمیں بیحد پسند ہیں۔ اس لیے ہماری دلی خواہش ہے کہ وہ ادبی سیاست کو چھوڑ کر اپنے اصل کاموں میں مصروف رہیں۔ پچھلے سال ایک ملاقات میں ہم نے ان سے عرض کیا تھا کہ "اب آپ لڑائی جھگڑے کے کام چھوڑ دیجیے، خدا نے آپ کو جو علم دیا ہے، اس سے ہمیں زیادہ سے زیادہ مستفید ہونے کا موقع دیجیے۔" انھوں نے دبستانِ سرگودھا کے خلاف "آئینہ" نامی ایک رسالہ ہمارے سامنے رکھا اور فرمایا، "دیکھیے یہ لوگ اس قسم کی بازاری چیزیں شائع کرتے ہیں، آپ انھیں کیوں منع نہیں کرتے۔" ہم نے عرض کیا، "آپ سے نیازمندی ہے، اس لیے آپ کا مفاد عزیز ہے۔ آپ کے حریفوں کا مفاد عزیز نہیں ہے، اس لیے ہم انھیں مشورہ کیوں دیں؟" ڈاکٹر صاحب نے فرمایا، "میں جب حریفوں کی اس قسم کی بازاری حرکتوں کو دیکھتا ہوں تو مجھ سے خاموش نہیں رہا جاتا۔ میں اپنا غصہ اپنی تحریروں میں نکالتا ہوں۔" ہم نے گزارش کی، "غصے کا اظہار بہت ہو گیا۔ بہتر ہوگا کہ اب غصے کی بجائے آپ کا علم آپ کی تحریروں سے ظاہر ہو۔"

ہمیں خوشی ہے کہ ہماری گزارش رائیگاں نہیں گئی۔ گزشتہ ایک برس میں ڈاکٹر صاحب نے کئی اہم علمی و ادبی کام انجام دیے ہیں، جن میں سے ایک شائع بھی ہو گیا ہے اور اس وقت اسی کے اعتراف کے لیے ہم نے اوپر کی سطریں بطور تمہید لکھنے کی زحمت اٹھائی ہے۔

اردو میں سفرنامہ لکھنے کی روایت کچھ زیادہ پرانی تو نہیں، تاہم پچھلے ڈیڑھ سو برسوں سے صنف اردو میں مروج ہے۔ کمبل پوش کا سفرنامہ ۱۸۴۷ء میں پہلی بار منظرِ عام پر آیا تھا، اس وقت سے اب تک بے شمار سفرنامے لکھے جا چکے ہیں۔ ان سفرناموں کے بارے میں متفرق مضامین تو گاہے گاہے شائع ہوتے رہتے ہیں، لیکن ایسی کوئی کتاب موجود نہیں تھی جس میں تمام اردو سفرناموں کا جائزہ لیا گیا ہو۔ خوشی کی بات ہے کہ ڈاکٹر انور سدید نے اس کمی کو پورا کر دیا ہے۔ انھوں نے "اردو ادب میں سفرنامہ" کے نام سے ایک عالمانہ کتاب لکھی ہے جسے مغربی پاکستان اردو اکیڈمی نے شائع کیا ہے۔

۴۴۴ صفحات کی اس کتاب میں ڈاکٹر انور سدید نے تحقیق وتنقید کا حق ادا کر دیا ہے۔ اس کتاب میں ابتدا سفرنامے کے فن پر بحث کی گئی ہے اور پھر دنیا کے چند قدیم اور اہم سفرناموں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کے بعد تقریباً چار سو اُردو سفرناموں کا فرداً فرداً تذکرہ ہے۔ بحث صرف کتابی صورت میں چھپنے والے سفرناموں تک محدود نہیں، بلکہ ان سفرناموں کو بھی پیشِ نظر رکھا گیا ہے جو رسالوں اور اخبارات میں دفن ہیں۔ انور سدید نے سفرناموں کی فہرست مرتب نہیں کی بلکہ ہر سفرنامے کو پڑھ کر اس کی خصوصیات بیان کی ہیں۔ یہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔ اس کے لیے بڑی محنت اور صبر آزما تلاش و جستجو کی ضرورت تھی۔ انور سدید اس مرحلے سے نہایت خوش اسلوبی سے گزرے ہیں۔

اس کتاب میں شروع سے آخر تک عالمانہ شان نظر آتی ہے۔ یہاں تک کہ عطاء الحق قاسمی اور امجد اسلام امجد کے سفرناموں کا ذکر بھی سنجیدگی اور شائستگی سے کیا گیا ہے حالانکہ ڈاکٹر انور سدید چاہتے تو ان دونوں کے سفرناموں کی ان خامیوں کو بھی بیان کر سکتے تھے جو ان میں موجود نہیں ہیں۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ دبستانِ فنون کے ان دونوں اہم اراکین کے سفرناموں کا ذکر اس باب میں کیا گیا ہے جس کا عنوان "سفرنامے کا دورِ زریں" ہے۔ ڈاکٹر انور سدید چاہتے تو ان دونوں سفرناموں کا ذکر ایک الگ باب میں بھی کر سکتے تھے جس کا عنوان ہوتا: "اُردو سفرنامے کا دورِ زوال"۔

عطاء الحق قاسمی پر ڈاکٹر انور سدید نے یہ خصوصی عنایت بھی کی ہے کہ ان کے ایک مزاحیہ سفرنامے ("ایک غیر ملکی کا سفرنامۂ لاہور") کا ذکر تفصیل سے کیا ہے۔ سچ مچ کے سفرناموں کے ساتھ ایک فرضی سفرنامے کا تذکرہ کرنا عجیب سی بات ہے۔ اس سے ڈاکٹر انور سدید کی انصاف پسندی ظاہر ہوتی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ سخن فہمی مشکوک ہو جاتی ہے۔

سب سے زیادہ حیران کن بات یہ ہے کہ سفرنامے کی فنی بحث سے متعلق باب میں عطاء الحق قاسمی کو ایک صاحبِ فکر ونظر دانشور تسلیم کیا گیا ہے۔ ان کا ایک اقتباس درج کرنے سے پہلے یہ لکھا گیا ہے: "عطاء الحق قاسمی کا یہ خیال درست ہے کہ....." یہ پہلا موقع ہے کہ ڈاکٹر انور سدید کو عطاء الحق قاسمی کا کوئی خیال درست نظر آیا۔ اب یہ عطاء الحق قاسمی کا فرض ہے کہ وہ اپنا مذکورہ "خیال" غلط قرار دیں، ورنہ ڈاکٹر انور سدید کی طرف سے دی گئی درستی کی سند اُن کے ادبی مستقبل کو نقصان پہنچا سکتی ہے۔

(۱۷ نومبر ۱۹۸۸ء)

ہم قارئین کی مغفرت کے لیے دعا کرتے ہیں

بعض لوگ ادب تخلیق کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے گھاس کاٹ رہے ہیں اور بعض گھاس کاٹتے ہیں تو وہ ادب بن جاتا ہے۔ انتظار حسین کا شمار اسی دوسری قسم کے لوگوں میں ہوتا ہے۔ یوں تو وہ ہمارے صفِ اوّل کے افسانہ نگار اور ناول نویس ہیں، لیکن یہاں ان کی اس حیثیت سے بحث نہیں، بطور صحافی انھیں بہت کچھ مجبوراً لکھنا پڑتا ہے۔ اسی مجبوری کو ہم نے گھاس کاٹنے کا نام دیا ہے۔

اخبار میں کالم نگاری کرنا بہت آسان بھی ہے اور بہت مشکل بھی۔ آسان اس لیے کہ بیشتر لکھنے والے محض لکھنے کی خاطر لکھتے ہیں۔ گویا اپنا پیٹ بھرنے کے لیے اخبار کا پیٹ بھرتے ہیں۔ ایسے لکھنے والوں کو کاتب کے سوا کوئی اور نہیں پڑھتا اور کاتب بھی خالی الذہن ہو کر ہی پڑھتا ہے۔ لیکن یہ کام اس وقت بہت مشکل ہو جاتا ہے جب لکھنے والے کی پہلے سے ایک ادبی حیثیت ہو اور اسے یہ احساس ہو کہ میں اخبار میں جو کچھ لکھوں گا، اس سے میری ادبی حیثیت متاثر ہو سکتی ہے۔ انتظار حسین کا تعلق اسی دوسرے گروہ سے ہے۔ انھوں نے پیشہ ورانہ ضروریات کے تحت جو کچھ لکھا، یہ سوچ کر لکھا کہ کہیں صحافی انتظار حسین کی وجہ سے افسانہ نگار انتظار حسین بدنام نہ ہو جائے۔ وہ اپنی اس کوشش میں اس حد تک کامیاب ہوئے کہ ان کی صحافتی تحریروں کی وجہ سے ہمیشہ دوسرے ہی بدنام ہوتے ہیں۔

انتظار حسین کے اخباری کالم دو طرح کے ہوتے ہیں: ایک تو وہ جو عام دنوں میں چھپتے ہیں اور جن میں ادب، ثقافت، موسم اور کسی حد تک سیاست کے حوالے سے گفتگو کی جاتی ہے۔ دوسرے ہفتہ وار کالم، جن میں ادبی مسائل ہوتے ہیں یا کتابوں پر تبصرے یا پھر ادبی شخصیتوں سے ملاقاتوں کا حال ہوتا ہے۔ آخر الذکر کالم "ملاقاتیں" کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہو گئے ہیں۔ اس وقت یہی کتاب پیشِ نظر ہے۔

انتظار حسین نے تقریباً ایک سو ادبی شخصیتوں سے ملاقاتوں کا حال لکھا ہے۔ ان میں فیض احمد فیض، محمد حسن عسکری، احمد ندیم قاسمی، غلام عباس، ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر وزیر آغا جیسے اکابر بھی ہیں اور ...... کام کیا گنوائیں اس یہ سمجھ لیجیے کہ ہمارے جیسے اصاغر بھی خاصی تعداد میں ہیں۔ لفظ ''اصاغر'' کے استعمال کے لیے ہم جناب عبدالعزیز خالد سے معذرت خواہ ہیں کہ اس قسم کے الفاظ کے جملہ حقوق انھیں کے نام محفوظ ہیں۔

سب سے پہلے تو ہم انتظار حسین کو ان کی حوصلہ مندی کی داد دیتے ہیں کہ انھوں نے ایک سو کے قریب ادیبوں سے ملاقات کی جب کہ ان میں سے نصف سے زیادہ ادیب ایسے ہیں کہ ان سے ملاقات کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ ہم ذاتی طور پر ادیبوں سے ملنے سے گھبراتے ہیں کہ کہیں ملاقات کے بعد ان کے بارے میں ہماری رائے خراب نہ ہو جائے۔ انتظار حسین کا کمال یہ ہے کہ جن ادیبوں کے بارے میں وہ پہلے سے خراب رائے رکھتے تھے، ان سے ملنے سے دریغ نہیں کیا اور ان کے بارے میں ایسی ایسی باتیں لکھ دیں کہ پڑھنے والوں کی رائے بھی متاثر ہو سکتی ہے۔

اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس سے آزادی کے بعد اُردو ادب اور ادبی رجحانات کے بارے میں بہت سی ایسی باتیں معلوم ہو جاتی ہیں جو کسی دوسری جگہ نظر نہیں آتیں۔ اس اعتبار سے ہم اسے جدید اُردو ادب کی تاریخ بھی کہہ سکتے ہیں۔ ایک ایسی تاریخ جس میں ہمارے ادیبوں کی کامرانیاں بھی نظر آتی ہیں اور ناکامیاں بھی۔ امیدیں بھی نظر آتی ہیں اور مایوسیاں بھی۔ یہ کامیابیاں اور ناکامیاں کس نوعیت کی ہیں، ان کی ایک مثال ملاحظہ ہو:

منیر نیازی ہمارے اُن شاعروں میں سے ہیں جن کی، بقول ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، بھارت میں پرستش ہوتی ہے۔ پاکستان میں بھی ان کے ساتھ اچھا سلوک ہوتا ہے۔ بڑے فخر سے فرماتے ہیں:

''سارا شہر میری گواہی دیتا ہے۔ میں صرف اخباری کالموں اور دانشوروں کی محفل میں زندہ نہیں ہوں، میں شہر کی خلقت میں زندہ ہوں۔ جب میں گھر سے نکلتا ہوں اور منی بس میں بیٹھتا ہوں تو ایک خوبصورت دوشیزہ میرے لیے ٹکٹ خریدتی ہے۔ باقی سواریوں سے منہ موڑ کر مجھ سے سدھارتا پر بات کرتی ہے۔''

نغز گو شاعر عبدالعزیز خالد کو اس کا شدید احساس ہے کہ انھوں نے ابھی تک کچھ نہیں لکھا۔ فرماتے ہیں، ''میں نے ابھی تک کچھ نہیں کیا، صرف تمہید باندھی ہے۔ خدا کہنے کی توفیق دے تو کہوں گا'' ..... خالد صاحب اب تک خدا کے فضل سے ۳۵، ۴۰ کتابیں لکھ چکے ہیں۔ اگر یہ تمہیدی کام ہے پھر اصل کام تو شاید سینکڑوں کتابوں پر محیط ہوگا۔ ہماری دعائیں اور نیک تمنائیں خالد صاحب کے ساتھ ہیں۔ خدا انھیں اپنے مقصد میں کامیاب کرے۔ اس کے ساتھ ہی ہم خالد صاحب کے قارئین کے لیے مغفرت کی دعا بھی کرتے ہیں۔

اس کتاب میں صرف کامیابیوں کا اور ناکامیوں ہی کا ذکر نہیں، بعض ادیبوں نے کام کی باتیں بھی کی ہیں۔ مثلاً اعجاز بٹالوی فرماتے ہیں:

''تخلیقی سرگرمی اور کتاب ساتھ ساتھ نہیں چلتے۔ منیر نیازی اگر کتابیں پڑھنا شروع کر دے تو اس کا کیا حال ہوگا۔ محمد حسن عسکری کو دیکھو، جوں جوں کتابیں پڑھتے گئے توں توں پیچھے ہٹتے گئے۔ ادیب کو زیادہ نہیں پڑھنا چاہیے۔ اقبال اور غالب کی طرح بڑا دماغ ہو تو اور بات ہے ورنہ غریب کتابوں کے نیچے دب کر رہ جاتے ہیں۔''

شاید اعجاز بٹالوی کو یہ معلوم نہیں کہ جس طرح پڑھنے والے ادیب دوسروں کی کتابوں کے نیچے دب کر رہ جاتے ہیں، اسی طرح نہ پڑھنے والے ادیب خود اپنی تصانیف کے بوجھ تلے پریشان حال رہتے ہیں۔ بہر حال اعجاز صاحب نے جو کچھ کہا ہے، اس کی معقولیت میں کوئی شبہ نہیں۔ آدمی ایک وقت میں ایک ہی کام اچھی طرح کر سکتا ہے۔ یا لکھے یا پڑھے۔ ادیب اگر دوسروں کی تحریریں پڑھے گا تو اس کے ذہن میں ادب کا اعلیٰ معیار قائم ہوگا، اور یہ چیز لکھنے کے راستے میں رکاوٹ پیدا کر سکتی ہے۔

مظفر علی سید کو اپنے ہم عصروں سے یہ شکایت ہے کہ وہ یہ چاہتے ہیں کہ نقاد صرف اشتہاری تنقید لکھے، اپنے بارے میں وہ کسی قسم کی نکتہ چینی کو برداشت نہیں کر سکتے۔ سید صاحب کا تعلق جس نسل سے ہے وہ اب پرانی ہو چکی ہے۔ نئی نسل کے ادیب اشتہاری تنقید کو بھی پسند نہیں کرتے۔ ان کا گزارا صرف اشتہارات پر ہوتا ہے۔

یہ تو دوسروں کی باتیں تھیں، خود انتظار حسین نے بھی کچھ کمی نہیں کی۔ شاید ہی کوئی ادیب ہو

گا جس پر انھوں نے طنز کے تیر نہ برسائے ہوں۔ مثلاً انور سجاد کے بارے میں لکھا ہے:

''افسانہ اب بھی وہ لکھے جا رہے ہیں، اگرچہ وہ مختصر سے مختصر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ یاروں کو اندیشہ ہے کہ کسی روز انور سجاد خالی کاغذ لے کر آئیں گے اور یہ کہیں گے کہ یہ میں نے افسانہ لکھا ہے اور مداحوں کے لیے وہ انور سجاد کا سب سے اچھا افسانہ ہوگا۔''

اسی طرح انجم رومانی کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

''سال ہا سال سے ایک ہی وضع چلی آ رہی ہے کہ قینچی کے سگریٹ پیتے ہیں اور غزل لکھتے ہیں۔ نہ سگریٹ کا برانڈ بدلتا ہے نہ غزل کا رنگ بدلتا ہے۔''

اس کتاب میں جا بجا تاریخی واقعات بھی ملتے ہیں۔ مثلاً ڈاکٹر عبادت بریلوی کی حلقۂ ارباب ذوق دہلی کے ایک اہم اجلاس کی روداد یوں بیان کی گئی ہے:

''ضیا جالندھری سیکرٹری تھے۔ ایک عدد صدر بھی فراہم کر لیا گیا۔ غلام عباس افسانہ پڑھنے کے لیے تیار ہوئے مگر حاضرین میں بھی تو کسی کا ہونا ضروری تھا۔ غلام عباس نے کہا کہ یار میرا ایک کتا ہے اُسے لے کر آتا ہوں۔ غلام عباس نے اپنے کتے کو سیٹی دے کر بلایا، سامعین کی صف میں بٹھایا اور اپنا افسانہ سنایا۔''

انتظار حسین نے بعض رازوں سے بھی پردہ اٹھایا ہے۔ مثلاً یہ کہ انور سجاد ایک زمانے میں شعر بھی کہتے تھے اور وہ بھی اس قسم کے شعر۔

صبا کے دوش پہ جب بھی وہ زلف لہرائی
جبین لالہ و گل پر بہار مسکائی

افسوس کہ انور سجاد نے شاعری ترک کر دی، ورنہ وہ آج ٹی وی کے ڈراموں ہی کے نہیں ٹی وی کے مشاعروں کے بھی ممتاز اداکار ہوتے۔ ٹی وی پر اس قسم کی شاعری بہار بن کے ''مسکاتی'' ہے۔

(۸ دسمبر ۱۹۸۸ء)

انتظار حسین کی سفاکانہ آرا

انتظار حسین کی کتاب ''ملاقاتیں'' کا ذکر کرتے ہوئے ہم نے پچھلے ہفتے ایک محفل میں عرض کیا تھا کہ انتظار حسین نے اس کتاب میں ادیبوں ہی سے بے تکلفانہ گفتگو نہیں کی، بلکہ ترقی پسند تحریک سے بھی بے تکلف ہونے کی خاصی کوشش کی ہے۔ ہمارے اس جملے سے بعض لوگوں نے یہ مطلب نکالا کہ جب کوئی کسی سے بے تکلفی کا اظہار کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ فاصلے ختم ہو رہے ہیں، قربت بڑھ رہی ہے۔ ہمیں اپنے جملے کے اس مفہوم سے اتفاق نہیں ہے۔ ہم نے بے تکلفی کو قربت کے معنوں میں استعمال نہیں کیا تھا، بلکہ یہ بتانا مقصود تھا کہ انتظار حسین اپنی کتاب میں ترقی پسند تحریک سے مذاق کرنے یا تفریح لینے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ بات کسی سے ہو رہی ہو یا کہیں سے ہو رہی ہو، وہ ترقی پسند تحریک کا ذکر ضرور چھیڑ دیں گے اور اس تحریک کے بے وقت موت پر آنسو بہائیں گے۔ گریہ کرنا انتظار حسین کی عادت ہے، خوشی کے موقع پر بھی ان کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔

ذرا دیکھیے، انھوں نے ترقی پسند تحریک سے کس کس انداز سے بے تکلفی کا اظہار کیا ہے:

''مسعود اشعر نے علامتی افسانہ لکھنے سے پہلے بہت پاپڑ بیلے۔ ان میں ان کی ترقی پسندی بھی شامل ہے، مگر انھیں جلد ہی عقل آ گئی اور وہ ترقی پسندی کے اثر سے نکل گئے۔''

ہمیں انتظار حسین کی اس سفاکانہ رائے سے اتفاق نہیں ہے۔ ہم نے بہت سے ایسے ترقی پسند دیکھے ہیں، جو عقل آنے کے باوجود ترقی پسندی کے اثر سے نکل نہیں سکے۔ عقل اور ترقی پسندی ایک دوسرے کی دشمن نہیں ہیں۔ وہ متوازی خطوط کی طرح ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔

احمد فراز کے بارے میں انتظار حسین لکھتے ہیں:

''ایک نظریے سے شغف چلا آتا ہے۔ اس نظریے سے جسے ترقی پسند تحریک

لے کر چلی تھی، لیکن آدمی سمجھدار ہیں۔ اس شغف کو محبت کا نعم البدل کبھی نہیں سمجھا
اور ایسی باتیں کبھی نہیں کیں کہ ع اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا۔"

انتظار حسین نے بڑی دیدہ دلیری سے فیض کا مصرعہ لکھ کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے
کہ احمد فراز بڑے شاعر ہیں، کیونکہ وہ فیض کی طرح چھوٹی چھوٹی باتوں کی خاطر محبت سے دستبردار
نہیں ہوتے۔ یہ صحیح ہے کہ فیض احمد فیض، احمد فراز کے رنگ میں شعر کہتے تھے، لیکن اس کا فیصلہ
انتظار حسین نہیں کر سکتے کہ دونوں میں کون بڑا شاعر ہے۔ اس قسم کے فیصلے آنے والے وقت پر
چھوڑ دینے چاہئیں۔

عارف عبدالمتین کے متعلق لکھتے ہیں کہ ان کے والد نے یہ نصیحت کی تھی کہ تتلی کے اوپر
گدھے کا بوجھ نہیں لادتے، لیکن بیٹے نے باپ کی یہ بات سنی ان سنی کر دی اور ترقی پسند تحریک
میں شامل ہو گیا، جہاں ہر تتلی گدھے کے بوجھ تلے دبی ہوئی تھی...... عارف صاحب ترقی پسند
ضرور تھے، مگر رجعت پسندوں سے ملنے جلنے میں مضائقہ نہیں سمجھتے تھے۔ آدمی وضعدار تھے مگر ترقی
پسند تحریک ایسی وضعداریوں کی قائل نہیں تھی۔ عارف صاحب کو جو نصیحت کی گئی تھی، اس کا تعلق
زندگی کے عام معمولات سے تھا، لیکن انتظار حسین نے اسے بھی ترقی پسندی کے کھاتے میں ڈال
دیا۔ یہ رجعت پسندی کی انتہا ہے۔

ڈاکٹر محمد حسن نے بجا طور پر انتظار حسین کو ظلمت پسند کہا ہے۔ دیکھیے ترقی پسندی کا چراغ
گل ہونے پر وہ کس طرح بغلیں بجاتے ہیں۔ "تقسیم کے بعد پاکستان میں ترقی پسندی نے [illegible]
ٹھوکر کھائی اور آخر اپنے تئیں اللہ کو پیاری ہو گئی۔ کتنے ادیب تحریک کے ساتھ اللہ کو پیارے ہو
گئے۔ کچھ پھول دو دن بہار جانفزا دکھلا کر کملا گئے، بہت سے غنچے بن کھلے ہی مرجھا گئے۔" انتظار
حسین کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ ترقی پسند تحریک ختم نہیں ہوئی، یہ اب بھی زندہ ہے اور ان
کھلے غنچوں کے ہاتھ میں ہے۔

معلوم نہیں انتظار حسین کے پاس کون سا جادو ہے کہ جس کے زیر اثر بڑے بڑے ترقی
پسند بھی اس کا اعتراف کر لیتا ہے کہ ترقی پسند تحریک ختم ہو چکی ہے۔ فیض صاحب سے گفتگو کے
دوران انتظار حسین نے کہا، "ترقی پسند تحریک تو اپنا سفر پورا کر چکی، تقسیم کے بعد اردو
شاعری پیدا ہوئی ہے، وہ دوسری تحریکوں اور دوسرے رجحانات کے حوالے سے ہوئی ہے۔" فیض

صاحب نے نہلے پہ دہلا مارا اور فرمایا: "شاعری کسی بھی حوالے سے پیدا ہو رہی ہو، مگر اچھی شاعری
کسی نہ کسی سطح پر ترقی پسند ہی ہوتی ہے۔" فیض صاحب کا جواب صحیح ہے یا غلط، انتظار حسین کو اس
سے غرض نہیں، انھیں تو اس کی خوشی ہے کہ فیض صاحب نے اس کی تردید نہیں کی کہ ترقی پسند تحریک
اپنا سفر پورا کر چکی ہے۔

ترقی پسند تحریک کے کئی علمبرداروں سے انتظار حسین نے تحریک کے ختم ہو جانے کی
تصدیق کرائی ہے اور اس کے اسباب معلوم کیے ہیں۔ مثلاً جناب احمد ندیم قاسمی سے انھوں نے
سوال کیا: "اب جب کہ انجمن اللہ کو پیاری ہو چکی ہے اور تحریک کو ایک زمانہ گزر چکا ہے، تو اب
آپ مڑ کر دیکھتے ہیں، تو آپ کو اس تحریک کی کیا صورت نظر آتی ہے؟" اس کے جواب میں قاسمی
صاحب نے فرمایا: "کمیونسٹ دوستوں کی انتہا پسندی نے اس تحریک کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔"
یہی نہیں، انتظار حسین نے انجمن ترقی پسند مصنفین کے سابق سیکرٹری جنرل کی زبان سے
نوجوان ترقی پسندوں کے بارے میں یہ بھی کہلوا لیا کہ "یہ نوجوان" حالات کا جائزہ پاکستان دوستی
کے حوالے سے نہیں لیتے۔"

ظہیر کاشمیری نے بھی اس قسم کی بات کی ہے، "ایک انتہا پسند ٹولہ پیدا ہو گیا تھا، جس کی
[illegible] تحریک کو لے ڈوبیں۔"

حد تو یہ ہے کہ علی سردار جعفری جیسے بڑے ترقی پسند نے بھی اعتراف کیا ہے کہ "ترقی پسند
تحریک اپنا رول ادا کر چکی، اب نئے حالات کے دباؤ کے تحت نئی تحریکیں پیدا ہوں گی۔"
اگر کوئی غیر ترقی پسند ادیب بھی ترقی پسندی کے خلاف کچھ کہتا ہے، تو انتظار حسین بے حد
خوش ہوتے ہیں۔ ممتاز مفتی کو وہ محض اس لیے بڑا ادیب مانتے ہیں کہ انھوں نے یہ بات کہی:

"پروپیگنڈے کی لائن میں دو بڑے شخص گزرے ہیں۔ ایک وہ جس نے یہ اشتہار
بنایا کہ گرمیوں میں چائے ٹھنڈک پہنچاتی ہے اور دوسرا وہ جس نے ترقی پسندی کی
اصطلاح تراشی۔"

احسان دانش جب یہ کہتے ہیں کہ "ترقی پسند اچھی شراب کے تو قائل ہیں، اچھے کاموں
کے نہیں۔" تو انتظار حسین خوش ہو کر سوال کرتے ہیں، تو کیا وہ اچھی شاعری کے بھی قائل نہیں ہیں؟
[illegible] اس سوال کے جواب سے انتظار حسین مزید خوش ہوئے ہوں گے۔

محمد طفیل مرحوم [illegible]ول کتاب میں نقل کیا گیا ہے:

''ترقی پسند[illegible]ں نے تو کلاسیکی ادب کو دفن کر دینے کا منصوبہ باندھا تھا اور اپنی دانست میں [illegible]ام انجام دے دیا تھا، مگر ہوا یہ کہ تحریک کا آخر وقت آتے آتے کلاسیکی ادب[illegible] ہوا پھر سے چل پڑی اور شعر کے رسیا ترقی پسند نظموں کو بھول کر میر میر پکار[illegible] لگے۔''

شمس الرحمٰن [illegible]رقی پہلے تو صاف صاف کہتے ہیں:

''ترقی پسند[illegible]ں نے ہمارے عہد میں کوئی بڑا اضافہ نہیں کیا۔''

پھر فرماتے ہیں:

''جس تحریک [illegible]نے استعاراتی اظہار کو رد کر دیا، ان کا حشر کیا ہوا۔ ان کے شاعر کیفی اعظمی اور سا[illegible]رصیا نوی بن کر رہ گئے۔''

انتظار حسین [illegible]بعض سابق ترقی پسندوں سے پوچھا کہ انھوں نے تحریک سے [illegible] کیوں کیا۔ اس سلسلے [illegible]عارف عبدالمتین نے انھیں بتایا، ''کاش میرے دوستوں نے مقصد کے جوش میں فن کا دا[illegible]و سے نہ چھوڑا ہوتا، مگر انجمن ترقی پسند مصنفین میں مصنف پر زور کم [illegible] ترقی پسند پر زور زیا[illegible]. ہمارے ساتھیوں نے جمالیاتی اقدار کو فراموش کیا اور سستی نعرہ بازی [illegible] اتر آئے۔''

ترقی پسند تحر[illegible]ختم ہونے کے اسباب انتظار کو اب تک اچھی طرح معلوم ہو چکے [illegible] پھر بھی انہوں نے [illegible] ادیب اور احمد فراز کو زحمت دینے کی ضرورت محسوس کی۔ میرزا صاحب نے تو وہی اسباب [illegible]، جو ماضی کی بعض قوموں کی تباہی کے اسباب تھے، لیکن احمد فراز [illegible] کوڑی لائے، فرمایا:

''ترقی پسند[illegible] نے رفتہ رفتہ ادب کا مطالعہ شروع کیا۔ اس مطالعے نے ان کے یہاں بہت[illegible]ڈالا۔ انھیں پتا چلا کہ لکھنے کے اور بھی طریقے ہیں، محض دھاڑنے چنگھاڑنے [illegible] ادب پیدا نہیں ہوتا۔''

یہاں انتظار [illegible]ن کو اپنی عادت اور مزاج کے مطابق یہ پوچھنا چاہیے تھا کہ وہ کون ترقی پسند ادیب [illegible]نھوں نے رفتہ رفتہ ادب کا مطالعہ کیا۔ مگر انھوں نے ایک ذاتی سوال

بحث کا رُخ تبدیل کر دیا۔ سوال یہ تھا کہ اکثر شاعروں کو پریشان حال دیکھا ہے، لیکن آپ نے خوش زندگی گزاری۔ یہ کیوں کر ہوا؟ احمد فراز نے جواب دیا:

''مجھے درویش ملتے رہے جو میرے کھانے پینے کی ذمہ داریاں اپنے سر لیتے تھے اور بیروزگار بھی نہیں ہوا کرتا تھا۔ دیکھنے والے یہ دیکھتے اور حیران ہوتے اور پھر الزام لگاتے کہ یہ فلاں طاقت کا ایجنٹ ہے۔ وہاں سے اسے پیسے ملتے ہیں۔''

پرانے زمانے میں درویشوں کے کھانے پینے کی ضرورتیں دوسرے پوری کرتے تھے، لیکن اب درویش اتنے دنیادار ہو گئے ہیں کہ انھوں نے احمد فراز کے کھانے پینے کی ذمہ داریاں اپنے سر لے رکھی ہیں۔

(۱۵ دسمبر ۱۹۸۸ء)

امجد کو اجازت ہے کہ نثر بھی لکھتا رہے اور غزل بھی کہتا رہے

(۱)

دو نقاد گفتگو کر رہے تھے۔ ایک نے کہا، ''ہمارے شاعر اچھی نثر لکھنا نہیں جانتے۔'' دوسرے نے پوچھا، ''تو کیا وہ اچھی شاعری لکھنا جانتے ہیں؟''

چونکہ ہم نقاد نہیں ہیں، اس لیے ہمارا تجزیہ ان دونوں نقادوں کے مقابلے میں مختلف ہے۔ ہم نے امجد اسلام امجد کی شاعری بھی پڑھی ہے اور اب ان کا سفرنامہ ''شہر در شہر'' بھی پڑھ لیا ہے۔ وہ بہت اچھے شاعر ہی نہیں، نہایت عمدہ نثر نگار بھی ہیں، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ شاعری میں وہ داغ بدل نظر آتے ہیں اور نثر میں خندہ بلب۔ امجد زندگی کی محبت اور محبت کی زندگی کے قائل ہیں، اس لیے ان کی شاعری دل و دماغ دونوں کو متاثر کرتی ہے اور پڑھنے والے کو سوچ کی راہ دکھاتی ہے۔ اس کے برعکس امجد کی نثر قاری کو تو کیا، خود امجد کو بھی سوچنے کا موقع نہیں دیتی۔ امجد کی طبع کی روانی ہی ان کی نثر کی روانی بن جاتی ہے، جس کے ساتھ قاری خس و خاشاک کی طرح بہتا چلا جاتا ہے۔

''شہر در شہر'' میں دو سفرنامے شامل ہیں۔ ایک تو پیرس، مانٹریال، واشنگٹن، ٹورنٹو، لاس اینجلس، شکاگو اور لندن وغیرہ کا سفر ہے اور دوسرا ہندوستان کے شہروں انبالہ، سہارنپور اور دہلی کا۔ پہلے سفر میں ان کے رفیقانِ سفر پروین شاکر اور جمیل الدین عالی تھے۔ دوسرے سفر میں عطاء الحق قاسمی شریکِ رنج و راحت تھے۔ امجد نے اپنے دو رفیقانِ سفر اور ایک عدد ''شریکِ رنج و راحت'' کے ساتھ بیرونِ ملک جو وقت گزارا، اس کی روداد انھوں نے نہایت دلچسپ انداز میں قلم بند کی ہے۔ ہم نے عطاء الحق قاسمی کو رفیقِ سفر کی بجائے ''شریکِ رنج و راحت'' اس لیے کہا ہے کہ اگرچہ عطا کی ہمسفری راحت کا باعث ہوتی ہے، لیکن فریقِ ثانی کو جب مشاعرے

میں ان کا کلام سننا پڑتا ہے تو صورت حال تبدیل ہو جاتی ہے جس کی وضاحت کے لیے آپ کو ایک واقعہ سننا پڑے گا۔

ہندوستان کے کسی شہر میں کوئی مشاعرہ تھا۔ امجد اور عطا ریلوے اسٹیشن سے سیدھے مشاعرہ گاہ پہنچے۔ سامانِ سفر دونوں نے آدھا آدھا اٹھا رکھا تھا۔ جب مشاعرہ ختم ہوا تو سارا سامان عطا نے اٹھایا، امجد خالی ہاتھ تھے۔ کسی نے کہا، ''بیچارے عطا نے کتنا بوجھ اٹھا رکھا ہے، امجد خالی ہاتھ ہیں۔'' یہ سن کر امجد نے کہا، ''میرے ہاتھ خالی ہیں تو کیا، ذہن پر جو بوجھ ہے وہ اس بوجھ سے زیادہ ہے جو عطا نے اٹھا رکھا ہے۔''

سوال کیا گیا، ''آپ کے ذہن پر کس چیز کا بوجھ ہے؟''

جواب ملا، ''ان غزلوں کا جو عطا نے مشاعرے میں پڑھی ہیں۔''

یہ واقعہ یا لطیفہ ہم نے اس لیے نہیں سنایا کہ ہم عطا کی شاعرانہ عظمت کے قائل نہیں ہیں۔ عطا کی شاعرانہ عظمت کے تو ہم اس وقت بھی قائل تھے جب انھوں نے شاعری شروع نہیں کی تھی۔ یہ لطیفہ سنانے کا مقصد صرف یہ ہے کہ ہم ''شہر در شہر'' کے اسلوب سے اپنے قارئین کو آگاہ کر سکیں کہ کس طرح بات سے بات نکال کر لطیفہ سنایا جا سکتا ہے۔ امجد کا کمال یہ ہے کہ وہ سفر کے حالات بیان کرتے ہوئے اس کثرت سے لطیفے سناتے ہیں کہ اگر ان کے سفرنامے سے لطیفے خارج کر دیے جائیں تو جو کچھ باقی بچے گا، وہ بھی سفرنامہ نہیں ہوگا، لطیفہ ہوگا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ لطیفے بہت مزے کے ہیں، لیکن افسوس اس کا ہے کہ بہت سے لطیفے یہ کہہ کر انھوں نے نہیں سنائے کہ وہ ناقابلِ اشاعت ہیں۔ موجودہ زمانے میں جب کہ ہمارے مطبوعہ ادب کا بڑا حصہ ناقابلِ اشاعت تحریروں پر مشتمل ہے، امجد کو لطیفوں کے سلسلے میں اس قدر محتاط ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔

ہمیں یہ تو معلوم تھا کہ امجد بہت اچھے شاعر اور ڈراما نگار ہیں، لیکن اس کا علم نہیں تھا کہ لطیفہ گوئی بھی ان کا خاص میدان ہے۔ بلکہ ''شہر در شہر'' پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ یہی ان کا خاص میدان ہے۔ لطیفے وہ کس رفتار سے سناتے ہیں، اس کا اندازہ خود انھی کے ایک بیان سے کیجیے:

''...... میں نے ہوائی سفر سے متعلق لطیفے سنانے شروع کر دیے۔ تیسرے لطیفے پر جہاز نے ٹیک آف کیا اور پانچویں پر ہمارے آگے کی سیٹ پر بیٹھے ہوئے ایک

گرگ باراں دیدہ نے ہمیں اس طرح گھور کر دیکھا جیسے اسے گوروں کی اس دنیا میں رنگ دار نسل کی ہنسی پسند نہ آئی ہو...... اگلا لطیفہ میں نے آواز کا والیوم مزید بلند کر کے سنایا۔"

گویا لطیفے امجد کے نزدیک وقت ناپنے کا پیمانہ ہیں بلکہ وہ آدمی کو بھی اسی پیمانے سے ناپتے ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں "ان کے قد کی مناسبت سے ملاقات کے پانچویں منٹ کے اختتام سے پہلے میں نے انھیں ایک لطیفہ سنایا۔"

امجد کے پاس لطیفوں کا اتنا اسٹاک ہے کہ ملاقات کے پانچویں منٹ کے اختتام سے پہلے کیا، سننے والے کے اختتام تک بھی وہ اگر لطیفے سناتے رہیں تو یہ اسٹاک ختم نہیں ہوگا۔

اس لطیفے بازی کی وجہ انھوں نے یہ بتائی ہے کہ "لطیفہ پوری نسلِ آدم کی میراث ہے اس لیے جہاں تک ہو سکے اسے خلقِ خدا تک پہنچانا چاہیے۔ اتنی Tense اور پریشان زندگی میں کچھ تو اپنے ہونے کا احساس ہو۔"

اس لطیفہ گوئی کی وجہ سے امجد کو یہ نقصان بھی پہنچا کہ سفر کے دوران بعض لوگ ان کی شاعری سے زیادہ ان کے لطیفوں کے قدردان ہو جاتے تھے۔ انبالے کے ایک پولیس افسر کی بیوی تو انھیں شاعر کی بجائے لطیفہ گو ہی سمجھتی رہی۔ پولیس افسر بیوی سے بھی دو ہاتھ آگے تھا۔ مشاعرے میں امجد کے شعروں پر قہقہے لگا کر داد دیتا رہا۔

امجد نے یوں تو مشاعرے پڑھنے کے لیے سفر کی مشکلیں اٹھائی تھیں، لیکن اصل مقصد سفر نامہ لکھنا تھا۔ وہ سفر کے آغاز سے اختتام تک ڈائری لکھتے رہے تاکہ بعد میں ان یادداشتوں کو سفر نامے کی صورت دی جا سکے۔ لندن میں جب اُردو کے سب سے بڑے طنز و مزاح نگار مشتاق احمد یوسفی کو اس خطرناک منصوبے کا علم ہوا تو انھوں نے امجد کو سفر نامہ نہ لکھنے کا مشورہ دیا۔ اس کے بعد کی روداد امجد کی زبانی سنیے:

"میری حیرت اور پریشانی دیکھ کر کہنے لگے، "مجھے خدانخواستہ آپ کے لکھنے کی اہلیت پر شک نہیں ہے۔ دراصل مجھے سفر ناموں کی کثرت نے حیران اور اُن کی سطح، انداز اور داستان طرازی نے پریشان کر دیا ہے۔ میں نے ایسی ایسی بوگس، من گھڑت اور افسانوی باتیں پڑھی ہیں کہ اس صنفِ ادب سے میرا ایمان ہی

اٹھ گیا ہے۔"..... میں نے ابنِ انشاء، مستنصر حسین تارڑ، عطاء الحق قاسمی، محمد خالد اختر، اشفاق احمد، جمیل الدین عالی اور محمد کاظم کی مثالیں دیں کہ دیکھیے ان لوگوں نے کیسے کیسے مزیدار سفرنامے لکھے ہیں۔ قرۃ العین حیدر اور شفیق الرحمٰن کے رپورتاژوں کا حوالہ دیا مگر ان کی رائے میں کوئی تبدیلی نہ لا سکا۔ کہنے لگے، "آپ شاعر، ڈرامہ نگار، نقاد اور مترجم ہیں اور خیر سے خاصے مشہور بھی ہیں، اگر سفرنامہ نہیں لکھیں گے تو کون سی قیامت آ جائے گی۔" میں نے انھیں اپنے سفر نامے کے متوقع محاسن سے آگاہ کیا اور بتایا کہ میں ان تمام برائیوں سے احتراز اور گریز کا ارادہ رکھتا ہوں، جن کی وجہ سے وہ سفرنامے سے بدظن ہو چکے ہیں۔ اتنے میں ہوٹل آ گیا اور بات درمیان میں رہ گئی۔"

اچھا ہوا کہ بات درمیان میں رہ گئی ورنہ یوسفی صاحب جب امجد کو سفرنامہ نہ لکھنے پر آمادہ کر لیتے تو اس کے بعد شاعری ترک کرنے کا مشورہ بھی دیتے۔ یہ عام طور پر ہوتا ہے کہ اگر کسی بزرگ کا ایک مشورہ مان لیا جائے تو دوسرے مشورے کا راستہ کھل جاتا ہے۔ اس بات کی وضاحت کے لیے ہم ایک واقعہ سنانے کے لیے مجبور ہیں۔

پروفیسر شجاع احمد زیبا علی گڑھ میں اپنی طالب علمی کے زمانے میں پروفیسر رشید احمد صدیقی کے چہیتے شاگرد تھے۔ زیبا صاحب نثر بھی لکھتے تھے اور غزل بھی کہتے تھے۔ ایک روز رشید صاحب نے اپنے شاگرد کی غزل سن کر کہا، "تم اتنی عمدہ نثر لکھتے ہو، تمھیں غزل کہنے کی کیا ضرورت ہے۔" اس کے بعد زیبا صاحب نے اپنا ایک مقالہ استاد کو پڑھنے کے لیے دیا۔ رشید صاحب نے مقالہ پڑھ کر کہا، "تم اتنی عمدہ غزل کہتے ہو، نثر نویسی میں وقت ضائع نہ کرو۔" شاگرد نے عرض کیا، "چند روز پہلے آپ نے مجھے غزل کہنے سے منع کیا تھا اور اب آپ نثر لکھنے سے منع کر رہے ہیں، میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔" رشید صاحب نے نہایت شفقت سے فرمایا، "جب تک میرا مطلب سمجھ میں نہ آئے، تمھیں اجازت ہے کہ نثر بھی لکھتے رہو اور غزل بھی کہتے رہو۔"

خیر یہ تو مذاق کی باتیں تھیں، اصل بات یہ ہے کہ امجد نے یوسفی صاحب کے مشورے پر عمل نہ کر کے بہت اچھا کیا۔ اگر خدانخواستہ وہ اس مشورے کو قبول کر لیتے تو اُردو ادب ایک اچھے سفرنامے سے محروم ہو جاتا۔ اس سفرنامے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ امجد نے

اسے تاریخی و جغرافیائی معلومات سے گراں بار نہیں کیا۔ یہاں تک کہ یہ بھی نہیں بتایا کہ کولمبس نے امریکا کب دریافت کیا تھا اور ٹاور آف لندن کا سنگِ بنیاد کب رکھا گیا تھا۔ انھوں نے تو بس اپنے سفر کے حالات، سفر کے دوران اپنی ذہنی کیفیات بیان کرنے اور گرد و پیش کی تصویر کشی تک اپنے آپ کو محدود رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پڑھنے والا یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ سفرنامہ نہیں پڑھ رہا بلکہ امجد کے ساتھ خود بھی سفر کر رہا ہے۔ اسی لیے تو ہم نے اس کالم کے شروع میں یہ کہا ہے کہ امجد کی طبع کی روانی ہی اس کی نثر کی روانی بن جاتی ہے جس کے ساتھ قاری خس و خاشاک کی طرح بہتا چلا جاتا ہے۔

(۵ جنوری ۱۹۸۹ء)

(۲)

امجد اسلام امجد کے سفرنامے کا نام اگر "شہر در شہر" کی بجائے "شخص در شخص" ہوتا تو بہتر تھا۔ اس میں شہروں کا ذکر کم ہے اور اشخاص کا زیادہ۔ جمیل الدین عالی، پروین شاکر اور عطاء الحق قاسمی ہم سفر تھے، اس لیے ان کا جا و بے جا ذکر تو ہونا ہی تھا۔ بے شمار لوگ سفر کے دوران ملے ہوائی جہازوں کے مسافر، مشاعروں کے سامعین، اپنے گھروں پر دعوتیں کرنے اور اپنی کاروں میں گھمانے والے عقیدت مند۔ سفرنامے میں ان سب کا ذکر ملتا ہے۔ ہر شخص کو اس کے مرتبے بساط کے مطابق یاد کیا گیا ہے۔ کسی کا ذکر ایک سطر میں ہے، کسی کا ایک پیراگراف میں اور کہیں پورا ایک صفحہ کسی کی نذر کیا گیا ہے۔ کسی کے گھر اگر ایک دن سے زیادہ قیام رہا تو اسی نسبت سے ذکر کے صفحات کی تعداد بڑھا دی گئی ہے۔

اس سفرنامے میں کچھ ایسے لوگ بھی نظر آتے ہیں جن کا امجد کے سفر سے دور کا بھی کوئی تعلق نہیں۔ مثلاً صہبا لکھنوی، نظیر صدیقی، ڈاکٹر انور سدید۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے، ان لوگوں سے امجد کے کوئی خاص مراسم نہیں، اس کے باوجود امجد نے جس بے تکلفی اور گرم جوشی سے ان کا ذکر کیا ہے، اس پر حیرت ہوتی ہے۔

صہبا لکھنوی کا تذکرہ اس طرح آیا کہ ایک روز شکاگو کی ایک محفل میں کسی نے اقبال کا کوئی شعر پڑھا جس میں "افکار" کا لفظ آیا تھا۔ چونکہ "افکار" اور صہبا لکھنوی لازم و ملزوم ہیں، اس

لیے دونوں کا ذکر چل نکلا۔ پروین شاکر نے یہ واقعہ سنایا کہ ایک مرتبہ لندن میں قیام کے دوران صہبا لکھنوی نے یہ کہا کہ میرا جی چاہتا ہے کہ لندن سے بھی "افکار" جاری کیا جائے، مگر میرے وسائل اجازت نہیں دیتے۔ اس پر کسی نے صہبا صاحب سے کہا، "لندن والوں کا ضابطۂ اخلاق بھی اس کی اجازت نہیں دیتا کہ کوئی ایسا رسالہ شائع کیا جائے جو صرف مشتہرین کے لیے ہو۔"

عام ضابطۂ اخلاق یہ ہے کہ غیر ملک میں، غیروں کے سامنے اپنے ملک کے داخلی مسائل پر گفتگو نہیں کی جاتی۔ پروین شاکر کو یہ نہیں چاہیے تھا کہ وہ صہبا لکھنوی کے بارے میں شکاگو میں اس قسم کا واقعہ سناتیں اور اگر غلطی سے انھوں نے یہ واقعہ سنا ہی دیا تھا تو امجد کو نہیں چاہیے تھا کہ وہ اسے اپنے سفرنامے میں شائع کرتے۔ یہ درست ہے کہ غالب و میر کی طرح صہبا لکھنوی ایک بین الاقوامی شخصیت ہیں، تاہم وہ ہمارے ملک کا ایک داخلی مسئلہ بھی ہیں، ان کے بارے میں لطیفے گھڑنا اور شائع کرنا کوئی اچھی بات نہیں۔

نظیر صدیقی کا ذکر اس کتاب میں دو جگہ ملتا ہے اور دونوں جگہ موصوف کے شایانِ شان نہیں ہے۔ پیرس کی سیر کرتے ہوئے امجد نے نظیر صدیقی کے تنقیدی مجموعے "تاثرات و تعصبات" کے حوالے سے کوئی بات کہی۔ عالی صاحب نے اس بات کو تو نظر انداز کر دیا اور نظیر صدیقی کی کتاب کے بارے میں اپنے تاثرات و تعصبات اس طرح ظاہر کیے، "میں داد دیتا ہوں آپ کے مطالعے کی، کیا کیا چیزیں آپ نے پڑھ رکھی ہیں۔" "تاثرات و تعصبات" وہ تاریخی کتاب ہے جس میں عالی صاحب کی شاعری پر ایک طویل مضمون شامل ہے۔ یہ عالی صاحب کی شاعری کا پہلا مفصل تنقیدی جائزہ ہے۔ محض اس مضمون کی وجہ سے عالی صاحب نظیر صدیقی کی پوری کتاب سے دل برداشتہ ہو گئے، حالانکہ اس کتاب کے باقی مضامین خاصے فکر انگیز ہیں۔

دوسری مرتبہ نظیر صدیقی کا ذکر ساقی فاروقی کے حوالے سے کیا گیا ہے۔ چند سال پہلے نظیر صدیقی لندن گئے تو ساقی نے انھیں کیٹس کا مکان دکھایا۔ مکان کے ارد گرد پھیلے ہوئے باغ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ساقی نے کہا، "یہ ہے وہ باغ جس کے درختوں سے اڑنے والی بلبلوں کے لیے کیٹس نے بے پناہ نظمیں لکھی ہیں۔" نظیر صدیقی نے بڑے غور سے باغ کا جائزہ لیا اور پھر پوری سنجیدگی سے پوچھا، "کس درخت سے اڑی تھی وہ بلبل؟"

ہمیں اس واقعے کی صداقت پر شک ہے، اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اس کے راوی ساقی

فاروقی ہیں، جن کی سخن گوئی کی طرح سخن سازی بھی اپنی مثال آپ ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ خود نظیر صدیقی نے اپنے سفرنامۂ لندن میں اس واقعے کا ذکر نہیں کیا۔ ان کا سفرنامہ پہلے ایک رسالے میں چھپا تھا اور اب "دو سفرنامے" کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہوا ہے۔ انھوں نے ساقی فاروقی کے ساتھ کیٹس کا مکان دیکھنے کا اعتراف کیا ہے، لیکن باغ اور بلبل وغیرہ کا کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ جب نظیر صدیقی نے کیٹس کے مکان کے اردگرد پھیلا ہوا باغ دیکھا ہی نہیں تو وہ اس باغ کے کسی درخت اور اس سے اڑنے والی بلبل کے بارے میں کوئی سوال کیسے کر سکتے تھے۔

دراصل قصہ یہ ہے کہ نظیر صدیقی سے ساقی فاروقی اس بات پر ناخوش ہیں کہ انھوں نے پروین شاکر پر تو ۲۵ صفحات کا مقالہ لکھا، لیکن ساقی کی شاعری پر پانچ صفحے بھی نہیں لکھے۔ بلبل والا لطیفہ سنا کر ساقی نے اپنی اسی ناخوشی کا اظہار کیا ہے۔ بے جا نہ ہوگا، اگر یہ بھی بتا دیا جائے کہ ساقی فاروقی کی شکایت جب نظیر صدیقی تک پہنچی، تو انھوں نے کہا، "ساقی فاروقی کی شاعری پر پانچ صفحے ضائع کرنے سے بہتر ہے کہ میں پروین شاکر کی شاعری پر مزید ۲۵ صفحے لکھ دوں۔"

ڈاکٹر انور سدید کے بارے میں امجد نے اپنے سفرنامے میں بہت کچھ لکھا ہے۔ ڈاکٹر صاحب سے نیازمندی کی بنا پر ہم ان سب باتوں کو نقل کرنے کی جسارت نہیں کر سکتے۔ البتہ امجد اسلام امجد سے ہمارے جو خوشگوار مراسم ہیں، ان کی وجہ سے کچھ خاص خاص باتیں نقل کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"انور سدید ایک نقاد تھے۔ اب محقق، شاعر اور انشائیہ نگار بھی ہیں۔ ایم اے اُردو میں فرسٹ آئے تھے۔ پیشے کے اعتبار سے نہروں کے محکمے میں انجینئر ہیں۔ ادب کے وسیع المطالعہ طالب علم ہیں۔ لیکن ان کے سارے علم اور مطالعے کا واحد مقصد ڈاکٹر وزیر آغا کو مشہور کرنا اور اُن کے خلاف یا بارے میں لکھی جانے والی ہر تحریر کے جواب میں "ردِ عمل" لکھنا ہے۔ ...... میری سمجھ میں آج تک یہ نہیں آیا کہ ڈاکٹر وزیر آغا جیسے عمدہ نقاد، اچھے ادیب اور نہایت نفیس اور ادب پرور شخص کو کیا ہو گیا ہے۔ ان کی سمجھ میں کیوں نہیں آتا کہ انور سدید کے چلائے توپ کے گولے، پورس کے ہاتھیوں کی طرح انھی کی صفوں کو روندتے رہتے ہیں اور ان خواہ مخواہ کے ادبی جھگڑوں کی وجہ سے ان کا ادبی مقام بڑھنے کی بجائے گھٹ رہا ہے۔"

ان باتوں پر ہم کوئی تبصرہ نہیں کریں گے، کیونکہ تبصرہ کرنے کے لیے ڈاکٹر انور سدید بذاتِ خود موجود ہیں۔ بہرحال ہم اس قدر ضرور عرض کریں گے کہ امجد نے اپنے سفرنامے کو ڈاکٹر انور سدید کا اعمال نامہ بنا کر اچھا نہیں کیا۔ انھوں نے ڈاکٹر انور سدید کو ڈیڑھ درجن مضامین لکھنے کے لیے ایک نہایت عمدہ موضوع دے دیا ہے۔ اب امجد اسلام امجد جانیں اور ڈاکٹر انور سدید۔ ہم دونوں کے حق میں دعائے خیر کرتے ہیں۔

اور اب آخر میں افتخار عارف کے بارے میں ایک اقتباس بلا تبصرہ ملاحظہ فرمایئے:

"افتخار عارف نے بطور شاعر اپنے لیے جو مقام پیدا کیا ہے، اس کے حوالے سے اب وہ جدید نسل کے شعراء کی پہلی صف میں شامل ہیں ...... بطور انسان وہ ایک انتہائی نفیس، ملنسار اور پسندیدہ شخصیت کا حامل ہے۔ اس کا پی آر کا دائرہ اب کراچی اور لاہور کی تنگنائے سے نکل کر تین براعظموں کے پھیلاؤ پر محیط ہے۔ اگرچہ اتنے زیادہ دوست رکھنے والوں کی دوستی مشکوک ٹھہرتی ہے، پھر بھی ذاتی طور پر گزشتہ دس برس میں میں نے اسے ایک اچھا دوست پایا ہے۔ وہ حسبِ معمول بہت جوش اور تپاک سے ملا، لیکن اس کی آنکھوں کی الجھن اور بے چینی چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔ مجھے پتہ تھا کہ اس کی وجہ وہاں پروین شاکر کی موجودگی تھی۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ پروین جب شاعری کے میدان میں نووارد تھی اور ایف اے کی طالب کی حیثیت میں بین الکلیاتی مشاعروں میں حصہ لیا کرتی تھی، تو اس وقت افتخار ایک بڑے بھائی اور سینئر کی طرح اس کے دوستوں میں پیش پیش تھا، پھر پروین کی "خوشبو" آئی اور آتے ہی پھیل گئی، تو پتہ نہیں کس رَو میں افتخار نے مختلف احباب کو ایک خط لکھ مارا، جس میں "خوشبو" کے چار پانچ مصرعوں پر اپنا حق جتایا تھا۔ یہی نہیں، بلکہ مختلف رسائل میں انٹرویو دیتے ہوئے بھی اس نے اس مسئلے کو خاص طور پر اُچھالا۔ پروین کا دکھ اور غصہ تو اپنی جگہ، مگر اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ صورتِ حال دونوں کے مشترکہ دوستوں کے لیے پیدا ہوگئی اور پھر ہوتی ہی چلی گئی۔ معاملہ کچھ ایسا نازک اور جذباتی تھا کہ اگر شروع میں سنبھل جاتا تو سنبھل جاتا، مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دلوں میں پڑ گئی

ہوئی گرہیں مضبوط تر ہوتی چلی گئیں اور اگرچہ ایک وقت میں افتخار نے [illegible] احباب کو بیچ میں ڈال کر وضاحت اور صلح صفائی کی کوشش بھی کی، مگر اس وقت پروین نے مذاکرات سے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ وہ اس مسئلے پر کسی قسم کی بات کرنا اور سننا نہیں چاہتی...... افتخار کے بار بار کہنے کے باوجود میں نے اپنے آپ کو اس جھگڑے سے باہر رکھا اور افتخار کو بھی مشورہ دیا کہ اتنی بگڑی ہوئی بات ایک دم نہیں بن سکتی...... یہ بات آج تک میری سمجھ میں نہیں آئی کہ عارف [illegible] ذہین، صلح کل، ذمہ دار اور محتاط شخص نے ایسا غیر محتاط بیان کیسے اور کیوں دیا تھا؟ آسکر وائلڈ کے بارے میں کہتے ہیں کہ اس نے اپنے خلاف لگائے گئے ایک الزام کو عدالت میں چیلنج کیا تھا اور اس کے بعد کیس ہار کر خود اندر ہو گیا تھا۔"

(۱۹/[illegible]۱۹۸۹ء)

ڈاکٹر ملک حسن اختر کی تحقیقی خوش فعلیاں

[illegible] کالم لکھنے والوں میں اور ہم میں یہ فرق ہے کہ وہ اپنے لکھے پر کبھی نادم نہیں ہوتے اور ہمیں [illegible] ہونا پڑتا ہے۔ اگر ہم ڈاکٹر انور سدید کی تعریف کریں، تو ڈاکٹر سلیم اختر سے آنکھیں چار [illegible] نہیں ہوتی، اور اگر ڈاکٹر سلیم اختر کے اوصاف بیان کریں، تو ڈاکٹر انور سدید خط لکھ [illegible] کرتے ہیں۔ لیکن سب سے زیادہ ندامت ہمیں اس وقت ہوئی جب ہم نے لاہور [illegible] روزہ جریدے میں مدیر تکبیر کے نام ڈاکٹر ملک حسن اختر کا ایک کھلا خط پڑھا۔ اس [illegible] انھوں نے مدیر تکبیر کو بتایا ہے کہ خامہ بگوش کالم نگاری نہیں کرتا، شرفا کی پگڑیاں اچھالتا [illegible] صاحب نے ہمارے بارے میں ایسی فصیح و بلیغ زبان استعمال کی ہے کہ اس کے سامنے [illegible] انشا اور سعادت یار خان رنگین کی ریختی بھی بے رنگ نظر آتی ہے۔ ملک صاحب [illegible] نے ہمارے بارے میں خط غبار جو کچھ لکھا ہے، اس کی شان نزول یہ ہے کہ پچھلے [illegible] صاحب کی کتاب "اردو شاعری میں ایہام گوئی کی تحریک" پر ہم نے ایک کالم لکھا تھا، [illegible] اس کتاب کی بعض تحقیقی خوش فعلیوں کی نشاندہی کی گئی تھی۔ اس پر ملک صاحب مشتعل ہو [illegible] شکایت ہے کہ ہم تحقیقی کتابوں پر مزاحیہ مضامین کیوں لکھتے ہیں؟ حالانکہ ہم نے بھی [illegible] کی کہ بعض لوگ تحقیق کے نام پر مزاح نگاری کیوں کرتے ہیں۔

ملک صاحب نے فرمایا ہے کہ ہم نے غلط بیانی اور بہتان تراشی سے کام لیا ہے۔ اس کے [illegible] نے اپنی دو غلطیوں کو سہو کتابت قرار دے کر فرمایا ہے کہ خامہ بگوش نے اپنی ساری توجہ [illegible] غلطیوں پر صرف کر دی ہے، لیکن ملک صاحب نے کتابت کی ان غلطیوں کا ذکر نہیں کیا، [illegible] ناموزوں طبع ہونے کی وجہ سے اس کتاب میں شامل اشعار میں پائی جاتی ہیں اور [illegible] میں ہر صفحے پر ایک دو مصرعے ناموزوں نظر آتے ہیں۔ کیا اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط [illegible] کی بہت سی غلطیاں یکجا کر دی جائیں، تو تحقیقی کتاب وجود میں آ جاتی ہے۔

ہم نے اپنے کالم میں صرف کتابت کی غلطیوں سے بحث نہیں کی تھی، بہت سی ایسی باتیں بھی لکھی تھیں جن کو ملک صاحب نے یہ کہہ کر نظر انداز کر دیا: ''میں ان کی ہر دلیل کا جواب لکھ سکتا ہوں مگر اس سے خط کے مزید طویل ہو جانے کا اندیشہ ہے۔'' ملک صاحب کو خدا نے فرصت دی ہے۔ ان کی صرف ایک تحقیقی کتاب گیارہ سو سے زائد صفحات کی ہے، اگر خط طویل ہو جاتا تو کون سی قیامت ٹوٹ پڑتی، ہمیں اپنی ہر دلیل کا جواب تو مل جاتا!

ہم نے اپنے کالم میں جو باتیں عرض کی تھیں، وہ ایسی نہیں ہیں کہ ملک صاحب ان کو نظر انداز کر دیں۔ مثلاً ملک صاحب نے فرمایا تھا کہ شاہ عالم آفتاب نے نثر میں ایک قصہ لکھا تھا جو اب نایاب ہے۔ ہم نے عرض کیا کہ یہ قصہ نایاب نہیں ہے۔ ملک صاحب کے خود اپنے شہر لاہور سے شائع ہو چکا ہے۔ ملک صاحب کے استاد ڈاکٹر سید عبداللہ مرحوم کی نگرانی میں اسے مرتب کیا گیا تھا اور اس کا مخطوطہ اس یونیورسٹی کے کتب خانے میں موجود ہے، جس نے موصوف کو پی ایچ ڈی کی ڈگری دی تھی۔ اس قصے کا نام ''عجائب القصص'' ہے۔ اگر ملک صاحب کو ہماری بات پر یقین نہ ہو، تو وہ محترم احمد ندیم قاسمی سے صحیح صورتِ حال معلوم کر سکتے ہیں، جن کے ادارے مجلس ترقی ادب نے یہ قصہ شائع کیا ہے۔

اس قسم کی اطلاعات کی فراہمی پر ملک صاحب کو ہمارا شکریہ ادا کرنا چاہیے تھا، مگر افسوس کہ وہ ناراض ہو گئے اور اب انھیں خوش کرنے کے لیے ہمیں یہ کالم لکھنے پر محنت کرنی پڑ رہی ہے۔ کیا زمانہ آ گیا ہے کہ کتاب کوئی لکھتا ہے اور محنت کسی کو کرنی پڑتی ہے۔

ہم نے اپنے کالم میں ملک صاحب کی ''تاریخ ادب اُردو'' کا بھی ذکر کیا تھا۔ اس کتاب پر ہمارا ایک کالم کچھ عرصہ قبل شائع ہو چکا ہے۔ معلوم ہوتا ہے، وہ ملک صاحب کی نظر سے نہیں گزرا۔ اس کالم کے کچھ حصے ذیل میں درج کیے جاتے ہیں، تاکہ موصوف مدیر تکبیر کے نام ایک اور کھلا خط تحریر فرما دیں۔ کیا ہی اچھا ہو کہ ہم کالم اور وہ کھلے خطوط لکھتے رہیں۔ اس طرح کھلے یعنی ڈھیلے ڈھالے خطوں کا ایک مجموعہ مرتب ہو جائے گا، جو غالب کے خطوں کی طرح مقبول ہو سکتا ہے۔

ایک ہزار ایک سو بارہ صفحات کی اس ضخیم کتاب کا نام ''تاریخ ادب اُردو'' ہے اور مصنف ہیں ڈاکٹر ملک حسن اختر۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی اس تالیفِ لطیف کے دیباچے میں فرمایا ہے کہ

اب تک اُردو ادب کی جو تاریخیں لکھی گئی ہیں، وہ کسی نہ کسی اعتبار سے ناقص ہیں، اس لیے ایک نئی تاریخ ادب لکھنے کی ضرورت تھی اور اس ضرورت کو وہ خود پورا کر رہے ہیں۔ پنجاب یونیورسٹی سے پانچ جلدوں میں اُردو ادب کی، جو تاریخ شائع ہوئی تھی، اس کے بارے میں موصوف فرماتے ہیں:

''اس میں انتشار اور غلطیوں کی بھرمار ہے، اس کے پیش نظر تو یہ کتاب مرتب کر کے پنجاب یونیورسٹی نے اپنے نیک نام کو بدنام کیا ہے۔ اس میں تحقیق، تنقید، ترتیب، حتیٰ کہ پروف ریڈنگ کی بے شمار غلطیاں موجود ہیں...... ایک ہی موضوع پر مختلف لوگوں نے لکھا ہے، جس سے تکرار بھی پیدا ہوئی ہے اور انتشار بھی۔ کتاب کو بلاوجہ ضخیم بنا دیا گیا ہے...... اہم اور غیر اہم کا امتیاز روا نہیں رکھا گیا...... چوں چوں کا مربہ والی مثال اس کتاب پر پوری طرح صادق آتی ہے۔''

ڈاکٹر ملک حسن اختر کے ان الفاظ سے ہمیں پورا پورا اتفاق ہے، بلکہ ہم تو ان الفاظ کی صداقت کے اس حد تک قائل ہیں کہ اگر ہمیں ڈاکٹر صاحب کی زیر نظر تاریخ ادب پر تبصرہ کرنے کے لیے کہا جائے، تو ہم مذکورہ بالا اقتباس ہی کو ان کی خدمت میں پیش کر دیں گے۔ ڈاکٹر صاحب اس اقتباس میں غیر شعوری طور پر اپنی ہی تاریخ ادب کی خصوصیات بیان کر گئے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ پنجاب یونیورسٹی کی تاریخ ادب، بہت سے لوگوں نے مل کر لکھی ہے اور ڈاکٹر صاحب نے تن تنہا یہ کارنامہ سرانجام دیا ہے۔

سب سے پہلے تحقیق ہی کو لیجیے۔ ڈاکٹر صاحب نے سابقہ مصنفوں کی باتوں کو اپنے انداز میں دہرایا ہے، قدیم شعراء کا انتخاب بھی وہی ہے، جو سابقہ تاریخوں میں ملتا ہے۔ شاید ہی کسی شاعر کے کلام سے انھوں نے براہِ راست استفادہ کیا ہو۔ کہیں ازراہِ لطف و کرم حوالہ دیا ہے اور کہیں حوالے کے بغیر ہی چراغ سے چراغ جلایا ہے اور بعض جگہ تو اپنا چراغ جلانے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی، دوسروں کے چراغ سے ہی اُجالا کر لیا ہے۔ جدید تحقیق سے انھوں نے کوئی سروکار نہیں رکھا۔ مثلاً حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کے حالات میں ''معراج العاشقین'' کو ان کی تالیف بتایا ہے، حالانکہ یہ بات اب ثابت ہو چکی ہے کہ یہ خواجہ صاحب کی تصنیف نہیں ہے۔ اس سلسلے میں کئی تحریریں شائع ہو چکی ہیں۔ خود مولوی عبدالحق، جنھوں نے یہ کتاب دریافت کی تھی، اس کا اعتراف کر چکے ہیں کہ پہلے انھیں شبہ تھا، لیکن اب یقین ہے کہ یہ خواجہ صاحب کی تصنیف

نہیں ہے۔ اگر فاضل مؤلف ڈاکٹر جمیل جالبی کی تاریخ ادب ہی دیکھ لیتے تو انھیں معلوم ہو جاتا کہ جدید تحقیق اس سلسلے میں کیا کہتی ہے۔

مؤلف کی معلومات کے ناکافی ہونے کا ثبوت جگہ جگہ ملتا ہے۔ مصنفوں اور ان کی تصانیف کے بارے میں پیش کی گئی معلومات تشنہ ہیں اور بعض مقامات پر تشنگی اتنی زیادہ نظر آتی ہے کہ قاری گمراہ جادۂ تحقیق ہو جاتا ہے۔ مثلاً قدرت اللہ شہاب کے ناولٹ ''یا خدا'' کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے کہ ''اس میں بنگال کے قحط کی عکاسی کی گئی ہے اور اسے بڑے مؤثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔'' ..... ہم نے جب یہ ناولٹ پڑھا تھا تو اس وقت یہ ۱۹۴۷ء کے فسادات کے بارے میں تھا، ممکن ہے بعد میں شہاب صاحب نے ترمیم کر کے اسے بنگال کے قحط کا آئینہ دار بنا دیا ہو۔

ڈاکٹر زور کی تصانیف میں ''دیوان زادۂ حاتم'' بھی شامل ہے، حالانکہ یہ دیوان ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار نے مرتب کیا تھا۔ ڈاکٹر زور نے شاہ حاتم کے حالات میں جو کتاب لکھی تھی اس کا نام ''سرگزشت حاتم'' ہے۔ فاضل مؤلف نے ڈاکٹر شوکت سبزواری کی ایک کتاب کا نام ''کتاب العسکر'' لکھا ہے۔ جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے، سبزواری مرحوم نے اس نام کی کوئی کتاب نہیں لکھی تھی اور اب مرنے کے بعد لکھ ڈالی ہو تو دوسری بات ہے۔ اسی طرح حامد حسن قادری کی تصانیف میں ''شاہکار انیس'' کا نام شامل ہے، جب کہ ان کا اس کتاب سے کوئی تعلق نہیں۔

معلومات کے ناکافی ہونے کی ایک مثال ملاحظہ ہو۔ مفتی صدر الدین آزردہ نے شعرائے اردو کا جو تذکرہ لکھا تھا، اس کے بارے میں بتایا ہے کہ اس کا ایک نسخہ کیمبرج میں ہے۔ فاضل مؤلف کو اس کا علم نہیں کہ یہ تذکرہ پاکستان اور ہندوستان دونوں جگہ شائع ہو چکا ہے۔ صرف ایک تذکرہ کیا، شاعروں اور نثر نگاروں پر، جو جدید ترین تحقیقی کام ہے، وہ بھی موصوف کے پیش نظر نہیں ہے۔ مثلاً آرزو لکھنوی، چکبست، سرور جہاں آبادی، نظم طباطبائی، منیر شکوہ آبادی وغیرہ کے بارے میں گزشتہ دس بارہ برسوں میں جو کتابیں شائع ہوئی ہیں ان سے استفادہ نہیں کیا گیا۔

عدم توازن کی مثالیں بھی کثرت سے ملتی ہیں۔ قائم جیسے بڑے شاعر پر تین صفحے لکھے ہیں جرأت کا ذکر دو صفحات میں ہے، عبدالولی عزلت جیسے اہم شاعر پر ایک لفظ نہیں لکھا اور محمد حسین کلیم جیسے غیر اہم شاعر پر سارا زور قلم صرف کر دیا ہے۔ عزلت کا دیوان چھپ چکا ہے

مثنوی ''راگ مالا'' بھی، جب کہ کلیم کے صرف وہی چند شعر ملتے ہیں، جو تذکرہ در تذکرہ نقل ہوتے رہے ہیں اور زیر نظر تاریخ ادب میں بھی نقل ہوئے ہیں۔ ۱۲۱۲ صفحات کی تاریخ ادب میں اردو سفر ناموں کا ذکر صرف چودہ سطروں میں کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر ملک حسن اختر کو شکایت ہے کہ پنجاب یونیورسٹی کی تاریخ ادب میں پروف ریڈنگ کی غلطیاں کثرت سے ہیں۔ ان کی اپنی تاریخ کا حال یہ ہے کہ کوئی صفحہ غلطیوں سے پاک نہیں ہے۔ معلوم نہیں یہ غلطیاں پروف ریڈنگ کی ہیں یا کسی اور فنی خرابی کا نتیجہ ہیں۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ کا نام فہرست میں ''ابوالعلا'' لکھا ہے۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری کا جہاں ذکر ہے، وہاں عنوان میں ''شوکت سہروردی'' لکھا ہے۔ جلیل قدوائی کو جمیل قدوائی بنا دیا ہے۔ اس قسم کی ستم ظریفیوں کے کچھ اور نمونے ملاحظہ ہوں۔ ہم نے قارئین نیز فاضل مؤلف کی سہولت کے لیے صحیح نام قوسین میں لکھ دیے ہیں۔ یگانہ کی کتاب ''شہر کاذبہ'' (صحیح۔ شہرت کاذبہ)، محمد حسین آزاد کی تصنیف ''سپارک دنمارک'' (صحیح۔ سپارک ونماک) حامد حسین قادری کی کتاب ''داستان نثر اردو'' (صحیح۔ داستان تاریخ اردو)، احتشام حسین کے سفرنامے کا نام ''ساحل سمندر'' (صحیح۔ ساحل اور سمندر)۔

اس تاریخ میں جس قسم کی معلومات پیش کرنے پر خاص توجہ دی گئی ہے، اس کے چند نمونے بھی ملاحظہ فرمائیے:

۱۔ ''جگر کی شکل و صورت اچھی نہ تھی، پست قد اور سیاہ رو تھے۔ ان کو تین چیزوں سے بہت محبت تھی۔ پان، شراب، تاش'' ص ۵۸۰

۲۔ علی سردار نام اور جعفری نسبت خاندانی ہے۔ اردو زبان سے انھیں بے حد پیار تھا ص ۹۵۵۔ لفظ ''تھا'' کا استعمال قابل توجہ ہے۔

۳۔ ''مرزا ادیب نہایت شریف انسان ہیں۔ وہ پرانے لوگوں کی طرح محبت کا ذکر آ جانے پر شرما جاتے ہیں۔ ایک محفل میں ان سے ان کی جذباتی زندگی کے متعلق سوال کیا گیا، تو وہ ایک شرمیلی مسکراہٹ سے ٹال گئے۔'' ص ۱۹۰

یہاں تک تو تحقیق کا معاملہ تھا۔ اب تنقید کی کچھ مثالیں بھی دیکھ لیجیے:

۱۔ فیض احمد فیض بہت کم گو اور حیادار شخص ہیں، مگر اس کے باوجود انھوں نے اپنی زندگی میں

کئی بھرپور عشق کیے، جن کا اثر ان کی شاعری میں نظر آتا ہے۔" ص ۹۲۰

۲۔ "...سرد ملکوں کی گرمی اور گرم ملکوں کی سردی، دیہات کی طبعی خوشگواریاں اور عملی پریشانیاں، غرضیکہ تضاد کا یہ احساس ہی ندیم کی شاعری کا سب سے بڑا موضوع ہے۔" ص ۹۷۳

۳۔ ظفر اقبال کی شاعری کو سمجھنے کے لیے قاری کو کاوش کرنا پڑتی ہے، کیونکہ وہ اندر سے باہر کی طرف آتے ہیں اور اندر اور باہر کا رشتہ کمزور ہوتا ہے۔" ص ۱۰۵۴

۴۔ "محمد حسن عسکری کے فقرے بھی مزیدار ہوتے ہیں۔ وہ چٹ پٹی باتیں کرتے ہیں، تعریف کرتے ہیں تو بہار آجاتی ہے اور تنقیص کرتے ہیں تو اندھیرا چھا جاتا ہے۔" ص ۱۱۳۲۔

قارئین کرام! ہم معذرت خواہ ہیں کہ یہ کالم ضرورت سے زیادہ سنجیدہ ہو گیا ہے، لہٰذا منہ کا مزا بدلنے کے لیے ایک لطیفہ سن لیجیے۔ ایک مرتبہ مولانا چراغ حسن حسرت نے اپنے کالم میں مولانا تاجور نجیب آبادی کے بارے میں کوئی ایسی بات لکھ دی، جو انھیں پسند نہ آئی اور انھوں نے مولانا حسرت سے شکایت کی: "آپ شرفاء کی پگڑیاں اچھالتے ہیں۔" مولانا حسرت نے جواب دیا: "مگر شرفاء نے تو کبھی اس کی شکایت نہیں کی۔"

(۱۶ر فروری ۱۹۸۹ء)

اقبال اور مٹنڈو آدم

مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم سے کچھ سیاسی غلطیاں سرزد ہوئی تھیں، جس کی سزا انھیں یہ ملی کہ مولانا ابوسلمان شاہجہانپوری نے ان پر ایک درجن سے زیادہ کتابیں لکھ ڈالیں۔ لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ علامہ اقبال نے ایسی کون سی غلطی کی تھی جس کی سزا میں ہر ہفتہ ان پر ایک نئی کتاب شائع ہو جاتی ہے۔ اک زمانہ تھا کہ علامہ پر کتاب لکھنا فیشن میں داخل تھا، لیکن اب یہ کام عادات میں داخل ہو گیا ہے۔ بعض لوگ محض اس لیے کتابیں لکھتے ہیں کہ انھیں علامہ پر لکھنے کی عادت ہو گئی ہے۔ عادتیں بری ہوں یا اچھی ذرا مشکل ہی سے چھوٹتی ہیں۔ ایک ایسے ہی ماہر اقبالیات سے ایک بار ہم نے عرض کیا، "آخر علامہ سے ایسا کون سا قصور سرزد ہوا تھا جو آپ ان کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔" کہنے لگے، "صاحب میں تو بہت کوشش کرتا ہوں لیکن کمبل مجھے نہیں چھوڑتا۔ میری یہ حالت ہو گئی ہے کہ اگر میں دن بھر میں دس بیس صفحے علامہ کے بارے میں نہ لکھ لوں، تو ایسا محسوس ہوتا ہے، جیسے کئی روز کا فاقہ ہے"...... بعد میں معلوم ہوا کہ یہ صاحب علامہ پر لکھنے کا معاوضہ فی صفحے کے حساب سے وصول کرتے ہیں اور فاقوں سے بچنے ہی کے لیے یہ شغل اختیار کر رکھا ہے۔ ہمیں ان صاحب سے ہمدردی پیدا ہوگئی کہ وہ بیروزگاری کی وجہ سے علامہ پر کتابیں لکھنے کے لیے مجبور ہیں اور علامہ سے ہماری عقیدت میں کچھ اضافہ ہو گیا کہ وہ مرنے کے بعد بھی بے روزگاروں کو روزگار مہیا کر رہے ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ اقبال کا کلام پڑھنے سے زندگی کے بہت سے مسائل حل کرنے میں مدد ملتی تھی۔ اب صرف روزگار کا مسئلہ حل ہوتا ہے، اسی لیے تو اقبال کے نام پر قائم شدہ اداروں کو ایمپلائمنٹ ایکسچینج سے تشبیہ دی جاتی ہے۔

علامہ اقبال پر جو کتابیں لکھی جا رہی ہیں، وہ دو طرح کی ہیں: ایک تو وہ جن میں ان کے کلام کی خصوصیات بیان کی جاتی ہیں۔ وہ اس طرح کہ پہلے ایک عنوان قائم کیا، تھوڑی سے تمہید لکھی اور پھر عنوان کی مناسبت سے شعر درج کر دیے۔ مثلاً عنوان اگر "شاہین" ہے تو تمہید کچھ اس

طرح کی ہوگی...... ''شاہین ایک پرندہ ہے، جو چیل سے کچھ بڑا ہوتا ہے اور گدھ سے چھوٹا۔ یہ پہاڑوں کی چٹانوں پر رہتا ہے۔ قصرِ سلطانی کے گنبد کے قریب نہیں جاتا کہ کہیں اسے پکڑ نہ لیا جائے۔ علامہ کو اس پرندے سے بے حد پیار تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ کچھ شاہین ان کے سامنے ہر وقت موجود رہیں، لیکن یہ پرندہ چونکہ آسانی سے دستیاب نہیں ہوتا، اس لیے انھوں نے کچھ کبوتر پال رکھے تھے۔ انھیں کو دیکھ کر شاہین کے بارے میں شعر لکھا کرتے تھے۔ واضح رہے کہ اس شاہین کا شاہین غازی پوری سے کوئی تعلق نہیں، کیونکہ مؤخر الذکر پرندہ نہیں، شاعر ہے''...... اس تمہید کے بعد وہ تمام شعر درج کر دیے جائیں گے، جن میں شاہین کا ذکر ملتا ہے۔

دوسری طرح کی کتابیں وہ ہیں جن میں تحقیق کا شوق پورا کیا جاتا ہے۔ یہ تحقیق کچھ اس قسم کی ہوتی ہے کہ علامہ کوٹ کے ساتھ شلوار کا اور شیروانی کے ساتھ تہمد کا استعمال کرتے تھے یا اس کے برعکس عمل کرتے تھے۔ ان کے حقّے میں نہر کا پانی استعمال ہوتا تھا یا کنویں کا۔ جن مکانوں میں انھوں نے وقتاً فوقتاً رہائش اختیار کی، ان میں علامہ سے پہلے اور بعد میں کون کون رہائش پذیر تھے۔ علامہ کے ملازم علی بخش کا شجرہ نسب کیا تھا اور وہ جس گاؤں کا رہنے والا تھا اس کی زرعی پیداوار کیا ہے۔

یہ واقعہ تو ہم آپ کو سنا ہی چکے ہیں کہ ''اقبال اور حیدر آباد'' اور ''اقبال اور بھوپال'' [illegible] کتابوں سے متاثر ہو کر ایک صاحب نے ''اقبال اور ٹنڈو آدم'' کے نام سے ایک کتاب لکھ ڈالی۔ ان سے پوچھا گیا کہ علامہ اقبال تو کبھی ٹنڈو آدم نہیں گئے تھے، پھر آپ نے اس کتاب میں کیا ثابت کیا ہے۔ کہنے لگے، ''یہی ثابت کیا ہے کہ وہ ٹنڈو آدم کبھی نہیں گئے تھے۔''

اس صورتِ حال سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اقبال پر کتابیں لکھنا جتنا آسان ہے، انھیں پڑھنا اتنا ہی مشکل ہے۔ ہم چونکہ علامہ اقبال کے لفظوں میں ''تن آسان'' واقع ہوئے ہیں اس لیے ہماری کوشش یہ ہوتی ہے کہ مشکل کام دوسرے کریں اور ہم انھیں داد دیتے رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہمارے پاس اقبال کے بارے میں کوئی کتاب تحفۃً آتی ہے تو ہم یہ تحفہ جناب [illegible] آبادی کی خدمت میں پیش کر دیتے ہیں کہ انھیں کتابوں کے فلیپ اور فہرست مضامین پڑھنے کا بہت شوق ہے۔ لیکن پچھلے دنوں جب ماہنامہ ''شاعر'' بمبئی کا اقبال نمبر ہمیں موصول ہوا، تو اس کی غیر معمولی ضخامت کے پیشِ نظر اسے جناب [illegible] جیسے نازک خیال کے لائق نہ سمجھا کہ وہ [illegible]

بوجھ تو اٹھا نہیں سکتے، اتنا وزنی رسالہ کیا اٹھائیں گے۔ لہٰذا ہم نے خود ہی اس کی ورق گردانی شروع کر دی۔ جوں جوں ہم ورق پلٹتے گئے، ایسا محسوس ہوا، جیسے یہ اقبال پر چھپنے والی عام کتابوں اور رسالوں سے کوئی مختلف چیز ہے۔ اس کے بعد ہم نے ذرا غور سے اس کا مطالعہ کیا تو معلوم ہوا کہ مختلف ہی نہیں، بہت کام کی چیز ہے۔

''شاعر'' کے ایڈیٹر افتخار امام صدیقی ہیں۔ یہ وہی جوان رعنا ہیں، جو نہایت عمدہ غزل کہتے ہیں اور کہنے سے زیادہ پڑھنے میں کمال رکھتے ہیں۔ ان کا ترنم ایسا خوبصورت ہے کہ لفظ و معنی سے زیادہ اصوات کا زیر و بم سننے والوں کو متاثر کرتا ہے۔ وہ اپنی تمام غزلوں کو ایک ہی جیسے ترنم کی لاٹھی سے نہیں ہانکتے، ہر غزل کا ترنم جداگانہ ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ پہلے دُھن بناتے ہیں اور پھر اس کے مطابق الفاظ کا انتخاب کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دُھن چل جاتی ہے اور غزل بیاض میں پڑی رہ جاتی ہے یا کسی رسالے میں چھپ کر سرمۂ دیدۂ اہلِ نظر بن جاتی ہے۔ بشرطیکہ کتابت کسی اچھے کاتب نے کی ہو۔ افسوس کہ ابھی تک ہمارے ہاں موسیقی کو تحریری صورت میں ضبط کرنے کا رواج نہیں ہوا۔ جب یہ کام شروع ہوگا، تو پہلی کتاب جو چھپے گی، وہ افتخار امام صدیقی کا دیوان ہوگا۔

افتخار امام صدیقی مشاعروں کے مقبول ترین شاعر ہیں۔ ہندوستان میں شاید ہی کوئی بڑا مشاعرہ ہوگا، جس کا تصور ان کے بغیر کیا جا سکے۔ پاکستان میں بھی ان کی بہت مانگ ہے۔ ایک مرتبہ یہ تجویز پیش کی گئی تھی کہ جس طرح پاکستان اور ہندوستان کے درمیان سامانِ تجارت کا تبادلہ ہوتا ہے، اسی طرح اگر جناب صہبا لکھنوی کا افتخار امام صدیقی سے تبادلہ کر لیا جائے تو بہت اچھا ہو۔

موصوف کا تعلق ایک ممتاز ادبی گھرانے سے ہے۔ وہ علامہ سیماب اکبر آبادی کے پوتے اور اعجاز صدیقی مرحوم کے صاحبزادے ہیں۔ وہ اس گھرانے کی ادبی روایات کے امین ہیں۔ رسالہ ''شاعر'' ان کے دادا نے جاری کیا تھا، اسے وہ باقاعدگی سے شائع کرتے ہیں۔ صرف شائع کرنا کوئی کمال نہیں، کمال کی بات یہ ہے کہ آج ''شاعر'' صرف ہندوستان میں نہیں، ساری اردو دنیا میں پڑھا جاتا ہے۔ یہ ایک بہترین ادبی رسالہ ہے۔ افتخار امام صدیقی جس لگن، محنت اور ذوق و شوق سے اسے مرتب کرتے ہیں، وہ کچھ انھی کا حصہ ہے۔ اس رسالے کے کئی خاص نمبر شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔

''شاعر'' کے اقبال نمبر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ محض منتشر اور مختلف تحریروں کا

مجموعہ نہیں، بلکہ اسے ایک خاص منصوبے کے تحت مرتب کیا گیا ہے۔ گو اس میں اقبال کی فکر اور شاعری پر چند مقالے ہیں، لیکن اس کا اصل موضوع اقبال کی حیات اور تصانیف ہیں۔ مرتب نے بہت سے مفید مضامین دوسروں سے لکھوائے ہیں اور بہت کچھ خود بھی لکھا ہے۔ انھوں نے بلاشبہ اس نمبر پر بے حد محنت کی ہے۔ اگر اتنی محنت وہ اپنی شاعری پر کرتے، تو آج اُن کا شمار ہندوستان کے بڑے شاعروں میں ہوتا۔

اس نمبر میں اقبال کے حوالے سے بہت سے نوادر جمع کر دیے گئے ہیں۔ غیر مطبوعہ خطوط، کمیاب تصویریں، تحریروں کے عکس اور نہ جانے کیا کیا کچھ ہے۔ آفتاب اقبال اور والدۂ آفتاب اقبال سے اکبر علی خاں عرشی زادہ نے جو تحریری انٹرویو لیے تھے، وہ بھی پہلی مرتبہ اس نمبر میں شائع ہوئے ہیں۔ پاکستان میں شائع شدہ چند کتابوں کے مکمل متن بھی اس میں ہیں۔ ان کتابوں سے ہندوستانی قارئین کو پہلی مرتبہ استفادے کا موقع ملے گا۔ پاکستانی کتابوں میں محمد امین زبیری کی "خدوخال اقبال" بھی ہے۔ حیرت ہے کہ افتخار امام صدیقی نے اسے ایک بڑی علمی تصنیف قرار دیا ہے۔ اگر موصوف اس کتاب پر ہمارا کالم دیکھ لیتے ہیں تو معلوم ہو جاتا کہ وہ ہر مہینے اس قسم کی ایک کتاب خود تصنیف کر سکتے ہیں۔

اس نمبر کی خوبیاں اپنی جگہ، بعض خامیاں ایسی ہیں جو نہ ہوتیں، تو اچھا تھا۔ مثلاً کسی محقق اعظم نے علامہ اقبال کی تاریخ ولادت اور والد کے نام کے بارے میں جو مضامین لکھے ہیں، ان کا لب و لہجہ، عامیانہ ہی نہیں، احمقانہ بھی ہے۔ حیرت ہے کہ افتخار امام جیسے نستعلیق شخص نے ان مضامین کو کیسے شائع کر دیا۔ ان مضامین میں کوئی نئی بات نہیں ہے، سوائے اس کے کہ معروف باتوں کو نہایت زہریلے انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اگر محقق اعظم علامہ اقبال کی ولادت و ولدیت کی بحث میں پڑنے کی بجائے خود اپنی ولادت کے بارے میں کچھ فرماتے تو بہتر تھا۔ کم از کم یہ معلوم ہو جاتا کہ موصوف کون ہیں، کیا ہیں اور کیوں ہیں؟

(۲۳ر فروری ۱۹۸۹ء)

راغب کا کلام عروضی غلطیوں اور غیر عروضی خوبیوں سے پاک ہوتا ہے

جوش ملیح آبادی بلاشبہ ہماری زبان کے ایک بہت بڑے شاعر ہیں۔ ان کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور آئندہ بھی لکھا جائے گا، لیکن جیسی کتاب راغب مراد آبادی نے شائع کی ہے، ویسی کسی نے اب تک لکھی ہے نہ آئندہ کوئی لکھے گا۔ ہمارے کالم میں چونکہ لاغر مراد آبادی کا ذکر آتا رہتا ہے، اس لیے یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ راغب و لاغر دو الگ الگ شخصیات ہیں۔ اگرچہ دونوں کے تخلص چار حرفی ہیں اور ان میں سے تین حرف (الف۔ غ۔ ر) مشترک ہیں، اس کے باوجود ان دونوں میں کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں۔ راغب صاحب فی البدیہہ شعر کہنے میں اپنی مثال آپ ہیں، اسی لیے ان کا کلام ان شاعروں سے مختلف ہے، جو غور و فکر کے بعد اور سوچ سمجھ کر شعر کہتے ہیں۔ راغب صاحب کی فی البدیہہ گوئی کا کمال دیکھنا ہو تو کسی مشاعرے میں چلے جایئے، جہاں وہ معلن کے فرائض انجام دے رہے ہوں۔ وہ ہر شاعر کو بذریعہ رباعی متعارف کراتے ہیں۔ رباعی کے چار مصرعوں میں وہ شاعر کا نام، ولدیت اور سال پیدائش اس خوبصورتی سے نظم کر دیتے ہیں کہ ان کی قوت شعر گوئی اور سننے والوں کی قوت برداشت پر حیرت ہوتی ہے۔ عالم یہ ہے کہ ان کی روزمرہ گفتگو بھی بحر ہزج مثمن سالم میں ہوتی ہے اور ردیف و قوافی کا اہتمام ایسا ہے کہ وہ کہیں اور سنا کرے کوئی۔ عروض پر ان کی نظر بہت گہری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام عروضی غلطیوں اور غیر عروضی خوبیوں سے پاک ہوتا ہے۔

راغب صاحب کی دوسری خوبی یہ ہے کہ وہ حضرت جوش ملیح آبادی سے بہت قریب تھے۔ ان کو خاص الخاص مصاحب کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ جوش صاحب انھیں بے حد عزیز رکھتے تھے۔ ان کا ثبوت جوش صاحب کے وہ خطوط ہیں جو ماہنامہ "افکار" کراچی کے شمارۂ خصوصی

"یادِ جوش" (۱۹۸۲ء) میں شائع ہوئے تھے۔ بے تکلفی کا اظہار خطوں ہی سے نہیں، لفافوں سے بھی ہوتا ہے۔ "افکار" کے مذکورہ شمارے میں تین لفافوں کے عکس شائع کیے گئے ہیں۔ ان پر راغب صاحب کا نام بخطِ جوش اس طرح درج ہے:

۱۔ حضرت راغب مرادآبادی (کاش ان سے ہوتی مری شادی)

۲۔ حضرت راغب مرادآبادی (سراپا ایک صاحب زادی دوشیزۂ کوہ و وادی)

۳۔ اقلیمِ جمال و مقال کی شاہزادی مس راغب مرادآبادی

ان لفافوں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ خطوں میں کیا کچھ ہوگا۔

راغب صاحب نے جوش سے اپنے بے تکلفانہ مراسم کا یہی فائدہ نہیں اٹھایا کہ ان سے اپنے کلام کے بارے میں کئی تعریفی اسناد لکھوائیں، بلکہ یہ کارنامہ بھی انجام دیا کہ ان سے بہت سے سوالوں کے جواب حاصل کر کے کتابی صورت میں مرتب کر دیے۔

اس وقت یہی کتاب ہمارے پیشِ نظر ہے جو "مکالماتِ جوش و راغب" کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ یہ کتاب اس طرح وجود میں آئی کہ راغب صاحب ایک کاغذ پر کچھ سوال لکھ کر جوش صاحب کو پڑھ کر سناتے اور ہر سوال کے آگے جوش صاحب کا جواب لکھ کر کاغذ کے آخر میں موصوف سے دستخط کرا لیتے۔ راغب صاحب نے کل ۵۵۵ سوال کیے۔ جوش صاحب نے [illegible] سوالوں کے جواب مصلحتاً نہیں دیے، باقی سب سوالوں کے جواب عنایت فرمائے۔ بیشتر جواب دو تین لفظوں میں ہیں۔ کہیں کہیں آٹھ دس لفظ بھی نظر آتے ہیں۔

راغب صاحب نے کتاب کو "مستند" بنانے کے لیے اصل مسودات کے عکس شائع کیے ہیں۔ حضرت لاغر مرادآبادی کا کہنا ہے کہ یہی بات کتاب کو غیر مستند بناتی ہے کیونکہ سوال و جواب دونوں راغب صاحب کے قلم سے ہیں، نیز سوالوں اور جوابوں کے درمیان سادہ جگہ خاصی ہے اس لیے اس کا امکان ہے کہ کاتب نے جوش صاحب کے دستخط حاصل کرنے کے بعد بھی اضافے کیے ہوں یا جوابات کو تبدیل کر دیا ہو۔ لاغر صاحب نے اس کے ثبوت میں یہ دلیل دی ہے کہ کتاب کے صفحہ ۱۰۰ پر یہ سوال ملتا ہے، "میر تقی میر نے سودا اور خواجہ میر درد کو پورا اور میر سوز کو آدھا شاعر تسلیم کیا ہے۔ اپنے معاصرین میں آپ کن شعراء کو پورا اور کن شعراء کو آدھا شاعر مانتے ہیں؟" جوش صاحب کی طرف سے اس کا یہ جواب درج کیا گیا ہے، "راغب مرادآبادی اور فراق

گورکھ پوری۔" گویا راغب پورے شاعر ہیں اور فراق آدھے۔ جوش صاحب لاکھ "راغب پسند" سہی لیکن یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ فراق کو ان کے مقابلے پر آدھا شاعر کہیں۔

لاغر صاحب کی اس رائے سے ہمیں اتفاق نہیں ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی جب احمد مشتاق کو فراق سے بڑا شاعر قرار دے سکتے ہیں تو جوش کے لیے فراق کو راغب کے مقابلے پر آدھا شاعر قرار دینے میں کیا قباحت ہو سکتی ہے؟

لاغر صاحب نے ایک اور سوال اور اس کے جواب (ص ۲۶) کے بارے میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ دونوں جوش کی وفات کے بعد کا اضافہ معلوم ہوتے ہیں۔ سوال یہ ہے، "راغب صاحب کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟" جوش کا جواب یہ ہے، "راغب صاحب کا زود گوئی میں کوئی جواب ہی نہیں اور یہ خوش گو بھی ہیں، جو ایک نادر بات ہے۔" راغب صاحب نے سوال کے آگے قوسین میں یہ لکھا ہے، "یہ جناب زیبا ردولوی نے پوچھا۔" لاغر صاحب فرماتے ہیں کہ جوش اور زیبا دونوں کا انتقال ہو چکا ہے۔ ہم کس سے پوچھیں کہ اصل معاملہ کیا ہے؟

لاغر صاحب کی خدمت میں عرض ہے کہ بدگمانی اچھی چیز نہیں۔ جوش صاحب جب اپنے قلم سے راغب صاحب کو "سراپا ایک صاحبزادی" لکھ سکتے ہیں تو خوش گو کیوں نہیں کہہ سکتے۔ یہ مذاق کی باتیں ہیں، ان کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔

اس کتاب کے فلیپ نگار محمد علی صدیقی فرماتے ہیں کہ یہ کتاب ایک ایسا آئینہ ہے جو مفکر جوش نے شاعر جوش کو دکھایا۔ لیکن افسوس کہ ہمیں اس کتاب میں مفکر جوش نظر آیا نہ شاعر جوش۔ آئینہ ضرور نظر آیا، لیکن وہ راغب صاحب کے سامنے ہے۔ موصوف کے بیشتر سوال ایسے ہیں جیسے وہ جوش جیسے عظیم شاعر سے نہیں، کسی فلم ایکٹر سے انٹرویو لے رہے ہوں۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمایئے:

س: آپ کو کون سے پھل پسند ہیں؟

ج: آم، میٹھا، لیموں اور گنا۔

س: سبزیاں؟

ج: صرف بھنڈی۔

س: دالیں؟

ج: ماش کی دھوئی دال۔

س: خشک میووں میں؟

ج: پستہ۔

س: پھولوں میں؟

ج: موگرا۔

س: عطر؟

ج: ہماری کوئی خاص پسند نہیں۔

س: مٹھائی؟

ج: برفی۔

س: آپ صبح اور شام نہاتے ہیں۔ایک بار نہانے میں کتنا وقت صَرف فرماتے ہیں؟

ج: میرے چالیس منٹ دونوں وقت میں صَرف ہو جاتے ہیں۔

س: چائے دن میں کتنی بار پیتے ہیں؟

ج: صرف دو بار۔

محمد علی صدیقی سے گزارش ہے کہ ان سوال و جواب میں اگر مفکر جوش اور شاعر جوش کا سراغ ملے تو ہمیں ضرور مطلع فرمائیں۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ راغب صاحب نے یہ کتاب جوش صاحب کو بدنام کرنے کے لیے شائع کی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو کتاب میں اس قسم کے سوال و جواب شامل نہ ہوتے۔

س: ہم جنس پرستی کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

ج: یہ بھی فطری جذبہ ہے۔ ہر فطری جذبے کو روکنے سے نفسیاتی بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔

افسوس کے اس قسم کے بہت سے سوال اور ان کے جواب ہم نقل نہیں کر سکتے۔ شاید ایسے ہی سوالات سے بیزار ہو کر ایک جگہ جوش صاحب نے اپنے قلم سے لکھا ہے، "آج کے تمام سوالات احمقانہ ہیں۔" (ص ۳۶) ممکن ہے بعض لوگوں کو اس کتاب کے تمام سوالات احمقانہ نظر آئیں، لیکن ایسا نہیں ہے۔ بعض سوالات "مفکرانہ" بھی ہیں، مثلاً

س: آپ نے متعدد شہروں کی طوائفوں کو دیکھا ہوگا، ان کا گانا سنا ہوگا۔ کس شہر کی طوائفوں کو

حسن و جمال تہذیب کے اعتبار سے بہتر پایا؟

ج: لکھنؤ۔

س: ایک خاندان میں کتنے بچے ہونا چاہئیں؟

ج: ایک بھی نہ ہو، تو اچھا ہے۔ زندگی کے درندے کی خوراک ہم کیوں پیدا کریں۔

س: آپ نے انگریزی، اُردو اور دیگر مشرقی السنہ کے کن نقادوں کی کتابوں کا مطالعہ کیا ہے؟

ج: یاد نہیں۔

س: آپ نے اپنی محبوباؤں سے مراسلت بھی کی ہوگی؟ مواصلت زیادہ اور مراسلت کم رہی۔

س: کیا آپ نے اپنی کسی محبوبہ کے ساتھ تصویر کھنچوائی ہے؟

ج: ہاں ہاں کھنچوائی ہے۔

س: صنفِ نازک میں آپ نے اودھ، یو پی، جنوبی ہند، پنجاب، سندھ، کس صوبے یا قطعۂ ارض کی عورت کو سب سے بہتر پایا، باعتبارِ کشش حسن و جمال؟

ج: ہمارا تو سابقہ یو پی سے پڑا۔

جوش ملیح آبادی بلاشبہ ہماری زبان کے ایک بڑے شاعر ہیں، مگر اس کتاب میں ان کی بڑائی، راغب مراد آبادی کی فنکاری کے سامنے ماند پڑتی نظر آتی ہے۔

(۶ر اپریل ۱۹۸۹ء)

اشتعال انگیز تنقید

ہمارے ہاں تنقید کی روایت خاصی صحت مند ہے۔ لیکن یہ صحت مندی، بقول شخصے، ذیابیطس کے مریض کی سی ہے، جو دیکھنے میں اچھا بھلا دکھائی دیتا ہے، لیکن اندر سے کھوکھلا ہوتا ہے۔ اردو میں ادب کم تخلیق ہوتا ہے، ادب پر تنقیدیں زیادہ لکھی جاتی ہیں۔ دیوانِ غالب ہی کی مثال لیجیے۔ اس مختصر سے دیوان پر جو تنقیدی طومار باندھا گیا ہے، وہ منوں کے حساب سے ہے۔ شاید ہی اردو کوئی نقاد ہوگا جس نے غالب پر طبع آزمائی نہ کی ہو، اور ڈیڑھ دو درجن مقالے لکھ کر غالب شناسی کا حق ادا نہ کیا ہو۔ بعض نے تو ایسی ضخیم کتابیں بھی تصنیف کر ڈالی ہیں، جن میں متداول دیوانِ غالب ہی نہیں، پورا نسخۂ حمیدیہ بھی انڈیل دیا گیا ہے، تاکہ کوئی یہ اعتراض نہ کر سکے کہ نقاد نے غالب کا پورا اردو کلام نہیں پڑھا...... حالانکہ اس کے بعد بھی یہ اعتراض اپنی جگہ قائم رہتا ہے۔ کلامِ غالب نقل کرنا اور بات ہے، اسے سمجھنا اور بات ہے!

بیشتر نقاد تنقید اس لیے لکھتے ہیں کہ کوئی دوسرا کام کرنا یعنی کوئی شریفانہ پیشہ اختیار کرنا، ان کے بس میں نہیں ہوتا وہ دوسروں کی کتابوں میں تبصروں کے اقتباسات پڑھ کر نیا مقالہ لکھنے میں مہارت رکھتے ہیں۔ ان کی کوشش ہوتی ہے کہ ان کی تحریریں پڑھ کر کوئی ناخوش نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر تنقیدی جائزے مردم شماری کی رپورٹوں سے مماثلت رکھتے ہیں۔ کسی صنفِ ادب پر گفتگو کرتے ہوئے کوئی اہم اور غیر اہم نام چھوٹنے نہیں پاتا۔ ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ ایک مشہور نقاد نے اردو غزل کا ایک جائزہ لکھ کر کسی رسالے میں چھپوایا تھا۔ اس میں انھوں نے اپنے بہت سے غیر معروف اہلِ محلہ کے نام بھی شامل کر دیے تھے۔ جب یہ مقالہ کتابی صورت میں چھپا، تو ان غیر معروف ناموں کی جگہ دوسرے غیر معروف نام تھے۔ اس تبدیلی کی وجہ یہ معلوم ہوئی کہ نقادِ موصوف نے مکان تبدیل کر لیا تھا، اس لیے پرانے اہلِ محلہ کی جگہ نئے اہلِ محلہ کے ناموں کو کتاب کی زینت بنایا گیا۔

کچھ نقاد ایسے ہوتے ہیں کہ وہ لکھتے تو بہت ہیں، لیکن یہ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کیا لکھتے ہیں۔ غالب نے شاید انھیں کے لیے کہا تھا:

ع مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

ایک ایسے ہی نقاد سے جب یہ پوچھا گیا کہ آپ کی باتیں سمجھ میں کیوں نہیں آتیں، تو انھوں نے فرمایا، ''یہ اردو زبان کی خامی ہے کہ وہ اعلیٰ درجے کے تنقیدی خیالات کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ چونکہ اُردو میں فلسفیانہ خیالات کے اظہار کی روایت نہیں ہے، اس لیے میرا اندازِ تحریر پڑھنے والوں کے لیے نامانوس ہے۔'' حالانکہ اصل وجہ یہ ہے کہ یہ صاحب جو کچھ انگریزی میں پڑھتے ہیں، اُسے ہضم کیے بغیر اُردو میں منتقل کر دیتے ہیں اور یہ نہیں جانتے کہ غیر منہضم غذا کی طرح غیر منہضم علم بھی نقصان دہ ہوتا ہے۔ مستعار خیالات کی بناء پر اس قسم کے نقادوں کی تحریروں کو ''نقد مستعار'' کہا جاتا ہے۔

نقادوں کی ایک قسم پچھلے دس برسوں میں منظرِ عام پر آئی ہے۔ انھیں آپ تقریباتی نقاد کہہ سکتے ہیں۔ ان کا کام یہ ہے کہ کتابوں کی رونمائیوں میں تنقید کے نام پر قصیدہ خوانی کرتے ہیں۔ آج کل بیشتر لکھنے والے، لکھ کر نہیں، اپنی تعریف سن کر خوش ہوتے ہیں۔ اسی لیے لکھنے پر اتنی توجہ نہیں کی جاتی جتنی اپنے بارے میں لکھوانے پر۔ تقریباتی نقاد اسی صورتِ حال کی پیداوار ہیں۔ کتاب کسی موضوع پر ہو یا اس کے بارے میں وہ سب کچھ لکھ دیں گے جو کلیاتِ میر یا دیوانِ غالب کے بارے میں لکھا جا سکتا ہے۔ بعض تقریباتی نقاد تو اس حد تک فراخ دل واقع ہوئے ہیں کہ وہ ممدوح کا نام تبدیل کر کے ایک ہی مضمون ہر تقریب میں پڑھ دیتے ہیں، کیونکہ انھیں معلوم ہے کہ اس قسم کے مضامین جب تقاریب میں پڑھے جاتے ہیں تو انھیں کوئی نہیں سنتا۔ دیباچے اور فلیپ لکھنے والے نقاد بھی اسی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایک ایسے نقاد سے جب ہم نے شکایت کی کہ آپ جھوٹی تعریف کر کے لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں، تو انھوں نے فرمایا، ''جب سچی تعریف کرنے کے لیے کوئی چیز موجود نہ ہو تو جھوٹی تعریف کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔''

نقادوں کی اور بھی بہت سے قسمیں ہیں، لیکن اس مختصر کالم میں ان سب کے تذکرے کی گنجائش نہیں نکل سکتی، کیونکہ ہم کالم لکھ رہے ہیں، ڈاکٹر عبادت بریلوی کی طرح اردو تنقید کے ارتقا پر پی ایچ ڈی کا مقالہ نہیں لکھ رہے۔ لہٰذا بحث کو سمیٹتے ہوئے ہم نقادوں کے ایک ایسے گروہ کا

ڈر کر بیٹھ گئے جس کے اراکین کی تعداد کچھ زیادہ نہیں ہے۔ ان نقادوں کو کتابوں کی تقریبات میں بلایا جاتا ہے، نہ ان سے دیباچے اور فلیپ لکھنے کی فرمائش کی جاتی ہے، اور نہ ان سے کوئی خوش دلی سے ملتا ہے۔ اگر کسی شاعر یا افسانہ نگار کو اس گروہ کا کوئی نقاد نظر آ جائے تو وہ فوراً کترا کے نکل جاتا ہے کہ خدا جانے سلام کے جواب میں کیا کچھ سننا پڑے۔ اس گروہ میں صرف دو نقاد شامل ہیں۔ اتفاق سے دونوں کا ایک ہی نام ہے اور نام "شمیم احمد" ہے۔

ایک شمیم احمد تو وہ ہے جو ادب کے بنیادی مسائل پر لکھتا ہے۔ دوسرا شمیم احمد ادب کے بنیادی مسائل کو موضوع بناتا ہے۔ ایک شمیم احمد فکر انگیز سوال اٹھاتا ہے، دوسرا شمیم احمد کسی کو سر اٹھانے نہیں دیتا۔ ایک شمیم احمد مسائل پر سوچتا ہے اور دوسروں کو سوچنے کی راہ دکھاتا ہے۔ دوسرا شمیم احمد خود سوچتا ہے نہ دوسروں کے لیے سوچنے کی گنجائش چھوڑتا ہے اور اپنے حریف سے باآواز بلند کہتا ہے، "آؤ ایک پکڑ کشتی کی میرے تمہارے درمیان ہو جائے۔" ایک شمیم احمد قلم سے لکھتا ہے اور دوسرا نیزے کی انی سے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ دراصل شمیم احمد ایک ہی ہے، جس کے دو رخ ہیں: ایک جمالی، دوسرا جلالی۔ جب وہ کسی ادیب کو سمجھنا چاہتا ہے تو جمالی بن جاتا ہے اور جب ادیب کو کچھ سمجھانا چاہتا ہے تو جلالی کیفیت میں آ جاتا ہے۔ لیکن ہمیں اس سے اتفاق نہیں۔ شمیم احمد کے نام سے جو کچھ چھپا ہے، وہ ہماری نظر میں ہے۔ اس میں واضح طور پر دو اُسلوب نظر آتے ہیں۔ ایک اُسلوب دامن کش دل ہوتا ہے اور دوسرا کانٹے کی طرح پاؤں میں چبھتا ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی شخص ایسے دو متضاد اسالیب میں لکھ سکتا ہو۔ ہمارا خیال ہے کہ لکھنے والے تو دو الگ الگ شخص ہیں لیکن وہ ایک ہی نام سے لکھتے ہیں اور "محمد عمر نور الٰہی" کی طرح ان دونوں میں اتنا اتفاق ہے کہ ایک ہی کتاب میں اپنی تحریریں جمع کر کے چھپوا دیتے ہیں۔ ہم اپنے اس موقف کی دلیل میں "سوال یہ ہے" کے نام سے اسی مہینے شائع ہونے والی کتاب پیش کر سکتے ہیں جس میں ایک طرف اقبال، ابوالفضل صدیقی اور غلام عباس کے بارے میں نہایت عالمانہ قسم کے مقالے ہیں اور دوسری طرف محترم احمد ندیم قاسمی، شمس الرحمٰن فاروقی اور شہزاد منظر سے متعلق "کالمانہ" قسم کی تحریریں ہیں۔ "عالمانہ" اور "کالمانہ" کی اصطلاحیں ہم نے قافیہ پیمائی کے شوق میں استعمال نہیں کیں، بلکہ یہ حقیقت ہے کہ جہاں اول الذکر قسم کے مضامین پڑھ کر شمیم احمد کے لیے دل سے دعائے خیر نکلتی ہے، وہیں ثانی الذکر قسم کے مضامین کے مطالعے کے بعد ان لوگوں کے لیے دل

میں ہمدردی کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں، جن کے بارے میں مضامین لکھے گئے ہیں۔ یہ دونوں طرح کی تحریریں اگر ایک شمیم احمد نے لکھی ہیں، تو حیرت ہے کہ ہمارے ہاں کیسے کیسے فن کار پڑے ہیں۔

"سوال یہ ہے" ایک ایسا تنقیدی مجموعہ ہے، جو بیک وقت فکر انگیز بھی ہے اور اشتعال انگیز بھی...... فکر انگیز اس لیے کہ شمیم احمد کے لیے ادب وقت گزاری کا کوئی مشغلہ نہیں، بلکہ زندگی کا دوسرا نام ہے۔ وہ اس لیے نہیں لکھتے کہ انھیں لکھنے والوں کی صف میں شامل ہونا ہے، اس لیے لکھتے ہیں کہ وہ ادب کے حوالے سے زندگی کو سمجھنا چاہتے ہیں۔ کتاب کے دیباچے میں انھوں نے لکھا ہے: "اس زندگی کرنے میں جو تجربے، جو حقیقتیں، جو صداقتیں، جو شکستیں اور جراحتیں پائی ہیں، ان پر اپنے تعلق سے سوچا ہے، سو یہ ساری تحریریں بس اسی کا نتیجہ ہیں۔"

اس مجموعے کا پہلا مضمون (فرد، تنہائی، محبت، شاعری اور توحید) ہی ایسا ہے کہ اُسے وہی شخص لکھ سکتا تھا، جس نے زندگی کو ہر انداز سے برتا ہو۔ شمیم احمد نے اُردو غزل کے حوالے سے زندگی کی بنیادی حقیقتوں کو سمجھنے اور ان حقیقتوں کے حوالے سے اُردو غزل کے مزاج کو پرکھنے کی جو کوشش کی ہے، اس بناء پر اگر اس مضمون کو "جدید مقدمۂ شعر و شاعری" کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ شمیم احمد نے جو کچھ لکھا ہے، اُس کے حوالے سے پوری اُردو شاعری کا از سرِ نو جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ اس مضمون سے شمیم احمد کی وسعتِ مطالعہ، سلامتیِ فکر اور نظر کی گہرائی کا ذہن میں خوشگوار تاثر قائم ہوتا ہے۔ اس نوعیت کے کئی اور مضامین بھی اس مجموعے میں شامل ہیں، لیکن ہمیں شمیم احمد کی فکر انگیزی سے زیادہ اشتعال انگیزی سے دلچسپی ہے، لہٰذا ذرا اُس مضمون کا آغاز ملاحظہ فرمایئے جو شہزاد منظر کے بارے میں لکھا گیا ہے اور جس کا عنوان ہے:

"بدباطنی کی شناخت"

"خدا جانے بعض لوگوں کی فطری ذہنیت کا تقاضا ہی ہوتا ہے، یا ان کی سرشت میں بے وقوفی کے ساتھ چالاکی کا بھی کوئی ایسا عنصر پایا جاتا ہے کہ سن و سال کی تبدیلیوں کا ان پر کوئی اثر نہیں پڑتا اور وہ ہر زمانے میں وہیں نظر آتے ہیں، جہاں سے چلے تھے۔ ان میں کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں، جو خود ہی ہمیشہ ایک ہی سطح پر نہیں رہتے، بلکہ دوسروں کو بھی مجبور کر دیتے ہیں کہ ان پر ڈی ڈی ٹی

چھٹر کنے کا دیرینہ کام کرتے رہیں، خواہ یہ کام انھیں پسند ہو یا نہ ہو۔"

ذرا تصور کیجیے جس قصیدے کی تشبیب یہ ہے، اُس کا نفسِ مضمون کیا ہوگا۔ شہزاد منظر کا قصور یہ ہے کہ انھوں نے ایک مضمون لکھا تھا، "محمد حسن عسکری کی شناخت"۔ شمیم احمد نے انھی کا جواب لکھا ہے، جواب کیا لکھا ہے، اچھا خاصا قاتلانہ حملہ کیا ہے۔

اس مجموعے میں دو شخصی خاکے بھی ہیں۔ ایک زمرد حسین مرحوم کا اور دوسرا جمیل جالبی کا۔ زمرد حسین بلوچستان کی ایک کاروباری اور سیاسی شخصیت تھے۔ شمیم احمد کے ان سے گہرے دوستانہ مراسم تھے۔ ان مراسم کے حوالے سے شمیم احمد نے جو کچھ لکھا ہے، وہ ایک خوبصورت شخصی خاکے کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے بارے میں شمیم احمد نے اپنے تجربات و مشاہدات کو اس طرح قلم بند کیا ہے کہ "گفتنی" اور "ناگفتنی" سبھی طرح کی باتیں معلوم ہو جاتی ہیں۔ اس خاکے کو پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ شمیم احمد جس پر مرتے ہیں، اُسے جان سے مارنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ ایسا خاکہ شمیم احمد ہی لکھ سکتے تھے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی سے ان کی والہانہ محبت سونے کی طرح کھری نظر آتی ہے، لیکن یہ سونا ویسا ہی ہے، جس کے بارے میں کہا گیا ہے......

بھاڑ میں جائے وہ سونا، جس سے ٹوٹیں کان

(۲۷/اپریل ۱۹۸۹ء)

فیض، سبطِ حسن اور ابنِ انشاء
اپنی بدنامی کا سامان اپنی زندگی میں کر گئے تھے

ہمارے نام جو خط آتے ہیں، ان میں زیادہ تعداد ایسے خطوں کی ہوتی ہے، جن میں ہماری "غلط بیانیوں" کی تردید کی جاتی ہیں یا ہمیں راہِ راست پر آ جانے کا مشورہ دیا جاتا ہے۔ بعض مکتوب نگار تو اس قدر خفگی کا اظہار کرتے ہیں کہ ازالۂ حیثیت عرفی کا مقدمہ دائر کرنے کی دھمکی بھی دے دیتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ حیثیت عرفی کے ازالے کا سوال وہاں پیدا ہوتا ہے، جہاں کوئی حیثیتِ عرفی ہو۔

ایک مرتبہ ہم نے ایک شاعر صاحب کے مجموعۂ کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ یہ مجموعہ سو (۱۰۰) گرام کے دبیز کاغذ پر چھپا ہے، لیکن شاعری دس گرام وزن کی بھی نہیں۔ اگر شاعری کاغذ کے وزن کے برابر نہیں ہو سکتی تھی تو پھر کاغذ ایسا استعمال کرنا چاہیے تھا کہ جو شاعری کا ہم وزن ہوتا۔ کیونکہ شاعری حسن توازن کا دوسرا نام ہے۔ یہ پڑھ کر جناب شاعر بہت ناراض ہوئے اور انھوں نے ایک ناقابلِ اشاعت قسم کا عتاب نامہ ارسال فرمایا۔ ظاہر ہے کہ اس کا جواب دینا ہمارے لیے ناممکن تھا۔ اتفاقاً ایک مرتبہ اُن سے ملاقات ہو گئی تو فرمایا، "آپ کا شعر فہمی کا خانہ خالی ہے۔ غلطی میری ہے کہ آپ کو اپنا مجموعۂ کلام تبصرے کے لیے بھجوایا۔" ہم نے عرض کیا، "یہ آپ کی پہلی نہیں، دوسری غلطی تھی۔ پہلی غلطی اس وقت کی تھی، جب آپ نے شاعری کے میدان میں قدم رکھا تھا۔"

ہمارے نام جو خط آتے ہیں، ان میں سے بعض اس لائق ہوتے ہیں کہ شائع کیے جائیں، مگر افسوس کہ کالم کی محدود گنجائش کے پیشِ نظر ہم ایسا نہیں کر سکتے۔ اس مرتبہ ہم بطور خاص چند ضروری خطوں کے لیے گنجائش نکال رہے ہیں۔

کچھ عرصہ ہوا ہم نے ایک ہندوستانی صحافی سرور تونسوی کی آپ بیتی پر ایک کالم لکھا تھا۔ اس کتاب میں بہت سے ایسے واقعات ملتے ہیں، جن کا تعلق ہندوستان کی سیاحت کرنے والے پاکستانی شاعروں سے ہے۔ سرور تونسوی نے شراب نوشی کے سلسلے میں بعض پاکستانی شاعروں کو سفلہ پن، بے غیرتی اور گداگری کا طعنہ دیا تھا۔ سرور تونسوی کے الفاظ یہ ہیں:

''پاکستان کے شاعر کئی ماہ ہندوستان میں رہے اور انھوں نے تمام ممکن حربے استعمال کر کے مشاعرے پڑھنے کے لیے دعوت نامے حاصل کیے اور ہر مشاعرے میں بڑے طمطراق سے یہ کہتے رہے کہ پاکستان میں ان کی ٹکر کا کوئی دوسرا شاعر نہیں ہے۔ مگر شراب نوشی کے لیے جو سفلہ پن، بے غیرتی اور گداگری انھوں نے فرمائی، اُسے دیکھتے ہوئے بے شک اس کا یقین ہو گیا کہ ان اوصاف میں واقعی پاکستان کا کوئی شاعر ان کی ٹکر کا نہیں ہے۔''

ہم نے اپنے کالم میں سرور تونسوی کو مناسب الفاظ میں تنبیہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ پاکستانی شاعروں کو بدنام نہ کریں اور اس کے ساتھ ہی ہم نے حکومت پاکستان کو تجویز پیش کی تھی کہ ہمارے جو شعرائے کرام ہندوستان جا کر ساغر و مینا سے شغل فرمانا چاہیں، ان کے لیے شراب کی مفت فراہمی پاکستانی سفارت خانے کی طرف سے ہونی چاہیے تاکہ وہ ہندوستانیوں کے ممنون کرم نہ ہوں۔ اس مقصد کے لیے دہلی کے سفارت خانے میں پریس سیکرٹری اور کمرشل سیکرٹری کی طرح ایک عہدہ ''بوتل سیکرٹری'' کا بھی ہونا چاہیے۔

یہ کالم پڑھ کر ایک ''ہندوستان پلٹ'' شاعر نے، جو گمنام عتاب نامہ لکھا ہے، اس کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

''آپ کا کالم تنگ نظری اور متعصبانہ ذہنیت کا آئینہ دار ہے۔ سرور تونسوی ہندوستان کی کوئی ایسی ثقہ شخصیت نہیں کہ آپ اس کے بیان کو سچ مان کر پاکستانی شاعروں کی تذلیل کریں۔ اگر ایک آدھ شاعر کسی وقت تھوڑی سی پی لیتا ہے، تو اس میں کیا مضائقہ ہے۔ آخر علامہ اقبال اور حافظ شیرازی نے اپنے کلام میں جا بجا شراب کا ذکر بے وجہ نہیں کیا ہے۔ وہ شعراء جو ہندوستان جا کر اُردو کا پرچم بلند کرتے ہیں اور اپنے وطن کا نام روشن کرتے ہیں، ان کے بارے میں توہین آمیز کالم لکھنا اُردو اور پاکستان دونوں کی توہین ہے۔ اس خط کے ساتھ رسالہ ''ظرافت'' کراچی کے ایک مضمون کا عکس بھیج رہا ہوں۔ اس میں آپ کا حساب کتاب برابر کر دیا گیا ہے۔ اس آئینے میں اپنی صورت ملاحظہ فرمائیے۔''

جناب گمنام کی خدمت میں عرض ہے کہ اُردو کا پرچم بلند کرنے اور وطن کا نام روشن کرنے کے لیے ہندوستان جانے کی کیا ضرورت ہے۔ پہلے آپ اپنے وطن میں بیٹھ کر یہ ثابت کیجیے کہ آپ اس کام کے اہل بھی ہیں یا نہیں۔ ''ظرافت'' میں شائع شدہ مضمون ہم نے پڑھا، اس میں ہمارے اس کالم کے خلاف لکھا گیا ہے، جس میں نام نہاد پاکستانی شاعروں کی ہندوستان میں شراب نوشی کا تذکرہ ہے۔ ''ظرافت'' کے ایڈیٹر بزعم خود شاعر ہیں اور اکثر ہندوستان جاتے رہتے ہیں، اس لیے انھوں نے جو کچھ لکھا ہے، وہ ان کے نقطۂ نظر سے بالکل درست ہے۔ مگر ہم سے ان کی ناراضی کی وجہ یہ ہے کہ موصوف اپنا مزاحیہ مجموعۂ کلام ''رنگِ ظرافت'' کا مسودہ لے کر ہمارے پاس آئے تھے کہ اس پر رائے لکھ دیجیے۔ ہم نے کلام دیکھا تو اسے ہر قسم کی رائے سے بے نیاز پا کر رائے لکھنے سے انکار کیا، لیکن اُن کے شدید اصرار پر ہم نے چند جملے لکھ دیے۔ جن کا خلاصہ یہ تھا کہ اس مزاحیہ کلام کو پڑھ کر کلام پر نہیں شاعر پر ہنسی آتی ہے کہ انھوں نے ایک ایسے کام پر محنت کی ہے، جو ان کی بساط سے باہر ہے۔ موصوف اس رائے سے کچھ خوش نہیں ہوئے، مذکورہ مضمون اسی ناخوشی کا سبب ہے۔

مدیر ''ظرافت'' کے بارے میں لکھنے کے لیے بہت کچھ ہے، لیکن ہم نے ان کے چھوٹے بھائی عطاء الحق قاسمی سے اجازت طلب کی ہے۔ قاسمی صاحب برادر خورد ہونے کے باوجود خاصے معقول آدمی ہیں، اس لیے امید ہے وہ مدیر ''ظرافت'' کے بارے میں تفصیل سے لکھنے کی اجازت دے دیں گے۔

کچھ عرصہ ہوا ہم نے محترمہ سرفراز اقبال کی کتاب ''دامنِ یوسف'' پر ایک کالم لکھا تھا۔ اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ جن لوگوں نے یہ کتاب نہیں پڑھی۔ وہ اس کے مطالب سے آگاہ ہو جائیں۔ اس کے بارے میں ہمیں بہت سے خط موصول ہوئے ہیں۔ ایک محترم قاری سید مظفر الاسلام نے عارف والا سے لکھا ہے کہ آپ نے فیض، سبطِ حسن اور ابن انشاء کو بدنام کرنے کی

کوشش کی ہے۔ عرض ہے کہ مرحومین اپنی بدنامی کا سامان اپنی زندگی ہی میں کر گئے تھے۔ ہم نے تو صرف اتنا کیا کہ ان کے کچھ خطوں کے اقتباسات اپنے کالم میں نقل کر دیے۔ معلوم ہوتا ہے کہ محترم مکتوب نگار کچھ ضرورت سے زیادہ محتاط واقع ہوئے ہیں۔ ورنہ دل کے معاملات میں نیک نامی یا بدنامی کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ صرف یہ دیکھا جاتا ہے کہ طالب نے مطلوب تک پہنچنے میں کوئی کسر تو نہیں چھوڑی۔ اس سیاق و سباق میں اگر فیض، سبطِ حسن اور ابن انشاء کے خطوں کا مطالعہ کیا جائے تو وہ ادبی شاہکار نظر آتے ہیں۔ ادبی شاہکار کسی مصنف کی بدنامی کا سبب نہیں ہوتے، بلکہ عزت میں اضافے کا وسیلہ بنتے ہیں۔

اسی سلسلے میں جناب محمد اظہر صدیقی صاحب نے کراچی سے دلچسپ خط لکھا ہے۔ فرماتے ہیں:

"رجعت پسندوں کی ہمیشہ سے یہ عادت رہی ہے کہ وہ ترقی پسندوں کے خلاف لکھنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ آپ نے سرفراز اقبال کے حوالے سے ترقی پسندوں کے خلاف جو کچھ لکھا ہے، آپ کی متعصبانہ ذہنیت اور رجعت پسندی کا کھلا ثبوت ہے۔ کاش آپ کو معلوم ہوتا کہ ذاتی خطوں کے حوالے سے کسی کی کردار کشی کرنا ایک بہت بڑا اخلاقی جرم ہے۔"

ہمیں اپنے رجعت پسند اور مکتوب نگار کے ترقی پسند ہونے سے انکار نہیں، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ محترم مکتوب نگار، ضرورت سے کچھ زیادہ ترقی پسند واقع ہوئے ہیں۔ اگر ہم مذکورہ ادیبوں کے خطوط، اپنے ذاتی وسائل سے حاصل کر کے شائع کرتے، تو شاید ہم "اخلاقی مجرم" ہونے کا الزام بھی تسلیم کر لیتے، لیکن یہ خط تو ایک کتاب میں شامل ہیں اور یہ کتاب اس نے لکھی ہے، جس کے نام یہ خط ہیں۔ رہا کردار کشی والا الزام، تو ہم صرف یہ عرض کریں گے کہ صاحبان کردار کی کردار کشی کوئی نہیں کرتا۔ یہاں تک کہ وہ خود بھی چاہیں، تو یہ کام نہیں کر سکتے۔ بیگم سرفراز اقبال نے فیض، سبطِ حسن اور ابن انشاء کے، جو خطوط شائع کیے ہیں، ان سے ان تینوں ادیبوں کے کردار کی اعلیٰ خصوصیات سامنے آتی ہیں، مثلاً فیض صاحب کے انتقال کے بعد سبطِ حسن نے بیگم سرفراز اقبال کو، جو خط لکھا، اس میں انھوں نے جس انداز سے موصوفہ کے غم کو ہلکا کرنے کا عزم کیا ہے، اس سے ان کی انسان دوستی کا بھرپور اندازہ ہوتا ہے، سبطِ حسن مرحوم کے یہ جملے ایک مرتبہ پھر ذہن

میں تازہ کیجیے۔ "مجھ کو کبھی کبھی فیض پر رشک آتا تھا، ان کو کتنا پیارا چاہنے والا ملا ہے، مگر وہ تو خود بہت ٹوٹ کر پیار کرتے تھے۔ مجھ میں وہ دلداری کی صلاحیت کہاں، لیکن کوشش کروں گا کہ آپ کے غموں کو جہاں تک ممکن ہو، ہلکا کر دوں یا بانٹ لوں۔" کیا یہ سطریں کوئی ایسا شخص لکھ سکتا ہے، جو انسانی ہمدردی کے اعلیٰ جذبے سے محروم ہو؟

اسی سلسلے میں بریگیڈیئر (ریٹائرڈ) نثار احمد قریشی (سیالکوٹ) نے مدیر "تکبیر" کے نام جو خط لکھا ہے، وہ بھی ملاحظہ فرمائیے:

"جناب خامہ بگوش نے کتاب "دامنِ یوسف" کے متعلق بہت تفصیلی تبصرہ رقم فرمایا ہے...... ایک عدد تصویر بھی شاملِ اشاعت کر دی گئی ہے۔ یہ سب دیکھ کر بہت تعجب ہوا اور اضطراب بھی۔ آپ کے یہ خادم تکبیر سے یہ توقع نہیں رکھتے۔ ازراہِ کرم توجہ فرمائیں۔ یہ "نثر میں شاعری" ہو تو ہو "قلم سے عریانی و فحاشی" ضرور ہے۔"

ہم اس سلسلے میں کوئی صفائی پیش نہیں کریں گے۔ موضوع ہی ایسا تھا کہ ہم دل اور قلم پر قابو نہ رکھ سکے۔ اس کے لیے ہم بریگیڈیئر نثار احمد قریشی سے اور ان تمام قارئین سے معذرت چاہتے ہیں، جنھیں ہمارے کالم میں "عریانی و فحاشی" نظر آئی۔

سلمان اطہر صاحب (کراچی) اپنے گرامی نامے میں لکھتے ہیں:

"آپ آخر ایسی کتابوں پر خامہ فرسائی کیوں کرتے ہیں، جو بازار میں دستیاب نہیں ہوتیں۔ آپ کا کالم پڑھ کر اگر کسی کتاب کو تلاش کیا جائے، تو مایوسی ہوتی ہے۔ اس لیے میری تجویز ہے کہ آپ ہندوستانی کتابوں پر اور ایسی کتابوں پر کالم نہ لکھا کریں، جو بازار میں دستیاب نہ ہوں۔ پچھلے ہفتے آپ نے "مکالمات جوش و راغب" پر کالم لکھا تھا، کراچی کی ساری دکانیں دیکھ ڈالیں، مگر یہ کتاب نہیں ملی۔ ازراہِ کرم بتائیے کہ یہ کہاں سے حاصل کی جائے۔ سنا ہے یہ کتاب کینیڈا سے چھپی ہے۔"

سلمان اطہر صاحب کی خدمت میں عرض ہے کہ ہندوستانی کتابوں پر لکھتے ہی اس لیے

ہیں مگر وہ یہاں دستیاب نہیں ہوتیں، مقصد یہ ہوتا ہے کہ پاکستانی قارئین کم از کم ان کتابوں سے واقف ہو جائیں، جو ہماری نظر سے گزرتی ہیں۔ "مکالمات جوش و راغب" کراچی ہی سے شائع ہوئی ہے، نامعلوم وجوہ کی بنا پر پریس کے نام کے ساتھ شہر کا نام نہیں لکھا گیا۔ یہ کتاب راغب مراد آبادی صاحب سے حاصل کی جا سکتی ہے، جن کا پتہ کتاب پر شائع کیا گیا ہے۔ پتہ یہ ہے: بلاک نمبر ۱۶/ ۱۱۰۱، فیڈرل بی ایریا، کراچی۔

(۲۵ مئی ۱۹۸۹ء)

مولانا کوثر نیازی کی خارج از آہنگ اور روایتی شاعری

(۱)

مولانا کوثر نیازی کے بارے میں آپ کی رائے کچھ بھی ہو لیکن یہ مانے بغیر چارہ نہیں ہے کہ ان کی شخصیت بڑی پہلودار ہے۔ ایسی پہلودار کہ ۔

رشکِ آئینہ ہے اس رشکِ قمر کا پہلو
صاف اِدھر سے نظر آتا ہے اُدھر کا پہلو

وہ بیک وقت سیاست، ادب، صحافت اور مذہب کے میدانوں کے شہسوار ہیں اور شہسوار بھی ایسے ۔

نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

یہی وجہ ہے کہ انھوں نے جس تیزی سے مختلف النوع منزلوں تک رسائی حاصل کی ہے، وہ بجا طور پر انھی کا حصہ ہے۔ سیاست میں آئے، تو جماعتِ اسلامی کے ایک معمولی کارکن سے اپنے کیریئر کا آغاز کیا اور وفاداریاں تبدیل کرتے کے فکر انگیز عمل سے گزرتے ہوئے مرکزی وزیر کے منصب تک پہنچ گئے۔ ادبی کارنامہ یہ ہے کہ خارج از آہنگ اور روایتی قسم کی شاعری کی اور جوش ملیح آبادی سے عظیم شاعر ہونے کی سند لے لی۔ اردو میں زرد صحافت کو اس حد تک فروغ دیا کہ ہفت روزہ "شہاب" کو فلمی رسالوں سے زیادہ مقبول اور کثیر الاشاعت بنا دیا۔ مذہب کی طرف آئے تو سرکاری خرچ پر بیسیوں حج اور عمرے کر ڈالے۔ مختصر یہ کہ مولانا صاحب نے زندگی کو ہر رُخ سے دیکھا اور برتا ہے۔ ان کے مشاہدات و تجربات میں جو تنوع اور وسعت ہے، وہ شاید ہی کسی دوسرے فرد کے نامۂ اعمال میں ہو۔ اسی لیے ہمارا جی چاہتا ہے کہ مولانا صاحب اپنے تجربات و مشاہدات کو آپ بیتی کی صورت میں قلم بند کر دیں (کاتب صاحب! یہ جملہ ذرا احتیاط سے کتابت کیجیے۔ آپ ایک مرتبہ "آپ بیتی" کو "باپ بیتی" لکھ چکے ہیں، اب کے ایسا نہ کیجیے گا، کیونکہ یہ جملہ ایک محترم شخصیت کے بارے میں ہے)۔

مولانا کی ایک بات جو ہمیں دل سے پسند ہے، وہ یہ ہے کہ وہ مسلسل اُردو ادب کے خزانے میں اضافہ کرتے رہتے ہیں۔ (یہ دوسری بات ہے کہ ماضی میں ان کا تعلق ایک ایسی پارٹی سے رہا ہے، جو خزانوں کو خالی کرنے میں مہارت رکھتی ہے)۔ ان کی متعدد کتابیں منظرِ عام پر آ چکی ہیں اور بعض (جیسے ''پردہ دور'') شائع ہو کر ضائع ہو چکی ہیں۔ ان کی تازہ ترین تصنیف ''جنھیں میں نے دیکھا'' ہے جو اس وقت ہمارے پیشِ نظر ہے۔ یہ شخصی خاکوں کا مجموعہ ہے، جس میں ۴۷ علمی، ادبی، سیاسی اور مذہبی شخصیات کے خدوخال اُجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ چند خاکے مفصل ہیں، لیکن بیشتر دو دو تین تین صفحوں سے زیادہ نہیں۔ گویا چند خاکے جم کر لکھے گئے ہیں اور باقی میں ہتھیلی پر سرسوں جمائی گئی ہے۔ بہر حال اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہر خاکہ دلچسپ ہے اور متعلقہ شخصیت کے بارے میں بعض نئی معلومات فراہم کرتا ہے۔

کتاب کے دیباچے میں مولانا صاحب فرماتے ہیں:

''وقت کی کج رفتاری یوں تو ہمیشہ ہی ضرب المثل رہی ہے، لیکن مارشل لاء کے پچھلے گیارہ سال میں تو اس کی رفتار کا عالم یوں رہا۔ ع۔ جیسے اک قافلۂ نوحہ گراں گزرے ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے کتنے اہلِ علم عالمِ آخرت کو سدھار گئے۔ شاید وہ اسلام کے نام پر اقتدار کی جنگِ زرگری نہیں دیکھ سکے۔ کتنے ہی سیاستدان خدا کو پیارے ہو گئے۔ شاید وہ گھٹن کے اس ماحول میں جینے سے بیزار ہو چکے تھے۔''

ضیاء الحق مرحوم کے دورِ اقتدار کی ''برائیوں'' کا ذکر فیشن میں داخل ہو چکا ہے۔ ریڈیو، ٹیلیویژن اور سرکاری اخبارات کا اب یہی کام رہ گیا ہے کہ ہر خرابی کا سبب مرحوم ضیاء الحق کے عہدِ اقتدار میں تلاش کیا جائے۔ مولانا صاحب نے بھی اسی روش کی پیروی کی ہے لیکن ایک نئے اُسلوب سے۔ انھوں نے یہ فتویٰ صادر فرمایا ہے کہ جتنے بھی اہلِ علم اور سیاستدان ضیاء الحق کے عہد میں اللہ کو پیارے ہوئے، ان سب کی موت کا سبب ضیاء الحق کی پالیسیاں تھیں۔ الحمدللہ کہ مولانا صاحب نے ان سخت جان عالموں اور سیاستدانوں کو معاف کر دیا ہے، جو ضیاء الحق کے دور میں اسلام کے نام پر جنگِ زرگری دیکھتے اور گھٹن کے ماحول میں سانس لیتے رہے۔ مولانا چاہتے تو ان سخت جانوں کو زندہ رہنے کا طعنہ دے کر شرمسار کر سکتے تھے۔

استاد لاغر مراد آبادی نے ایک دلچسپ سوال اٹھایا ہے، وہ فرماتے ہیں، اگر صدر ضیاء ان

لوگوں کی موت کے ذمہ دار ہیں، جس نے ان کے عہد میں دنیا سے منھ موڑا، تو پھر اس عہد میں بے شمار لوگ پیدا بھی ہوئے ہیں۔ کیا ان کی پیدائش کو بھی صدر ضیاء کے عہد کی خرابیوں میں شمار کیا جائے گا؟ استاد لاغر مراد آبادی نے اپنی بات کی وضاحت کے لیے ایک واقعہ بھی سنایا جو واقعہ کم اور لطیفہ زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ پچھلے دنوں حکمران پارٹی نے یہ اعلان کیا تھا کہ مارشل لاء کے متاثرین پارٹی سے رابطہ قائم کریں تا کہ ان کے ساتھ صدر ضیاء کے عہد میں جو ظلم ہوا ہے، اس کی تلافی کی جا سکے۔ ایک غریب آدمی پارٹی کے دفتر پہنچا اور کہا کہ میری مدد کی جائے۔ میں غریب آدمی ہوں۔ آمدنی کم ہے اور بچے زیادہ ہیں۔ پارٹی والوں نے کہا ہم تو صرف ان لوگوں کی مدد کرتے ہیں، جن پر صدر ضیاء کے عہد میں ظلم ہوا تھا۔ غریب آدمی نے جواب دیا: ''مجھ پر تو سب سے زیادہ ظلم ہوا ہے۔ میرے سارے بچے ضیاء الحق ہی کے اقتدار کے زمانے میں پیدا ہوئے ہیں۔''

معاف کیجیے، سیاست ہمارا موضوع نہیں ہے۔ چونکہ مولانا کوثر نیازی نے اپنی کتاب کے دیباچے میں سیاسی بات کی ہے۔ اس لیے ہمیں مجبوراً کچھ عرض کرنا پڑا۔ ہاں تو مولانا صاحب کی تازہ ترین تصنیف ''جنھیں میں نے دیکھا'' ایک نہایت دلچسپ کتاب ہے۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس سے یہ معلوم جاتا ہے کہ جناب مصنف جب عہدۂ وزارت پر فائز تھے، تو انھوں نے کس کس پر کیا کیا احسانات کیے تھے۔ مثلاً احسان دانش مرحوم کو ان کی کتاب ''جہانِ دانش'' پر اپنی وزارت کی طرف سے پانچ ہزار روپے بطور انعام دیے۔ ظہور الحسن ڈار مرحوم کو پریس ٹرسٹ میں کام دلایا۔ حافظ مظہر الدین مرحوم کو ان کے مجموعۂ نعت کے لیے کاغذ مہیا کیا۔ مولانا زکی کیفی مرحوم کو سرکاری خرچ پر حج کرایا۔ مولانا مفتی محمود مرحوم کو ان کی خواہش پر شاہ فیصل کے جنازے میں شرکت کرنے والے سرکاری وفد میں شریک کیا۔ مولانا غلام اللہ خاں مرحوم کو پیپلز پارٹی کی قیادت نے قتل کرانے کا منصوبہ بنایا تو کوثر نیازی صاحب نے انھیں پیشگی اطلاع دے کر ان کی جان بچائی۔

ان سب مرحومین پر مولانا صاحب نے ایک آدھ احسان کیا ہے، لیکن جوش ملیح آبادی پر تو احسانوں کے دریا بہا دیے۔ جوش صاحب کا شخصی خاکہ خاصا طویل ہے۔ اس میں بہت سی کام کی باتیں آگئی ہیں۔ ۱۹۷۲ء میں جوش صاحب مولانا سے ملے اور ملازمت کی خواہش ظاہر کی۔ پہلی ملاقات کے دوران جوش صاحب نے مولانا کی شان میں تین رباعیاں پیش کیں جن میں سے ایک یہ ہے:

ہاں قطبِ خراباتِ مغاں آیا ہے
سلطانِ بتان و حوریاں آیا ہے
کوثر! مواج ہو کہ ساحل پہ ترے
سر حلقۂ رندانِ جہاں آیا ہے

جوش صاحب نے لفظ ''کوثر'' سے خوب فائدہ اٹھایا۔ جوش جیسا بڑا شاعر اور مولانا کی مدح؟

آنکھ شیراں را کند روبہ مزاج
احتیاج و احتیاج و احتیاج

ان رباعیوں کے طفیل جوش صاحب کا کام بن گیا۔ انھیں سرکاری قیام گاہ، ایک پرائیویٹ سیکرٹری، ٹیلی فون، موٹر اور جوائنٹ سیکرٹری کے برابر مشاہرہ ملا اور وہ اسلام آباد میں مزے سے زندگی گزارنے لگے۔ اس دوران میں وہ چھوٹے موٹے کاموں کے لیے مولانا صاحب کو زحمت دیتے رہے۔ ان کا طریق کار یہ تھا کہ وہ جب بھی کسی کام کے لیے مولانا صاحب کو خط لکھتے تو اس میں ایک آدھ تعریفی جملہ ایسا لکھ دیتے کہ کام کے انجام پا جانے کی راہ ہموار ہو جاتی۔ اس قسم کا ایک خط ملاحظہ فرمایئے:

''بندہ پرور! آج سے دس پندرہ دن پیشتر اپنے مکان کی بجلی کا بل آپ کی خدمت میں پیش کیا تھا اور آپ نے شہزاد صاحب کو وہ بل دے کر حکم دیا تھا اس کا تادیہ کر دیا جائے۔ آج پھر وہی بل میرے پاس اس دھمکی کے ساتھ آیا ہے کہ ادائے زر میں مزید تاخیر ہوئی تو میرے مکان کا برقی رشتہ منقطع کر دیا جائے گا۔ چنانچہ اس پرچے کے ساتھ منسلک کر رہا ہوں کہ براہِ کرم جلد تر یہ رقم ادا فرما دی جائے تاکہ میری شبِ ہجراں تاریک سے تاریک تر نہ ہو جائے۔ آپ کی شرافت پر ایمان لے آنے والا۔ مرحوم بلکہ آں جہانی جوش۔''

اس خط کا آخری جملہ قابلِ غور ہے۔ جوش صاحب کا انداز ایسا ہے کہ اگر بجلی کا بل ادا کر دیا گیا تو وہ مکتوب الیہ کی شرافت پر ایمان لے آئیں گے ورنہ...... جوش صاحب کا زندگی بھر یہ معمول رہا ہے کہ وہ اپنے کام نکلوانے کے لیے اسی قسم کے خطوط لکھتے رہے ہیں۔ جوش صاحب اور سردار مسعود کی خط و کتابت جن لوگوں کی نظر سے گزری ہے، وہ جوش صاحب نے اس اُسلوب خاص سے واقف ہوں گے۔ راس مسعود مرحوم کو تو ''ورنہ'' کے بعد والے مرحلے سے بھی گزرنا پڑا تھا۔

مولانا کوثر نیازی کو خوش کر کے اپنا کام نکالنے کے لیے جوش صاحب خطوں میں کیا کچھ لکھتے تھے، اس کا ایک نمونہ ملاحظہ فرمایئے:

''میرا دل آپ کا شکر گزار بھی ہے اور آپ کی شرافت کا پرستار بھی، لیکن یہ دیکھ کر میرے دل کے ٹکڑے اڑے جا رہے ہیں کہ آپ مجھ سے غافل ہو چکے ہیں اور نوبت یہاں تک آ چکی ہے کہ حسرت موہانی کا یہ شعر مجھ پر صادق آ رہا ہے کہ۔

ایک ہی بار ہوئیں وجہِ گرفتاریِ دل
التفات ان کی نگاہوں نے دوبارہ نہ کیا''

مولانا حسرت موہانی اگر زندہ ہوتے تو اپنے اس شعر کے غلط استعمال پر سر پیٹ لیتے۔

ایک مرتبہ (۱۹۷۳ء) جوش صاحب نے مولانا صاحب کو خط لکھ کر اپنی غیر مطبوعہ کتابوں کی اشاعت کی طرف متوجہ کیا۔ یہ خط نقل کر کے مولانا صاحب اس پر اظہارِ افسوس کرتے ہیں کہ کسی ادارے کو یہ توفیق نہ ہوئی کہ ''جوش صاحب کی کتابیں شائع کر کے ایک طرف اردو لٹریچر میں لازوال اور بے مثال اضافہ کرتا اور دوسری طرف حضرت جوش کو مالی پریشانیوں سے چھٹکارا دلاتا''۔ نیازی صاحب کو شاید یاد نہیں رہا کہ جس زمانے میں جوش صاحب نے یہ خط لکھا تھا، اس زمانے میں ''دیدہ ور'' جیسی کتابیں شائع کر کے اردو لٹریچر میں لازوال اور بے مثال اضافے کیے جاتے تھے، بیچارے جوش کی کتابوں کی طرف کون توجہ کرتا!

کتابوں کی اشاعت کا تو خیر بہانہ تھا، دراصل جوش صاحب کو دس ہزار روپوں کی ضرورت تھی۔ وہ یہ رقم رائلٹی کی صورت میں بطور قرض حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اور قرض بھی ایسا جو سو روپے مہینے کے حساب سے ان کی تنخواہ سے ادا کیا جاتا رہے۔ مولانا صاحب نے بڑا اکرم کیا کہ جوش صاحب کو قرض دلا دیا۔ جوش صاحب زندگی بھر ''قرض'' سے کام چلاتے رہے۔ بقول شخصے ان کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ قرض ہی تھا۔ بے شمار لوگوں نے انھیں قرض دیا، یا دلایا اور پھر بھول گئے۔ لیکن مولانا کوثر نیازی نے نہ صرف اس واقعے کو یاد رکھا بلکہ لکھ بھی دیا تاکہ سند رہے اور بوقت ضرورت کام آئے۔

آئندہ جب کبھی جوش کا سوانح نگار اس واقعے کا ذکر کرے گا تو اس سے جہاں ایک طرف

جوش صاحب کی پریشانیوں کا اندازہ ہوگا، وہیں دوسری طرف یہ بھی معلوم ہوگا کہ مولانا کوثر نیازی کس درجہ ادب پرور اور جوش نواز تھے۔ لیکن صحیح صورت حال یہ ہے کہ مولانا صاحب نے تصویر کا ایک ہی رُخ دکھایا ہے۔ یہ تو بتا دیا کہ انھوں نے جوش پر کیا کیا احسانات کیے لیکن یہ نہیں بتایا کہ اس کے صلے میں جوش صاحب نے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ جوش صاحب نے مولانا کے مجموعۂ کلام پر جو دیباچہ لکھا ہے، وہ دراصل انھی "احسانات" کا بدلہ ہے۔ یہ ایسا شاندار دیباچہ ہے کہ مولانا صاحب کو ان کے کلام کی وجہ سے نہیں، اس دیباچے کی وجہ سے یاد رکھا جائے گا۔

(۱۵/جون ۱۹۸۹ء)

(۲)

مولانا کوثر نیازی کی تصنیف "جنھیں میں نے دیکھا" اگرچہ دوسروں کے بارے میں ہے، لیکن اس آئینہ خانے میں جناب مصنف بھی پوری طرح جلوہ گر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شخصی خاکہ ذاتی تعلق کے بغیر نہیں لکھا جا سکتا۔ لکھنے والا جب کسی دوسری شخصیت کو موضوع بناتا ہے، تو وہ اپنے تجربے اور مشاہدے کے حوالے سے بات کرتا ہے۔ یہ تجربہ اور مشاہدہ، جہاں ایک طرف موضوع کی تصویر بناتا ہے، وہیں دوسری طرف لکھنے والے کی شخصیت کی جھلکیاں بھی دکھاتا جاتا ہے۔ زیرِ نظر کتاب کی بہت سی شخصیتوں کے درمیان سب سے دلکش شخصیت خود مولانا کوثر نیازی کی ہے۔ ان کے بارے میں بھی بہت سی دلچسپ باتیں معلوم ہوتی ہیں۔

پہلی نظر میں جو چیز سامنے آتی ہے، وہ مولانا صاحب کی خوش خوراکی ہے اور اسی حوالے سے وہ دوسروں کی شخصیات کو جانچتے ہیں۔ یعنی وہ یہ دیکھتے ہیں کہ دوسروں کو کھلانے پلانے میں کوئی کس حد تک متواضع ہے۔ ذرا دیکھیے مولانا اظہر حسن زیدی کا ذکر کس محبت سے کیا ہے:

"ان کی بیگم کے کھانوں کا کیا کہنا! مولانا زیدی مدظلہٗ نے ہمیں ان کھانوں کی ایسی چاٹ لگا دی تھی کہ وقت بے وقت ہم ان سے تقاضا کر کے اپنے ذوقِ خوش خوری کی تسکین کر ہی لیا کرتے تھے۔" (ص ۹۳)

حضرت بابا ذہین شاہ تاجی کے ذکر میں ارشاد ہوتا ہے:

"...... جانتے تھے کہ میں بادام اور دوسرے مغزیات کی چائے پسند کرتا ہوں، اس

لیے اس کا تھرموس پہلے سے تیار رہتا۔" (ص ۱۰۹)

ایک اور بزرگ کے تذکرے میں لکھا ہے:

"...... مٹھائیاں منگوائیں، چائے پیش فرمائی، مگر ایسی چائے کہ اب تک ذائقہ دعائیں دیتا ہے۔ فرمایا، ہماری اپنی بکری کا دودھ ہے، اسی لیے چائے میں خاص مزہ ہے۔" (ص ۱۴۴)

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے شخصی خاکے میں لکھتے ہیں:

"دلّی کے تھے اور نہاری چونکہ ہے ہی اصلاً دلّی والوں کا کھاجا، اس لیے گھر پر پکواتے۔ جانتے تھے کہ میں بھی نہاری شوق سے کھاتا ہوں، اس لیے کبھی کبھی مجھے بھی بلوا بھیجتے۔" (ص ۴۴)

مولانا محمد جعفر پھلواروی کی جہاں بہت سی خوبیاں بیان کی ہیں، وہاں یہ بھی لکھا ہے:

"بہاری کباب بنانے میں تو ان کا جواب ہی نہ تھا۔ بڑے اہتمام سے کباب تیار کرتے اور دوستوں کو کھلا کر خوشی محسوس کرتے۔"

مولانا پھلواروی مرحوم نے کسی اجتماع میں مولانا کوثر نیازی کو مدعو کیا۔ وہ چاہتے تھے کہ مولانا ضرور تشریف لائیں، لہٰذا ان کے مزاج کی مناسبت سے لکھا:

"اگر اس فقیر کو نوازیں تو حسبِ معمول بہاری کباب کی پوری لبریز پلیٹ حاضر خدمت کی جائے گی، ان شاء اللہ اور گلی والے کی نہاری تو ہے ہی۔" (ص ۶۵)

مختصر یہ کہ زیرِ نظر کتاب میں مولانا صاحب کی خوش خوراکی کی تمام تفصیلات ملتی ہیں۔ اگر مولانا کی سوانح عمری لکھی گئی (اور ضرور لکھی جائے گی کہ وہ ہمارے قومی مشاہیر میں سے ہیں) تو اس میں ان کی خوش خوراکی کی تفصیلات کے لیے زیرِ نظر کتاب بہترین ماخذ ثابت ہوگی۔

صحافی کی حیثیت سے مولانا نے جو کارنامے انجام دیے ہیں، ان کے بارے میں بھی خاصی تفصیلات اس کتاب میں ملتی ہیں۔ صدر ایوب کے آخری زمانے میں جب پیپلز پارٹی کی تحریک شروع ہوئی، تو مولانا صاحب اپنے اخبار "شہاب" سمیت اس کاررواں میں شامل ہو گئے۔ اس زمانے میں ان کی پالیسی بقول خود، یہ تھی کہ "جارحیت بہترین دفاع ہے۔" یہ اردو میں بالکل ایک نیا اندازِ صحافت تھا، جس کی وجہ سے "شہاب" ایک لاکھ سے زیادہ کی تعداد میں چھپتا

اور اصل سے کہیں زیادہ قیمت پر بلیک میں فروخت ہوتا تھا۔ اس جملے کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ زرد صحافت کی طرح بلیک یعنی سیاہ صحافت اخبار نویسی کا ایک خاص اُسلوب ہے۔ اس جملے کا مطلب صرف اتنا ہے کہ ''شہاب'' اس حد تک مقبول اخبار تھا کہ طلب و رسد میں ہم آہنگی نہ ہونے کی وجہ سے بلیک مارکیٹ یعنی چور بازار میں فروخت ہوتا تھا۔ اخبار کی مقبولیت کی یہ تفصیلات مولانا صاحب نے خود بیان فرمائی ہیں (ص ۱۲۹) البتہ بلیک مارکٹ کا ترجمہ چور بازار ہمارا اضافہ ہے۔

مولانا صاحب نے اپنی صحافتی معرکہ آرائیوں کی روداد بھی فخر سے بیان کی ہے۔ شورش کاشمیری مرحوم کے شخصی خاکے میں وہ لکھتے ہیں:

''میں نے لاہور سے ہفت روزہ ''شہاب'' جاری کیا تو کبھی کبھی اس کے ساتھ ان (شورش کاشمیری) کا معاصرانہ چشمک ہونے لگی۔ یہ ۶۶ء کی بات ہے، میں نے شروع شروع میں تو اغماض برتا، لیکن آخر کار میرا جوان خون بھی کھول اٹھا۔ جواباً میں نے بھی انھیں للکار دیا۔ بس پھر کیا تھا، ایوانِ صحافت میں بھونچال آ گیا۔ آغا صاحب نظم اور نثر میں شروع ہو گئے۔ ادھر مجھے کالم نگاری میں ظہور الحسن ڈار مرحوم اور نظم میں حضرت عبدالحمید عدم کا تعاون حاصل تھا۔ میرے علاوہ ان دونوں حضرات نے بھی مضامین نظم و نثر کے انبار لگا دیے۔ بات صحافیانہ چوٹوں سے ذاتیات پر پہنچ گئی اور اس بحث بحثی میں کجی اور بدنمائی پیدا ہو گئی۔ دونوں طرف بیچ میں ایسے لوگ بھی آ گئے جنھوں نے اس آگ کو اور ہوا دی۔ اب آہستہ آہستہ مسئلہ امن و امان کا پیدا ہو چلا تھا کہ......'' (ص ۱۲۸)

بعض بزرگوں کی کوششوں سے یہ لڑائی ختم ہو گئی، مگر وہ جو مولانا حالی نے کہا ہے:

صلح ہے اک مہلتِ سامانِ جنگ
کرتے ہیں بھرنے کو یاں خالی تفنگ

تو یہ صلح بھی دوبارہ تفنگ آزمائی کا دیباچہ ثابت ہوئی۔ اس کی تفصیل بھی مولانا صاحب کی زبان حقیقت ترجمان سے سنیے:

''قلمی لڑائی پھر چھڑ گئی اور اب کے اس نے انتہائی مکروہ شکل اختیار کر لی۔ لاہور کی ڈولنٹن مارکیٹ میں ہم دونوں میں ہاتھا پائی ہو گئی۔ بات کا بتنگڑ بن گیا۔ دونوں

طرف سے احتجاجی جلسے ہوئے، جلوس نکلنے لگے۔ ہم دونوں کو مارشل لاء اتھارٹیز نے بلا کر وارننگ دی۔ وقتی طور پر تصادم رک گیا، لیکن طبیعتوں میں تلخی بدستور باقی رہی تا آنکہ پیپلز پارٹی کی حکومت قائم ہو گئی اور کچھ عرصے بعد شورش مرحوم جیل میں ڈال دیے گئے۔'' (ص ۱۲۹)

قطع نظر اس سے کہ ہاتھا پائی کے نتیجے میں شورش مرحوم کو جیل جانا پڑا، یہ واقعہ اردو صحافت کی تاریخ میں یادگار رہے گا اور اس کے لیے مولانا صاحب اُن تمام لوگوں کے شکریے کے مستحق ہیں، جو صحافت اور پہلوانی کو ایک ہی چیز سمجھتے ہیں۔

جب کوئی شخص خوبیِ قسمت سے کسی بڑے عہدے پر فائز ہوتا ہے، تو عام لوگوں کا کیا ذکر، اچھے اچھے صاحبانِ علم و فضل بھی عہدے کی چمک دمک سے مرعوب ہو کر ایسی باتیں کرنے لگتے ہیں، جو اُن کے شایانِ شان نہیں ہوتیں۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ عبرتناک مثال سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم کی ہے۔ کون نہیں جانتا کہ سید صاحب ہمارے عہد کی ایک بہت بڑی علمی شخصیت تھے۔ وہ مولانا شبلی اور سید سلیمان ندوی کے وارث یعنی دار المصنفین اعظم گڑھ کے ناظم تھے۔ دار المصنفین کے ایک معاملے میں سید صاحب کو مولانا کوثر نیازی کی مدد درکار تھی۔ انھوں نے اس سلسلے میں مولانا کو ایک خط لکھا، جو زیرِ نظر کتاب میں شامل ہے۔ اس خط میں پہلے تو انھوں نے طالب آملی کے ایک قصیدے کے کچھ اشعار بطور تہنیتِ عید مولانا صاحب کی خدمت میں پیش کیے ہیں اور پھر یہ لکھا ہے:

''آپ کی نثر نگاری کا انداز لکھنؤ اور دلی کے اہلِ قلم کی طرح سلیس، فصیح و بلیغ اور دلکش پایا اور اگر یہ لکھوں تو محض ایک حقیقت کا اظہار ہوگا کہ اس میں بہت کچھ حالی کی سادگی، نذیر احمد کی برجستگی اور شبلی کے ایجاز کی پرکاری کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔'' (ص ۱۳۷)

ہم اس سلسلے میں کچھ نہیں کہیں گے کہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن ہم سب کے محترم بزرگ تھے اور اب ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں۔ اب تو ہم صرف یہی کر سکتے ہیں کہ حالی، نذیر احمد اور شبلی کو ایک مرتبہ پھر پڑھیں تا کہ ان کی نثر میں مولانا کوثر نیازی کی سادگی، برجستگی اور ایجاز کی جھلکیاں دیکھ سکیں۔

(۲۲ رجون ۱۹۸۹ء)

مشاہیرِ علم و ادب کی کہکشاں

کراچی کی خاک میں بھی کیا کیا گنج ہائے گراں مایہ دفن ہیں۔ ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کے درجنوں شہروں کا سہاگ اجڑا، تو کراچی کی مانگ ستاروں سے بھر گئی۔ زندگی کے دوسرے شعبوں سے قطع نظر، اگر صرف ادب کے حوالے سے دیکھا جائے، تو کیسی کیسی بلند قامت شخصیات نظر آتی ہیں، جنھوں نے اس شہر کی ثقافت کی بنیاد رکھی اور آج اسی کے دامن میں آسودۂ خاک ہیں۔ آسودگانِ کراچی کی فہرست بہت طویل ہے۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق، سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالعزیز میمن، آرزو لکھنوی، سیماب اکبر آبادی، محمد حسن عسکری، ڈاکٹر شوکت سبزواری، ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، غلام عباس، شاہد احمد دہلوی، حفیظ ہوشیار پوری، رئیس احمد جعفری، رئیس امروہوی...... یہ محض چند نام ہیں، مکمل فہرست تیار کی جائے، تو کئی سو ناموں پر مشتمل ہوگی۔

دس بارہ برس پہلے ڈاکٹر محمد ایوب قادری مرحوم سے اس کا ذکر آیا کہ "آسودگانِ کراچی" کے نام سے ایک تذکرہ مرتب کرنا چاہیے، جس میں ان اہلِ علم و ادب کے حالات ہوں، جو کراچی میں دفن ہیں۔ مرحوم نے اس کام کو انجام دینے پر آمادگی ظاہر کی اور کچھ ہی دنوں میں ایک طویل فہرست بھی مرتب کر لی، لیکن موت کے ظالم ہاتھوں نے ان کے بہت سے علمی کاموں کی طرح اس کام کو بھی مکمل نہ ہونے دیا۔ کاش کوئی علمی ادارہ اس کام کی طرف توجہ کرے۔ آج ہم آسودگانِ کراچی کے حالات بآسانی جمع کر سکتے ہیں، کل یہ کام بہت مشکل ہو جائے گا۔

کراچی کی ادبی دنیا کو رونق دینے والوں میں ایک نام مولانا اعجاز الحق قدوسی کا بھی ہے۔ ابھی تین ساڑھے تین برس پہلے وہ ہمارے درمیان موجود تھے۔ وہ زندگی بھر قلم کی مزدوری کرتے رہے۔ برصغیر میں تصوف کی تاریخ ان کا خاص موضوع تھا۔ صوفیائے سندھ، صوفیائے پنجاب اور صوفیائے سرحد، جیسی عالمانہ کتابوں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے موضوع پر کس حد تک حاوی تھے۔ ہندوستان سے ہجرت کرکے کراچی آئے، تو سندھ کی تاریخ و ثقافت کی طرف متوجہ

ہوئے۔ کئی جلدوں میں "تاریخ سندھ" لکھی، جو اس موضوع پر اردو میں بے مثال کتاب ہے۔ یہ بات کم لوگوں کو معلوم ہے کہ سندھی ادبی بورڈ کے ابتدائی زمانے میں جن مہاجر اہلِ علم نے اس ادارے کو اپنا خونِ جگر دیا، ان میں حبیب اللہ رشدی اور مولانا اعجاز الحق قدوسی بھی شامل تھے۔ مولانا صاحب ایک عرصے تک سندھی ادبی بورڈ سے منسلک رہے اور اس کے مختلف منصوبوں کی تکمیل میں حصہ لیتے رہے۔

مولانا قدوسی کو زندگی بھر مالی آسودگی حاصل نہیں ہوئی۔ انھوں نے نہایت متوکلانہ زندگی بسر کی۔ بس اتنا ہی کماتے تھے کہ روح و تن کا رشتہ برقرار رکھا جا سکے۔ اس کے باوجود وہ نہایت زندہ دل اور شگفتہ مزاج تھے۔ علم مجلسی کے وہ ماہر تھے۔ محفل میں کیسے ہی مختلف المزاج لوگ موجود ہوں، وہ ہر شخص کا خیال رکھتے اور ہر شخص ان کی گفتگو سے محظوظ ہوتا۔ پیر حسام الدین راشدی مرحوم سے ان کے خصوصی تعلقات تھے پیر صاحب ان کی دل سے قدر کرتے تھے اور اس حد تک چاہتے تھے کہ ان کے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ سالہا سال پیر صاحب کا یہ معمول رہا کہ روزانہ دو تین گھنٹے مولانا اعجاز الحق قدوسی کے ساتھ ان کی نشست رہتی۔

پیر صاحب کے گھر پر جو محفلیں ہوتی تھیں، ان میں شرکت تو بہت سے لوگ کرتے تھے، لیکن جانِ محفل مولانا قدوسی ہی ہوتے تھے۔ ان محفلوں میں مولانا صاحب خوب چہکتے تھے۔ وہ دوسروں پر جملے کستے تھے اور اگر کوئی ان پر جملہ کستا تو سب سے زیادہ وہی محظوظ ہوتے تھے۔ ایک ایسی ہی محفل میں مولانا قدوسی نے اپنی ایک نئی غزل سنائی۔ یہ غزل ایک سفر کی یادگار تھی۔ وہ ایک مشاعرے میں شرکت کے لیے لاہور گئے۔ ریل گاڑی میں ان کے ساتھ ایک شاعرہ نے بھی سفر کیا۔ غزل کے اشعار کچھ اس قسم کے تھے:

گلستاں کا گلستاں ہم سفر ہے
کہ اک جانِ بہاراں ہم سفر ہے
کہیں رستہ ہی منزل بن نہ جائے
نگارِ حشر ساماں ہم سفر ہے

اس غزل میں مقطع نہیں تھا۔ ممتاز حسن مرحوم بھی شریکِ محفل تھے، انھوں نے کہا، "مولانا مقطع کے بغیر غزل اچھی نہیں لگتی۔ آپ کی طرف سے میں نے مقطع کہہ دیا ہے۔" اور

انھوں نے فی البدیہہ کہا:

اٹھا پردہ تو اے اعجاز دیکھا
کہ خود بچوں کی اماں ہم سفر ہے

مولانا قدوسی آخر عمر تک تصنیف و تالیف کے کاموں میں مصروف رہے۔ ان کے آخری کتاب ''میری زندگی کے ۷۵ سال'' ہے، جس میں انھوں نے اپنے ذاتی حالات اور چشم دید واقعات لکھے ہیں۔ یہ کتاب ان کی وفات کے بعد شائع ہوئی ہے۔ اس کا دیباچہ ڈاکٹر جمیل جالبی نے لکھا ہے، جن سے مرحوم کے گہرے مراسم تھے۔ جالبی صاحب نے بعض بڑی درد انگیز باتیں لکھی ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

''مولانا سے ملیے تو ان کے چہرے کی شگفتگی، ان کے مسکراتے ہونٹ، ان کی بولتی آنکھیں آپ کو کبھی احساس نہیں ہونے دیں گی کہ انھوں نے ساری عمر مفلسی میں بسر کی ہے۔ معمولی آمدنی، بڑا کنبہ اور لکھنے پڑھنے کا پیدائشی ذوق۔ یہ وہ مثلث ہے، جس کے شکنجے میں آ کر لکھنے پڑھنے والے انسان کے لیے ہمارے سفاک معاشرے میں سانس لینا بھی دوبھر ہو جاتا ہے۔ لطف یہ ہے کہ اس کام میں نہ روزی ہے نہ عزت و احترام۔ معاشرہ لکھنے پڑھنے والے کو ایک ایسا دیوانہ سمجھتا ہے، جو اپنا وقت، اپنی عمر اور اپنی زندگی بیکار گنوا رہا ہے۔ مولانا قدوسی اگر مستند کتابیں لکھنے کی بجائے اسی لگن کے ساتھ ٹھیلا لگاتے تو تیس سال میں...... معاشرے میں دولت کی وجہ سے ان کی عزت ہوتی...... مولانا کی حالت یہ ہے کہ آج سے اکتیس سال پہلے بھی بے زری کا شکار تھے اور آج بھی۔ پندرہ ہزار صفحات اور پچاس لاکھ سے زیادہ الفاظ لکھ کر، ۷۶، ۷۷ سال کی عمر میں، اسی طرح مفلس اور تلاشِ معاش میں سرگرداں ہیں اور رعشہ زدہ ہاتھوں سے لالو کھیت کے گرمیوں میں گرم اور سردیوں میں سرد کمرے میں بیٹھے لکھتے پڑھتے رہتے ہیں۔ ان کو دیکھ کر عبرت ہوتی ہے اور اپنے سفاک معاشرے کے خلاف اعلانِ جہاد کرنے کو جی چاہتا ہے۔''

آپ بیتیاں عموماً دلچسپ ہوتی ہیں۔ لیکن مولانا قدوسی کی آپ بیتی میں دلچسپی کا عنصر کچھ

زیادہ ہی ہے۔ اس کا کوئی صفحہ ایسا نہیں کہ پڑھنے والا اس سے سرسری گزر جائے۔ اس کی ایک وجہ تو مولانا کا خوبصورت اندازِ بیان ہے اور دوسری اور بڑی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے واقعات سے زیادہ شخصیات پر توجہ دی ہے۔ یہ کتاب ایک آئینہ خانہ ہے، جس میں بہت سے ایسے آشنا چہرے دکھائی دیتے ہیں، جنھیں مولانا صاحب نے بہت قریب سے دیکھا ہے۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ، مولانا مناظر احسن گیلانی، مرزا ہادی رسوا، خواجہ حسن نظامی، فانی بدایونی، جوش ملیح آبادی، ماہر القادری، مرزا فرحت اللہ بیگ، حیرت بدایونی، غرض کے مشاہیر علم و ادب کی ایک کہکشاں ہے، جو اس کتاب کے صفحات کو روشن کر رہی ہے۔ تقریباً نوے شخصیات سے متعلق مولانا نے اپنے تاثرات و مشاہدات پیش کیے ہیں، جن سے ان شخصیات کے بارے میں بہت سی نئی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔

مولانا نے جوش ملیح آبادی کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جوش سے ان کے تعلقات کا عرصہ نصف صدی پر پھیلا ہوا ہے۔ مولانا نے کئی ایسے واقعات بیان کیے ہیں، جن سے جوش کی شخصیت کے عجیب و غریب پہلو سامنے آتے ہیں۔ اس قسم کا ایک واقعہ یہ ہے:

''ایک رات تقریباً گیارہ بجے جوش صاحب میرے پاس آئے۔ عارف مرحوم مدیر ''صبح دکن'' بھی ان کے ساتھ تھے۔ بولے، شیروانی پہن لو اور چلو۔ میں نے کہا، کہاں کے ارادے ہیں۔ بولے، میں ایک بخیل پر نظم لکھنا چاہتا ہوں اور عطا کے وقت اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں تمھیں قاضی تلمذ حسین صاحب کے پاس لے جانا چاہتا ہوں، جو خاصے کفایت شعار ہیں اور تم سے واقف بھی نہیں۔ تمھیں منھ سے کچھ بولنا نہیں، صرف خاموشی سے ایک سائل کا پارٹ ادا کرنا ہے...... میں ساتھ ہو گیا۔ ہم تینوں قاضی تلمذ حسین صاحب کے پاس پہنچے...... قاضی صاحب مرحوم گراں گوش تھے۔ جوش صاحب نے بلند آواز سے کہا، قاضی صاحب اس وقت زحمت دہی کا سبب یہ تھا کہ یہ صاحب نہایت پریشان حال مسافر ہیں۔ میں نے بھی ان کی مدد کی ہے۔ اگر آپ بھی ان کی مدد فرمائیں تو بڑا کرم ہوگا۔ قاضی صاحب نے ایک روپیہ جیب سے نکالا اور میری طرف بڑھایا۔ لیکن جوش صاحب نے انھیں روکتے ہوئے کہا، قاضی صاحب!

شبنم کا یہ قطرہ، اس پیاسے کی پیاس کیا بجھائے گا...... قاضی صاحب...... کے چہرے کی عجیب و غریب کیفیت تھی، تلملا کر بولے، جوش صاحب! لوگوں نے گداگری کے نئے نئے ڈھونگ رچائے ہیں۔ کوئی حاجی بن کر آتا ہے، کوئی مسافر بن کر لوٹتا ہے۔ آخر کب تک کوئی اپنے گاڑھے پسینے کی کمائی ان کی نذر کرتا رہے۔ اٹھے اور گھر میں سے پانچ روپے کا نوٹ لے کر آئے اور میری طرف بڑھاتے ہوئے کہنے لگے، لیجیے حضرت، دیکھنے میں تو آپ بڑے معقول معلوم ہوتے ہیں۔ جوش صاحب نے پھر انھیں روکا اور کہا، قاضی صاحب! اس سے بھی ان غریب کا کیا بھلا ہوگا۔ قاضی صاحب بھنا گئے اور بگڑ کر بولے، جوش صاحب! آپ کا مطلب یہ ہے کہ میں اپنا سارا گھر ان کی نذر کردوں۔ آخر جوش صاحب کی بڑی رد و قدح کے بعد وہ بگڑتے ہوئے دوسری مرتبہ گھر میں گئے اور مزید پانچ روپے لے کر آئے اور دس روپے مجھے دیتے ہوئے کہنے لگے، لیجیے اور مجھے معاف کردیجیے۔

میں نے سلام کیا اور روپے جیب میں رکھ لیے۔ ہم تینوں وہاں سے اٹھے۔ راستے میں میں نے جوش صاحب سے کہا، آپ نے مجھے سائل بھی بنایا اور قاضی صاحب کے چہرے کا رنگ بھی دیکھ لیا، لیکن ان روپوں کا کیا ہوگا۔ جوش نے کہا، ہوگا کیا، ان کی مٹھائی کھائیں گے۔ جوش اور عارف کا اصرار تھا کہ میں یہ روپے ان کو دے دوں۔ اتفاق سے پہلے میرا گھر پڑتا تھا، وہ روپے مجھ سے چھیننے لگے، لیکن میں دروازہ کھول کر گھر میں داخل ہوگیا۔"

دوسرے روز مولانا قدوسی قاضی تلمذ حسین کے ہاں گئے اور دس روپے انھیں واپس کردیے۔

(۲۹ر جون ۱۹۸۹ء)

ڈاکٹر انور سدید سنجیدہ علمی کتابیں لکھ کر اپنا وقت ضائع کرتے ہیں

پچھلے دنوں ڈاکٹر انور سدید چند روز کے لیے کراچی تشریف لائے، یہاں ان کا اسی طرح استقبال ہوا، جس طرح ہندوستان سے آنے والے ادیبوں کا ہوتا ہے۔ یعنی کہیں ظہرانہ ہے، کہیں عصرانہ اور کہیں عشائیہ۔ ڈاکٹر صاحب ہر محفل میں جانِ محفل بن کر چہکتے رہے۔ اس قسم کی ایک دو محفلوں میں ہمیں بھی شرکت کا موقع ملا، تو اندازہ ہوا کہ ڈاکٹر صاحب کا قلم ہی اشہب جہندہ نہیں ہوتے، محفل میں بھی بلبل ہزار داستاں بن جاتے ہیں۔ جس روانی سے وہ لکھتے ہیں، اسی روانی سے وہ بولتے ہیں۔

ایک محفل میں کچھ ہمدردوں اور بہی خواہوں نے ڈاکٹر صاحب سے یہ گذارش کی کہ آپ اتنے عالم و فاضل ہیں، آپ اپنا قیمتی وقت قلمی معرکہ آرائیوں میں کیوں ضائع کرتے ہیں، یہی وقت اگر آپ اپنے تنقیدی و تحقیقی کاموں میں صرف کریں تو کتنا اچھا ہو۔ اس کے جواب میں ڈاکٹر صاحب نے فرمایا، "میرا بھی جی چاہتا ہے کہ میں معرکہ آرائیوں میں حصہ نہ لوں، لیکن مجھے مجبوراً ایسا کرنا پڑتا ہے، حریف جب چھیڑ چھاڑ کرتے ہیں، تو میں خاموش نہیں رہ سکتا۔" اس پر کسی نے کہا، "دو چار مہینے خاموش رہ کر دیکھیے، شاید اس کا کوئی مثبت نتیجہ برآمد ہو۔" ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا، "خاموش رہ کر بھی دیکھ چکا ہوں، اس طرح حریفوں کا حوصلہ بڑھ جاتا ہے، وہ سمجھتے ہیں کہ میں میدان سے بھاگ گیا ہوں۔"...... غرض کہ ڈاکٹر صاحب کو راہ پر لانے کی بہت کوشش کی گئی، لیکن انھوں نے اپنے موقف کی تائید میں ایسی ایسی دلیلیں پیش کیں کہ سمجھانے والوں کو ہی خاموش ہونا پڑا۔ اس محفل میں استاد اغر مراد آبادی بھی موجود تھے، انھوں نے ڈاکٹر صاحب کے سامنے تو احتراماً کچھ نہ کہا، بعد میں ہم سے فرمایا، "ڈاکٹر انور سدید قلمی معرکہ آرائیوں کے اتنے

عادی ہو چکے ہیں کہ اگر اس کمبل کو وہ چھوڑنا بھی چاہیں، تو یہ کمبل انھیں نہیں چھوڑے گا۔"

ہمیں اس پر اعتراض نہیں کہ ڈاکٹر انور سدید قلمی معرکہ آرائیوں میں حصہ لیتے ہیں، بلکہ اعتراض اس پر ہے کہ وہ سنجیدہ علمی کتابیں لکھ کر اپنا وقت کیوں ضائع کرتے ہیں، اقبال، انیس اور غالب پر انھوں نے جو تنقیدی کتابیں لکھی ہیں اور اُردو سفرناموں اور ادبی تحریکوں پر جو تحقیقی کام کیا ہے، اس کے مفید اور معیاری ہونے میں کلام نہیں۔ لیکن ان کاموں سے ان کی ذہنی اور ادبی صلاحیتوں کا بھرپور اندازہ نہیں ہوتا۔ یہ سب ان کے بائیں ہاتھ کے کمالات ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کا اصل کمال یہ ہے کہ وہ صاحبِ قلم ہونے کے ساتھ ساتھ صاحبِ سیف بھی ہیں۔ صفحۂ قرطاس کو پانی پت کا میدان بنا کر انھوں نے تاریخی کارنامہ انجام دیا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ کام سنجیدہ ادبی کاموں سے کہیں زیادہ اہم ہے، کیونکہ اس طرح اہلِ ادب کو لہو گرم رکھنے کا موقع ملتا ہے۔ علامہ اقبال بھی اس معاملے میں ہم سے متفق ہیں۔ فرماتے ہیں۔

جھپٹنا، پلٹنا، پلٹ کر جھپٹنا
لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ

ہمارا خیال ہے کہ ڈاکٹر انور سدید کا نام ان کی سنجیدہ تحریروں کی وجہ سے نہیں، قلمی معرکہ آرائیوں کے سبب زندہ رہے گا، کیونکہ یہ معرکہ آرائیاں اہلِ ادب کا خون گرم رکھنے کا وسیلہ ہیں۔ اپنی اس بات کی وضاحت کے لیے ہم مصحفی اور انشا کی مثال پیش کرتے ہیں۔ اُردو کی ادبی تاریخ کے یہ دو بڑے نام ہیں۔ انشاء نے صرف ایک غزل (کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں) اور مصحفی نے صرف چند شعر ایسے کہے ہیں، جن سے اہلِ ادب واقف ہیں۔ کیا ایک غزل اور چند اشعار کی بناء پر ان دونوں کو اُردو ادب میں بلند مقام ملا ہے؟ ہرگز نہیں۔ ان دونوں کی عظمت کا راز وہ معرکہ آرائی ہے، جس کی تفصیلات محمد حسین آزاد نے "آبِ حیات" میں پیش کی ہیں۔

خوشی کی بات ہے کہ ڈاکٹر انور سدید نے اپنی قلمی معرکہ آرائیوں کا مجموعہ "کھردرے مضامین" کے نام سے شائع کر دیا ہے۔ یہ مضامین اخباروں اور رسالوں میں شائع ہو کر گلدستۂ طاقِ نسیاں بن چکے تھے۔ اب یہ دولتِ خفتہ کتابی صورت میں جلوہ گر ہو کر دولتِ بیدار بن گئی ہے اور اس سے ہر وہ شخص مستفید ہو سکتا ہے، جسے ادب سے زیادہ ادبی اخلاقیات سے دلچسپی ہو۔ "ادبی اخلاقیات" کی اصطلاح ڈاکٹر انور سدید ہی نے وضع کی ہے اور اسے دیباچے کے جس

پیراگراف میں استعمال کیا ہے، اس کا کچھ حصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

"ڈاکٹر وزیر آغا کے رسالے "اوراق" کا اجرا ایک ایسے مجادلے کا باعث بنا، جس میں ادبی اخلاقیات کو بالائے طاق رکھ کر دشنام اور طعن کو حربے کے طور پر استعمال کیا گیا اور وزیر آغا کو ہدف بنا کر ہر قسم کی تیر اندازی کی گئی۔ ادب کے اختلاف کو نہ صرف ذاتی اختلاف کا درجہ دے دیا گیا، بلکہ ذاتی ناراضیوں اور رنجشوں کو بھی پروان چڑھایا گیا۔ اخبارات کے ادبی صفحے پر ادیبوں کی غیر مصدقہ باتوں سے مختلف نوعیت کے اسکینڈل تراشے جانے لگے۔ چنانچہ ادب کی طبعی ترقی رک سی گئی اور ادیبوں کی نئی نسل کی تباہی کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ مجھے افسوس ہے کہ میں ادب کے ایک عبادت گزار کی حیثیت سے اس منظر کا خاموش تماشائی نہ بن سکا اور جہاں بھی خلطِ بحث پیدا کیا گیا یا ذاتیات کے مدار میں داخل ہونے کی کوشش کی گئی، میں نے اپنا ردِ عمل پیش کیا۔ ہر چند میں نے ادب کے دفاع اور ادبی معاشرے کی اصلاح کو ہی پیشِ نظر رکھا، لیکن مملکتِ ادب کے چند اجارہ داروں نے اسے پسند نہ کیا اور مجھے ناپسندیدہ شخص قرار دے دیا...... میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ردِ عمل کے طور پر لکھے گئے مضامین کا انتخاب، کبھی کتابی صورت میں پیش کیا جائے گا، لیکن جب متذکرہ بالا صورت پیدا ہوئی تو میرے دوستوں نے انھیں کتابی صورت دینے پر اصرار کیا۔ ان کا موقف یہ تھا کہ میرے مضامین اخبارات و رسائل میں بکھرے پڑے ہیں، انھیں یکجا کر دیا گیا، تو قاری کو اس دور کی ادبی تاریخ کے ایک بھیانک باب کا اور بعض بڑے ادیبوں کے ادبی کردار کا مطالعہ کرنے کی سہولت ہوگی۔"

اس طویل اقتباس کے لیے قارئین سے معذرت طلب کرتے ہوئے ہم نہایت ادب کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں عرض کریں گے کہ اس میں آزردہ ہونے کی کوئی بات نہیں ہے کہ انھیں ناپسندیدہ ادبی شخصیت قرار دیا گیا ہے۔ ہمارے علم کی حد تک وہ اُردو ادب کی تاریخ میں واحد شخص ہیں، جنھیں یہ اعزاز ملا ہے۔ یہ خوشی کا مقام ہے کہ انھیں امتیازی سلوک کا مستحق سمجھا گیا۔ جہاں تک ادبی معاشرے کی اصلاح کا تعلق ہے، ہمارا خیال ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے تاریخ ساز

کارنامہ انجام دیا ہے۔ ”کھردرے مضامین“ کی اشاعت کے بعد ادبی معاشرے کو اصلاح کی ضرورت نہیں رہی، دعائے خیر کی ضرورت ہے۔

ہمیں معلوم ہے کہ وہ لوگ اس کتاب کی اشاعت سے خوش نہیں ہوں گے جن کا تذکرہ اس کتاب میں ملتا ہے۔ لیکن ہم خوش ہیں کیونکہ کتاب پڑھنے کے بعد ہمارے دل میں ان لوگوں کے لیے ہمدردی کے جذبات موجزن ہو گئے، جن کے خلاف ڈاکٹر انور سدید نے زورِ قلم صرف کیا ہے۔ ڈاکٹر انور سدید نے دفاعی جنگ جارحانہ انداز سے لڑی ہے اور خاصی سفاکی کا مظاہرہ کیا ہے۔ جہاں تیرِ نیم کش سے کام چل سکتا تھا، وہاں انھوں نے توپیں داغی ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید کے معتوبین سے ہمیں اس لیے بھی ہمدردی ہے کہ ہم ان کے بارے میں اچھی رائے رکھتے ہیں۔ اگر کسی کے بارے میں ہماری رائے خراب بھی تھی، تو کتاب پڑھنے کے بعد ہم نے اچھی رائے قائم کر لی ہے۔ کاش ڈاکٹر صاحب ایک آدھ مضمون ہمارے خلاف بھی لکھ دیتے تاکہ ہمیں اپنے بارے میں اچھی رائے قائم کرنے کا موقع مل جاتا۔

ادبی اخلاقیات سے متعلق، اس کتاب کا کوئی صفحہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ ہمارا جی چاہتا ہے کہ ڈاکٹر انور سدید کے اسلوبِ تحریر کے کچھ نمونے پیش کیے جائیں، لیکن افسوس کہ ہمارا ادبی اخلاق ہی نہیں، عام اخلاق بھی اس کی اجازت نہیں دیتا۔ لہٰذا جو لوگ کسی قسم کے اخلاقی دباؤ میں نہ ہوں، وہ براہِ راست کتاب کا مطالعہ فرمائیں۔

اس کتاب میں یوں تو بے شمار خوبیاں ہیں، لیکن ایک خوبی بے مثال ہے۔ کتاب کا ایک ایک لفظ ڈاکٹر وزیر آغا کے لیے ڈاکٹر انور سدید کی محبت کی گواہی دیتا ہے۔ آغا صاحب خوش قسمت ہیں کہ انھیں ڈاکٹر انور سدید جیسا محبت کرنے والا دوست ملا ہے۔ ایسا عاشقِ صادق ہم نے پرانے شاعروں کے دواوین میں دیکھا تھا، یا اب زیرِ نظر کتاب میں دیکھا ہے۔

(۱۳ جولائی ۱۹۸۹ء)

سلسلۂ شہابیہ ایک فعال تنظیم کی صورت اختیار کر چکا ہے

قدرت اللہ شہاب مرحوم کے بارے میں ایک مرتبہ ہم نے لکھا تھا:

”ان میں بے شمار خوبیاں تھیں، مگر عیب صرف تین تھے، ابنِ انشاء، اشفاق احمد اور ممتاز مفتی۔ شہاب صاحب اگرچہ بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہے، مگر اپنے مخصوص مزاج کی وجہ سے ان میں عہدیداروں والی خُو بُو پیدا نہ ہو سکی۔ سول سروس کے اراکین انھیں ہمیشہ آؤٹ سائڈر سمجھتے رہے۔ اس طرح ان کی زندگی میں جو مجلسی خلاء پیدا ہوا، اسے انھوں نے ادب سے پُر کرنے کی کوشش کی۔ ادب ان کی زندگی میں آیا تو اہلِ ادب سے بھی شناسائی پیدا ہوئی۔ یوں تو متعدد ادیبوں سے ان کے تعلقات تھے، لیکن ابنِ انشاء، اشفاق احمد اور ممتاز مفتی ادب کے راستے ان کی زندگی میں داخل ہو گئے۔ ان تینوں کی وجہ سے شہاب صاحب کی تنہائی ختم ہوئی اور شہاب صاحب کی وجہ سے ان تینوں کی بہت سے محرومیوں کا ازالہ ہوا۔ یہ تینوں شہاب صاحب سے ملنے سے پہلے بیروزگار یا ”کم روزگار“ تھے۔ بعد میں اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوئے۔ اس کے جواب میں ان تینوں نے شہاب صاحب کو وہ منصب عطا کیا، جو برگزیدہ نفوس ہی کو حاصل ہوتا ہے۔ یعنی اچھے خاصے بیوروکریٹ قدرت اللہ شہاب کو ولی اللہ بنا دیا اور ان سے ایسے ایسے واقعات منسوب کیے، جو صوفیہ اور اولیاء کے تذکروں ہی میں پڑھنے میں آتے ہیں۔“

ابنِ انشاء، شہاب صاحب کی زندگی ہی میں اللہ کو پیارے ہو گئے، اس لیے انھیں شہاب صاحب کے روحانی کمالات کے بیان کی کچھ زیادہ مہلت نہ مل سکی۔ باقی دونوں خدا کے فضل سے ہمارے درمیان موجود ہیں۔ خدا انھیں تادیر سلامت رکھے۔ انھوں نے مادی سطح پر شہاب صاحب

سے جو کچھ حاصل کیا تھا، اسے روحانی سطح پر لوٹانے میں شب و روز مصروف ہیں۔ ان دونوں کی مخلصانہ کوششوں کے نتیجے میں سلسلۂ شہابیہ ایک فعال تنظیم کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ اور وہ دن دور نہیں جب تصوف کے دیگر سلسلوں کی طرح سلسلۂ شہابیہ بھی عالمگیر حیثیت اختیار کر لے گا اور شہاب صاحب کی آخری آرام گاہ قوالوں کی آخری پناہ گاہ بن جائے گی۔ اس ضمن میں جو تازہ ترین اطلاعات ملی ہیں، ان میں قابلِ ذکر یہ ہے کہ لاہور میں ہر ہفتے ایک عقیدت مند کے ہاں شہاب صاحب کی یاد میں ایک محفل منعقد ہوتی ہے، جس میں خود شہاب صاحب بھی شرکت کرتے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

ایک عرصے تک شہاب صاحب کو غلام محمد، سکندر مرزا اور ایوب خان جیسے آمروں کا قرب حاصل رہا۔ ذوالفقار علی بھٹو برسرِ اقتدار آئے تو انھوں نے بھی شہاب صاحب پر اعتماد کا اظہار کیا۔ وہ خود اختیاری جلاوطنی ترک کر کے بھٹو صاحب کی حکومت میں ایک اعلیٰ منصب پر فائز ہوئے۔ جنرل ضیاء الحق نے حکومت سنبھالی تو انھوں نے بھی شہاب صاحب کو ایک اعلیٰ عہدے کی پیشکش کی، لیکن اس مرتبہ انھوں نے کوئی عہدہ قبول نہ کیا، کیونکہ وہ سرکاری ملازمت سے اُکتا چکے تھے۔ غلام محمد کو سکندر مرزا نے چلتا کیا، سکندر مرزا کو ایوب خان نے تخت سے اتارا، ایوب خان کو ذوالفقار علی بھٹو نے اقتدار سے الگ کیا اور بھٹو صاحب کو جنرل ضیاء الحق نے رخصت کیا۔

سوچنے کی بات ہے کہ یہ سربراہانِ مملکت، جن میں سے ہر ایک نے اپنے پیشرو کا تختہ الٹا، شہاب صاحب کو اس قدر عزیز کیوں رکھتے تھے؟ ہمارا خیال ہے کہ اس کی وجہ یہ تھی کہ شہاب صاحب نہایت زیرک، معاملہ فہم اور مردم شناس بیوروکریٹ تھے۔ ان کا ذاتی کردار بے داغ تھا۔ وہ نہایت سادہ طریقے سے زندگی گزارتے تھے۔ دولتِ دنیا کو سمیٹنے کی کوشش کرتے تھے نہ اپنے عہدے سے کوئی ناجائز فائدہ اٹھاتے تھے۔ ہمیشہ اسی کا فائدہ ملحوظ رکھتے تھے جس کی وہ نوکری کرتے تھے۔ یہی وہ خوبیاں ہیں جن کی ہر سربراہِ مملکت نے قدر کی۔ لیکن یہی سوال اگر ممتاز مفتی اور اشفاق احمد سے کیا جائے، تو وہ یہ جواب دیں گے کہ شہاب صاحب چونکہ روحانیت کے بلند درجے پر فائز تھے، اس لیے سربراہِ مملکت کو غیب سے اشارہ ملتا تھا کہ انھیں اپنے قریب رکھے۔

ممتاز مفتی چونکہ اشفاق احمد سے زیادہ تجربہ کار اور سرد و گرم زمانہ چشیدہ ہیں، اس لیے انھوں نے شہاب صاحب کی زندگی ہی میں ان کی روحانیت کا چرچا شروع کر دیا تھا، جس کو اوّل

اوّل شہاب صاحب نے پسند نہ کیا اور آخر آخر سرِ تسلیم خم کر دیا۔ "شہاب نامہ" میں انھوں نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ ان کی بیگم نے شہاب صاحب سے متعلق ممتاز مفتی کی بعض تحریروں پر تعجب کا اظہار کیا تو انھوں نے کہا، "تم ممتاز مفتی کو جانتی ہو۔ بہت بڑا افسانہ نگار ہے۔ جو جی میں آئے لکھتا رہتا ہے۔ اس نے میرے سر پر سبز عمامہ باندھ کر اور اس میں مشک کافور کا برادہ چھڑک کر مجھے ایک عجیب و غریب پُتلا بنا رکھا ہے۔ وہ دیدہ و دانستہ عقیدے سے بھاگتا ہے اور عقیدت کا روگ پالتا ہے، اس کی کسی بات پر دھیان نہ دو۔"

شہاب صاحب کے انتقال کے بعد بھی ممتاز مفتی نے مضامین کی صورت میں مرحوم کے روحانی درجات کی بلندی کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے اور سننے میں آیا ہے کہ وہ ایک مستقل کتاب لکھ رہے ہیں، جو ضخامت میں "علی پور کا ایلی" کو مات کر دے گی۔ اشفاق احمد نے شہاب صاحب کی زندگی میں بوجوہ ان کے بارے میں کچھ لکھنے سے اجتناب کیا، تاہم زبان و کلام کی حد تک وہ شہاب صاحب کی روحانیت کا چرچا کرتے رہے۔ شہاب صاحب کے انتقال کے بعد انھوں نے ایک کتاب شائع کرنے کا منصوبہ بنایا۔ یہ کتاب "ذکرِ شہاب" کے نام سے گزشتہ مہینے شائع ہوئی ہے۔ یہ شہاب صاحب کی شخصیت اور "شہاب نامہ" کے بارے میں مختلف اہلِ قلم کے مضامین کا مجموعہ ہے، جس کے آخر میں شہاب صاحب کی کچھ متفرق تحریریں بھی شامل کر دی گئی ہیں۔ کتاب کا پہلا مضمون ممتاز مفتی کا ہے اور آخری اشفاق احمد کا، جو اس بات کا ثبوت ہے کہ مطالب کتاب کی حدود متعین ہیں اور ان حدود سے کوئی لکھنے والا تجاوز نہیں کر سکتا۔

اشفاق احمد، بقول شخصے، ڈراما نگار بھی ہیں اور ڈراما باز بھی، اس لیے ان سے کسی سنجیدہ علمی و ادبی کام کی توقع نہیں رکھنی چاہیے۔ تاہم شہاب صاحب سے انھیں جو قربت حاصل تھی، اس کی بنا پر ہمارا خیال تھا کہ وہ ایک ایسی کتاب مرتب کر دیں گے، جو شہاب صاحب کے بارے میں ایک بنیادی مآخذ کی حیثیت اختیار کرے گی۔ افسوس کہ یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ رسمی و روایتی قسم کے مضامین کے اس مجموعے سے شہاب صاحب کے بارے میں کوئی نئی بات سامنے نہیں آئی۔ حد تو یہ ہے کہ ان کے اصل کام کو سرے سے نظر انداز کیا گیا ہے۔ ان کے ادبی کاموں کے بارے میں کوئی مضمون اس کتاب میں شامل نہیں ہے۔ شہاب صاحب کچھ بھی ہوں، ان کی اصل حیثیت یہ ہے کہ وہ "یا خدا" جیسی لازوال تخلیق کے مصنف ہیں اور کئی ایسے افسانوں کے خالق ہیں جو اردو

ادب میں ناقابلِ فراموش اضافہ ہیں۔ شہاب صاحب کی ادبی حیثیت کی نفی کر کے اشفاق احمد نے اپنے "گرو" کے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں کیا۔

"شہاب نامہ" یقیناً ایک اہم کتاب ہے۔ نثر کے اعتبار سے یہ ایک اعلیٰ درجے کی تصنیف ہے۔ لیکن جہاں تک مطالب کا تعلق ہے، اس کی حیثیت متنازع ہے۔ اس کتاب کے بعض بیانات نیم صداقت کا درجہ رکھتے ہیں، بعض آرائشِ بیان کے ذیل میں آتے ہیں اور بعض محض "بیان صفائی" کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ اس کتاب پر ایسے لوگوں سے لکھوایا جاتا، جو شہاب صاحب کے بیانات کو پرکھتے اور صداقت اور نیم صداقت کے درمیان امتیاز کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اگر نئے مضامین لکھوانے ممکن نہیں تھے تو کم از کم ان "تنقیدی" تبصروں ہی کو زیرِ نظر کتاب میں شامل کیا جا سکتا تھا، جن سے تصویر کا دوسرا رُخ سامنے آتا ہے۔

شخصیت پر لکھنے والوں نے عقیدت کے بے پناہ پھول برسائے ہیں۔ شہاب صاحب کا چہرہ ان پھولوں سے اس طرح ڈھک گیا ہے کہ دیکھنے والے کو پھولوں کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ ان پھولوں کی خوشبو مسحور کن سہی، لیکن آنکھیں اس قدرت اللہ شہاب کو ڈھونڈتی ہیں، جو دیندار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک دنیا دار انسان بھی تھا اور دنیا کو برتنے کا ہنر جانتا تھا۔ اشفاق احمد نے اپنے مضمون میں شہاب صاحب کی یک رخی تصویر پیش کرنے پر ان لفظوں میں معذرت کی ہے:

"شہاب صاحب کی جوانی کے قصے بہت ہی بھرپور اور بے حد رس بھرے، میں نے ان لوگوں سے سنے، جو انھیں ان کی جوانی کے وقت سے جانتے تھے۔ پھر ان کے سینئر افسروں، ساتھی افسروں اور ماتحت عملے سے وہ کچھ بھی معلوم ہوا، جو عام طور پر بڑے بیورو کریٹ افسروں کے بارے میں مشہور ہوتا ہے۔
ان کے ہم عصر ادیبوں سے انسانی کمزوری کے ایسے واقعات بھی معلوم ہوئے، جن کا براہِ راست تعلق شہاب صاحب کی ذات سے تھا۔ اپنے نفس کی تشفی کے لیے میں نے چند کہانیاں اور بھی حاصل کر کے رکھیں، لیکن ان سب کو جوڑ جاڑ کر بھی شہاب صاحب کی تصویر مکمل نہ ہوئی۔ سیدھی تصویر تو کیا بنتی، ایک تجریدی تصویر بھی نہ بن سکی۔ شہاب صاحب کو کلی طور پر سمجھنے کے لیے ان کے ایک محرم

راز قریبی دوست سے درخواست کی کہ وہ ان کے مخفی پہلو کو اُجاگر کرنے کے لیے کچھ لکھے تاکہ ہمارے دلوں کا بوجھ اترے۔ لیکن انھوں نے بھی یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ حضرت عمرؓ کی بائیوگرافی ان کے فاروقِ اعظم بننے سے پہلے کوئی معنی نہیں رکھتی۔" (ص ۲۹-۲۸۳)

سوال یہ نہیں کہ شہاب صاحب کی انسانی کمزوریاں تلاش کی جائیں اور مخفی پہلو تلاش کیے جائیں۔ اصل چیز یہ ہے کہ اس قدرت اللہ شہاب کو تلاش کیا جائے، جو عام انسانوں جیسا ایک انسان تھا۔ اس سلسلے میں زیرِ نظر کتاب ہماری کوئی مدد نہیں کرتی اور اشفاق احمد کے مضمون سے تو یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ ان کا موضوع خود اُن کی اپنی شخصیت ہے یا شہاب صاحب کی شخصیت۔ آدھے سے زیادہ مضمون میں اشفاق احمد نے اپنی مدح سرائی کی ہے اور قسم کی نادر معلومات فراہم کی ہیں:

"اپنی کسی چیز کے ساتھ شیئر کرنے یا اپنی چیز کسی کو دینے یا اپنے مال میں سے کچھ کسی کو عطا کرنے کے خیال سے مجھ پر خفقان کی اور اس کے بعد ہذیان کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ میں اپنی معمولی سے معمولی چیز بھی "رینی ڈے" کے لیے سنبھال کر رکھتا ہوں۔ گو ابھی تو کوئی رینی ڈے تو نہیں آیا (نہ ہی اب امید رہتی ہے) البتہ میرے پاس چیزوں کے خزانے جمع ہو چکے ہیں اور ان میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔" (ص ۲۵۹)

ہمیں شہاب صاحب سے دلی ہمدردی ہے کہ ایسا مادیت پرستانہ رویہ رکھنے والے ان کے روحانی مدارج کی گواہی دے رہے ہیں! کہیں ایسا تو نہیں کہ اشفاق احمد کو اپنے مال میں سے کسی کو کچھ عطا کرنے اور یہ مضمون لکھنے کا خیال ساتھ ساتھ آیا ہو۔ اپنے مال میں سے کسی کو کچھ عطا کرنے کے خیال کے بعد کی کیفیت اس مضمون میں بھی ملتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ الفاظ کے استعمال میں انھوں نے احتیاط سے کام نہیں لیا۔ اوپر جو اقتباس درج کیا گیا ہے، اس میں شہاب صاحب کو حضرت عمرؓ سے تشبیہ دی گئی ہے۔ یہ کوئی معقول بات نہیں۔ اسی طرح ایک جگہ وہ شہاب صاحب کے عجز و انکساری کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں، "وہ غیرت اور خودداری اور پاسِ ناموس سے قطعاً ناآشنا تھے۔" شہاب صاحب جیسی محترم شخصیت کے بارے میں ان الفاظ کا استعمال دیکھ کر

یہی کہا جا سکتا ہے:

؎ ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

اس کتاب میں بعض جگہ حواشی کی ضرورت تھی، لیکن جناب مرتب نے اس قسم کی کوئی زحمت نہیں اٹھائی۔ مثلاً حبیب اللہ شہاب نے لکھا ہے:

''بابائے اُردو سے ان کا لگاؤ بہت گہرا تھا۔ ہفتے میں ایک آدھ بار ان کے یہاں حاضری دیتے اور انجمن ترقی اُردو کے کام میں بہت فرحت محسوس کرتے۔'' (ص ۳۹)

بابائے اُردو نے اپنی زندگی میں شہاب صاحب کو زیادہ سے زیادہ چھ سات مرتبہ دیکھا تھا۔ ایک مرتبہ گلڈ کے افتتاحی جلسے میں اور تین چار مرتبہ شہاب صاحب کے دفتر میں۔ بابائے اُردو اپنے آخری دنوں میں مری کے فوجی اسپتال میں زیر علاج تھے، تو وہاں بھی شہاب صاحب دو ایک مرتبہ تشریف لائے تھے۔ لیکن جہاں تک بابائے اُردو کے ہاں حاضری دینے کا تعلق ہے، ہفتے میں ایک آدھ بار تو کیا، شہاب صاحب نے اپنی پوری زندگی میں بھی ایک آدھ بار اس قسم کی زحمت نہیں اٹھائی۔

اسی طرح ایم بی خالد نے اپنے مضمون میں لکھا ہے:

''ایک وقت آ گیا جب شہاب نے محسوس کیا کہ خوشامدی لوگ صدر پاکستان (محمد ایوب) کے گرد حلقہ تنگ کر رہے ہیں اور صدر صاحب کی بصارت ضعیف ہو کر ان کی بصیرت پر اثر انداز ہونے لگی ہے، تو انھوں نے نوکری سے آزادی کی درخواست گزار دی۔'' (ص ۱۰۲)

ایم بی خالد وہی صاحب ہیں، جن کی کتاب ''ایوانِ صدر میں سولہ سال'' خاصی مقبول ہوئی ہے۔ ''شہاب نامہ'' میں شامل مضمون انھوں نے پہلے لکھا تھا، مذکورہ کتاب بعد میں شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب میں شہاب صاحب کے استعفے کا جو متن شامل ہے، اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ شہاب صاحب خود بھی ان لوگوں میں شامل تھے، جو صدر ایوب کے گرد حلقہ تنگ کر رہے تھے۔ اس استعفے کے یہ الفاظ قابل توجہ ہیں:

''جناب صدر نے ملک میں نئی زندگی کا احساس پیدا کیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ میں

الگ ہو کر اپنا اصل کام شروع کرنا چاہتا ہوں۔ اصل میں میرا مشن ہی جناب صدر کے افکار اور فلسفے کی تشریح ہو گا۔ سول سرونٹ کی حیثیت سے میں صرف عام قسم کا..... فائل ورک کر سکتا ہوں۔ الگ ہو کر میں ان کے افکار کو پھیلانے اور عام کرنے کے لیے کتابیں لکھ سکوں گا، لیکچر دے سکوں گا۔''

ایسے اور بھی مقامات کی نشاندہی کی جا سکتی ہے جہاں مرتب کی طرف سے حواشی کی ضرورت تھی۔

اس کتاب میں شہاب صاحب کے کچھ خطوں کے عکس بھی شامل ہیں۔ بانو قدسیہ کے نام ایک خط میں شہاب صاحب فرماتے ہیں:

''مجھے نہ پیری پسند ہے نہ فقیری۔ میں تو محض ایک سیدھا سادا عیش پسند انسان ہوں۔ جب عیش میسر ہو تو اللہ کا احسان ہے۔ جب نہ ہو تو تب بھی اس کی دین ہے۔ پتا نہیں کس طرح۔ لیکن کسی نہ کسی طرح کھینچ کھانچ کر اب میں اس منزل تک پہنچ گیا ہوں، جہاں میرے لیے مدح و ذم یکساں ہیں۔ اس منزل میں میری واحد آزمائش مفتی جی ہیں۔ وہ چابک مار مار کر حکم دیتے ہیں کہ اپنی تعریف سنو اور خوش رہو۔ میں تعریفیں سنتا ہوں اور خوش ہوتا ہوں۔'' (ص ۶۶)

(۳۰/جولائی ۱۹۸۹ء)

شہاب صاحب توجہ فرماتے تو ملک و قوم بہت سی بلاؤں سے محفوظ ہو جاتے

ابھی ہم اشفاق احمد کی کتاب "ذکرِ شہاب" کی طلسمی فضا سے باہر نہیں نکلے تھے کہ ان کی بیگم بانو قدسیہ نے بھی قدرت اللہ شہاب کے بارے میں "مردِ ابریشم" کے نام سے ایک کتاب لکھ کر شائع کرادی ہے، جسے پڑھ کر ہم ایک خواب آور فضا میں پہنچ گئے ہیں۔ "خواب آور" اس لیے کہ بانو قدسیہ نے شہاب مرحوم کو صرف حقائق ہی کے حوالے سے نہیں دیکھا بلکہ خوابوں کے ذریعے بھی پہچاننے کی کوشش کی ہے۔ بانو قدسیہ کا ایک خواب ملاحظہ کیجیے:

"ایک پہاڑی علاقے میں ایک کشادہ سڑک ہے، جس پر کار چل رہی ہے اور اس میں شہاب بھائی، میں اور خان صاحب (اشفاق احمد) سوار ہیں...... ایک ایسے مقام پر جہاں نشیب میں ایک خوبصورت گاؤں اور پشت کی جانب ایک آبشار ہے، کار رک جاتی ہے...... شہاب بھائی بولے، "اس آبشار کو دیکھا اشفاق! اس کا پانی چادر کی طرح گر رہا ہے اور شیشے کی طرح شفاف ہے۔ اس پر چل کر اوپر جانا ہوگا"...... کچھ یہ لمحے گزرے ہوں گے کہ نظر آیا شہاب بھائی آبشار پر اوپر کی طرف چڑھ رہے ہیں...... وہ بڑے اطمینان سے اوپر کی طرف چلتے جا رہے ہیں۔ انھیں جاتا دیکھ کر مجھے کچھ گھبراہٹ ہوئی۔ میں نے خان صاحب کو گھسیٹا اور ہم دونوں بھاگم بھاگ آبشار تک پہنچے۔ شہاب بھائی واپس لوٹے اور بولے،
"اشفاق! وقت بہت ہی تنگ ہے، آؤ چلیں۔"
"لیکن شہاب بھائی، ہم تو پانی پر چلنا نہیں جانتے۔" میں نے کہا۔
"پانی پر چلنا نہیں پڑتا۔ جتنی تیزی سے یہ نیچے گرتا ہے، اسی رفتار سے آپ کو اوپر

دھکیلتا ہے۔"...... شہاب بھائی مسکرائے اور دونوں ہاتھ لجاجت سے آگے بڑھا کر بولے، "تم دونوں کو کچھ کرنا نہیں پڑے گا، بس مضبوطی سے میرے ہاتھ پکڑ لو، پانی ہمیں خود بخود اوپر پہنچا دے گا۔" ہم دونوں نے ان کا ایک ایک ہاتھ بڑی مضبوط گرفت سے پکڑ لیا اور پھر محسوس ہوا، جیسے نیوٹن کا اصول کارفرما ہے۔ جس تیزی سے آبشار گر رہی تھی، اسی سرعت سے درمیان میں شہاب بھائی، دائیں بائیں خان اور میں آبشار پر اوپر اٹھتے جا رہے تھے۔"

قطع نظر اس سے کہ عالمِ بیداری میں کرتب دکھانے کی عادت پڑ جائے، تو خواب بھی بازی گرانہ آتے ہیں، اگر بانو قدسیہ یہ نہ بتاتیں کہ مذکورہ واقعہ ایک خواب ہے، تو کوئی وجہ نہ تھی کہ ہم اسے ایک سچا واقعہ نہ سمجھتے۔ کیونکہ بانو قدسیہ نے زیرِ نظر کتاب میں جتنے سچے واقعات لکھے ہیں، وہ بیداری کے عالم میں نہیں، غنودگی کی حالت میں ہی لکھے جا سکتے ہیں۔

اس کتاب کا مرکزی اور بنیادی خیال یہ ہے کہ قدرت اللہ شہاب کا تعلق بظاہر تو اسی عالمِ آب و گِل سے تھا، لیکن بباطن وہ کسی اور دنیا کے باشندے تھے۔ جب وہ......

"کسی کے خیر خواہ ہو جاتے، کسی پر اپنی نظر کی رِدا ڈال دیتے، اس کے لیے خیر خواہی کا جذبہ محسوس کرتے، تو پھر ان خواہش سے ہی احکام جاری ہوتے۔ کام بننے لگتے۔ حالات سدھرنے لگتے۔ وہ چاہے انشاء جی ہوں، خان صاحب (اشفاق احمد) کا گھرانا ہو، مفتی جی کے گھر والے ہوں...... سب کی گاڑیاں اپنے اپنے پٹرول سے چلنے لگتیں۔" (ص ۳۸)

یہی بات بانو قدسیہ نے ایک دوسرے انداز میں یوں لکھی ہے:
"مفتی جی، اشفاق احمد، انشاء جی اور جانے کون کون سے ایسے گھر تھے، جدھر انھوں نے توجہ دی اور رزق، خوشی، اولاد، محبت اور جانے کیا کیا برکتوں سے ان گھروں کو یوں بھرا کہ دروازے بند کرنے مشکل ہو گئے۔" (ص ۱۱۴)

اب تک تو یہی سنا تھا کہ رزق اور اولاد وغیرہ سے خدا نوازتا ہے، اب معلوم ہوا کہ خدا کے بعض "برگزیدہ" بندے بھی یہ کام کر سکتے ہیں۔

شہاب صاحب کی نگاہِ توجہ کے کچھ اور مثبت نتائج بھی نکلتے تھے۔ مثلاً:

''آپی آپ نوکری کے پروانے آ جاتے۔ گودیوں میں بیٹے پوتے آ جاتے......
اچانک پرائز بونڈ کا انعام نکل آتا۔ چوری کا سامان چور گھر چھوڑ جاتے۔'' (ص ۳۸)

یہ تو عالمِ انسانیت پر شہاب صاحب کے احسانات تھے۔ عالمِ نباتات پر بھی جب ان کی نگاہ مائل بہ کرم ہوتی تو......

''بانجھ درخت پھل لانے لگتے۔ بیلیں ہری ہو جاتیں خشک ان ڈور پلانٹس میں نئے سرے سے پتیاں نکل آتیں۔ انگوروں کی بیل میں پھل زیادہ آتا۔ میگنولیا کے پودے کو پھول بے تحاشا لگنے لگتے...... لان کے خشک حصوں میں خود بخود سبزہ پھیلنے لگتا۔'' (ص ۳۸)

افسوس کہ اتنی زبردست روحانی قوت رکھنے والے شہاب صاحب کی نگاہِ توجہ اشفاق احمد اور ممتاز مفتی کے گھرانوں، انگوروں کی بیلوں اور بانجھ درختوں سے آگے نہ بڑھی۔ کاش وہ ملک اور قوم کی طرف توجہ فرماتے تو ہم بہت سی بلاؤں سے محفوظ ہو جاتے۔ بار بار مارشل لا نہ لگتا، ۱۹۷۱ء کی جنگ میں ہمیں شکست نہ ہوتی۔ ملک دو حصوں میں تقسیم نہ ہوتا۔

شہاب صاحب صرف اہل لوگوں ہی کو نہیں نوازتے تھے، نااہلوں کی سرپرستی بھی فرماتے تھے۔ ممتاز مفتی کے صاحبزادے، عکسی مفتی، نے ایک مرتبہ بانو قدسیہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا تھا:

''قدسی تمھیں معلوم ہے Shahab Sahib is a Power۔ اس کی ایک Magnetic Field ہے۔ اس میں فیلڈ میں جو بھی داخل ہوتا ہے، اس پر کچھ وارداتیں ہونے لگتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ میں اپنی جاب کو Deserve نہیں کرتا، لیکن چونکہ میں شہاب کے مقناطیسی دائرے میں ہوں، کوئی مجھ سے نوکری نہیں لے سکتا۔''

اس پر بانو قدسیہ نے اس نوجوان کو سمجھایا:

''اب تم اس قدر خوش بھی نہ ہو جاؤ عکسی۔ جمعہ جمعہ آٹھ دن کی پیدائش، کچی نوکری اور وہ بھی نیم سرکاری۔ کل بلاسٹ کر دیں تو تمھیں پتہ نہ چلے۔''

عکسی نے اس کا یہ جواب دیا، ''جب تک شہاب نہ چاہے، مجھے کوئی بلاسٹ نہیں کر سکتا۔'' (ص ۴۰)

ممتاز مفتی کو شہاب صاحب سے ''عقیدت'' تو والہانہ تھی ہی، عکسی مفتی اس سلسلے میں اپنے

باپ سے بھی آگے بڑھ گیا ہے۔ شاید ایسے ہی موقعوں پر کہا جاتا ہے:

ع اگر پدر نتواند پسر تمام کند

زیرِ نظر کتاب میں بانو قدسیہ نے اپنے شوہر، اپنے تینوں بیٹوں، بہوؤں، ممتاز مفتی، عکسی مفتی کے اور خود اپنے حوالے سے شہاب صاحب کی شخصیت کے مافوق الفطرت پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے، اور نہایت تفصیل سے بتایا ہے کہ شہاب صاحب کا کس سے کیسا تعلق تھا۔ جوشِ عقیدت میں بعض جگہ ایسا بھی ہوا ہے کہ شہاب صاحب پس منظر میں چلے جاتے ہیں اور مذکورہ افراد اس طرح نمایاں ہو جاتے ہیں، جیسے یہ کتاب انھیں کے روحانی درجات کی بلندی کے مناظر دکھانے کے لیے لکھی گئی ہے۔ مثلاً عکسی مفتی کے بارے میں غیر ضروری اور غیر دلچسپ تفصیلات سے قاری اکتا جاتا ہے۔ خصوصاً اس کی دوسری شادی کا واقعہ کوئی قومی و ملی اہمیت کا واقعہ تو نہیں تھا جو بانو قدسیہ اس کے بیان میں اپنا اور قاری کا وقت ضائع کرتیں۔

مصنفہ نے کتاب میں اپنے اور ممتاز مفتی کے گھر کے ہر فرد کی تصویر شامل کی ہے۔ بچوں کی شادیوں کی تصویریں بھی ہیں۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ کتاب دراصل ایک فیملی البم ہے جو شہاب صاحب کی خدمت میں نذرانۂ عقیدت کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

شہاب صاحب کے انتقال کے بعد ان کے عقیدت مندوں میں بحث چل رہی ہے کہ ان کا جانشین کون ہے؟ ممتاز مفتی یا اشفاق احمد۔ یہ دونوں بزرگ شہاب صاحب کے بے حد قریب تھے اور دونوں نے ایک دوسرے سے بڑھ کر شہاب صاحب کی خدمت کی ہے۔ اس لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ کون جانشینی کے اعزاز کا مستحق ہے۔ یہ خوشی کی بات ہے کہ زیرِ نظر کتاب میں اس مشکل مسئلے کا حل موجود ہے۔

بانو قدسیہ نے اشفاق احمد کا ایک مضمون بھی اپنی کتاب میں شامل کیا ہے، جس کے ابتدائی الفاظ یہ ہیں:

''میں سمجھتا ہوں کہ اب یہ بات کہہ دینی چاہیے اور اس کے کہنے میں کسی قسم کی معذرت یا کسی حیلے کو سہارا نہیں بنانا چاہیے کہ میں قدرت اللہ شہاب کا خلیفہ ہوں اور واحد خلیفہ ہوں کیونکہ انھوں نے دو مرتبہ خود اپنی زبان سے واشگاف الفاظ میں بیان دیا تھا کہ اشفاق احمد میرا خلیفہ ہے اور میں اس کے لیے دعا کرتا ہوں۔'' (ص ۲۳)

شہاب صاحب نے ''خلیفہ'' کا لفظ کن معنوں میں استعمال کیا تھا، اس کی تفصیل بانو قدسیہ نے ان لفظوں میں بیان کی ہے:

''شہاب بھائی کے (پیروں کے) انگوٹھوں میں جو ناخن اگتے وہ ایسے ناہنجار ہوتے کہ سیدھا باہر نکلنے کی بجائے اندر کی طرف مڑ کر گوشت میں پیوست ہونے لگتے۔ یہ ناخن خان صاحب (اشفاق احمد) بڑی پریت سے، جیسے کوئی لڑکی گڑیا کو کپڑے پہناتی ہے، کاٹا کرتے تھے۔'' (ص ۶۱)

یہ کام عموماً لاہور میں اشفاق احمد کے گھر پر ہوتا تھا، لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ اشفاق احمد کو یہ خدمت انجام دینے کے لیے اسلام آباد جانا پڑتا۔ شہاب صاحب فون کرکے بانو قدسیہ سے کہتے

''میرے ناخنوں کی تکلیف بڑھ گئی ہے...... تم میرے خلیفہ کو ایک دن کے لیے بھیج دو کہ آ کر میرے ناخن کاٹ جائے۔'' (ص ۸۰)

اردو ادب کی تاریخ میں ایک اور ''خلیفہ'' بھی گزرے ہیں۔ یہ اپنے زمانے کے مشہور شاعر اور میرزا سودا کے شاگرد تھے۔ نام عنایت اللہ تھا اور تخلص حجام۔ نہایت متقی اور پرہیزگار تھے البتہ شاعری میں خاصے شوخ تھے۔ ان کے چند شعر سنیے:

سر میاں حجام بہتوں کا بچریں تھے مونڈتے
آج اس کوچے میں ان کی بھی حجامت ہو گئی

اس شوخ کے کوچے میں نہ جایا کرو حجام
چھن جائیں گے اک روز یہ ہتھیار تمہارے

دکان کے آگے سے گزر جاتے ہیں بے لوث
سکھوں کو ذرا دیکھ غضب کرتے ہیں کتنا

کہتے ہیں حسینانِ جہاں مجھ کو خلیفہ
حجام نہیں کہتے، ادب کرتے ہیں کتنا

آخری شعر میں لفظ ''خلیفہ'' انھیں معنوں میں استعمال کیا گیا ہے، جن معنوں میں شہاب صاحب استعمال کیا کرتے تھے۔

(۳۱ راگست ۱۹۸۹ء)

علی گڑھ کی تعلیم بھی ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکی

آج کل اخباروں میں وفاقی وزیر تعلیم غلام مصطفیٰ شاہ کا بڑا چرچا ہے۔ کہیں ان کے خلاف مضامین چھپ رہے ہیں اور کہیں ان کے حق میں۔ ہمیں شاہ صاحب کے مخالفوں اور ہمدردوں دونوں سے شکایت ہے کہ رائی کا پہاڑ بنا رہے ہیں۔ ہمارے اس جملے کا غلط مطلب نہ لیا جائے، ہم شاہ صاحب کو ''رائی'' سے تشبیہ دینے کی جسارت نہیں کر سکتے۔ البتہ انھیں ''رائے کا پہاڑ'' کہا جا سکتا ہے کیونکہ وہ ہر اس مسئلے پر رائے دینے کے لیے بے تاب نظر آتے ہیں، جو ان کی چوٹی یعنی سر کے اوپر سے گزر جاتا ہے۔ مثلاً اردو، مہاجر، اقبال اور قائداعظم وغیرہ کے بارے میں انھوں نے وقتاً فوقتاً جن آراء کا اظہار کیا ہے، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ علی گڑھ کی تعلیم بھی ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکی۔ البتہ وفاقی وزارت نے ان کی شخصیت کو بگاڑنا اور مسخ کرنا شروع کر دیا ہے، جس کا ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے اقبال اکیڈمی کے بورڈ آف گورنرز کی صدارت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے:

''علامہ اقبال بین الاقوامی اور قومی سطح کی چند اہم شخصیتوں میں سے ایک تھے اور پاکستان تاریخ کے ایسے مقتدر مفکرین پر بلاشبہ فخر کر سکتا ہے...... پاکستان کے جغرافیائی، مذہبی، سماجی اور ثقافتی وجود کا سب سے پہلے علامہ اقبال نے تصور پیش کیا، اور یہ وہ قرض ہے، جو قوم کبھی ادا نہیں کر سکتی۔''

معلوم ہوتا ہے، حساب کتاب کے معاملے میں شاہ صاحب خاصے بے پروا واقع ہوئے ہیں۔ اقبال کے جس قرض کی ادائیگی کا وہ ذکر فرما رہے ہیں، وہ تو خود شاہ صاحب ہی کے ذریعے ادا کیا جا چکا ہے۔ یہ زیادہ پرانی بات نہیں ہے۔ شاہ صاحب نے خود اپنے رسالے ''سندھ کوارٹرلی'' میں وقتاً فوقتاً لکھ کر قسطوں میں یہ قرض ادا کیا ہے۔ قرض کی صرف تین ابتدائی قسطیں ملاحظہ کیجیے:

''پاکستان کو اقبال کے فلسفے سے ہوشیار رہنا چاہیے، جس نے پنجاب کو فاشزم،

دہشت گردی اور مطلق العنانیت دی ہے، جو بدلے میں اسے اور بقیہ پاکستان کو تباہ کردے گی۔ اقبال محبت، خیر خواہی اور وطن دوستی کا شاعر نہیں تھا۔ وہ تکبر، نفرت، فرقہ واریت اور نسلی تفاخر کا شاعر تھا۔ وہ صرف پنجاب کے نفسانی اور حیوانی کنجرپن کا عاشق تھا۔ اس کے افکار کسی قوم کی تخلیق اور بقا کے لیے نہیں تھے، بلکہ قوم کو تباہ کرنے کے لیے تھے۔ وہ عام آدمی اور عوام الناس پر یقین نہیں رکھتا تھا۔ وہ تو خواص کا چیمپئن اور پیروں اور لٹیروں کا لیڈر تھا۔"

(سندھ کوارٹرلی، ۸۹-۱۹۸۷ء)

"وہ بے ہودگی، بازاری پن اور زبان و بیان کے بھونڈے پن کا بادشاہ بنا رہتا تھا۔ اقبال قابل ذکر نوعیت اور اہمیت کا شاعر ضرور تھا، لیکن فکری اعتبار سے بہت معمولی اور عامیانہ۔ میرا خیال ہے کہ ساری زندگی اسے بطور عالم عزت نفس اور فخر کا احساس تک نہیں ہو سکا۔ اپنی زندگی کے آخر تک وہ انگریزوں کا درباری بنا رہا۔ ہندوستانی رجواڑوں، دہلی، لاہور، حیدرآباد، بھوپال اور لندن سے ہمیں اس کی گداگری، ناداری اور بدچلنی کے وافر ثبوت، شواہد اور ریکارڈ دستیاب ہوتے ہیں۔"

(ایضاً، جلد ۱۲، شمارہ ۲۰)

"اقبال فاشزم کا شاعر تھا، جو استعماریت کے گرگے اور پروردہ اور ہندوستانی راجواڑوں کے درباری اور چاپلوس کے طور پر پروان چڑھا۔ اس کی تعریف میں ہم خواہ کتنی غزلیں، ترانے پڑھا کریں، اس کی شاعری کی وجہ سے پاکستان میں فرقہ واریت اور نسل پرستی کا آغاز ہوا۔ قائداعظم کا پاکستان ٹوٹا، ملک دو ٹکڑوں میں بٹا اور آج کا پاکستان پیدا ہوا...... اقبال صحیح معنوں میں فاشسٹ تھا اور اپنے استاد نطشے کی طرح پاگل۔"

(ایضاً، جلد ۱۰، شمارہ ۱۰)

افسوس صد افسوس کے حیوانی کنجرپن کے عاشق، بازاری پن کے بادشاہ، عزت نفس سے محروم شاعر اور بدچلن شخص کے نام پر قائم ہونے والی اکیڈمی کا صدر غلام مصطفیٰ شاہ کو بنا دیا گیا۔ اور

شاہ صاحب نے اپنے ضمیر کے خلاف اور محض سیاست کی خاطر، اس عہدے کو قبول کر لیا اور یہ بھی نہ سوچا کہ یہ عہدہ ان کی عالی نسبی کے شایان شان نہیں ہے۔ گویا:

ع اس عاشقی میں عزت سادات بھی گئی

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ اقبال کی شاعری کی وجہ سے پاکستان میں فرقہ واریت اور نسل پرستی کا آغاز ہوا۔ مگر یہ نہیں بتایا کہ اس فرقہ واریت اور نسل پرستی کو فروغ کس نے دیا۔ ہمارے خیال میں اس "قومی خدمت" کا سہرا سوائے شاہ صاحب کے، کسی اور کے سر نہیں بندھ سکتا۔ تخریب کاری کا شگوفہ بم ہی سے نہیں ہوتی، قلم سے بھی ہوتی ہے۔ شاہ صاحب کے قلم کی زہر چکانی کی چند مثالیں ملاحظہ فرمایئے:

"اُردو ایک ایسی زبان ہے جسے سماجی اور فکری غلامی کے لیے ڈیزائن کیا گیا ہے۔"

(سندھ کوارٹرلی، جلد ۹، شمارہ ۱)

"ہم اُردو کو پاکستان کے قومی لوگوں کے خلاف ایک سازش سمجھتے ہیں۔ اُردو نے پاکستان میں فکری، سماجی، اخلاقی اور سیاسی طالع آزمائی کے امکانات ہی پیدا نہیں کیے بلکہ اسے زندگی کی ایک حقیقت اور المیہ بنا دیا۔"

(ایضاً)

"اُردو کو اپنی قومی زبان مان کر ہمیں پاکستان دشمن رواجوں، اداروں، طرز معاشرت اور درباری رسوم و آداب کے خطرات کی پیش گوئی کر دینی چاہیے۔"

(ایضاً، جلد ۱۱، شمارہ ۲)

"موجودہ اُردو میں وہ ساری کمزوریاں موجود ہیں، جن کی وجہ سے وہ پاکستان کی قومی زبان کے طور پر باقی نہیں رہ سکتی۔ یہ تو پنجابی فوج، پنجابی نوکر شاہی اور پنجاب کے ناشروں اور تاجروں کی کوششیں ہیں، جن کی وجہ سے اُردو کو مصنوعی طور پر باقی رکھا جا رہا ہے۔ یہ وہ زبان ہے، جو پنجاب کے عوام کو قابو میں رکھنے کے لیے اور ان کی تذلیل کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ انگریزی ایک جمہوری، فطری، پکی اور بنیادی طور پر غیر شاعرانہ زبان ہے۔ اُردو درباری، نسائیت زدہ، رومان پرست، مبالغہ آرائی کا شکار اور تصنع زدہ زبان ہے..... اُردو برہمنوں، ناچ گانے

اور دل لگی کی زبان بن گئی ہے......غل غپاڑہ، مبالغہ آرائی، تصنع، تکلف، آرائش اور دھوکا دہی پاکستان کے لوگ کبھی قبول نہیں کریں گے۔“

(سندھ کوارٹرلی، ۸۹-۱۹۸۷ء)

”سندھ کو ہند کا تعارف، ناچ گانے اور عصمت فروشی سے ہوا تھا۔ سندھ میں دلّی والے کا مطلب تھا دھوکے باز یا دلال یا جیب کترا۔ یوپی سے چوڑی دار پاجاموں یا غراروں میں ملبوس آنے والی عورتیں زیادہ تر خادمائیں تھیں یا گانے والیاں یا طوائفیں۔ انھیں ”کبوتریاں“ کہا جاتا تھا۔“

(سندھ کوارٹرلی، ۸۹-۱۹۸۷ء)

”۱۹۴۹ء کے بعد پاکستان میں داخل ہونے والا ہر ہندوستانی شہری، بھارت کا ایجنٹ ہے یا امریکہ کا، جسے یہاں اس منصوبے کے تحت بھیجا گیا ہے کہ پاکستان کی ترقی کی رفتار خراب کرے اور اس کے ایک قوم بننے کی کوششوں میں رخنے ڈالے اور خاندانی اور فرقہ وارانہ بالادستیاں زندہ اور مضبوط رکھے۔“

(سندھ کوارٹرلی، جلد ۵، شمارہ ۳)

”ہندوستان سے ہجرت کے وقت اہلِ فکر اور صاحبِ کردار لوگ مہاجرین میں شامل نہیں ہوئے۔ وہ ہندوستان ہی میں رہے۔ صرف گنواروں کا ریوڑ اور کنجڑے، قصائی اور نوکر شاہی، پناہ اور تماشے کی خاطر پاکستان بھاگ آئے۔ ہندوستان کی تقسیم سے فی الحقیقت ہندوستان کے مسلمانوں میں سے جھوٹے عناصر اور گندگی کی چھانٹی ہوگئی اور وہ پاکستان چلے آئے۔“

(سندھ کوارٹرلی، جلد ۵، شمارہ ۴)

”کیا ہمارے مہاجر ساتھی دیانت سے اپنے ضمیر کے سوالات کا جواب دے سکتے ہیں اور کوئی توجیہہ اپنے اعمال اور ارادوں کی کر سکتے ہیں؟ وہ سندھ میں تباہ حال آئے تھے، لیکن انھیں اقتدار، قوت، لوٹ کھسوٹ کے آسان مواقع اور چوری کے ذرائع مل گئے۔ سندھ نے ان کے لیے کیا نہیں کیا۔ کیا نہیں دیا۔ لیکن کیا ہم پوچھ سکتے ہیں کہ انھوں نے سندھ کو چالیس سال میں سوائے سازش گداگری،

بدکرداری اور فساد کے اور کیا دیا ہے؟ سندھ کو کون کون سے فائدے اور مواقع جان بوجھ کر نہیں دیئے گئے اور کون سی خفیہ اسکیمیں اس کے عوام میں تلخی، لڑائی جھگڑا اور بے یقینی پیدا کرنے کے لیے بروئے کار نہیں لائی گئیں۔ کیا سندھ کی زندگی ان کے مفادات اور ضرورتوں کے مطابق نہیں ڈھل گئی اور کیا وہ ان لوگوں کے گماشتے نہیں بن گئے، جو پاکستان کو ہڑپ کرنا چاہتے تھے اور سندھ کو نگل جانا چاہتے تھے۔“

(سندھ کوارٹرلی، ۸۹-۱۹۸۷ء)

بعض لوگ کہتے ہیں کہ اُردو زبان، جس نے پاکستان کی جنگ لڑی، اور مہاجر، جنھوں نے پاکستان بنایا، ان دونوں کے لیے اس قسم کے زہریلے اور متعصبانہ خیالات کا اظہار کوئی پڑھا لکھا آدمی تو کیا کوئی ناخواندہ شخص بھی نہیں کر سکتا۔ شاہ صاحب ایک کالج میں استاد، ڈائریکٹر آف ایجوکیشن اور ایک یونیورسٹی میں وائس چانسلر رہے ہیں اور اب وزیرِ تعلیم ہیں۔ تعلیم سے اتنے گہرے تعلق کے بعد بھی وہ بصیرت سے محروم ہیں۔

ہمیں اس رائے سے اتفاق نہیں ہے۔ شاہ صاحب مذکورہ عہدوں پر فائز ہونے کے بعد بصیرت سے محروم نہیں ہوئے بلکہ اس محرومی کی وجہ سے انھیں یہ عہدے ملے۔ لہٰذا ان کی کسی بات کا بُرا نہیں ماننا چاہیے۔

منتخبات طعن و تشنیع فہرست

شاہ صاحب کے متعصبانہ خیالات کے خلاف اخباروں میں جو مضامین شائع ہوئے ہیں ان کے ردِ عمل کے طور پر شاہ صاحب کے حواریوں نے بھی طبع آزمائی شروع کردی ہے۔ ”سندھ کوارٹرلی“ کے عملۂ ادارت کے ایک رکن سراج میمن کا ایک مضمون اخبار ”جنگ“ (۲۹ راگست) میں شائع ہوا ہے، جس میں انہوں نے غلام مصطفیٰ شاہ کا دفاع ان الفاظ میں کیا ہے:

”ان کے خیالات اور افکار سے مجھ سمیت کئی حضرات کو اختلاف ہو سکتا ہے لیکن چونکہ ان کی تنقید اصلاحِ احوال کے مقصد کے تحت ہوتی ہے، اس لیے اختلافِ رائے کے باوجود، اس کی کئی ایک سچائیوں کو تسلیم کرنا پڑتا ہے...... قائدِ اعظم یا

علامہ اقبال کے نظریات، افکار اور سیاسی اقدامات پر اگر برصغیر ہندو پاک کے جغرافیائی اور تاریخی تناظر میں کچھ لکھا جائے، تو اس پر طوفان بدتمیزی کھڑا کرنا انتہائی جہالت اور کوتاہ نظری ہے...... شاہ صاحب نے خود لکھا ہے کہ صاف گوئی اور کھری بات کرتے ہوئے ممکن ہے ان کا لہجہ درشت اور سخت ہو، لیکن وہ ان تنقیدی مضامین کو عمرانی تحقیق کا آئینہ سمجھتے ہیں۔"

اوپر شاہ صاحب کے مضامین کے جو اقتباسات پیش کیے گئے ہیں، ان کو سامنے رکھتے ہوئے سراج میمن سے گزارش ہے کہ وہ یہ بتائیں کہ شاہ صاحب نے اُردو، مہاجر اور اقبال کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے، اگر وہ عمرانی تحقیق کا آئینہ ہیں، تو خبث باطن کا آئینہ کسے کہا جائے گا۔ عمرانی تحقیق کے، اس آئینے میں صرف شاہ صاحب ہی کے روئے زیبا کی زیارت کی جا سکتی ہے، دیکھنے والے کو اور کچھ نظر نہیں آئے گا۔

عزیز میمن نے اپنا سارا غصہ گیارہ سالہ آمریت کے پروردہ دانشوروں پر نکالا ہے اور کہا ہے کہ شاہ صاحب کو قربانی کا بکرا بنا کر پیپلز پارٹی کی حکومت کو بدنام کیا جا رہا ہے۔ اس کو کہتے ہیں "ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ"۔ پیپلز پارٹی کی حکومت کو بدنام کرنے کے لیے خود پیپلز پارٹی کیا کم ہے، جو کسی نام نہاد دانشور کو قربانی کا بکرا بنایا جائے۔

اب آخر میں ایک لطیفہ بھی سن لیجیے۔ پچھلے دنوں شاہ صاحب نے اسلام آباد میں ایک مشاعرے میں بطور مہمانِ خصوصی شرکت کی۔ یہ مشاعرہ اسی زبان میں تھا، جو شاہ صاحب کے نزدیک "برہمنوں کی اور ناچ گانے اور دل لگی" کی زبان ہے۔ اس مشاعرے میں انھوں نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

"میں جب کراچی میں ڈائریکٹر ایجوکیشن تھا، امیر محمد خان گورنر تھے۔ فیض احمد فیض کو بیروزگاری کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ اس وقت یوسف ہارون نے سر عبداللہ ہارون کالج میں فیض صاحب کو پرنسپل لگا دیا، جس پر امیر محمد خان بہت سیخ پا ہوئے۔ میں نے گورنر صاحب کو لکھ بھیجا کہ اگر فیض صاحب سے کوئی نقصان پہنچا، تو میں اس کا ذمہ دار ہوں۔ آپ انھیں یہیں رہنے دیں۔"

(روزنامہ "حریت"، کراچی، یکم ستمبر ۱۹۸۹ء)

ممکن ہے بعض لوگ یہ کہیں کہ شاہ صاحب کی اپنی نوکری نواب کالاباغ کے رحم و کرم پر تھی، ان جیسا اوسط درجے کا کوئی سرکاری ملازم نواب کالاباغ کو اس قسم کا خط لکھنے کی جسارت عالم خواب میں بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ہمیں اس رائے سے اتفاق نہیں ہے۔ ممکن ہے شاہ صاحب نے عالم خواب ہی میں نواب کالاباغ کو خط لکھا ہو۔

(۱۴ر ستمبر ۱۹۸۹ء)

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو

پچھلے دنوں ایک نئے شاعر کا مجموعۂ کلام شائع ہوا، جس میں اس کا اپنا کلام تو کم تھا، دوسروں کا "کلام" زیادہ تھا۔ یعنی کم و بیش دو درجن افراد نے شاعر موصوف کو میر و غالب کے درجے کا شاعر ثابت کرنے کی کوشش کی تھی اور اس کوشش میں وہ کامیاب بھی ہوئے تھے۔ وہ اس طرح کہ میر و غالب شاعر موصوف کی سطح سے اوپر اٹھتے ہوئے دکھائی نہیں دیتے تھے۔ اتنی بہت سی اسناد اور ایسا بلند مقام حاصل کرنے کے بعد ان شاعر صاحب کو سکون نصیب نہ ہوا اور انھوں نے چھپا ہوا دیوان پیش کر کے مزید تعریفی اسناد حاصل کرنے کا پروگرام بنایا۔ موصوف استاد لاغر مراد آبادی کی خدمت میں بھی پہنچے۔ دیوان پیش کیا اور کہا، اس کے بارے میں چند سطریں لکھ دیجیے۔ استاد نے دیوان کی ورق گردانی کی، فلیپ کی آرا اور بہت سی دیباچہ نما تحریروں پر نظر ڈالی، کلام بلاغت نظام کو سونگھا اور کتاب میز پر رکھ دی۔ کچھ دیر طرفین خاموش رہے۔ شاعر صاحب کو توقع تھی کہ استاد ان کی شاعری کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیں گے اور استاد اس انتظار میں تھے کہ موصوف رخصت کی اجازت طلب کریں۔ جب دونوں ایک دوسرے کی توقعات پر پورے نہ اترے، تو شاعر صاحب نے مہرِ خاموشی کو توڑنے میں پہل کی اور کہا، "آپ نے اس مجموعے کے بارے میں کچھ فرمایا نہیں۔" استاد نے جواب دیا، "میں کیا اور میری رائے کیا، بہر حال یہ ضرور کہوں گا، کاغذ نہایت عمدہ ہے، کتابت خوبصورت ہے، طباعت روشن ہے، جلد بندی مضبوط ہے، سرورق جاذبِ نظر ہے۔" یہ کہہ کر استاد پھر خاموش ہو گئے۔ شاعر صاحب خاموش نہ رہ سکے۔ کہنے لگے، "شاعری کے بارے میں بھی تو کچھ فرمائیے۔ آپ کو میری شاعری یقیناً پسند آئی ہو گی۔" استاد نے اس کا کوئی جواب نہ دیا، تو شاعر صاحب نے نہایت رقت آمیز لہجے میں کہا، "کیا آپ میرے شاعرانہ مستقبل سے مایوس ہیں؟" اب کے استاد خاموش نہ رہے۔ فرمایا، "یہ مجموعہ دیکھ کر میں آپ کے مستقبل سے تو نہیں، میر و غالب کے مستقبل سے مایوس ہو گیا ہوں، کیونکہ آپ کے

دیباچہ نگاروں نے آپ کو ان دونوں کے برابر لا بٹھایا ہے۔"

ہمیں اس واقعے کا علم ہوا تو ہم نے استاد سے شکایت کی کہ انھوں نے ایک ہونہار شاعر کی دل شکنی کی ہے۔ اگر وہ چند تعریفی جملے لکھ دیتے تو اس میں ان کا کیا نقصان تھا۔ استاد نے اس کے جواب میں فرمایا، "مجھ سے ہرگز یہ توقع نہ رکھیے کہ میں کسی شخص کی جھوٹی تعریف کروں۔ آج کل کے لکھنے والے، لکھنے پر اتنی محنت نہیں کرتے، جتنی اپنے بارے میں تعریفی مضامین لکھوانے پر کرتے ہیں۔ ہر وہ نوآموز جو دو چار الٹی سیدھی غزلیں لکھ لیتا ہے، اپنے آپ کو میر و غالب کے پائے کا شاعر منوانے کے لیے "کاسۂ سخن" ہاتھ میں لے کر گھر سے نکل پڑتا ہے اور اپنے بارے میں رائیں جمع کرنے لگتا ہے۔ رائیں دینے والے بھی ایسے سخی داتا ہوتے ہیں کہ سائل کی منشا کے مطابق اسے نوازتے ہیں اور یہ نہیں سوچتے کہ ان کی دروغ گوئی ادب کو نقصان پہنچائے گی۔ نتیجہ یہ ہے کہ ادب غائب ہو چکا ہے اور اس غائب شدہ ادب کے بارے میں آرا کے ڈھیر ہر طرف نظر آتے ہیں۔"

استاد کی رائے سے اختلاف کرنا اگرچہ ہمارا شیوہ نہیں لیکن محض ان کو چھیڑنے کی خاطر ہم نے کہا، "اگر کوئی شخص اپنی تعریف سے خوش ہوتا ہے، تو اس میں کیا برائی ہے۔" فرمایا، "تعریف سچی ہونی چاہیے، جھوٹی تعریف کرنا اور سننا، دونوں ناقابلِ معافی جرم ہیں۔ اگر جھوٹی تعریف سننے کی عادت پڑ جائے تو پھر آدمی کسی کام کا نہیں رہتا۔ وہ ہر وقت اپنی تعریف سننے کے لیے بے قرار رہتا ہے، اور جب تعریف نہیں ہوتی تو زندگی سے بیزار ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کی شخصیت مسخ ہو جاتی ہے اور وہ معاشرے سے اور معاشرہ اس سے دور ہو جاتا ہے۔"

ہم نے عرض کیا، "استاد یہ تو آپ دور کی کوڑی لائے ہیں۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ تعریف سننے کی خواہش کا نتیجہ ایسا عبرت ناک ہو۔" استاد نے فرمایا، "بحث کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ یہ ایک رسالہ میں آپ کو دے رہا ہوں، اسے پڑھیے اور خود فیصلہ کیجیے کہ اپنی تعریف سننے کے مشتاق کا انجام کیا ہوتا ہے۔" یہ کہہ کر استاد نے ایک رسالے کا اختر انصاری نمبر ہمارے سامنے رکھ دیا۔

پروفیسر اختر انصاری دہلوی نہایت اچھے شاعر، افسانہ نگار اور نقاد تھے۔ ابھی پچھلے سال ان کا انتقال ہوا ہے۔ ان کا ایک شعر تو ایسا ہے، جو ہر اُس شخص نے سنا ہے جو اردو زبان جانتا ہے۔

یادِ ماضی عذاب ہے یارب
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

اختر صاحب کی تقریباً تین درجن کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں سے بعض خاصی مقبول ہوئیں۔ "ایک ادبی ڈائری" کو کلاسیکی حیثیت حاصل ہو چکی ہے۔ اختر صاحب کی یاد میں بدایوں کے رسالے "روشن" کا ایک خصوصی شمارہ شائع ہوا ہے، جس میں شمس بدایونی نے مرحوم کے بارے میں بہت سی معلوماتی تحریریں یکجا کر دی ہیں۔

اس شمارے کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اختر انصاری زندگی بھر اس وہم میں مبتلا رہے کہ ان کی خدمات کا صحیح طور پر اعتراف نہیں ہوا۔ اس کی تلافی کے لیے انھوں نے اپنے بارے میں خود ہی تعریفی مضمون لکھنے اور فرمائش کر کے دوسروں سے لکھوانے کا شغل اختیار کر لیا۔ ان کے وقت کا بڑا حصہ اسی فکر میں گزرتا تھا کہ کس طرح لوگوں کو یہ باور کرایا جائے کہ موصوف کس قدر بڑے شاعر، افسانہ نگار اور نقاد ہیں۔ حالانکہ اس کی ضرورت نہیں تھی۔ ان کی ادبی خدمات سے ہر اُردو داں واقف تھا اور ہے۔

اس رسالے میں شمس بدایونی کے نام اختر انصاری کے بہت سے خط شامل ہیں۔ یہ خط نہیں عبرت کا مرقع ہیں۔ ان خطوں سے بہت سی ایسی باتیں معلوم ہوتی ہیں جو اگر پردۂ راز میں رہتیں تو اچھا تھا۔ اختر انصاری اپنے بارے میں رسالوں کے نمبر نکلوانے کے لیے کوشاں رہتے تھے اور اپنے بارے میں لکھے ہوئے مضامین کی نقلیں بھی خود تیار کرتے تھے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

"گزشتہ پورے تین مہینے وحید اختر صاحب سے مقالہ لکھوانے میں گزر گئے۔ تین چار دفعہ میں خود گیا اور متعدد بار دوسروں سے یاد دہانی کرائی۔ بالآخر ایک دن وہ خود مضمون پہنچا گئے۔ خوب لکھا ہے۔ اس سے بہتر کسی نقاد نے میرے کام پر اظہارِ خیال نہیں کیا...... اب "الفاظ" کے گوشے (گوشۂ اختر انصاری) کے لیے دوسری چیزیں فراہم کر رہا ہوں۔ اختر انصاری نمبر کے لیے کسی کو لکھنے کی ضرورت نہیں۔ نہ کوئی لکھے گا۔ خود میرے پاس کم از کم تین سو صفحات کا مواد مقالات کی شکل میں موجود ہے اور خاص نمبر نکلوانے سے میرا اصل مقصد اس مواد کو یکجائی طور پر چھپا ہوا دیکھنے کی آرزو ہے۔ باقی رہا مسئلہ مقالوں کی نقل کا، تو اس کا انتظام ہو جائے گا۔ وحید اختر کے مقالے (کی)...... میں نے خود کاربن کی مدد سے تین کاپیاں تیار کیں۔ چنانچہ بعض مختصر تحریریں تو میں خود نقل کر لوں گا۔ طویل مقالے

معاوضہ دے کر لکھا لیے جائیں گے۔" (ص ۷۰-۶۹)

رانچی کا ایک طالب علم اختر انصاری پر پی ایچ ڈی کے لیے مقالہ لکھ رہا تھا۔ اختر صاحب نے اس کی بہت مدد کی۔ تمام مواد فراہم کیا، لیکن اس طالب علم نے کام کر کے نہ دیا۔ اس سے اختر صاحب کو جو مایوسی ہوئی، اس کا اندازہ ایک خط کے اس اقتباس سے کیا جا سکتا ہے:

"رانچی والا مردود بھی چار سال سے خون پی رہا ہے۔ اس نے تاخیر کی ساری ذمہ داری اپنے استاد پر ڈال دی ہے۔ اب میں نے علی گڑھ کے ایک پروفیسر سے ابو ذر عثمانی صاحب کو خط لکھوا دیا ہے۔ یا تو یہ صاحب دانستہ اس کے مقالے کو روکے ہوئے ہیں، تاکہ خود ڈگری لے لیں یا شاید اس مقالے کو رد کر چکے ہیں۔ چمپارن کے ایک لڑکے نے میرے اوپر کام شروع کر دیا تھا، مگر شاید میری ہی حماقت اور سادگی کے باعث اس نے یہ خیال ترک کر دیا۔ میں نے اس رانچی والے کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیے۔ مقصد یہ تھا کہ وہ جلد سے جلد کام کر ڈالے اور ممکن ہو تو رانچی والے سے میرے بارے میں سارا مواد لے لے۔ مگر نتیجہ الٹا نکلا۔ کیونکہ پھر نہ تو اس کا کوئی خط آیا، نہ اپنے ارادے کے مطابق آج تک علی گڑھ آیا۔ مجھے تو اصل میں رانچی والے کا اس سے ذکر ہی نہیں کرنا چاہیے تھا، بلکہ مجھ گدھے نے جھوٹ بھی بولا، یعنی اس کو یہ لکھا کہ شمس بدایونی آگرہ یونیورسٹی سے، شبیر رسول جامعہ ملیہ سے اور قمر الہدیٰ علی گڑھ سے میرے اوپر کام کرنے کے لیے پر تول رہے ہیں۔ اپنا کام تیزی سے کرنے کی بجائے وہ...... دبک کر رہ گیا۔" (ص ۸۶)

اپنے بارے میں مضامین اور پی ایچ ڈی کے مقالے لکھوانے کے ساتھ ساتھ اختر صاحب اپنی کتابوں پر انعامات حاصل کرنے کے لیے بھی کوشاں رہتے تھے، کیونکہ یہ بھی ان کی ادبی خدمات کے اعتراف کا ایک ذریعہ تھا۔ انعامات کے لیے سفارشی خط لکھنے سے بھی دریغ نہیں کرتے تھے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

"میں نے ایک دوست کے نام سے اپنے ہی پتے اکاڈمی کا خط لکھا ہے کہ انعامات کے لیے کتابیں ارسال کرنے کا...... فارم مجھے بھیج دیا جائے...... میں

سفارشی خط کس کو لکھوں۔ ہر ایرے غیرے کو نہیں لکھ سکتا...... آپ اس سلسلے میں کسی کو لکھ سکتے ہیں تو لکھ دیجیے گا۔'' (ص ۱۰۲)

اختر انصاری کا ادبی قد ان کے عہد کے بہت سے ادیبوں سے بلند تھا۔ اگر وہ مدح و ذم سے بے نیاز ہو کر اپنے ادبی کاموں میں مصروف رہتے تو ان کا قد اور بھی بلند ہو جاتا۔ لیکن وہ ہمیشہ اس خیال میں رہے کہ ان کی خدمات کا مناسب اعتراف نہیں کیا گیا۔ ان کی اتنی تعریف نہیں کی گئی، جس کے وہ خواہاں تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی شخصیت میں شکست و ریخت کا عمل شروع ہو گیا۔ وہ نہ صرف معاشرے سے، بلکہ اپنے گھر والوں سے بھی کٹ گئے۔ مزاج میں اس قدر تلخی پیدا ہوئی کہ کسی بھی شخص کے بارے میں سخت سے سخت بات کہہ دینے میں انھیں کوئی تامل نہ تھا۔ یہاں تک کہ جو لوگ ان سے عقیدت مندانہ ملتے تھے، وہ بھی اچھا تاثر لے کر نہ اٹھتے تھے۔ گھر سے باہر آکر دوسروں کو تو وہ برا بھلا کہتے ہی تھے، گھر والوں کے بارے میں بھی انھیں وہم ہو گیا تھا کہ یہ سب ان کے دشمن ہیں۔

ایک خط میں لکھتے ہیں:

''اولاد نے شرافت اور تہذیب کا وہ خول، جو میں نے چالیس سال کی عرق ریزی اور دیوانہ وار پدرانہ محبت اور حد سے زیادہ اسراف کو برداشت کرتے ہوئے ان کی ذلیل اور پیچ ہستیوں پر چڑھایا تھا، وہ خول ان چاروں نے...... خصوصاً دونوں لڑکیوں نے یک لخت اتار پھینکا...... اور اندر کے خوفناک بھیڑیے غراتے ہوئے باہر نکل آئے...... میں ایک مجرم کی حیثیت سے زندگی بسر کر رہا ہوں، بلکہ اس شخص کی طرح ہوں، جس کو پولیس طرح طرح سے تکلیف پہنچاتی ہے، بلکہ اس سے بھی بدتر حالت میں ہوں۔'' (ص ۷۳-۷۴)

انھیں دوسروں پر ہی نہیں اپنے آپ پر بھی غصہ آتا تھا اور اس کا اظہار اس طرح سے ہوتا تھا:

''خدایا! تو نے مجھ جیسے غبی الذہن، کوڑ مغز اور پلید الدماغ گدھے کو اس رشکِ جہنم سیارے کی سرزمین پر کیوں اور کس مقصد سے پیدا کیا۔'' (ص ۱۰۲)

اختر انصاری مرحوم کی زندگی سے ان سب لوگوں کو عبرت حاصل کرنی چاہیے، جو اپنی تعریف سننے کے لیے شب و روز بے قرار رہتے ہیں۔

(۲۱ ستمبر ۱۹۸۹ء)

حمزہ فاروقی کے سفرنامے رسوائی کا سبب بھی بنتے ہیں

حمزہ فاروقی خاصے پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ وہ کہاں تک پڑھے ہیں، اس کا علم انھی کو ہوگا، لیکن جہاں تک ان کے لکھنے کا تعلق ہے ہم اس کے عینی شاہد ہیں۔ اب تک ان کی پانچ کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور اتنی ہی زیرِ طبع ہیں۔ ان کا کتابیں لکھنے کا طریقہ دنیا سے نرالا ہے۔ کبھی تو وہ مہینوں کے لیے گھر سے غائب ہو جاتے ہیں اور جب واپس آتے ہیں، تو ان کے ہاتھ میں کسی نئی کتاب کا مسودہ ہوتا ہے، کبھی مہینوں کے لیے گھر سے باہر نکلنا چھوڑ دیتے ہیں، بلکہ یوں کہیے کہ دنیا ترک کر دیتے ہیں۔ اور جب گھر سے باہر نکلتے ہیں، تو تب بھی کوئی نئی کتاب ان کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ پہلی صورت میں وہ ملکوں ملکوں گھومتے ہیں، نئی منزلوں اور نئی وادیوں کا مشاہدہ کرتے ہیں، پھر اپنے اس مشاہدے کو صفحۂ قرطاس پر سفرنامے کی صورت میں منتقل کر دیتے ہیں۔ ان کے تین سفرنامے شائع ہو چکے ہیں جو ان کی آوارہ گردی کا دستاویزی ثبوت ہیں۔ یہ سفرنامے مقبول ہی نہیں ہوئے، مصنف کی رسوائی کا سبب بھی بنے ہیں، کیونکہ ڈاکٹر انور سدید نے اپنی تحقیقی کتاب ''اردو سفرنامے'' میں ان سفرناموں کی خاصی تعریف کی ہے۔ مصنف کے اور ہمارے بعد، ڈاکٹر انور سدید تیسرے آدمی ہیں، جنھوں نے ان سفرناموں کو اردو ادب میں اضافہ قرار دیا ہے۔ جب تک کوئی چوتھا آدمی ہم تینوں کی رائے سے اختلاف نہیں کرتا، اس وقت تک کے لیے انشاء اللہ یہ سفرنامے اردو ادب میں اضافہ شمار ہوتے رہیں گے، خواہ ان کے بوجھ سے اردو ادب کی کمر ٹوٹ جائے۔ واضح رہے کہ ہم تینوں کی رائے سے اختلاف کرنا آسان نہیں ہے۔ اس کے لیے حمزہ صاحب کے سفرنامے پڑھنے ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ یہ ہفت خواں طے کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔

حمزہ فاروقی پائے طلب توڑ کر اور دنیا سے منھ موڑ کر گوشۂ تنہائی میں جو کام کرتے ہیں، وہ تحقیقی نوعیت کا ہوتا ہے۔ اس قسم کا ان کا پہلا کام ''سفرنامۂ اقبال'' کی صورت میں منظرِ عام پر آ چکا

ہے۔ اس میں اس سفر کے روداد ہے، جو علامہ اقبال نے دوسری گول میز کانفرنس کے سلسلے میں ۱۹۳۱ء میں کیا تھا۔ اس سفر سے متعلق معلومات اس زمانے کے اخبارات میں بکھری ہوئی تھیں۔ حمزہ صاحب نے ان منتشر معلومات سے ایک مربوط اور مسلسل سفرنامہ مرتب کر دیا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے، جیسے حمزہ صاحب شروع سے آخر تک علامہ کے رفیق سفر رہے ہوں۔ حالانکہ یہ واقعہ حمزہ صاحب کی پیدائش سے پہلے کا ہے، لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اگر علامہ اقبال اپنی شاعری میں اپنے سے صدیوں پہلے کے مشاہیر سے ہم کلام ہو سکتے ہیں، تو حمزہ فاروقی اپنی پیدائش سے چودہ پندرہ سال پہلے علامہ اقبال کے ساتھ گول میز کانفرنس کے لیے سفر کیوں نہیں کر سکتے۔

''سفرنامۂ اقبال'' کو خاص مقبولیت حاصل ہوئی۔ یہاں تک کہ بعض اہلِ قلم نے اس کتاب کے بہت سے حصے بلا حوالہ اپنی کتابوں میں شامل کر لیے، لیکن یہ سرقہ انھیں راس نہ آیا۔ اس کی تفصیل ''سفرنامۂ اقبال'' کے دوسرے ایڈیشن سے معلوم ہوتی ہے۔ یہ ایڈیشن بہت سے اضافوں کے ساتھ حال میں شائع ہوا ہے۔ اس کے دیباچے میں حمزہ صاحب لکھتے ہیں:

> ''بہت سے اہلِ علم نے حوصلہ افزائی کی اور اس کے حوالے اپنی تصانیف میں دیے، لیکن بعض مصنفین نے جو حوالہ دیے بغیر میری کتاب کے مندرجات کو بلاتکلف اپنی تصانیف میں سمو دیا، اگر وہ ہمت کر کے اصل ماخذ تک رسائی حاصل کرتے تو عین ممکن تھا کہ وہ میری کتاب کے پہلے ایڈیشن کی خامیوں اور غلطیوں کی نشاندہی کرتے۔ کتاب کی اشاعتِ ثانی کے بعد میں یہ توقع رکھتا ہوں کہ وہ حضرات بھی اپنی غلطیوں کی اصلاح کریں گے، جو سفرنامۂ اقبال اشاعتِ اول کی تقلید میں ان کی تصانیف میں راہ پا گئی ہیں۔''

جو مصنفین ''سفرنامۂ اقبال'' کے دوسرے ایڈیشن سے بلا حوالہ استفادہ کا ارادہ رکھتے ہوں، ان کی آگاہی کے لیے عرض ہے کہ ممکن ہے، اس ایڈیشن میں بھی حمزہ صاحب نے دانستہ بہت سی غلطیاں باقی رہنے دی ہوں، تاکہ تیسرے ایڈیشن کے دیباچے میں وہ استفادہ کنندگان کو شرمندہ کر سکیں۔

حمزہ صاحب کی ایک اور ضخیم کتاب ''حیاتِ اقبال کے چند مخفی گوشے'' ریسرچ سوسائٹی آف پاکستان، پنجاب یونیورسٹی، لاہور نے شائع کی ہے۔ کتاب کا نام ایسا سنسنی خیز ہے کہ فوراً اس

طرف دھیان جاتا ہے کہ اس میں اقبال سے متعلق بہت سے سربستہ رازوں کو فاش کیا گیا ہوگا۔ اور کچھ نہیں تو سابق نام نہاد دانشور اور موجودہ وفاقی وزیرِ تعلیم غلام مصطفیٰ شاہ کی تقلید میں اقبال کی ''عیش کوشی'' کے چشم دید واقعات جمع کیے گئے ہوں گے۔ افسوس کہ یہ ایک سنجیدہ علمی کام ہے اور اقبال کی سماجی، ادبی اور علمی سرگرمیوں کے بارے میں نادر معلومات کا ذخیرہ ہے۔

روزنامہ ''انقلاب'' لاہور میں اقبال کی زندگی میں جو اُن کے بارے میں شائع ہوا تھا، اسے اس کتاب میں یکجا کر دیا گیا ہے۔ بہت سی ایسی باتیں سامنے آتی ہیں، جن سے اقبال کے سوانح نگار عام طور پر بے خبر ہیں۔ یہ ایک ایسا تحقیقی کام ہے، جو بے مثال محنت کا نمونہ ہے۔ حمزہ صاحب نے ''انقلاب'' کے کئی ہزار شماروں کا بالاستیعاب مطالعہ کر کے اقبال کے بارے میں ایک ایک لفظ کو محفوظ کر دیا ہے۔

عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ جو لوگ دنیا کا کوئی کام نہیں کر سکتے، وہ تحقیق کرتے ہیں۔ لیکن حمزہ صاحب نے اس بات کو غلط ثابت کر دکھایا ہے۔ وہ تحقیق بھی کرتے ہیں اور بہت سے دوسرے کام بھی، جن میں مکتوب نگاری سرِفہرست ہے۔ ہر ہفتے ان کا ایک خط ہمارے نام ضرور آتا ہے، جو ہمارے کالم کے بارے میں ہوتا ہے۔ جس ہفتے ہم کالم نہیں لکھتے، اس ہفتے وہ پرسشِ احوال کے لیے خط لکھتے ہیں۔ کالموں سے متعلق خطوں میں وہ ہماری لفظی و معنوی اغلاط کی نشاندہی کے ساتھ مفید مشورے بھی دیتے ہیں۔ ہمیں افسوس ہے کہ ان کے مشوروں پر عمل کرنے کی توفیق ہمیں کبھی نہیں ہوئی، کیونکہ عمل کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم کالم نگاری ترک کر دیں گے۔

کبھی کبھی حمزہ صاحب کسی خاص موضوع پر اظہارِ خیال کرتے ہیں اور ان کی خواہش ہوتی ہے کہ ہم ان کا خط اپنے کالم میں شائع کر لیں اور ہم خود بھی اس موضوع پر اظہارِ خیال کریں۔ ایک ایسا ہی خط انھوں نے مولانا کوثر نیازی کے بارے میں لکھا ہے، جس میں ان کی نئی تصنیف ''ذوالفقار علی بھٹو'' کا ذکر ہے۔ حمزہ صاحب کی خواہش ہے کہ ہم بھی اس کتاب کو پڑھیں اور اپنے تاثرات قلم بند کریں۔ فی الحال حمزہ صاحب کا خط شائع کیا جا رہا ہے، جس کے مندرجات سے ہمارا تو کیا مولانا کوثر نیازی کا بھی متفق ہونا ضروری نہیں۔ ہم اپنے تاثرات اگلے ہفتے پیش کریں گے۔

جناب خامہ بگوش صاحب۔ سلام مسنون

مولانا کوثر نیازی کی تازہ تصنیف ''ذوالفقار علی بھٹو'' پڑھ کر جی بے حد خوش ہوا۔ اس خوشی کے اظہار کے لیے یہ چند سطریں لکھ رہا ہوں۔ کیا ہی اچھا ہو اگر آپ میرے اس مراسلے کو اپنے کالم میں شائع کر دیں۔ آپ کے قارئین اگر کبھی بھار کوئی بہتر تحریر پڑھ لیں، تو آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں ہونا چاہیے۔

مولانا کوثر نیازی تصنیف وتالیف کے میدان میں، جس کامیابی سے جھنڈے گاڑ رہے ہیں، اس کی مثال ملنی محال ہے۔ ایک کتاب کا صدمہ حافظے سے محو نہیں ہوتا کہ ان کے قلم عجوبہ رقم سے دوسری تصنیف منصۂ شہود پر آ جاتی ہے۔ مولانا سے بے پناہ عقیدت کے باوجود ہمیں ان قارئین سے دلی ہمدردی ہے، جو موصوف کی تصانیف کی زد میں ہیں۔

اپنی تازہ ترین تصنیف ''ذوالفقار علی بھٹو'' میں مولانا صاحب نے خلافِ معمول غور وفکر اور مصلحت اندیشی سے کام لیا ہے۔ انھوں نے اس موضوع پر ''دیدہ ور'' بھی لکھی تھی۔ جب ''دیدہ ور'' شرمندۂ اشاعت ہوئی تھی تو مولانا صاحب ایک جمہوری آمر کے سائے تلے کامیابی کی منزلیں طے کر رہے تھے۔ پانچوں انگلیاں دولتِ دنیا کے گھی میں اور سر وزارت کی کڑاہی میں تھا۔ اس صورتِ حال کو قائم رکھنے کے لیے ''دیدہ ور'' جیسی کتاب کا لکھا جانا، بذاتِ خود دیدہ وری کا ثبوت تھا۔ خدا کا کرنا یہ ہوا کہ یہ بزم رہی نہ اہلِ بزم۔ مولانا صاحب پیپلز پارٹی میں شمعِ محفل کی حیثیت رکھتے تھے، لیکن اب یہی پارٹی ان کے لیے محفلِ اغیار بن گئی۔ اس صورتِ حال میں ''دیدہ ور'' کو واقعی نظرِ ثانی کی ضرورت تھی۔ اب یہ کتاب نئے عہد کے تقاضوں کے مطابق نئے روپ میں جلوہ گر ہوئی ہے۔

مولانا صاحب کی شخصیت رنگا رنگ خصوصیات کی حامل ہے، لیکن ہم ان کی دو خوبیوں کے بطورِ خاص معترف ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ اپنا اسمِ مبارک پکی روشنائی سے لکھا ہوا مسلسل دیکھتے رہنا پسند کرتے ہیں۔ عام سیاستدانوں کی طرح وہ صرف گفتار کے غازی نہیں، تحریر کے مردِ میدان بھی ہیں۔ اپنے افکار و خیالات کو سپردِ قرطاس کرنے میں وہ ملک کے تمام سیاستدانوں میں منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔ مولانا صاحب کی دوسری خوبی جو ہمیں پسند ہے وہ یہ ہے کہ جب حالات سازگار تھے اور فلکِ ناہنجار اُن کا مخالف نہ تھا اور ٹیلی ویژن کا دروازہ ان پر وا تھا، تو وہ ٹی وی کی

اسکرین پر ایک صاحبِ کمال کی طرح جلوہ گر ہوتے تھے۔ لوگ انھیں دیکھنے اور سننے کے لیے بے قرار رہتے تھے، لیکن ہم چونکہ کمزور دل کے آدمی ہیں، اس لیے ہم ٹی وی بند کر دیتے تھے۔ اندیشہ رہتا تھا کہ موصوف جوشِ خطابت میں اسکرین توڑ کر باہر نہ آ جائیں۔

مولانا نے کچھ عرصہ قبل شخصی خاکوں کا ایک مجموعہ ''جنھیں میں نے دیکھا'' شائع کیا تھا۔ اس میں انھوں نے ان تمام دعوتوں کا ذکر کیا تھا، جو اُن کے مداحین نے ان کے اعزاز میں دی تھیں۔ کہیں بگھارے بینگنوں کا ذکر تھا اور کہیں بہاری کبابوں، قورمے اور بریانی کے مسالوں کا تذکرہ تھا۔ نہاری کے چٹخاروں کا ذکر پڑھ کر تو ہمیں بھی اپنے اوپر قابو نہ رہا۔ یہ الگ بات ہے کہ مولانا کی تقلید کے نتیجے میں معدہ کئی روز تک آہ وفغاں کرتا رہا اور ہم ڈاکٹروں کا تختۂ مشق بنے رہے۔ اس تصنیفِ لطیف کے مطالعے سے ہمیں خیال آیا کہ کاش ہم میں بھی اتنی استطاعت ہوتی کہ مولانا کی چند پُر تکلف دعوتیں کرتے اور اس طرح اس کتاب کے کسی حاشیے میں ہمارا ذکر بھی آ جاتا۔

خاکوں کے اس مجموعے کو پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا صاحب کی طبیعت میں بے حد انکسار ہے، وزارت کے منصب عالیہ تک پہنچنے اور ہیڈ ماسٹروں جیسی وردی پہننے کے باوجود وہ بہت عاجزی کے ساتھ اہلِ علم سے ملتے تھے، حالانکہ آپ جس منصب پر فائز تھے، اس کے حوالے سے اچھے اچھوں کو عاجز کر سکتے تھے۔ سچ پوچھیے تو ہمیں، مولانا کی وزارت سے زیادہ وزارت والی وردی اچھی لگتی تھی۔ یقیناً یہ وردی ان کے پاس اب بھی ہوگی۔ کیا ہی اچھا ہو، اگر وہ اس وردی کو کراچی کے نیشنل میوزیم میں جمع کرا دیں، جہاں زمانہ قدیم کے بادشاہوں کے لباس محفوظ ہیں۔ جب کبھی مولانا صاحب سے ملنے کو جی چاہے گا، ہم ان کی وردی کی زیارت کر لیا کریں گے۔

مولانا صاحب کے کمالات کی فہرست بہت طویل ہے۔ سیاست، شاعری، مضمون نگاری اور صحافت کے ساتھ ساتھ لپاڈگی بھی ان کا خاص میدان ہے۔ جس کا بہترین اظہار لاہور کی وِلنگٹن مارکیٹ میں ہوا تھا۔ شورش کاشمیری مرحوم کے بالمقابل مولانا صاحب نے جس طرح دادِ شجاعت دی تھی، اس کی کوئی دوسری مثال ہماری تہذیبی وثقافتی تاریخ میں نہیں ملتی۔ اس معرکے کی تفصیل مولانا صاحب نے اپنی کتاب ''جنھیں میں نے دیکھا'' میں دی ہے۔ یہ ان کی منکسر المزاجی تھی کہ اس معرکے میں اپنی جیت کا ذکر آپ نے دبے لفظوں میں کیا ہے اور زیادہ تر شورش

مرحوم کی خوبیاں بیان کی ہیں۔

مولانا نے اپنے دورِ کمال میں "دیدہ ور" لکھی اور دورِ زوال میں روس کا سفرنامہ تحریر فرمایا۔ دونوں میں واقعہ نگاری سے زیادہ شاعری کا حق ادا کیا گیا ہے۔ ایک میں ان کے ممدوح بھٹو تھے اور دوسری کتاب میں گورباچیف۔ ان کتابوں کی موجودگی میں تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ مولانا صاحب، جس کو پسند فرماتے ہیں، اسی کے گن گاتے ہیں۔ حاسدین بدانجام ان کو بیرھیاں سناتے ہیں۔ لیکن اللہ نے چاہا تو حاسدین خائب و خاسر رہیں گے اور مولانا اپنے محسنوں کے گن گاتے اور قلم بجاتے رہیں گے۔

مخلص

حمزہ فاروقی

(۲۸ر ستمبر ۱۹۸۹ء)

حشر کے دن مولانا کوثر نیازی کا دامن پکڑنے والوں کی قطار بہت طویل ہوگی

پچھلے ہفتے ہم نے لکھنے کو تو لکھ دیا تھا کہ مولانا کوثر نیازی کی نئی کتاب "ذوالفقار علی بھٹو" پر ہم اگلے ہفتے اظہارِ خیال کریں گے، لیکن جب اظہارِ خیال کی نوبت آئی، تو معلوم ہوا کہ یہ کام اتنا آسان نہیں، جتنا ہم نے سمجھا تھا۔ سب سے بڑی زحمت کی بات یہ ہے کہ مبلغ ایک سو دس روپے سکۂ رائج الوقت صرف کر کے یہ کتاب حاصل کی گئی۔ بقول لاغر مراد آبادی اچھے وقتوں میں اتنی رقم میں کتاب کے ساتھ مصنف بھی خریدا جا سکتا تھا، مگر اب صرف کتاب ملتی ہے اور وہ بھی ایسی، جسے پڑھنے کے بعد رقم کے ضائع ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ اسی لیے لاغر صاحب کا ارادہ ہے کہ حشر کے دن وہ اپنے تمام مصنفین کے دامن پکڑیں گے، جن کی کتابیں انھوں نے خرید کر پڑھیں اور وقت ضائع ہونے کا احساس ہوا۔ لیکن وہ مولانا کوثر نیازی کے ساتھ یہ سلوک نہیں کریں گے، کیونکہ ان کا دامن پکڑنے والوں کی قطار بہت طویل ہوگی اور اس طرح مزید وقت ضائع ہونے کا اندیشہ ہے۔

بہر حال جب مولانا کی کتاب خرید لی، تو اسے پڑھنا بھی ضروری تھا۔ دورانِ مطالعہ ہمارا حال اس کالی جیسا تھا جسے حلوائی نے مٹھائی کے عوض صابن کا ٹکڑا دے دیا تھا۔ لوگوں نے جب اس سے صابن کھانے کا سبب پوچھا تو اس نے کہا، "ہم صابن نہیں کھاتا، اپنا پیسہ کھا رہا ہے۔" گویا ہم نے بھی مولانا کی کتاب نہیں پڑھی، ایک سو دس روپے کی رقم پر فاتحہ پڑھی۔

مولانا کی نئی کتاب "ذوالفقار علی بھٹو" ان کی پرانی کتاب "دیدہ ور" کا نیا روپ ہے۔ "دیدہ ور" وہ تاریخی کتاب، جو پہلی اور آخری مرتبہ جنوری ۱۹۷۷ء میں چھپی تھی اور اس کی اشاعت کے صرف چھ ماہ بعد بھٹو کی حکومت کا تختہ الٹ گیا تھا۔ اسی لیے بعض لوگوں نے بھٹو کے

اسباب زوال کی تحقیق کرتے ہوئے ''دیدہ ور'' کو بنیادی سبب قرار دیا ہے۔ لیکن ہمیں اس رائے سے اتفاق نہیں۔ مولانا نے یہ کتاب عقیدت ومحبت کے جذبات کے تحت لکھی تھی۔ اس قسم کے جذبات بھی کسی کے زوال کا سبب نہیں بن سکتے۔ یہ محض اتفاق ہے کہ ''دیدہ ور'' کی اشاعت کے چھ ماہ بعد بھٹو کی حکومت کا تختہ الٹ گیا۔ ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ مولانا کی عقیدت ومحبت میں کچھ کسر رہ گئی ہوگی، ورنہ چھ ماہ کی مدت میں کچھ کمی بھی ہو سکتی تھی۔

ہمیں مولانا صاحب سے دو شکایتیں ہیں، ایک یہ کہ انھوں نے کتاب کا نام تبدیل کر دیا اور دوسری یہ کہ انتساب کی عبارت بدل دی۔ اس کتاب کو کلاسیکی حیثیت حاصل ہو چکی ہے۔ ''دیدہ ور'' کا لفظ زبان پر آتا ہے، تو ذہن فوراً مولانا کی کتاب کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ جو کتابیں ادب عالیہ کا حصہ بن جائیں، ان کے نام تبدیل نہیں کرنے چاہئیں۔ اس طرح ان کی مقبولیت متاثر ہو سکتی ہے۔ اگر مشہور کتاب ''فسانۂ عجائب'' کا نام اس کے ہیرو کے نام پر ''فسانہ جان عالم'' رکھ دیا جائے تو لوگ یہی سمجھیں گے کہ یہ کوئی مختلف کتاب ہے۔

''دیدہ ور'' کا انتساب یہ تھا: ''پاکستان پیپلز پارٹی کے سرفروش اور انقلابی کارکنوں کے نام۔'' لیکن نئے ایڈیشن کا انتساب کچھ اور ہے۔ یہ درست ہے کہ پیپلز پارٹی سے مولانا کے قطع تعلق کے بعد اس جماعت میں کوئی سرفروش ہے نہ انقلابی کارکن۔ لیکن اس انتساب کی حیثیت تاریخی تھی اور اس سے مولانا کی خوش طبعی کا ثبوت ملتا تھا۔ اگر اس انتساب کو تبدیل نہ کیا جاتا تو بہتر تھا۔

مولانا نے ''نقش ثانی'' کے عنوان سے نئے ایڈیشن کا جو دیباچہ لکھا ہے، اس میں فرماتے ہیں کہ وہ ''دیدہ ور'' کے مندرجات پر اب بھی قائم ہیں کیونکہ ''افکار ونظریات لباس کی مانند نہیں ہوتے، جنھیں ہر موسم کی تبدیلی پر اتار پھینکا جائے۔'' یہ بات بڑی معقول ہے، لیکن مولانا صاحب نے کتاب کے آخر میں ''پس نوشت'' کے عنوان سے جو تحریر اضافہ کی ہے، اس میں انھوں نے فرمایا ہے، ''بڑوں کی غلطیاں بھی بڑی ہوتی ہیں، ان (بھٹو مرحوم) سے بھی بعض ایسی غلطیاں ہو گئیں جنھوں نے مستقبل کے صورت گر کو ماضی کا حصہ بنا دیا۔'' پوری کتاب میں مولانا نے اپنے ممدوح کی جو مدلل مداحی کی تھی، اس ایک جملے سے انھوں نے اس پر پانی پھیر دیا۔ افسوس کہ مولانا صاحب کو بھٹو مرحوم کی غلطیاں اس وقت نظر آئیں، جب وہ ہمارے درمیان موجود نہیں۔ اگر ان

کی زندگی میں مولانا صاحب ان کی غلطیوں کی طرف اشارہ کرتے، تو اس کی سب سے زیادہ ''داد'' مرحوم ہی سے ملتی۔ اس قسم کی ''داد'' سے جناب رحیم بھی ''محظوظ'' ہوئے تھے۔

مولانا صاحب نے یہ تو بتا دیا کہ کتاب کے نئے ایڈیشن پر نظر ثانی کی گئی ہے، لیکن یہ نہیں بتایا کہ نظر ثانی کی نوعیت کیا ہے۔ ہم نے نہایت صبر وتحمل اور محنت کے ساتھ دونوں ایڈیشنوں کا موازنہ کر کے معلوم کیا ہے کہ مولانا نے پرانے ایڈیشن کے درجنوں مقامات سے عبارتیں حذف کر کے نیا ایڈیشن تیار کیا ہے۔ جو عبارتیں حذف کی گئی ہیں، ان میں سے بیشتر کی نوعیت اس لباس جیسی ہے، جسے موسم کی تبدیلی پر اتار پھینکا جاتا ہے۔ یہاں پرانے ایڈیشن کی صرف چند محذوف عبارتوں کی نشاندہی کی جاتی ہے۔

۱۔ اس بیان کو حذف کر دیا گیا ہے کہ جناب بھٹو کا تعلق ایک دیندار گھرانے سے تھا اور ہزاروں یتیموں، بیواؤں اور مستحق افراد اس گھرانے سے مالی مدد حاصل کرتے تھے۔ (ص ۴۱)

۲۔ یہ واقعہ بھی نئے ایڈیشن میں موجود نہیں ہے کہ بھٹو مرحوم زرعی اصلاحات کے تحت اپنے پاس صرف ڈھائی سو ایکڑ زمین رکھ کر باقی زمین حکومت کے حوالے کرنے کو تیار تھے مگر صدر ایوب نے انھیں ایسا کرنے سے باز رکھا۔ (ص ۵۷)

۳۔ چین اور بھارت کے تنازع کے زمانے میں بھٹو چاہتے تھے کہ پاکستان فوجی اقدام کر کے کشمیر کو اپنے قبضے میں کر لے لیکن ایوب خان اس کے حق میں نہ تھے۔ بھٹو شعلہ بن کر میدان میں نکلنے ہی والے تھے کہ ایوب خان نے بڑی مشکل اور محبت سے بھٹو کو قابو میں کیا۔ (ص ۶۶-۶۵) یہ واقعہ بھی نئے ایڈیشن میں نہیں ہے۔

۴۔ ۶۵ء کی جنگ اور اس کے بعد کے واقعات سے متعلق باب میں سے تقریباً سات صفحات (ص ۹۳ تا ص ۱۰۱) کے برابر مواد حذف کیا گیا ہے۔ اس مواد کا تعلق معاہدہ تاشقند، ایوب بھٹو تعلقات اور پاکستان چین دوستی سے ہے۔ یہ حذف شدہ مواد نہایت اہم ''تاریخی'' واقعات پر مشتمل ہے، جن میں یہ واقعہ بھی شامل ہے کہ بھٹو نے کئی بار ایوب خان کو اپنا استعفیٰ پیش کیا، مگر ایوب خان، الطاف گوہر اور خواجہ شہاب الدین نے ''قوم کے وقار کے واسطے اور اپنی عزتوں کے حوالے دے کر انھیں یہ ارادہ ملتوی کرنے پر مجبور کر دیا۔

۵۔ حنیف رامے اور ولی خان کے بارے میں جو سنسنی خیز حقائق پیش کیے گئے تھے، نئے ایڈیشن کو ان سے محروم رکھا گیا ہے۔ حنیف رامے کی بے بصیرتی کے لیے پرانے ایڈیشن کے صفحات ۲۱۹، ۲۰۴، ۲۰۷ دیکھے جا سکتے ہیں، اور ولی خان کی وطن دشمنی کا تذکرہ ص ۱۰۴ سے ص ۱۱۵ تک مسلسل موجود ہے۔

یہ مثالیں جو ہم نے پیش کی ہیں، ان کا افکار و نظریات سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ سب واقعات پر مشتمل ہیں اور واقعات بھی ایسے، جن کے عینی شاہد خود مولانا صاحب تھے۔ ممکن ہے بعض لوگ پوچھیں کہ اگر یہ تمام واقعات درست تھے، تو انھیں دوسرے ایڈیشن سے حذف کیوں کیا گیا۔ اور اگر یہ غلط تھے تو انھیں پہلے ایڈیشن میں شامل کیوں کیا گیا تھا؟ معلوم نہیں مولانا اس کا کیا جواب دیں، ہمارا خیال یہ ہے کہ نظر ثانی کرتے وقت کتاب کی ضخامت کم کرنے کے خیال سے بہت سی عبارتیں مولانا صاحب نے حذف کر دی ہیں۔ یہ بعید از امکان ہے کہ کسی واقعے کو محض اس لیے حذف کیا گیا ہو کہ وہ درست نہ تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو اس کتاب کا پورا متن حذف کر دینے کے لائق تھا۔

بہر حال کاٹ چھانٹ کے بعد یہ کتاب خاصی دلچسپ ہے۔ اس سے نہ صرف ہمارے عہد کے ایک بڑے سیاستدان کی شخصیت کے تمام پہلو سامنے آجاتے ہیں، بلکہ خود مولانا صاحب کی شخصیت کو سمجھنے میں بھی بڑی مدد ملتی ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ بھٹو سے زیادہ یہ کتاب مولانا صاحب کی شخصیت کو بے نقاب کرتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے بھٹو مرحوم کے قریب رہ کر بہت کچھ سیکھا۔ خصوصاً مجلسی آداب تو انھیں پہلی مرتبہ بھٹو صاحب نے ہی سکھائے۔ مولانا نے اس سلسلے میں ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے۔

''جناب بھٹو نہ صرف اپنے ساتھیوں اور رفقائے کار کو وقت کی پابندی کی تربیت دیتے اور انھیں وقت کا پابند بناتے، وہ اپنے ساتھیوں کو مجلسی آداب کی تربیت دینا بھی ضروری سمجھتے ...... ایک مرتبہ ایوانِ صدر میں ایک ڈنر تھا۔ ڈنر کے مینو کارڈ میں پھل آخری شے تھی۔ مگر پھلوں کی ڈشیں میز پر پہلے سجا دی گئیں۔ ایک ڈش میرے سامنے بھی رکھی گئی، میں نے ایسے ہی شغلاً اپنے سامنے رکھی ڈش سے چند انگور اٹھائے اور انھیں کھا لیا۔ جب ڈنر ختم ہوا تو جناب بھٹو مجھے ایک طرف لے گئے اور پوچھا، ''تم نے مینو کارڈ نہیں پڑھا تھا۔ اس میں پھل تو آخری شے تھی۔

پھر تم نے ان کی طرف پہلے کیسے ہاتھ بڑھا دیا۔ یہ بات مجلسی آداب کے منافی ہے۔'' (ص ۲۳۲)

شاید اسی قسم کی تربیت کا نتیجہ تھا کہ پیپلز پارٹی والے ''کھانے پینے'' کے سلسلے میں مجلسی آداب کا خیال رکھتے ہیں۔

وزیر اطلاعات کی حیثیت سے مولانا کس قسم کے کام انجام دیتے تھے، اس کی تفصیل بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ فرماتے ہیں:

''جب وہ (بھٹو) صدر مملکت تھے، تو میں وزیر اطلاعات، تو ان کی فرمائش پر میں سنسر بورڈ والوں سے کہہ کر کوئی معیاری درآمدی فلم منتخب کرواتا اور ان کے ملاحظہ کے لیے ایوانِ صدر بھجوایا کرتا۔ فلم دیکھتے وقت وہ اپنے قریبی اور منتخب دوستوں کو بھی بلوایا کرتے۔ ان میں عام طور پر میرے علاوہ ممتاز بھٹو، عبدالحفیظ پیرزادہ، رفیع رضا اور غلام مصطفیٰ جتوئی بھی شامل ہوا کرتے تھے۔'' (۲۴۶)

مولانا صاحب نے کتاب کے دوسرے ایڈیشن میں کہیں کہیں لفظی تبدیلیاں بھی کی ہیں۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ پرانے ایڈیشن میں مولانا صاحب نے لکھا تھا:

''مجھے پارٹی کا سیکرٹری اطلاعات مقرر کیا گیا تھا اور اس منصب پر میں تادمِ تحریر فائز چلا آ رہا ہوں۔'' (ص ۳۱۲)

نئے ایڈیشن میں انھوں نے یہ جملہ اس طرح لکھا ہے:

''مجھے پارٹی کا سیکرٹری اطلاعات مقرر کیا گیا تھا اور میں پارٹی کی حکومت کے بعد بھی تادمِ آخر اس منصب پر فائز رہا۔'' (ص ۱۲۱)

خدا کرے مولانا صد وہی سال سلامت رہیں۔ یہ ''تادمِ آخر'' والی بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔

اور آخر میں ایک ضروری وضاحت، پچھلے ہفتے حمزہ فاروقی صاحب نے اپنے خط میں مولانا کے زمانۂ وزارت کی وردی کو ''بینڈ ماسٹروں والی وردی'' لکھا تھا۔ کتابت کی غلطی کی وجہ سے ''بینڈ ماسٹروں'' کی جگہ ''ہیڈ ماسٹروں'' چھپ گیا اس کے لیے ہم معذرت خواہ ہیں۔

(۱۵ را کتوبر ۱۹۸۹ء)

یہ دیوان نہیں دیوانگیِ شوق کا دفتر ہے

فیض احمد فیض کے انتقال کے بعد اُن کی بیٹی منیزہ ہاشمی نے اپنے نامور باپ کے بارے میں ایک فلم بنانے کا فیصلہ کیا ہے۔ ایک ایسی فلم جس میں فیض کی شخصیت اور فن کی عکاسی اس طرح کی جائے کہ مرحوم کی زندگی کا کوئی گوشہ فلم دیکھنے والوں کی نظر سے اوجھل نہ رہے۔ اس سلسلے میں یہ بھی طے کیا گیا کہ ان تمام مقامات کی عکس بندی کی جائے، جہاں فیض نے اپنی زندگی کے دن گزارے اور جہاں ان کے چاہنے والے موجود ہیں۔ فیض ایک طویل عرصے تک ملک سے باہر رہے، کئی ملکوں میں انھیں وقت گزارنے کا موقع ملا لیکن روس سے ان کا تعلق خصوصی تھا۔ جب جی چاہتا وہاں چلے جاتے اور جب تک جی چاہتا وہاں رہتے۔ بقول عبداللہ ملک...... "اس ملک نے فیض کو سب سے زیادہ چاہا ہے، سب سے زیادہ پیار دیا ہے، سب سے زیادہ احترام دیا ہے۔ اور اس ملک نے فیض کو اپنے ملک کا سب سے بڑا بین الاقوامی اعزاز لینن پرائز دیا ہے......" اس وجہ سے یہ طے کیا گیا کہ فلم بندی کا آغاز روس سے کیا جائے۔ روسی سفارت خانے سے رابطہ قائم کیا گیا تو انھوں نے دیدہ و دل فرشِ راہ کیے اور ہر قسم کے تعاون کا یقین دلایا۔

منیزہ ہاشمی اپنے شوہر حمیر ہاشمی کے ساتھ ۱۹۸۶ء کے وسط میں روس گئیں۔ ایک مہینے تک روسی حکومت کی مہمان نوازی سے لطف اٹھایا۔ ماسکو، لینن گراڈ، تاشقند، دوشنبے، قازقستان اور داغستان کا دورہ کیا۔ روسی ٹیلیویژن کی ایک ٹیم ساتھ تھی۔ تاریخی آثار اور تفریحی مقامات کی فلم بندی کی گئی۔ ان لوگوں کے تاثرات ریکارڈ کیے گئے، جو فیض کو جانتے تھے اور اُن کے ساتھ کچھ وقت گزار چکے تھے۔ فلم کا کام ہر وقت نہیں ہوتا تھا، اس لیے منیزہ اور حمیر ہاشمی نے خاصا وقت سیر و سیاحت میں گزارا۔ اس کے بعد بھی کچھ وقت بچ جاتا تو منیزہ شاپنگ کے لیے نکل جاتیں اور ہاشمی ہوٹل کے کمرے میں قید ہو کر روزنامچہ لکھتے۔ فیض کے بارے میں ابھی فلم تو منظرِ عام پر نہیں آئی، لیکن حمیر ہاشمی کا روزنامچہ شائع ہو گیا ہے، تاکہ جب تک فلم مکمل نہیں ہوتی، فیض صاحب کے

عقیدت مند اس روزنامچے سے دل بہلائیں۔ گندم اگر بہم نرسد......

حمیر ہاشمی کا نام تو ہم نے سنا تھا اور یہ بھی معلوم تھا کہ وہ فیض صاحب کے خویش ہیں۔ لیکن یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ عالم فاضل آدمی ہیں۔ یہ بات ہمیں بزرگ ادیب عبداللہ ملک کے اس دیباچے سے معلوم ہوئی، جو انھوں نے حمیر ہاشمی کے روزنامچۂ سیاحت پر لکھا ہے۔ ہاشمی صاحب ماہر نفسیات ہیں۔ انھوں نے اس مضمون میں بڑی بڑی پاکستانی اور امریکی ڈگریاں حاصل کر رکھی ہیں۔ ان کا موضوعِ تحقیق، صارفین کی نفسیات ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے پبلسٹی اور اشتہار سازی میں خصوصی مہارت حاصل کی ہے۔

روزنامچے کا نام "دیارِ صبحِ بہار" ہے۔ نام سے ہم یہ سمجھے کہ یہ حمیر ہاشمی کا دیوان ہے، کیونکہ اس قسم کے نام دیوانوں ہی کے رکھے جاتے ہیں۔ کتاب دیکھی تو معلوم ہوا، یہ دیوان نہیں دیوانگیِ شوق کا دفتر ہے۔ حمیر ہاشمی کو روس کے ذرّے ذرّے سے اتنی محبت ہے کہ اتنی محبت شاید روسیوں کو بھی اپنے وطن سے نہیں ہوگی۔ انھوں نے یہ سفر فیض کے بارے میں فلم بنانے کے لیے کیا تھا لیکن روزنامچے کے پیش لفظ میں فرماتے ہیں کہ انھوں نے یہ زحمت محض اس لیے اٹھائی ہے کہ ہمارے ملک میں سوویت یونین کے بارے میں جو غلط تصورات اور بے جا تعصبات پائے جاتے ہیں، انھیں دور کیا جائے نیز......

"اس تحریر کی دوسری وجہ یہ ہے کہ چونکہ پچھلے ۳۵-۴۰ برس سے اس ملک میں سوشلسٹ اور کمیونسٹ معتوب رہے ہیں، پاکستان کی کمیونسٹ پارٹی پر پابندی رہی ہے اور اس پارٹی یا اس سے متعلق افراد کو اپنے خیالات کی تشہیر کی اجازت نہیں رہی، اس بناء پر ہمارے معاشرے میں ایک مخصوص خلاء پیدا ہوا ہے۔ اس خلا کو اس طرح پُر کیا گیا ہے کہ کبھی وہ شخص جو ذہنی پریشانی یا مایوسی کا شکار ہے، کبھی منشیات کا عادی شخص، کبھی کام چور شخص، کبھی جنس کی بے راہ روی کا شکار شخص اور کبھی کوئی شدید ذہنی مریض اور حال میں تخریب کار اور دہشت پسند افراد کو سوشلسٹ یا کمیونسٹ گردانا گیا ہے۔ حالانکہ حقیقت میں ایسے افراد کا سوشلسٹ نظریات سے نہ صرف یہ کہ کوئی تعلق نہیں، بلکہ ان کے رویے سوشلزم کے نظریات کی ضد ہیں۔ چنانچہ موجودہ سفر کے دوران اپنی یادداشتوں کو قلم بند کرنے کا ایک مقصد یہ بھی تھا

کہ سوشلسٹ اور کمیونسٹ افراد کے بارے میں اپنے تاثرات اور مشاہدات کو بے لاگ طور پر قلم بند کر کے اپنے پڑھنے والوں تک پہنچاؤں تاکہ پڑھنے والے اگر چاہیں تو ان لوگوں کے متعلق اپنے تعصبات کی تصدیق یا نفی کر سکیں۔"

یہ بھی خوب رہی۔ پاکستان میں پاکستانی سوشلسٹوں اور کمیونسٹوں کے بارے میں جو تعصبات پائے جاتے ہیں، ان کی تصدیق یا نفی کے لیے حمیر ہاشمی روسی سوشلسٹوں اور کمیونسٹوں پر تحقیق فرما رہے ہیں۔ روس کے باشندوں میں اتنی ہمت کہاں کہ وہ اپنے ملک میں تخریب کاری اور دہشت گردی کا شغل اختیار کریں۔ اس کام کے لیے روس سے باہر کی دنیا خاصی وسیع ہے۔ تحقیق کا یہ شوق اگر حمیر ہاشمی اپنے ملک ہی میں پورا کرتے، تو انھیں معلوم ہو جاتا کہ اصل حقیقت کیا ہے۔ بہر حال حمیر ہاشمی کی روس یاترا رائیگاں نہیں گئی۔ انھوں نے اپنے "مقصد" میں نہ صرف کامیابی حاصل کی ہے، بلکہ روس کی حکومت کے سامنے بھی "سرخ رُو" ہوئے ہیں۔ روسی حکومت نے ان کی مہمانداری پر جو کچھ صرف کیا تھا، اسے حمیر ہاشمی نے روزنامچہ لکھ کر لوٹا دیا ہے۔

موصوف کے تاثرات و مشاہدات کی کیفیت یہ ہے کہ انھوں نے روس میں رہ کر بھی اپنے ذہن اور اپنی آنکھوں کو بہت کم زحمت دی ہے۔ زیادہ وقت انھوں نے ایسی کتابوں کے پڑھنے میں گزارا، جن میں روسی نظام حکومت اور روسی معاشرے کے بارے میں معلومات تھیں۔ روس میں غیر ملکیوں کو جن ہوٹلوں میں ٹھہرایا جاتا ہے، ان کے کمروں میں پروپیگنڈا لٹریچر رکھ دیا جاتا ہے تاکہ غیر ملکیوں کو روس کے بارے میں "صحیح" معلومات حاصل ہوں۔ حمیر ہاشمی نے اس قسم کے لٹریچر سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ انھوں نے سوویت نظامِ تعلیم، روس میں مذہبی آزادی، انقلاب سے پہلے عورتوں کی حالتِ زار، انقلاب کے بعد ان کی خوش حالی جیسے موضوعات پر سرکاری کتابچوں سے بہت کچھ نقل کیا ہے، اور ایک جگہ تو "نیا انسان" نامی کتاب کے پورے پندرہ صفحے نقل کر دیے ہیں۔ ظاہر ہے اس قسم کی نقل نویسی کے لیے روس کا سفر کرنا ضروری نہیں تھا۔ یہ کام ہاشمی صاحب اپنے گھر میں بیٹھ کر بہتر طور پر انجام دے سکتے تھے۔

حمیر ہاشمی جہاں کہیں روس کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملاتے ہیں، وہاں اپنے ملک کا طنزیہ طور پر ذکر کرتے ہیں۔ مثلاً ماسکو کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اس شہر میں خاموشی بہت ہے، جو یہاں کی صفائی میں چار چاند لگا دیتی ہے۔ کسی

رکشا کی آواز نہیں، کوئی گاڑی والا ہارن نہیں بجاتا، کوئی ریڑھی والا سودا بیچنے کے لیے آواز نہیں لگاتا، نہ بچوں کے کھیلنے یا رونے کی نہ کتے بھونکنے کا شور......
حالانکہ شہر کی آبادی کراچی شہر کے برابر ہے۔ لیکن لوگ آپس میں بہت آہستہ بولتے ہیں، ایسا لگتا ہے سارا ماسکو سرگوشی میں بات چیت کرتا ہے۔ لوگوں کے چہروں پر کوئی تاثر نہیں، بالکل سپاٹ اور پُرسکون چہرے لگتے ہیں۔" (ص ۲۳)

حیرت ہے کہ ماہرِ نفسیات ہونے کے باوجود حمیر ہاشمی اس نکتے کو نہیں سمجھے کہ لاکھوں کی آبادی کے جس شہر پر "شہرِ خموشاں" کا گمان گزرے، وہاں ضرور کسی آسیب کا سایہ ہوگا۔ جس شہر کے لوگ سرگوشی میں بات کرتے ہوں، انھیں ضرور یہ احساس ہوگا کہ ان کی باتوں سے اپنی مرضی کے مطابق مطلب اخذ کرنے والے آس پاس موجود ہیں۔ جس شہر کے لوگوں کے چہرے تاثرات سے عاری اور سپاٹ ہوں، اس شہر کے بارے میں سوائے اس کے کیا کہا جا سکتا ہے کہ چلتی پھرتی لاشوں کا شہر ہے۔ ایسا شہر کس کام کا، جہاں سودا بیچنے والوں کی صدائیں ہوں، نہ بچوں کے کھیلنے اور رونے کا شور۔ اور وہ شہر بھی کس کام کا جہاں پڑھنے کے لیے حمیر ہاشمی کی کتاب نہ ہو۔ ماسکو میں وہی کتابیں دستیاب ہوتی ہیں، جو وہاں کی حکومت پڑھوانا چاہتی ہے۔ ہمارے ہاں تو وہ کتابیں بھی مل جاتی ہیں جو روسی سفارت خانہ پڑھوانا چاہتا ہے۔

پاکستان اور روس کا موازنہ کرتے ہوئے، حمیر ہاشمی کس طرح سوچتے ہیں، اس کی بھی ایک مثال دیکھیے۔ دوشنبہ میں وادی حصار نامی ایک مقام کی سیر کو وہ جاتے ہیں اور وہاں اپنے آپ کو مخاطب کر کے کہتے ہیں:

"میاں تیرے ملک کی وادی کاغان یا وادی سوات یا کوئی دوسری وادی بھی اتنی خوبصورت ہے؟" (ص ۱۳۴)

بینائی بھی کیا چیز ہے، کچھ لوگ رنگوں میں امتیاز نہیں کر پاتے۔ انھیں کلر بلائنڈ (رنگوندھیا) کہا جاتا ہے۔ کچھ لوگوں کو رات کو نظر نہیں آتا، انھیں نائٹ بلائنڈ (رتوندھیا) کہا جاتا ہے۔ اور جن لوگوں کو اپنے ملک میں کچھ نظر نہیں آتا، انھیں کیا کہا جائے۔ مقتدرہ قومی زبان کو اس کے لیے کوئی اصطلاح وضع کرنی چاہیے!

اپنے وطن سے حمیر ہاشمی کو جو لگاؤ ہے، اس کا اظہار ان کے اس جملے سے بھی ہوتا ہے:

''میں دوسرے ممالک میں عام طور پر اپنے ہم وطنوں سے ملنے سے گریز کیا کرتا ہوں۔'' (ص ۱۸۵)

دوسرے ملکوں میں یہ حال ہے، تو معلوم نہیں خود اپنے ملک میں موصوف کا گزارا کیسے ہوتا ہوگا، جہاں چاروں طرف ہم وطن ہی ہم وطن نظر آتے ہیں۔

مذہبی آزادی کے معاملے میں بھی حمیر ہاشمی نے روس اور پاکستان کا موازنہ کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ روس میں مکمل مذہبی آزادی ہے.....

''اس کے برعکس ہمارے ملک سمیت دوسرے مغربی اور نام نہاد ''آزاد'' ممالک میں اب تک ایسی سینکڑوں مثالیں موجود ہیں جو وہاں کے باشندوں کے مذہبی احساسات کو مجروح کرتی ہیں۔'' (ص ۸۷)

روس میں ''مکمل مذہبی آزادی'' کے الفاظ شاید مذہب سے مکمل آزادی حاصل کرنے کے معنوں میں استعمال کیے گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں مذہبی احساسات کو مجروح کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ حمیر ہاشمی اس بات پر بہت زور دیتے ہیں کہ روس کے آئین میں مکمل مذہبی آزادی کی ضمانت دی گئی ہے۔ اس آئین میں تو آزادیِ رائے کی بھی ضمانت دی گئی ہے۔ لیکن آزادیِ رائے کو جس طرح پامال کیا گیا ہے، اس کا اعتراف تو خود حمیر ہاشمی نے بھی استالین کے دورِ حکومت کے حوالے سے کیا ہے۔ ہم لمبی چوڑی بحث کرنے کے اہل نہیں، اس لیے حمیر ہاشمی سے صرف ایک سوال کا جواب چاہیں گے۔ کیا روس کے شاعر کا داماد پاکستان کی سیاحت کے بعد پاکستان کی تعریف اور اپنے ملک کی مذمت میں کوئی کتاب لکھ کر روس میں چھپوا سکتا ہے؟

حمیر ہاشمی چونکہ ماہرِ نفسیات ہیں، اس لیے کتاب میں جگہ جگہ انھوں نے اپنے علم کا اظہار بھی کیا ہے۔ مثلاً ایک جگہ فرماتے ہیں:

''جس نفسیاتی بیماری کو میں انا پرستی کہوں گا وہ سوویت یونین...... میں بالکل ناپید ہے...... ہمارے ہاں انا پرستی کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے معاشرے کا اقتصادی ڈھانچہ افراد کے باہمی مقابلے کی روح پر مبنی ہے...... اس مقصد کے حصول کے لیے لوگ تمام اخلاقی، غیر اخلاقی، قانونی، غیر قانونی ہتھکنڈے اپناتے ہیں تا کہ ان کا درجہ دوسرے افراد سے بلند تر نظر آئے۔ خود نمائی یا انا پرستی بھی اسی ردِ عمل کا ایک رُخ ہے...... (اور اسی لیے ہمارے ہاں)...... اپنے منہ میاں مٹھو بننے کا رجحان عام ہے۔'' (ص ۱۶۴)

اس نظریے کے صحیح ہونے کا ثبوت زیرِ نظر کتاب سے بھی ملتا ہے، جس میں حمیر ہاشمی نے اپنی تعریف بڑے دلچسپ اور فنکارانہ انداز میں کی ہے۔ انھوں نے اپنے بارے میں دوسروں کی اس قسم کی باتیں نقل کی ہیں:

''اچھے لوگ چلے جاتے ہیں، لیکن بہت ہی اچھی نشانیاں چھوڑ جاتے ہیں۔ فیض چلے گئے اور آپ لوگوں کو ہمارے لیے چھوڑ گئے۔'' (ص ۱۳۳)

''مجھے اس بات کا احساس نہ تھا کہ ایک ذہین شاعر کا ایک ذہین داماد بھی ہو سکتا ہے۔'' (ص ۱۳۲)

''تم واقعی فیض کے قابل داماد ہو۔ میری طرف سے مبارکباد قبول کرو۔'' (ص ۱۸۱)

ہم بھی حمیر ہاشمی کو مبارکباد پیش کرتے ہیں کہ روس والوں نے ان کے ذہین اور قابل ہونے کا اعتراف کیا۔ البتہ ہمیں یہ شکایت ہے کہ انھوں نے ''ذہین داماد'' والا جملہ نقل کر کے اپنے بڑے بھائی شعیب ہاشمی کے ساتھ، جو ٹی وی کے مشہور اداکار ہیں، ناانصافی کی ہے۔ شعیب ہاشمی بھی فیض صاحب کے داماد ہیں۔ فیض کی بڑی بیٹی سلیمہ ان کی بیگم ہیں۔ اگر مذکورہ جملہ یوں ہوتا تو بہتر تھا: ''مجھے اس بات کا احساس نہ تھا کہ ایک ذہین شاعر کے دو ذہین داماد بھی ہو سکتے ہیں''

آخر میں ہم یہ عرض کریں گے کہ یہ کتاب ان لوگوں کو پڑھنی چاہیے، جو اشتہار سازی اور پبلسٹی کے فن میں مصنف کی مہارت کا اندازہ کرنا چاہتے ہیں۔ خصوصاً ہمارے ملک کے اشتہاری اداروں کو اس سے ضرور استفادہ کرنا چاہیے، تا کہ انھیں معلوم ہو کہ صارفین کی نفسیات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے کسی چیز (خواہ وہ کوئی ملک ہی کیوں نہ ہو) کی پبلسٹی کس طرح کی جاتی ہے۔

عبداللہ ملک نے دیباچے میں ایک بڑا خوبصورت جملہ لکھا ہے: ''...... حمیر اور میں گھنٹوں ایک دوسرے کو بور کر سکتے ہیں اور ہم اس بات پر متفق ہوتے ہیں کہ ہم بور نہیں ہو رہے۔'' خدا کرے کہ یہ کتاب پڑھنے والے بھی عبداللہ ملک اور حمیر ہاشمی کی طرح فراخدلی کا ثبوت دیتے ہوئے یہ کہیں کہ ہم بور نہیں ہوئے۔

(۱۵/ اکتوبر ۱۹۸۹ء)

ادب اور تجارت

جب سے پاکستان اور ہندوستان کے درمیان ادیبوں کی آسانی آمد ورفت کا سلسلہ شروع ہوا ہے، ایک عجیب وغریب صورت حال سامنے آئی ہے۔ دونوں طرف ''ادیبوں'' کا ایک ایسا طبقہ پیدا ہوگیا ہے جو ''ادب برائے ادب'' یا ''ادب برائے زندگی'' کی بحث میں نہیں پڑتا اور صرف ''ادب برائے سفر'' کا قائل ہے۔ دونوں ملکوں کے ادیبوں کا میل جول اچھی چیز ہے اور اس کے کچھ فائدے بھی ہیں، لیکن نقصانات زیادہ ہیں۔ فائدے ایک ہاتھ کی انگلیوں پر گنوائے جا سکتے ہیں لیکن نقصانات گنوانے کے لیے دونوں ہاتھوں اور دونوں پیروں کی انگلیاں بھی کم پڑیں گی۔ ہم ان ادیبوں کی بات نہیں کرتے جن کی ادبی حیثیت مسلّمہ ہے اور جو دوسرے ملک میں جا کر اپنے ملک کا نام روشن کرتے ہیں۔ بات ان ''ادیبوں'' کی ہے جن کا ادب سے کوئی جائز تو کیا، ناجائز تعلق بھی نہیں ہے۔ انھیں اپنے ملک میں کوئی نہیں جانتا، لیکن دوسرے ملک کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی وہ ''مشاہیر ادب'' میں شمار ہونے لگتے ہیں۔

دونوں ملکوں میں میزبانی کا جذبہ فراواں ہے۔ ''مشاہیر ادب'' اسی جذبے سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ان خود ساختہ ادیبوں کی دونوں ملکوں میں خوب پذیرائی ہوتی ہے۔ ان کے اعزاز میں جلسے ہوتے ہیں، اخباروں میں انٹرویو چھپتے ہیں، کتابوں کے تحفے ملتے ہیں۔ ہندوستان اس سلسلے میں ایک قدم آگے ہے۔ آل انڈیا ریڈیو کی اُردو سروس سے ان مشاہیر کے انٹرویو نشر ہوتے ہیں۔ ہم نے اپنے گناہ گار کانوں سے ایک پاکستانی ''ادیب'' کا انٹرویو سنا ہے، جس میں انھوں نے سوالوں کے جواب اس طرح دیے جیسے انٹرویو نہ ہو، کوئی مزاحیہ پروگرام ہو۔ مثلاً اُن سے سوال کیا گیا، ''پاکستانی ادب کے تازہ ترین رجحانات کیا ہیں؟'' انھوں نے جواب دیا، ''میں پرسوں ہی کراچی سے دہلی پہنچا ہوں۔ پرسوں تک کوئی تازہ رجحان پیدا نہیں ہوا تھا۔ ان دو دنوں میں کوئی نیا رجحان پیدا ہوگیا ہو تو میں اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔''

جیسے یہ پاکستانی ادیب تھے، ویسے ہی ایک ہندوستانی ادیب پچھلے دنوں کراچی تشریف لائے۔ کئی علمی و ادبی اداروں نے ان کے اعزاز میں تقاریب منعقد کیں۔ اخباروں میں خبریں اور تصویریں شائع ہوئیں۔ تقریباً ہر اخبار کے ادبی صفحے پر ان کا انٹرویو چھپا۔ یہ دھوم دھام دیکھ کر ہم خاصے مرعوب ہوئے اور سوچا کہ کیوں نہ اپنے کالم کے لیے ہم ان کا انٹرویو لے لیں۔ ہم نے ان کے میزبان سے فون پر رابطہ قائم کیا اور اپنی خواہش ظاہر کی۔ انھوں نے نہایت حقارت سے فرمایا، ''آپ اخبار والوں نے معزز مہمان کو بہت پریشان کر دیا ہے۔ انھیں کسی لمحے آرام تو کرنے دیجیے۔'' بڑی مشکل سے ہم نے میزبان کو شیشے میں اتارا۔ انھوں نے اس شرط پر انٹرویو لینے کی اجازت دی کہ انٹرویو کے ساتھ جو تصویر چھپے گی، اس میں مہمان اور میزبان دونوں ہوں گے۔ ہم وقتِ مقررہ پر مہمان عزیز کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان میں اور ہم میں مندرجہ ذیل گفتگو ہوئی۔

ہم: ہماری خوش قسمتی ہے کہ آپ ہمارے ملک میں تشریف لائے ہیں، اس سفر کے بارے میں آپ کے تاثرات کیا ہیں؟

وہ: سب کچھ ٹھیک ہے، مگر آپ کے ہاں پان اچھے نہیں ملتے۔ مجھے سالم پتا کھانے کی عادت ہے اور آپ کے ہاں ذرا ذرا سی کترنیں ملتی ہیں۔

ہم: تو آپ اپنے ساتھ کچھ پان لیتے آتے۔

وہ: لایا تو تھا، لیکن وہ بارڈر پر ہی رہ گئے۔

ہم: کسٹم والوں نے چھین لیے ہوں گے۔

وہ: ان کی کیا مجال کہ میرے مال پر ہاتھ ماریں۔ میں پان لایا ہی اس خیال سے تھا کہ کچھ رقم ہاتھ آجائے گی۔ گاہک بارڈر پر مل گیا۔

ہم: آپ اور کیا کیا چیزیں لائے تھے؟

وہ: بہت کچھ تھا۔ چھالیہ، الائچی، کاجو، ساریاں، مصنوعی زیورات، مگر اب تو کچھ بھی نہیں رہا۔ آپ بہت دیر میں تشریف لائے۔ سب چیزیں فروخت ہو چکی ہیں۔

ہم: اس وقت تو آپ سے ادبی گفتگو کرنے کا ارادہ ہے۔

وہ: صاحب جب سے میں یہاں آیا ہوں ہر شخص مجھ سے ادبی گفتگو کر رہا ہے۔ کام کی بات

کوئی نہیں کرتا۔ آپ بھی اپنا شوق پورا کر لیجیے۔

ہم: یہ فرمایئے ہندوستان میں اُردو کا کیا حال ہے؟

وہ: بہت عمدہ حال ہے۔

ہم: کچھ تفصیل بتایئے۔

وہ: جس ملک میں مجھ جیسے اُردو کے شاعر ہوں گے، وہاں اس زبان کا حال اچھا ہی ہوگا۔ بُرا حال ہوتا تو میں کسی اور زبان میں شعر کہتا۔

ہم: سنا ہے آپ کے ملک میں بے شمار اردو اکیڈیمیاں ہیں؟

وہ: آپ نے سنا ہی سنا ہے، میں تو دیکھتا رہتا ہوں۔ ہر سو میل کے فاصلے پر ایک اُردو اکیڈیمی ہے۔ اور جہاں اُردو اکیڈیمی نہیں، انجمن ترقی اُردو کی شاخ ہے۔

ہم: ان اُردو اکیڈیمیوں کے بارے میں کچھ بتایئے۔

وہ: کیوں بتاؤں؟ آپ کو ان اکیڈیمیوں سے کیا لینا ہے؟

ہم: لینا تو کچھ نہیں۔ اگر ان کی کارگزاری معلوم ہو جائے تو اچھا ہے۔

وہ: یہ اکیڈیمیاں کتابیں چھاپتی ہیں اور گودام بھرتی ہیں۔ جن کتابوں کے لیے گودام میں جگہ نہیں ہوتی، ان پر انعام دے دیتی ہیں۔

ہم: آپ کے ملک میں اب تک کتنی اُردو کتابوں پر انعام مل چکا ہے؟

وہ: اُردو کی کوئی کتاب ایسی نہیں جو چھپی ہو اور اُسے انعام نہ ملا ہو۔ اِدھر کتاب چھپی، اُدھر انعام کا اعلان ہوا۔ بلکہ اب تو یہ فیصلہ ہوا ہے کہ اُن کتابوں پر بھی انعام دیا جائے جو کسی وجہ سے لکھی نہ جا سکیں۔

ہم: آپ کی بھی کسی کتاب پر انعام ملا ہے۔

وہ: میں انعام کے لیے نہیں لکھتا۔ میں نے اب تک اسی خیال سے اپنی کوئی کتاب نہیں چھپائی کہ کہیں اس پر انعام نہ مل جائے۔

ہم: کیا آپ نے کوئی کتاب لکھی ہے؟

وہ: میں کاغذ پر نہیں لکھتا، دلوں پر اپنا کلام تحریر کرتا ہوں۔ یعنی مشاعروں میں پڑھتا ہوں۔ پورے ہندوستان میں میرا کلام شوق سے سنا جاتا ہے۔ اور اب تو آپ کے ملک میں بھی

میرے مداح لاکھوں کی تعداد میں ہیں۔ میں ہندوستان کے چند بڑے شاعروں میں سے ہوں۔

ہم: کیا آپ اُن چند بڑے شاعروں کے نام بتائیں گے۔

وہ: میں کسی کا نام لے کر اُسے رسوا نہیں کرنا چاہتا۔

ہم: پاکستان میں آپ کی تشریف آوری کا سبب کیا ہے؟ کیا آپ اپنے رشتہ داروں سے ملنے کے لیے تشریف لائے ہیں۔

وہ: جی نہیں۔ میں خالصۃً ادبی وجوہ کی بنا پر یہاں آیا ہوں۔ ’’جزیرۂ سخنوراں‘‘ کی طرف سے مجھے یہاں آنے کی دعوت ملی تھی۔

ہم: ’’جزیرۂ سخنوراں‘‘ تو غلام عباس کی کتاب کا نام ہے۔

وہ: کون غلام عباس؟ حیرت ہے کہ آپ ’’جزیرۂ سخنوراں‘‘ سے واقف نہیں۔ یہ آپ کے ملک کا سب سے بڑا ادبی ادارہ ہے۔ جس کی طرف سے ہر سال مشاعرہ ہوتا ہے۔ مجھے اس مشاعرے میں مدعو کیا گیا تھا۔ اس ادارے کے سیکرٹری میرے ماموں زاد بھائی ہیں۔

ہم: سیکرٹری صاحب کا احسان ہے کہ ان کی وجہ سے ہم اہلِ پاکستان کو آپ سے ملنے کا شرف حاصل ہوا۔

وہ: کاہے کا احسان! میں نے بھی اپنے شہر میں ایک ادبی ادارہ بنا رکھا ہے۔ اس کی طرف سے بھی ہر سال مشاعرہ ہوتا ہے۔ اس مشاعرے میں میں ’’جزیرۂ سخنوراں‘‘ کے سیکرٹری کو بلاتا رہتا ہوں۔ اس کے جواب میں اگر انھوں نے مجھے بلا لیا تو کون سا احسان کیا۔ عوض معاوضہ گلہ ندارد۔

ہم: اگر آپ اجازت دیں تو کچھ ہندوستانی ادب کے بارے میں گفتگو ہو جائے۔

وہ: اجازت ہی اجازت ہے۔

ہم: ہندوستان میں اُردو افسانہ نگاری کے بارے میں کچھ بتایئے۔

وہ: میرے نزدیک افسانہ نگاری خرافات کا درجہ رکھتی ہے۔ جسے کوئی کام نہیں ہوتا وہ افسانہ نگار بن جاتا ہے۔ میں افسانے پڑھنے میں وقت ضائع نہیں کرتا۔

ہم: کیا آپ نے کرشن چندر، عصمت چغتائی اور راجندر سنگھ بیدی کے افسانے بھی

نہیں پڑھے؟

وہ: پہلے وہ نام تو میں نے کبھی نہیں سنے۔ ہاں بیدی صاحب کو خوب اچھی طرح جانتا ہوں۔ میرے کرم فرما ہیں۔ وہ جن مشاعروں کی صدارت فرماتے ہیں، ان کے منتظمین مجبور ہو کر مجھے دعوت نامہ بجھواتے ہیں۔ پاکستان کے لیے ویزا ابھی انھیں کی سفارش پر ملا تھا۔

ہم: آپ شاید کنور مہندر سنگھ بیدی کا ذکر کر رہے ہیں، بات راجندر سنگھ بیدی کی ہو رہی تھی۔

وہ: آپ پاکستانیوں کی لاعلمی پر ہنسی آتی ہے۔ کنور صاحب ایک ہی ہیں۔ ان کا نام مہندر سنگھ بیدی ہے۔ بعض لوگ انھیں راجندر سنگھ بیدی بھی کہتے ہیں۔

ہم: راجندر سنگھ بیدی بہت بڑے افسانہ نگار تھے۔ چند برس پہلے ان کا انتقال ہو چکا ہے۔

وہ: آپ اپنی ہانکے جا رہے ہیں۔ میں ابھی دو ہفتے پہلے بیدی صاحب سے ملا ہوں۔ ویزا دلانے کے لیے وہ خود میرے ساتھ پاکستانی سفارت خانے گئے تھے۔ آپ کے سفیر نے اپنی کرسی سے اٹھ کر ان کا استقبال کیا تھا۔

ہم: آپ کا بے حد شکریہ کہ آپ کی وجہ سے ایک بہت بڑی غلط فہمی دور ہو گئی، ورنہ پاکستان میں عام طور پر مہندر سنگھ بیدی اور راجندر سنگھ بیدی کو الگ الگ شخصیات سمجھا جاتا تھا۔

وہ: آپ لوگوں کو ہندوستان کے ادب کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔

ہم: اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندوستانی کتابیں یہاں نہیں ملتیں۔

وہ: اچھا ہی ہے جو نہیں ملتیں۔ انھیں وہاں کوئی نہیں پڑھتا تو آپ پڑھ کر کیا کریں گے۔

ہم: دونوں ملکوں میں کتابوں کا لین دین تو ہونا چاہیے۔

وہ: لین دین اس چیز کا ہوتا ہے جس کی مارکیٹ ویلیو ہو۔ میں اگر اپنے ساتھ کتابیں لے کر آتا تو وہ پڑی کی پڑی رہ جاتیں، کوئی نہ خریدتا۔ پان، چھالیہ اور کاجو وغیرہ ہاتھوں ہاتھ بک گئے۔

ہم: یہاں سے آپ کیا لے کر جائیں گے؟

وہ: آپ کے ہاں غیر ملکی کپڑا آسانی سے دستیاب ہو جاتا ہے۔ سوچ رہا ہوں کہ یہیں سے لے جاؤں۔ وہاں منھ مانگے دام مل جائیں گے۔

ہم: اس کا مطلب یہ ہے کہ کاروباری نقطۂ نظر سے آپ کا دورہ کامیاب رہا۔

وہ: کیسا کاروبار، کہاں کا کاروبار۔ میں تو ادب کا آدمی ہوں اور ادب ہی کی خاطر یہاں آیا ہوں۔

ہم: آپ کو یہاں تحفے میں کتابیں تو ملی ہوں گی۔

وہ: جی ہاں، جو بھی ملتا ہے، بات بعد میں کرتا ہے پہلے کتاب پیش کرتا ہے۔ دو سو کے قریب کتابیں جمع ہو چکی ہیں۔

ہم: کیا آپ یہ سب کتابیں ساتھ لے جائیں گے؟

وہ: ہمارے ملک میں کیا کتابوں کی کمی ہے جو میں یہ بوجھ ساتھ لے جاؤں۔

ہم: تو پھر آپ ان کتابوں کا کیا کریں گے؟

وہ: میرے میزبان نے کتابوں کا ٹھیلہ لگانے والے ایک شخص سے سودا کر لیا۔ ان شاءاللہ یہیں پاکستان میں یہ کتابیں مستحقین تک پہنچ جائیں گی۔

ہم: واپس جا کر آپ سفرنامہ تو ضرور لکھیں گے۔

وہ: جی ہاں۔ یہ کام کرنا ہی پڑے گا۔ ذرا اپنا اور اپنے اخبار کا نام ایک کاغذ پر لکھ دیجیے۔ سفرنامے میں آپ کا ذکر بھی کروں گا۔ میں بہت کشادہ دل ہوں۔ جس سے بھی ملاقات ہوتی ہے، اس کا نام نوٹ کر لیتا ہوں تاکہ کسی کو شکایت نہ ہو کہ میں نے ان کا ذکر نہیں کیا۔

(۱۶ر نومبر ۱۹۸۹ء)

وہ چال چلن کے اعتبار سے صہبا لکھنوی ہیں

ایک زمانہ تھا کہ اخبار یا رسالہ نکالنے کے لیے ڈیکلریشن حاصل کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ آج معاملہ برعکس ہے۔ ڈیکلریشن اسی طرح آسانی سے مل جاتا ہے، جس طرح بازار میں کلاشنکوف اور دوسرے مہلک ہتھیار دستیاب ہوتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ کلاشنکوف کے لیے اچھی خاصی رقم درکار ہوتی ہے، لیکن ڈیکلریشن کے حصول کے لیے صرف ایک درخواست دے دینا کافی ہے۔ درخواست گزار کو گھر بیٹھے بٹھائے ڈیکلریشن مل جاتا ہے۔ اس صورت حال کا نتیجہ یہ ہے کہ بھانت بھانت کے رسائل شائع ہو رہے ہیں، جن میں ایک ہی جیسے مضامین اور ایک ہی جیسی تصویریں ہوتی ہیں۔ سیاسی ہفت روزوں کا زور ہے، جن کی اشاعت چند سو اور مدت اشاعت چند روزہ ہوتی ہے۔

موجودہ حکومت نے اگرچہ آزادیٔ اظہار کے فروغ کے لیے کاغذ کی قیمت میں بے حساب اضافہ کر دیا ہے، لیکن ''رسالے بازوں'' پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ مہنگے سے مہنگا کاغذ خریدتے ہیں اور سستی سے سستی صحافت کو پروان چڑھاتے ہیں۔ ان رسالوں میں کیا ہوتا ہے؟ سرورق پر ٹی وی یا سیاست سے متعلق کسی خاتون کی تصویر اور اندر سنسنی خیز مضامین، جن میں سچ آٹے میں نمک کے برابر ہوتا ہے یا اتنا بھی نہیں ہوتا۔ ان میں سے بیشتر مضامین ادھر ادھر سے نقل کیے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ اداریے بھی قلم سے نہیں، قینچی سے لکھے جاتے ہیں۔

لیکن یہ تصویر کا ایک رخ ہے۔ دوسرا رخ یہ ہے کہ چند اچھے رسالے بھی جاری ہوتے ہیں۔ خصوصاً دو نئے ادبی رسالے تو ایسے ہیں، جن سے ادبی صحافت کی آبرو میں اضافہ ہوا ہے۔ ایک رسالے کا نام ''صریر'' ہے اور دوسرے کا ''آج''۔ پہلا رسالہ مشہور ادیب فہیم اعظمی نے جاری کیا ہے۔ یہ وہی فہیم اعظمی ہیں، جن کے ناول ''جنم کنڈلی'' کے بارے میں ہم نے ایک مرتبہ لکھا تھا کہ اس ناول کا ہر باب دوسرے باب سے منسلک ہے، لیکن ناول نگار کا نہیں جلد ساز کا کمال ہے۔

''صریر'' کے بارے میں ہم اس قسم کی بات نہیں کہہ سکتے کیونکہ اس میں جو کمالات نظر آتے ہیں، ان سے اول تا آخر ایڈیٹر کے سلیقے اور باقی ماندہ علم و فضل کا اظہار ہوتا ہے۔ ''باقی ماندہ'' اس لیے کہ فہیم اعظمی کے علم و فضل کا بڑا حصہ ان کے مذکورہ ناول میں صرف ہو چکا ہے۔ بہر حال ''صریر'' ایک ایسا رسالہ ہے جسے اُردو ادب کا کوئی قاری نظر انداز نہیں کر سکتا۔ اس رسالے کے بارے میں ہم تفصیل سے آئندہ کبھی لکھیں گے۔

رسالہ ''آج'' کے ایڈیٹر اجمل کمال ہیں۔ یہ ابھی نوجوان ہیں، جو پیشے کے اعتبار سے انجینئر، مزاج کے اعتبار سے شاعر اور چال چلن کے اعتبار سے صہبا لکھنوی ہیں۔ چال چلن سے مراد یہ ہے کہ صہبا لکھنوی کی طرح دھان پان ہونے کے باوجود نہایت فعال آدمی ہیں۔ فرق یہ ہے کہ صہبا لکھنوی بیکار بھی بیٹھے ہوں، تو یہ ظاہر کرتے ہیں کہ بہت کچھ کر رہے ہیں۔ اجمل کمال بہت کچھ کرتے ہیں، لیکن ظاہر یہ کرتے ہیں کہ کچھ نہیں کر رہے۔ ان کا کوئی ادبی گروہ نہیں ہے اور نہ وہ اخباروں کے ادبی صفحات پر اپنے بارے میں خبریں چھپواتے ہیں۔ بس خاموشی سے کام کرتے رہتے ہیں۔ دوسری زبانوں کی کئی عمدہ تخلیقات انھوں نے اُردو میں منتقل کی ہیں۔ اجمل کمال اس رمز سے واقف ہیں کہ کسی زبان کا ادب اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتا، جب تک دوسری زبانوں سے تراجم کے ذریعے اس کی آبیاری نہ کی جائے۔ تیسرے درجے کی طبع زاد تخلیقات پیش کرنے سے بہتر ہے کہ دوسری زبانوں کے اعلیٰ ادب کو تخلیقی ہنر کے ساتھ اپنی زبان میں منتقل کیا جائے۔

اجمل کمال نے چند برس قبل ''آج'' کے نام سے منتخب نظم و نثر کا ایک کتابی سلسلہ شروع کیا تھا۔ اب انھوں نے اسے باقاعدہ ایک ادبی جریدے کی شکل دے دی ہے۔ اس کے سال میں چار شمارے شائع ہوں گے، جو چاروں موسموں (سرما، بہار، گرما اور خزاں) سے منسوب ہوں گے۔ اس کا پہلا شمارہ ستمبر ۸۹ء کا ہے، جو خزاں سے منسوب ہے، لیکن مطالب کے اعتبار سے اس کے اوراق پر بہار کا سماں نظر آتا ہے۔ یہ ایک سنجیدہ ادبی کاوش ہے۔ اس میں کچھ تراجم ہیں اور کچھ طبع زاد تخلیقات۔ سنجیدگی اس پر اس حد تک غالب ہے کہ اس میں کسی تجارتی ادارے کا اشتہار بھی نظر نہیں آتا۔ یہاں تک کہ ایڈیٹر نے اپنے آپ کو بھی مشتہر کرنے کی کوشش نہیں کی۔ حالانکہ ہمارے ادبی رسالوں میں اور کچھ ہو نہ ہو، ایڈیٹر کا اشتہار ضرور ہوتا ہے بلکہ پورا رسالہ ہی

اچھا خاصا اشتہار نامہ ہوتا ہے۔

۱۲۴ صفحات کے اس رسالے میں عالمی ادب کی کئی نمائندہ تحریروں کے تراجم شامل ہیں۔ بنگالی زبان کے ادیب تاراشنکر بینرجی کا افسانہ اور فارسی کی شاعرہ فروغ فرخ زاد کی نظموں کے تراجم خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ اسد محمد خان، محمد خالد اختر، افضال احمد سید، ذیشان ساحل اور نسرین انجم بھٹی کی طبع زاد تخلیقات تازگی اور ندرت کی حامل ہیں۔ ایک گوشہ ڈاکٹر نیر مسعود کے لیے وقف کیا گیا ہے۔ موصوف بیک وقت تحقیق اور تخلیق کے مرد میدان ہیں۔ اُردو اور فارسی ادب سے متعلق ان کے کئی تحقیقی کام علمی دنیا میں شہرت رکھتے ہیں۔ خصوصاً ان کا پی ایچ ڈی کا مقالہ، جو رجب علی بیگ سرور کے بارے میں ہے، ایک تحقیقی کارنامہ ہے۔ ڈاکٹر نیر مسعود نے گزشتہ چند برسوں میں افسانہ نگار کی حیثیت سے بھی نام پیدا کیا ہے۔ ہندوستان کے جدید افسانہ نگاروں میں انھیں ممتاز مقام حاصل ہے۔ ''آج'' میں ان کے چار افسانے اور فارسی نظم و نثر کے تراجم شامل ہیں۔

''آج'' میں تراجم کو زیادہ اہمیت دی گئی، لیکن حیرت ہے کہ اسد محمد خاں کی ایک نظم کو اصل صورت میں شائع کیا گیا ہے۔ حالانکہ یہ نظم اس لائق تھی کہ اس کا بھی ترجمہ شائع کیا جاتا۔ نظم کا عنوان انگریزی میں ہے، Native Hospitality۔ لیکن اس کا متن اُردو رسم الخط میں ہونے کے باوجود کسی اجنبی زبان میں ہے۔ نظم یہ ہے:

سرکار! کوئی جان گلکرسٹ صاحب آئے ہیں
بٹھاؤ، پوچھو، کیا شوق فرمایئے گا
حضور! کہتے ہیں میں پولو کھیلوں گا
تو اپنے میر امّن کو بھیج دو
سرکار! میرے زونے سے کوئی ٹورسٹ بی بی آئی ہیں
بٹھاؤ، پوچھو، کیا شوق فرمایئے گا
حضور! کہتی ہیں میں ڈھانچہ دیکھوں گی
چہ خوب! کہہ دو گرم پرواز ہے
فلک پر قلانچیں مار رہا ہے

اور کہہ دو جم جم آئیں پہ بدشگونی نہ فرمائیں
مگر ٹھہرو، مہمان ہیں
اس طور لوٹایا بھی تو نہیں جا سکتا
(یہیں کہیں تو کھٹ پٹ کر رہے تھے یا پچے چونی منڈی والے ڈاکٹر کہاں گئے)

یہ نظم ہماری سمجھ میں تو نہیں آئی۔ استاد لاغر مراد آبادی سے مشورہ کیا تو انھوں نے فرمایا:

''اسد محمد خان کی یہ نظم معاصرانہ چشمک کی آئینہ دار ہے۔ یہ ڈاکٹر انور سجاد کے بارے میں ہے، جو چونی منڈی لاہور میں رہتے ہیں۔ ٹورسٹ بی بی سے مراد لینڈا وینگ ہے جو اُردو افسانے پر تحقیقی کام کے سلسلے میں پاکستان آئی تھی اور جس نے ڈاکٹر انور سجاد سے کئی ملاقاتیں کیں اور اُن کی افسانہ نگاری پر ایک مفصل مضمون لکھا۔ اسد محمد خان کا خیال ہے کہ ایک زمانہ تھا جب باہر والوں کے کہنے پر زندہ رہنے والی کتابیں لکھی جاتی تھیں، جیسے گلکرسٹ کے کہنے پر میر امّن نے ''باغ و بہار'' لکھی۔ مگر اب ہم باہر والوں سے اپنی ان کتابوں پر مضامین لکھواتے ہیں جو میوزیم میں رکھے ہوئے ڈھانچوں کی طرح بے جان ہوتی ہیں۔''

استاد لاغر مراد آبادی کی یہ تشریح ہمیں تو قابلِ قبول نظر آتی ہے۔ استاد محترم غالب کے منسوخ کلام کی شرح لکھ چکے ہیں، اس لیے اسد محمد خان کے منسوخ کلام کی شرح لکھنا ان کے لیے کوئی مشکل کام نہیں۔ واضح رہے کہ غالب کا منسوخ کلام وہ ہے، جو انھوں نے خود رد کر دیا تھا اور جو اُن کے متداول دیوان میں شامل نہیں۔ اسد محمد خان کا منسوخ کلام وہ ہے، جسے پڑھنے والے، خصوصاً ڈاکٹر انور سجاد، رد کر دیتے ہیں۔

''آج'' میں منفرد طنز و مزاح نگار محمد خالد کا ایک خوبصورت مضمون ''کراچی کا تہذیبی مرقع'' بھی شامل ہے، جس میں انھوں نے کراچی کی تجارتی، سماجی، ثقافتی اور ادبی زندگی کے بارے میں دلچسپ باتیں لکھی ہیں۔ اس مضمون کے ساتھ ایک ضمیمہ بھی ہے، جس کا عنوان ''مدوحۂ بے نظیر'' ہے۔ اس میں اختر صاحب نے جنرل ضیاء الحق مرحوم کی برائی اور محترمہ بے نظیر کی تعریف ایک ہی انداز سے کی ہے۔ اس وجہ سے قاری کے دل میں ان دونوں کے لیے ہمدردی کے جذبات پیدا

ہوتے ہیں اور لکھنے والے پر ہنسی آتی ہے۔ محترمہ بے نظیر کی تعریف وہ اس انداز سے کرتے ہیں:

"سبحان اللہ! اس قدسی صفات، خندہ جبیں، حوصلہ مند بی بی کے گدی سنبھالتے ہی گھٹا ٹوپ ظلمت کے بادل چھٹ گئے۔ سپہر اول پر ماہتاب نے طلوع ہو کر چاروں طرف روشنی کر دی۔ گلشن خزاں رسیدہ میں بہار آ گئی...... اس بی بی نے حاتم اور سب گزشتہ سخیوں کے نام کتاب سخا سے حروف غلط کی طرح مسترد کر دیے ہیں۔"

محمد خالد اختر نے "ظلمت" کو "گھٹا ٹوپ" کہہ کر ثابت کر دیا ہے کہ مبالغہ آرائی میں ان کا کوئی حریف نہیں ہو سکتا۔

اس مضمون میں اختر صاحب نے ہمارے حال پر بھی کرم فرمایا ہے اور یہ لکھا ہے:

"......قلم رواں کے تیر و نشتر اس طور پر بے پناہ چلاتے ہیں کہ دوست دشمن میں امتیاز نہیں کرتے۔ ان کے ڈنک کا ڈسا شفایاب نہیں ہوتا۔"

اطلاعاً عرض ہے کہ ہم کسی کو اپنا دشمن نہیں سمجھتے، اس لیے دوست دشمن میں امتیاز کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ رہی ڈنک والی بات تو اس سے اس زہرناکی کا اندازہ ہوتا ہے، جو ہمارے لیے جناب اختر جیسے شیریں رقم کے قلم سے ٹپکی ہے۔ ہمارا قصور صرف اتنا ہے کہ کچھ عرصہ قبل ہم نے اختر صاحب کی کتاب "مکاتیب خضر" پر ایک کالم لکھا تھا جو انھیں پسند نہیں آیا۔ اختر صاحب کے ہم پرانے نیاز مند ہیں۔ اگر ہماری کوئی بات انھیں ناگوار گزری ہو، تو اس کے لیے معذرت قبول فرمائیں اور شفایاب ہو کر کشادہ دلی کا ثبوت دیں۔

اختر صاحب نے دوست دشمن میں امتیاز نہ کرنے کی جو بات کہی ہے، اس سے مشہور دانشور اور ادیب ستار طاہر کو اختلاف ہے۔ موصوف رسالہ "تخلیق" لاہور کے ہر شمارے میں "فٹ نوٹس" کے عنوان سے نہایت مفید اور فکر انگیز حواشی لکھتے ہیں۔ ہمیں اس کا اعتراف ہے کہ ہم "تخلیق" میں سب سے پہلے ستار طاہر کے "فٹ نوٹس" پڑھتے ہیں، جن سے ہماری معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ "تخلیق" کے تازہ شمارے میں ستار طاہر صاحب نے ہمارے حال پر کرم فرمایا ہے اور یہ لکھا ہے کہ محمد خالد اختر کا یہ کہنا درست نہیں ہے کہ خامہ بگوش دوست دشمن میں امتیاز نہیں کرتا۔ اس کا ثبوت یہ پیش کیا کہ خدا بخش جرنل پٹنہ میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ مرحوم کی پہلی تصنیف

(پنڈت مدن موہن مالویہ کی سوانح عمری) کا جو متن چھپا ہے، ہم نے اپنے کالم میں مصلحتاً اس کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ ستار طاہر صاحب لکھتے ہیں:

"......(خامہ بگوش) نے ایسے زبردست انکشاف (کہ مولانا نے مذکورہ سوانح عمری لکھی تھی) پر ایک لفظ نہیں لکھا اور یہ اہم دریافت گول کر گئے۔ وجہ صاف ظاہر ہے...... محمد صلاح الدین، جماعت اسلامی، سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی ذات اور...... (خامہ بگوش) کا ان سے احترام کا رشتہ۔ اس لیے وہ اپنے...... کالم کے ذریعے قارئین تک یہ اہم انکشاف پہنچا کر، کہ مولانا مودودی مرحوم، پنڈت مدن موہن مالویہ کے مدح خواں رہے ہیں، اپنے احترامی رشتے کو داغ دار نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اگر ترقی پسندوں اور جماعت اسلامی سے اختلاف رکھنے والے کسی شاعر، دانشور یا عالم دین کے بارے میں اس سے بھی کمتر درجے کی دریافت سامنے آتی، تو وہ اپنے مخصوص انداز میں ضرور لکھتے۔ لیکن...... (خامہ بگوش) کی مجبوری تھی کہ کئی رشتے اور احترامات ان کی راہ میں کھڑے تھے۔ انھیں پامال کرنے کا ان میں حوصلہ نہ تھا۔"

ہم اپنی "صفائی" میں یہ عرض کریں گے کہ ہمارا کالم ادبی ہے۔ ہم نے کبھی کسی عالم دین، سیاستدان یا غیر ادیب کے بارے میں کچھ نہیں لکھا اور کبھی کسی غیر ادبی کتاب کو موضوع نہیں بنایا۔ مولانا کوثر نیازی کے بارے میں ہم ضرور لکھتے رہتے ہیں، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے نزدیک نیازی صاحب جتنے اور جیسے سیاستدان ہیں، اتنے اور ویسے ادیب بھی ہیں۔ بیشک ہمارے دل میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے لیے بے حد احترام ہے، لیکن ان کی مذکورہ کتاب کسی ادبی موضوع پر ہوتی تو ہم اس پر ضرور لکھتے۔ ویسے ہمارے نزدیک مدن موہن مالویہ کی سوانح عمری لکھنا، کوئی ایسا کام نہیں ہے جس سے مولانا کی علمی و فکری حیثیت داغ دار ہو یا اس کو جانچنے میں کوئی مدد ملے۔ یہ سولہ برس کے ایک نوجوان کی پہلی تحریری کاوش ہے اور اس کی تاریخی اہمیت ہے۔ مولانا کی سوانح عمری میں اس کا ذکر آنا چاہیے اور ان کی تصانیف کی فہرست میں بھی اسے ضرور شامل کرنا چاہیے۔ علامہ اقبال نے ملکہ وکٹوریہ کی وفات پر ایک طویل مرثیہ لکھا تھا، جس میں اس قسم کے مبالغہ آمیز شعر بھی تھے۔

اے ہند تیرے سر سے اٹھا سایۂ خدا
اک غم گسار تیرے مکینوں کی تھی، گئی

کیا اقبال کے شاعرانہ اور فکری مقام کے تعین میں اس مرثیے سے کوئی مدد مل سکتی ہے؟

محترم ستار طاہر صاحب کی جو عبارت اوپر نقل کی گئی ہے، اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے جیسے جماعت اسلامی سے اختلاف رکھنے والے شاعروں اور ادیبوں کے خلاف لکھنا ہماری کالم نگاری کا واحد مقصد ہے۔ ایسا بھاری الزام ہمارے کمزور شانوں کے شایانِ شان نہیں۔ ہمارا جماعتِ اسلامی سے کسی قسم کا تعلق نہیں۔ یہاں تک کہ قربانی کی کھالوں سے حاصل ہونے والی آمدنی سے بھی ہمیں کوئی امدادی رقم نہیں ملی۔ ہم نے کبھی کسی مصنف کے بارے میں لکھتے ہوئے یہ نہیں دیکھا کہ یہ جماعت کا مخالف ہے یا موافق۔ ہمارے نزدیک ادبی معاملات میں غیر ادبی مصلحتوں کو پیش نظر رکھنا ادبی بددیانتی ہے۔ جماعتِ اسلامی سے اختلاف رکھنے والوں کا ہم دل سے احترام کرتے ہیں، کیونکہ اس گروہ میں ہم خود بھی شامل ہیں۔

(۳۰ نومبر ۱۹۸۹ء)

وزیٹنگ کارڈ یا مستقل تصنیف

کہا جاتا ہے کہ علم اور شگفتہ مزاجی ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ کوئی صاحب علم زندہ دل اور شگفتہ مزاج بھی ہو کیونکہ جب کسی کے پاس علم آتا ہے تو اپنی خشکی اور سنجیدگی بھی ساتھ لاتا ہے۔ علم کے آتے ہی زندہ دلی اور شگفتہ مزاجی کو رخصت ہونا پڑتا ہے اور اگر ایسا نہ ہو تو علم رخصت کی اجازت طلب کر لیتا ہے۔ لیکن مظفر علی سید کا شمار مستثنیات میں ہے۔ وہ بیک وقت صاحب علم بھی ہیں اور زندہ دل و شگفتہ مزاج بھی۔ اُن کی شگفتہ مزاجی ایسی ہے کہ بات سے بات پیدا کرتے ہیں، خود مسکراتے ہیں، دوسروں کو مسکرانے کا موقع دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ رقیق القلبی کا اظہار بھی مسکرا کر کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں اُن کا یہ واقعہ خاصا مشہور ہے کہ ایک شاعر دوست کی بیاض گم ہو گئی۔ اُس میں بیشتر کلام غیر مطبوعہ تھا۔ سب دوستوں نے اُن شاعر صاحب سے ہمدردی کا اظہار کیا تو سیّد صاحب کہنے لگے: ”مجھے تو اُس شخص سے ہمدردی ہے، یہ بیاض جس کے ہاتھ لگے گی۔“

سیّد صاحب کے علم کا یہ حال ہے کہ قدیم اور جدید سے جدید ادب پر اُن کی نظر ایسی گہری ہے جیسے بعض لوگ اپنی خوبیوں اور دوسروں کی خامیوں پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ وہ صرف اُردو ادب کے نہیں، عالمی ادب کے عالم ہیں۔ اُنھیں معلوم رہتا ہے کہ کس زبان میں کیا کچھ لکھا جا رہا ہے اور کس ملک میں کون کون سے ادبی رجحانات غالب ہیں۔ نئی سے نئی اور پرانی سے پرانی کتابیں اُن کی نظر سے گزرتی ہیں۔ پرانی کتابیں عموماً وہی ہوتی ہیں جو دیمک کی نگاہِ التفات سے بچ جاتی ہیں۔ ویسے سیّد صاحب نئے پرانے کے جھگڑے میں نہیں پڑتے۔ اُن کا کہنا ہے کہ ادب نیا ہوتا ہے نہ پرانا۔ اچھا ادب پرانا بھی ہو تو ہر عہد میں نیا معلوم ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ زمانے کی بہت سی کتابوں اور مصنفوں کے بارے میں وہ یہ رائے رکھتے ہیں کہ یا اپنے زمانے سے کئی سو سال بعد منظرِ عام پر آئے ہیں۔ مختصر یہ کہ سیّد صاحب کے پاس اتنا علم ہے کہ اگر وہ اسے

خیرات بھی کر دیں تو اُن کا کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ کیونکہ جن لوگوں کو وہ اپنا علم خیرات کریں گے، وہ دوسرے دن واپس کر جائیں گے کیونکہ ایسا ثقیل علم اُن کے کسی کام کا نہ ہوگا۔

سیّد صاحب کی دوسری خوبی اُن کا انکسار ہے۔ اب تک وہ ایک سو سے زیادہ علمی و ادبی مقالے لکھ چکے ہیں، لیکن کوئی مجموعہ نہیں چھپوایا۔ ہم نے اُن سے بارہا کہا کہ آپ کی پانچ چھ تنقیدی و تحقیقی کتابیں بآسانی شائع ہو سکتی ہیں۔ آپ اس طرف توجہ کیوں نہیں کرتے؟ وہ ہمیشہ ٹال گئے۔ ایک مرتبہ ہم نے بہت اصرار کیا تو فرمایا: "میں اپنے مقالوں کو اس لائق نہیں سمجھتا کہ انھیں کتابی صورت میں شائع کرایا جائے۔" ہم نے عرض کیا: "جب آپ انھیں فرداً فرداً چھپوا چکے ہیں، تو کتابی صورت میں شائع کرانے میں کیا قباحت ہے؟" کہنے لگے: "آدمی کو غلطی پر نادم ہونا چاہیے، اُس کو دہرانا نہیں چاہیے۔" اصولاً اس منطق کے سامنے ہمیں خاموش ہو جانا چاہیے تھا، لیکن ہم سے خاموش نہ رہا جا سکا۔ عرض کیا: "ہم نے اب تک جو کچھ سیکھا ہے دوسروں کی غلطیوں ہی سے سیکھا ہے۔ اگر آپ کے مقالے کتابی صورت میں چھپیں گے تو ہم ان سے بہت کچھ سیکھیں گے۔" اس کے جواب میں انھوں نے یہ کہہ کر ہمیں خاموش کر دیا: "دوسروں کی غلطیوں سے سیکھنے والے کے لیے ضروری ہے کہ وہ دوسروں کی درست باتوں سے بھی سیکھنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ ورنہ آدمی سیکھتا کچھ نہیں، غلط نامہ بن کر رہ جاتا ہے۔"

بہرحال سیّد صاحب نے کتاب نہ چھپوانے کی تلافی یوں کر دی ہے کہ وہ اپنا وزیٹنگ کارڈ باقاعدگی سے چھپواتے رہتے ہیں اور ہر ملاقاتی کو پیش کرتے ہیں۔ گزشتہ ایک سال میں اس کارڈ کے آٹھ دس ایڈیشن شائع ہو کر ہاتھوں ہاتھ تقسیم ہو چکے ہیں۔ سیّد صاحب اگر کتابیں چھپواتے تو اُن کا زیادہ سے زیادہ ایک ایڈیشن چھپتا اور وہ بھی ناشر کے گودام میں پڑا رہتا، کیونکہ علمی کتابیں گودام ہی کی رونق بڑھانے کے لیے چھاپی جاتی ہیں۔

سیّد صاحب سے ہماری ملاقات زیادہ پرانی نہیں ہے۔ اس سال کے شروع میں وہ ایک ثقافتی ادارے کے سربراہ کی حیثیت سے کراچی آئے تو ملاقات ہوئی۔ اس سے پہلے ہم اُن سے غائبانہ عقیدت رکھتے تھے۔ اُن کے کچھ مضامین پڑھ رکھے تھے اور انیس ناگی کی یہ رائے سُن رکھی تھی کہ سیّد صاحب کا تعلق نقادوں کے ہتھوڑا گروپ سے ہے۔ مطلب یہ کہ وہ تنقید میں لگی لپٹی نہیں رکھتے۔ جس بات کو وہ درست سمجھتے ہیں، اُس کا برملا اظہار کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ

دور کے بہت سے ادیب اُن سے ناخوش ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ اُنہوں نے احمد ندیم قاسمی اور ڈاکٹر وزیر آغا جیسے محترم ادیبوں کو بھی خوش رکھنے کی کوشش نہیں کی۔ ایک مرتبہ طاہر مسعود نے اُن سے انٹرویو لیتے ہوئے پوچھا کہ ان دونوں ادیبوں کے درمیان جو اختلافات ہیں، اُن کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔ کہنے لگے: "یہ اختلافات نہیں ہیں، نورا کشتی ہے۔" سیّد صاحب کی اس بات سے اُن لوگوں کو بے حد تکلیف ہوئی جو مذکورہ دونوں محترم ادیبوں کے باہمی اختلافات کو خلوص پر مبنی سمجھتے ہیں۔ ممکن ہے بعض لوگ "نورا کشتی" کی اصطلاح سے واقف نہ ہوں، اُن کی آگاہی کے لیے عرض ہے کہ یہ دکھاوے کی کشتی ہوتی ہے۔ پہلوان پہلے سے طے کر لیتے ہیں کہ کوئی جیتے گا نہ ہارے گا۔ مقابلہ برابر رہے گا۔

سیّد صاحب کی حق گوئی و بے باکی کبھی کبھی دل آزاری کی حد تک پہنچ جاتی ہے۔ کراچی میں ایک شاعر ہیں جو پبلسٹی کے اس حد تک شائق ہیں کہ اخباروں میں اپنے فرضی انٹرویو بھی چھپوا دیتے ہیں۔ یعنی اپنے آپ کو ایک بڑا شاعر تصور کر کے اپنا انٹرویو خود لیتے ہیں۔ یہ صاحب اپنا شعری مجموعہ لے کر سیّد صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ایک مضمون لکھنے کی فرمائش کی۔ سیّد صاحب انھیں ٹالنے کی کوشش کرتے رہے، لیکن یہ حضرت اپنے موقف پر قائم رہے اور یہ دلیل پیش کی: "آپ میر کو پسند کرتے ہیں، میرے کلام میں بھی آپ کو میر کا رنگ ملے گا۔" سیّد صاحب بھلا میر کی شان میں یہ گستاخی کہاں برداشت کر سکتے تھے۔ فرمایا: "میر صاحب اتنے بدرنگ نہیں تھے کہ اُن کی تقلید کی جا سکے۔" موصوف نے کہا: "آپ ایک مرتبہ میرا کلام پڑھ لیجیے، پھر کوئی رائے قائم کیجیے۔" سیّد صاحب نے جواب دیا: "میں نے آپ کی دو چار غزلیں اور دو چار نظمیں ابھی آپ کے سامنے پڑھی ہیں۔ پورا کلام پڑھنا مناسب نہ ہوگا۔ اتنا کافی ہے کہ آپ نے اس کلام کے لکھنے میں ساری زندگی ضائع کر دی، کوئی دوسرا اسے پڑھنے میں دو چار دن بھی کیوں ضائع کرے؟" یہ سُن کر وہ صاحب اتنے ناراض ہوئے کہ اپنا مجموعۂ کلام بھی اٹھا کر لے گئے، حالانکہ کچھ دیر پہلے اُنہوں نے بڑی عقیدت سے سیّد صاحب کا نام لکھ کر ہمیں انھیں پیش کیا تھا۔

یہ اپنی نوعیت کا پہلا واقعہ نہیں ہے۔ آج سے تقریباً تیس برس پہلے سیّد صاحب نے "نقاد کی داستانِ مصیبت" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا، جس میں انھوں نے بتایا تھا کہ نقاد کا ایک ہی مصرف رہ گیا ہے کہ وہ ادیبوں کی فرمائش پر اُن کے بارے میں مضامین لکھتا رہے۔ اس مضمون

میں اُنھوں نے کئی ایسے واقعات بیان کیے تھے، جو اُنھیں پیش آئے تھے۔ ہر موقع پر سیّد صاحب

ع ہزار دام سے نکلا ہوں ایک جنبش میں

کے مصداق سارے ادیبوں کی فرمائش پوری کرنے سے بچتے رہے، لیکن ناصر کاظمی کے سامنے وہ بے دست و پا ہو گئے۔ سیّد صاحب سے ناصر کاظمی کی بہت دوستی تھی۔ ناصر نے اُن سے اپنے مجموعہ کلام "برگِ نَے" کا دیباچہ لکھنے کے لیے کہا۔ سیّد صاحب نے اُسے سمجھایا کہ تمھارے دیوان کو کسی دوسرے کے دیباچے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم ایک توانا شاعر ہو۔ دیباچے تو وہ لکھواتے ہیں، جو کمزور شاعری کرتے ہیں۔" ناصر نے کہا، "ٹھیک ہے، تم دیباچے میں میرے بارے میں کچھ نہ لکھو، شاعری کی ماہیت کے بارے میں چند صفحے لکھ دو۔" یہ فرمائش ایسی تھی کہ سیّد صاحب انکار نہ کر سکے اور اُنھوں نے "اظہارِ نغمہ" کے عنوان سے چند صفحوں کا دیباچہ لکھ دیا۔ کتاب چھپ کر آئی تو دیباچے پر مظفر علی سیّد کی بجائے خود ناصر کاظمی کا نام چھپا ہوا تھا۔ سیّد صاحب کو بڑی حیرت ہوئی۔ اُنھوں نے ناصر سے اس "سہوِ کتاب" کی وجہ پوچھی، تو اُس نے جواب دیا، "مجھے اپنے اوپر پورا پورا اعتماد ہے، اس لیے مجھے اپنے دیوان پر کسی دوسرے کے نام سے دیباچہ چھاپنے کی ضرورت نہیں۔"

اختر الایمان کے بارے میں مظفر علی سیّد بڑی اچھی رائے رکھتے ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ جدید اُردو شاعری صرف فیض اور راشد تک محدود نہیں، بلکہ ایک تیسری آواز بھی ہے جو فیض اور راشد کی آوازوں سے الگ پہچانی جا سکتی ہے اور یہ اختر الایمان کی آواز ہے۔ پچھلے دنوں اختر الایمان کراچی تشریف لائے، تو انجمن ترقی اُردو نے ان کے اعزاز میں ایک جلسہ منعقد کیا اور سیّد صاحب کو مضمون پڑھنے کی دعوت دی جو اُنھوں نے بخوشی قبول کر لی۔ اُنھوں نے ایک بہت اچھا مضمون جلسے میں پڑھا، جس میں اُنھوں نے اختر الایمان کی شاعری کے اوصاف بیان کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہا کہ اختر الایمان کی شاعری کا کُھردراپن بعض اوقات "الفاظ کی بندش یا شعری آہنگ میں لڑکھڑاہٹ پیدا کر دیتا ہے...... یوں تو بڑے سے بڑا شاعر بھی نہ کبھی کوئی فنی الزام لے بیٹھتا ہے، لیکن اختر الایمان کی بعض نظموں میں سامنے کی لڑکھڑاہٹیں کھلنے لگتی ہیں۔ شاید یہ ڈرامائی مکالمت کا لہجہ برقرار رکھنے کی کوشش میں ہوئی ہو، لیکن حادثہ یہ ہے کہ ایسے موقعوں پر مکالمے کے لہجے میں رخنہ پیدا ہو جاتا ہے۔"

اختر الایمان کو یہ بات پسند نہ آئی اور اُنھوں نے بر سرِ جلسہ سیّد صاحب کے اعتراض کو رد کر دیا۔ جلسے میں مضمون پڑھنے سے پہلے سیّد صاحب خوش تھے کہ وہ اپنے عہد کے ایک اہم شاعر کی موجودگی میں اس کے فن کا تنقیدی جائزہ پیش کریں گے، لیکن اختر الایمان کا ردِّعمل جاننے کے بعد اُنھوں نے کہا، شاعر کتنا ہی اہم کیوں نہ ہو، وہ اپنی تعریف کے علاوہ کچھ اور سُننا پسند نہیں کرتا۔ بڑے سرکاری عہدیداروں اور وزیروں کی طرح وہ صرف سپاسنامہ سُننا چاہتا ہے۔ لہٰذا اب سیّد صاحب اپنے مضمون کو "اختر الایمان کی خدمت میں ایک تنقیدی سپاسنامہ" کے عنوان سے شائع کرا رہے ہیں۔

سیّد صاحب کے بارے میں ہم نے اتنا کچھ لکھ دیا اور یہ بتایا ہی نہیں کہ اس کا سبب کیا ہے۔ چند روز ہوئے، سیّد صاحب سے ملاقات ہوئی تو وہ پریشان نظر آ رہے تھے۔ ہم نے وجہ معلوم کی تو فرمایا، "اُردو کے خلاف اگر کوئی ذرا سی بات کہہ دے تو آپ لوگ اخبارات میں بیان جاری کرتے ہیں، احتجاجی جلسے کرتے ہیں، جلوس نکالتے ہیں۔ لیکن اب انگریزی زبان پر بُرا وقت آیا ہے تو آپ لوگ خاموش ہیں۔" ہم نے عرض کیا، "یہ آپ کیسے کہہ رہے ہیں۔ اُردو کے مقابلے پر ہمارے ملک میں انگریزی کو بہت اونچا مقام حاصل ہے۔ عملاً ہماری سرکاری و قومی زبان انگریزی ہے۔ اُردو کا تو صرف نام بدنام ہے۔ ایسی صورت میں انگریزی پر بُرا وقت کیسے آ سکتا ہے؟"

اس کے جواب میں اُنھوں نے فرمایا، "بُرا وقت آ چکا ہے، کیونکہ انتظار حسین نے انگریزی میں کالم نگاری شروع کر دی ہے۔"

(۷ر دسمبر ۱۹۸۹ء)

جوش صاحب بڑے شاعر ہی نہیں بڑے مکتوب نگار بھی ہیں

مولانا کوثر نیازی کی کتاب ''جنھیں میں نے دیکھا'' پر ہم نے جو کالم لکھا تھا، اس میں جوش صاحب کے ایک خط بنام مولانا کوثر نیازی پر حاشیہ آرائی کرتے ہوئے عرض کیا تھا: ''جوش صاحب کا زندگی بھر یہ معمول رہا کہ وہ اپنے کام نکلوانے کے لیے اسی قسم کے خطوط لکھتے تھے۔ جوش صاحب اور سر راس مسعود کی خط و کتابت جن لوگوں کی نظر سے گزری ہے، وہ جوش صاحب کے اس اسلوب خاص سے واقف ہوں گے......'' اس سلسلے میں ہمارے ایک غائبانہ کرم فرما اکبر عباس رضوی صاحب (کراچی) اپنے گرامی نامے میں تحریر فرماتے ہیں: ''جہاں تک مجھے معلوم ہے حضرت جوش کے سر راس مسعود سے کبھی تعلقات نہیں رہے...... جوش صاحب نے ''یادوں کی برات'' میں بے شمار جاننے والوں کا ذکر کیا ہے، لیکن راس مسعود کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ اگر دونوں میں تعلقات ہوتے تو جوش صاحب اتنی بڑی شخصیت کو کبھی نظر انداز نہ کرتے۔ کئی رسالوں کے جوش نمبر شائع ہوئے ہیں۔ یہ سب میری نظر سے گزرے ہیں، کسی نمبر میں بھی جوش اور راس مسعود کے تعلقات کا حوالہ نہیں ملتا۔ اس صورت میں دونوں کی خط و کتابت کا جو آپ نے ذکر کیا ہے، وہ کہیں کسی غلط فہمی کی بنا پر تو نہیں ہے؟ اگر آپ ''تکبیر'' ہی میں اس کی وضاحت کر دیں تو میری طرح بہت سے قارئین کو صحیح صورت حال معلوم ہو جائے گی۔''

گزارش ہے کہ ہم نے کوئی من گھڑت بات نہیں لکھی تھی۔ جوش اور سر راس مسعود کے درمیان جو خط و کتابت ہوئی تھی، وہ شائع ہو چکی ہے۔ جوش صاحب کے اصل خطوط اور راس مسعود کے جوابات کی نقلیں بزرگ ادیب جناب جلیل قدوائی کے پاس موجود ہیں اور وہ انھیں دو مرتبہ چھپوا چکے ہیں۔ ایک مرتبہ انجمن ترقی اردو کے رسالے ''قومی زبان'' میں اور دوسری مرتبہ راس

مسعود سوسائٹی کی طرف سے شائع کردہ ایک کتاب میں۔ ان دونوں مطبوعات کی اشاعت چونکہ ایک محدود حلقے تک رہی اس لیے عام ادبی حلقوں میں ان خطوں کی شہرت کچھ زیادہ نہ ہو سکی۔

یہ خیال درست نہیں کہ ''یادوں کی برات'' میں راس مسعود کا ذکر نہیں ملتا۔ جوش صاحب نے دیگر شخصیات کی طرح راس مسعود پر الگ باب نہیں لکھا، لیکن حیدر آباد دکن میں ملازمت حاصل کرنے کے ضمن میں تین جگہ ان کا نام لیا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ انھیں اچھے لفظوں میں یاد نہیں کیا۔ جوش صاحب کو حیدر آباد دکن میں ملازمت دلانے میں اور لوگوں کے ساتھ راس مسعود کا ہاتھ تھا۔ لیکن حیدر آباد چھوڑنے کے بعد جوش صاحب ایک خاص وجہ سے، جس کا ذکر آگے آئے گا، راس مسعود کو ناپسند کرنے لگے تھے۔ اسی ناپسندیدگی کا اظہار ''یادوں کی برات'' میں ملتا ہے۔ جوش صاحب نے لکھا ہے کہ مہاراجہ کشن پرشاد شاد کے کہنے پر سر راس مسعود نے انھیں سر اکبر حیدری سے ملوایا تھا، لیکن ان دونوں نے جوش صاحب کی ''حق گوئی و بے باکی'' کی وجہ سے ملازمت کے حصول میں ان کی کوئی مدد نہ کی۔

سر راس مسعود کا یہ قاعدہ تھا کہ ان کے نام شاعروں ادیبوں کے جو خطوط آتے تھے، وہ انھیں محفوظ رکھتے تھے۔ جواب میں جو کچھ لکھتے تھے، اس کی نقل بھی اپنے پاس رکھ لیتے تھے۔ راس مسعود کے ذاتی کاغذات کا بڑا حصہ جناب جلیل قدوائی کے پاس محفوظ ہے۔ ہماری درخواست پر قدوائی صاحب نے جوش صاحب کے اصل خطوط اور اُن کے جوابات سے استفادہ کرنے کی اجازت دی جس کے لیے ہم ان کے شکر گزار ہیں۔

اس مراسلت کا پس منظر یہ ہے کہ حیدر آباد دکن سے اخراج کے بعد جوش صاحب کے مالی حالات اچھے نہ رہے۔ سر راس مسعود اس زمانے میں ریاست بھوپال میں تھے۔ جوش صاحب نے انھیں مالی امداد کے لیے خط لکھا۔ راس مسعود نے اس خط کا حوصلہ افزا جواب دیا۔ جوش صاحب نے ''جواب الجواب'' ۱۵/ اکتوبر ۱۹۳۵ء کو لکھا، جب وہ مختصر قیام کے لیے ریاست دھول پور میں تشریف رکھتے تھے۔ اس خط میں جوش صاحب فرماتے ہیں:

''آپ کے مکتوب گرامی نے میرے دل سے وہی سلوک کیا ہے، جو مرہم زخم سے اور ابر برشگال پیاسی زمین سے کرتا ہے۔ نتیجہ خواہ کچھ ہو کہ نہ ہو، آپ میری دستگیری کی سعی میں کامیاب ہوں یا ناکام، مگر یہ کیا کم ہے کہ آپ نے میری بات تو

پوچھی، امداد پر آمادگی تو ظاہر فرمائی، مشفقانہ لہجے میں خط کا جواب تو دیا۔ کیا میرے تاحیات احسان مند رہنے کے لیے یہ کافی نہیں ہے؟ اپنی حالت کیا عرض کروں، اگر تنہا ہوتا تو بڑی سے بڑی مصیبت کا حقارت آمیز تبسم سے خیر مقدم کرتا اور ہر عظیم سے عظیم بلا کے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مضحکہ اڑاتا۔ مگر کیا کروں مجبور ہوں اہل وعیال سے۔ باپ نے، جب میں نو برس کا تھا، میرا نکاح کر دیا تھا۔ انھیں کیا معلوم تھا کہ ان کی آنکھیں بند ہوتے ہی تمام دولت و ثروت ان کے گھر سے چلی جائے گی۔ مجھے آج تک اپنے سہرے کی لڑیوں کی خوشبو یاد ہے، کتنی دلفریب تھی، مگر آج وہی ذریعہ بنی ہوئی ہے میری پریشان خاطری کا۔

میرے محترم! مصیبت کبھی تنہا نہیں آتی۔ آبائی جائیداد تو پہلے ہی تلف ہو چکی تھی، اس کے بعد جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، حیدر آباد میں جگہ مل گئی تھی۔ سو وہ بھی سازشوں کی نذر ہو گئی۔ اب میں ہوں اور بے کسی، میرے مریض اہل وعیال ہیں اور کسمپرسی۔ ڈھول پور میں اپنے ماموں کے وہاں پڑا ہوا ہوں۔ ماموں سوتیلے نہیں حقیقی ہیں۔ لیکن جس طرح جی رہا ہوں، اس سے موت بہتر ہے۔ واضح رہے کہ ماموں جان کی آمدنی ڈھائی ہزار روپے ماہوار ہے، کیا آپ کو عبرت نہیں ہوگی؟ میں آپ کو زیادہ زحمت دینا نہیں چاہتا، صرف اس قدر درخواست کرتا ہوں کہ بھوپال وغیرہ سے میرے رسالے کے واسطے اتنی مدد کرا دیجیے کہ میں فراغت سے زندگی بسر کر سکوں۔ رسالے کے اخراجات پانچ سو روپے ماہوار سے کم نہیں ہیں۔ سر لیاقت حیات خان وزیر پٹیالہ نے پٹیالے سے ایک مستقل ماہانہ امداد کا وعدہ فرما لیا ہے۔ پنڈت کیلاش نرائن صاحب ہاکسر بھی گوالیار سے امداد دینے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ اگر بھوپال یا دو تین جگہیں اور ملا کر آپ ڈھائی سو روپے ماہوار کی مستقل ادبی امداد کا بندوبست کر دیں تو میرے مصائب کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔ کیا آپ ایسا کر سکیں گے؟ میں ایک بار اور عرض کروں کہ میرے تمام عمر احسان مند رہنے کے واسطے آپ کی پرسش ہی بہت کافی ہے۔ کیا ایک محبت کی نگاہ، تمام دنیا کے خزانوں پر بھاری نہیں، اور کیا ایک مخلصانہ تبسم، تمام عالم کے

زر و گوہر سے زیادہ گراں قیمت نہیں؟ خدا کرے آپ اچھے ہوں، میں اور میرے متعلقین میں سے کوئی بھی اچھا نہیں۔ معتوبِ قدرت۔ جوش۔"

سر راس مسعود نے ۱۷ر اکتوبر ۱۹۳۵ء کو اس خط کا جواب لکھا اور ہر ممکن امداد کا وعدہ کیا۔ اس کے بعد سال بھر کی مراسلت محترم جلیل قدوائی صاحب کے پاس نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ اس دوران میں سر راس مسعود نے ضرور کچھ نہ کچھ امداد کی ہوگی، ورنہ ۲۰ر دسمبر ۱۹۳۵ء کو جوش صاحب اپنے رسالے "کلیم" کی مدد کے لیے خط نہ لکھتے۔ اس خط کے ساتھ جوش صاحب نے "کلیم" کا ایک شمارہ بھی بھیجا اور اس رسالے کی توسیع اشاعت کی درخواست کرتے ہوئے لکھا: "۱۔ کیا آپ اپنے محکمے میں کچھ پرچے خرید سکتے ہیں؟...... ۲۔ دوسری ریاستوں کو توجہ دلا سکتے ہیں؟...... ۳۔ دیگر احباب کو خطوط لکھ کر براہ بندہ نوازی مجھے روانہ فرما سکتے ہیں؟"

سر راس مسعود نے اس کے جواب میں وعدہ کیا کہ وہ رسالے کے سلسلے میں مدد کریں گے اور ساتھ ہی یہ بھی لکھا، "(رسالے) میں جو آپ نے تصاویر شائع کی ہیں، وہ کم سے کم مجھے مناسب معلوم نہیں ہوتیں۔ آرٹ میں اور ننگ میں زمین و آسمان کا فرق ہونا چاہیے۔ اور اگر آپ نے احتیاط شروع ہی سے نہ کی تو آپ کسی قسم کی کوئی خصوصیت آرٹ کے لحاظ سے اپنے رسالے میں پیدا نہ کر سکیں گے۔ جہاں تک ہو، لاہور کے رسالوں کی نقالی نہ کیجیے۔"

اس کے بعد خط و کتابت میں پھر تقریباً ایک سال کا وقفہ ہے۔ راس مسعود نے مدد کر دی ہو گی، اس لیے جوش صاحب نے مراسلت موقوف کر دی۔ ۳۰ر اکتوبر ۱۹۳۶ء کو ایک مرتبہ پھر جوش صاحب نے خط و کتابت کا آغاز کیا اور یہ خط لکھا:

"اخی محترم۔ اگر میرے حالات غیر متوقع طور پر یکایک انتہائی نازک صورت اختیار نہ کر لیتے اور معاملات کی نوعیت دفعۃً خطرناک نہ ہو جاتی، تو میں ہرگز آپ کی خدمت میں یہ تحریر نہ روانہ کرتا۔ مصیبت، ایک دن کا بھی نوٹس دیے بغیر، مجھ پر اس طرح اچانک طور سے نازل ہو گئی ہے کہ اگر کسی فوری امداد نے مجھے نہ سنبھال لیا تو...... ۱۔ میرا پرچہ پلک جھپکتے ہی بند ہو جائے گا...... ۲۔ جن چندوں کی میعادیں باقی ہیں، وہ میری روح پر ایک ابدی عذاب بن کر طاری ہو جائیں گے اور میں تاحیات شرم سے آنکھیں نہ اٹھا سکوں گا...... ۳۔ اور سب سے بڑھ کر یہ

کہ زندگی میں کوئی مستقبل باقی نہیں رہے گا۔

مصائب تو اس نامراد زندگی میں ہر آن نازل ہوا کرتے ہیں، مگر ایک ایسی ہولناک مصیبت دفعتاً یکایک نازل ہو جانا، جس کا ایک روز پیشتر تک گمان بھی نہ ہو، مصیبت نہیں موت ہوا کرتا ہے۔

مصائب اور تھے پر دل کا جانا

عجب اک سانحہ سا ہو گیا ہے

اس وقت میرے سامنے اپنی فلاح و بہبود اور ترقی کا نہیں بلکہ اپنی عزت و حرمت اور مستقبل کا سوال پیش ہے۔ اگر آپ کے نزدیک میری عزت اور میرا مستقبل کوئی معنی رکھتا ہے تو براہِ اخوت و کرم جلد خبر لیجیے۔ ورنہ

ع پس ازاں کہ من نمانم بچہ کار خواہی آمد!"

اس کے جواب میں ۲۳؍ نومبر ۱۹۳۶ء کو سر راس مسعود نے لکھا:

"یہ پڑھ کر بے حد افسوس ہوا کہ آپ کی عزت، حرمت اور مستقبل خطرے میں ہیں، لیکن چونکہ اور کچھ آپ نے نہیں لکھا تو میں یہ نہ سمجھ سکا کہ ایسا کیوں ہوا۔ یہ تو آپ نے تحریر فرمایا کہ آپ کو فوری امداد کی بے حد ضرورت ہے، لیکن یہ نہیں لکھا کہ کس قسم کی امداد کی آپ کو ضرورت ہے۔ آپ کے عنایت نامہ کو میں نے دوبارہ پڑھا، لیکن پھر بھی اس کے سمجھنے سے قاصر رہا کہ اصل صورتِ حال کیا ہے۔ آپ مجھے صاف صاف لکھیے تاکہ میں کوئی رائے قائم کر سکوں کہ آپ کے واسطے کیا کیا جا سکتا ہے۔"

جوش صاحب نے ۲۸؍ نومبر ۱۹۳۶ء کو اس خط کا یہ جواب لکھا:

"اخی محترم۔ کل لکھنؤ سے سولھویں دن واپس آ کر آپ کا مکتوب گرامی ملا۔ ہم نامراد لوگوں کا حال بچوں کا سا ہے۔ جب تک ہم بھوکے نہیں ہوتے، کھیل کود میں مصروف رہتے ہیں اور دین و دنیا کی پروا نہیں کرتے۔ لیکن بھوک لگتے ہی رونے لگتے ہیں۔ میرے خط کا مفہوم آپ اسی بناء پر نہیں سمجھ سکے کہ وہ خط نہ تھا بلکہ بچے کا بھوک میں رونا تھا۔ اب مختصراً میرا حال سنیے۔ "کلیم" میں جو صاحب

شریک تھے، بوجوہ ان کی شرکت ختم ہو گئی ہے اور ان کا مجھ پر پانچ ہزار کا مطالبہ نکلا ہے۔ اگر آپ اس مطالبے یا اس کے کسی حصے کے ادا کرنے میں میری مدد فرما سکتے ہوں، تو براہِ اخوت و کرم تاخیر نہ فرمائیں، ورنہ میرا رسالہ بند ہو جائے گا اور میں دنیا کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہوں گا۔ اس کے علاوہ میری آپ کی خدمت میں یہ بھی درخواست ہے کہ براہِ بندہ نوازی بھوپال یا بھوپال کے ساتھ دو ایک اور ریاستوں کو ملا کر ڈیڑھ سو روپے میری ماہانہ ادبی پنشن مقرر کرا دیجیے تاکہ میں پبلشروں اور ناشروں کے رحم و کرم پر زندگی بسر کرنے کی درماندگی سے نجات حاصل کر لوں۔

مجھے معلوم ہے کہ آپ نے دوسروں کے ساتھ بہت کچھ کیا ہے، اور میرا عقیدہ ہے کہ اگر آپ دل پر رکھ لیں گے، تو میری پنشن بھی مقرر کرا سکتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ آپ میری درخواست کو درخورِ اعتنا نہ سمجھ کر معذرت فرما دیں۔ میں زیادہ خامہ فرسائی کرتے ہوئے شرماتا ہوں، صرف اس قدر لکھنے پر اکتفا کروں گا کہ میرے حالات خوفناک حد تک نازک ہو چکے ہیں، اور اگر آپ نے خدانخواستہ توجہ نہ فرمائی تو میری اور میرے اہل و عیال کی حالت سن کر آپ ہمیشہ رنج کرتے رہیں گے۔

تھوڑی سی زندگی تھی بہرطور کٹ گئی

تم کو جو ہم پہ رحم نہ آیا تو کیا ہوا

میری پالی پوسی بچی کو ایک برس سے بخار آ رہا ہے۔ میں کم بخت اس کا علاج بھی نہیں کر سکتا ہوں۔

آپ کا جوش"

سر راس مسعود نے اس خط کا جواب نہیں دیا۔ وجہ ظاہر ہے کہ جوش صاحب نے گھر دیکھ لیا تھا، آئے دن کے مطالبات سے راس مسعود صاحب تنگ آ گئے ہوں گے۔ راس مسعود کی خاموشی کو جوش صاحب نے اپنے شاعرانہ وقار کے منافی سمجھا اور غصے کے عالم میں ۱۲؍ دسمبر ۱۹۳۶ء کو یہ خط لکھا:

"اخی محترم! دنیاوی مراتب کا تفاوت بھی عجیب شے ہے۔ اپنے سے پست مرتبہ رکھنے والے کے خط کا جواب نہ دینا بھی ایک وقار آمیز امر سمجھا جاتا ہے۔ مجھے یہ خیال تھا کہ آپ میری حالت سن کر ضرور میری امداد فرمائیں گے۔ یہ کیا جانتا تھا کہ میری درخواست کو درخورِ اعتنا بھی نہ سمجھیں گے۔ صاحبِ احتیاج کو نگاہِ کم سے نہ دیکھنا چاہیے۔ احتیاج سے خالی کون ہے؟ ایک پَل میں بڑے بڑے صاحبانِ تاج و تخت محتاج ہو جاتے ہیں، اور ایک لمحے کے اندر کروڑ پتی بھیک مانگنے لگتے ہیں۔ نواب مسعود بہادر جنگ! زمانے کو آنکھ پھیرنے میں نہ دیر لگتی ہے نہ زحمت ہوتی ہے۔ کل کی بات ہے کہ میرے باپ دادا بھی "نواب" اور "جنگ" و "بہادر" تھے۔ آج میں آپ کی خدمت میں امداد کے واسطے خطوں پر خط لکھتا ہوں، آپ پروا بھی نہیں کرتے، آدمی کو ہر وقت ڈرتے رہنا چاہیے۔ اس دنیا میں کتنے لوگ رات کو بادشاہ کی صورت سے سوتے ہیں اور صبح کو گداگر کی حیثیت سے بیدار ہوتے ہیں۔

نازکم کن کہ دراین باغ کے چوں تو شگفت

آپ کی نظروں میں صرف ایک صاحبِ حاجت۔

نیاز مند

جوش"

۲۰ دسمبر ۱۹۳۶ء کو سر راس مسعود نے اس خط کا یہ جواب دیا:

"مکرمی جناب جوش صاحب۔ تسلیم۔ آپ کے دونوں خط یعنی مورخہ ۲۸ نومبر و ۱۲ دسمبر ۱۹۳۶ء بھوپال واپس آنے پر ملے۔ آخرالذکر خط کو پڑھ کر اور آپ کی طرزِ تحریر دیکھ کر میرے دل کو رنج ہوا۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے آپ کے ساتھ یا کسی اور کے ساتھ کبھی کوئی بدتمیزی کا برتاؤ کیا ہو...... اگر یہ امر آپ کے پیشِ نظر رہتا تو آپ یہ سمجھ جاتے کہ کوئی خاص وجہ ہوگی کہ آپ کے خط کے جواب میں اتنی تاخیر لگی اور آپ مجھ کو وہ دھمکیاں نہ لکھتے، جو آپ نے اپنے ۱۲ دسمبر والے خط میں لکھی ہیں اور جنھیں پڑھ کر میرے اس خیال میں بے حد

تبدیلی ہوگئی، جو کہ آپ کی نسبت میں رکھتا تھا۔ میں نہ صاحبِ دولت ہوں، نہ اس ریاست کے خزانے کا مالک کہ آپ کے پاس پانچ ہزار روپیہ کی رقم روانہ کر سکوں تاکہ آپ اپنے قرضے سے نجات پائیں۔ آپ کے معاملے کو میں اعلیٰ حضرت فرماں روائے بھوپال کے حضور پیش کر چکا اور جو جواب ملا اس سے آپ کو اپنے خط مورخہ ۱۱ نومبر ۱۹۳۵ء کے ذریعے مطلع کر چکا۔ کوئی اور تدبیر آپ کی مدد کے لیے میری سمجھ میں نہیں آتی۔

خاکسار

راس مسعود"

اس کے جواب میں جوش صاحب نے ۳ جنوری ۱۹۳۷ء کو یہ خط لکھا اور اس کے ساتھ ہی یہ خط و کتابت ختم ہوگئی۔

"محترمی۔ آپ فرماتے ہیں میں نے اپنے خط میں آپ کو "دھمکی" دی ہے۔ اگر آپ غور فرمائیں گے تو یہ باآسانی آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ جس شے کو آپ "دھمکی" کا لقب دے رہے ہیں، وہ "دھمکی" نہیں ہے، بلکہ اسے عبرت دلانے کے سوا اور کچھ کہا ہی نہیں جا سکتا۔ اس کے بعد آپ نہایت تلخ لہجے میں فرماتے ہیں کہ بھوپال کا خزانہ میرے قبضہ میں نہیں ہے کہ آپ کا قرض ادا کر دوں۔ اگر آپ تھوڑا سا غور فرماتے تو اس مفہوم کو بہتر اور نرم الفاظ میں بھی ادا کر سکتے تھے۔ صاحبِ حاجت کو جھڑک دینا کسی شریعت میں بھی روا نہیں رکھا گیا ہے۔

آخر میں آپ تحریر فرماتے ہیں کہ اب آپ کی میرے متعلق رائے بدل گئی ہے۔ میرے نزدیک یہ کوئی نادر بات نہیں۔ راست گفتار کی ہر شخص برداشت نہیں کر سکتا۔ "حق" کڑوا ہوتا ہے۔ اگر آپ کا ذائقہ بھی خراب ہو گیا ہو، تو کون سی تعجب کی بات ہے، اس سے پیشتر جب کہ آپ میرے متعلق اچھی رائے رکھتے تھے، اس وقت آپ نے میرے ساتھ کون سا اچھا سلوک کیا تھا کہ اب تبدیلیٔ رائے کا افسوس ہو۔ میں آپ کی خدمت میں یہ اطلاع پہنچا دینا چاہتا ہوں کہ میرا قرض ادا ہو گیا اور اس کے ساتھ ایک ریاست سے میرا ادبی وظیفہ بھی جاری

ہو گیا۔ اس سے آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ بھوپال کے خزانے اور سر راس مسعود کی ہمدردی کے بغیر بھی لوگوں کا کام چل سکتا ہے اور ابھی دنیا ہمدرد افراد سے خالی نہیں ہوگئی ہے۔

ع تم کو جو ہم پہ رحم نہ آیا تو کیا ہوا

نیاز مند

جوشؔ"

اس خط و کتابت سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جوش صاحب نے "یادوں کی برات" میں سر راس مسعود کا ذکر اچھے لفظوں میں کیوں نہیں کیا۔

(۲۷ جولائی ۱۹۸۹ء)

انگریزی زبان پر بُرا وقت آگیا ہے

پچھلے ہفتے ہم نے مظفر علی سیّد کے حوالے سے انتظار حسین کی انگریزی کالم نگاری کا ذکر کیا تھا۔ سیّد صاحب نے ازراہِ کرم کچھ کالموں کے تراشے بھی عنایت فرمائے تھے جنھیں پڑھ کر ہم سیّد صاحب کی اس رائے سے متفق نہیں ہیں کہ انگریزی زبان پر بُرا وقت آگیا ہے۔ اس لیے کہ انتظار حسین کی انگریزی، اُردو کے اُن بہت سے ادیبوں کی انگریزی سے اچھی ہے، جو اپنے منھ کا مزا بدلنے اور قارئین کے منھ کا مزا خراب کرنے کے لیے انگریزی میں جولانیٔ طبع کا اظہار کرتے ہیں۔

پرانے زمانے میں جب کوئی شاعر دلّی یا لکھنؤ سے دور رہ کر شعر کہتا تھا، تو اس کی تعریف یوں کی جاتی تھی کہ زبان کے مرکز سے دور ہونے کے باوجود وہ صحتِ زبان کا خیال رکھتا ہے۔ یہی بات ہم انتظار حسین کے بارے میں بھی کہہ سکتے ہیں۔ گو پچھلے سال وہ مرکزِ زبان یعنی انگلستان کی سیر کر آئے ہیں، لیکن وہاں اُن کی زیادہ تر ملاقاتیں ساقی فاروقی اور افتخار عارف وغیرہ سے ہوئیں۔ اس لیے اُن کی انگریزی پر کیا اچھا اثر پڑا ہوگا، اُردو ہی پر ناخوشگوار اثرات مرتّب ہوئے ہوں گے۔

اس وقت ہمارے سامنے انتظار حسین کے جو چند انگریزی کالم ہیں، انھیں پڑھ کر ہمیں ان کے اُردو کالم یاد آگئے۔ وہی خوب صورت اُسلوب، وہی بات کرنے کا دھیما اور میٹھا لہجہ اور وہی تبسّم زیرِ لب۔ ہر کالم میں کسی اہم مسئلے پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ مثلاً ایک کالم میں انھوں نے اس پر حیرت کا اظہار کیا ہے کہ اس سال یومِ آزادی پر حکومت نے ادب کے حوالے سے شعیب سلطان نامی جس شخص کو تمغائے حسنِ کارکردگی عطا کیا ہے، وہ کون ہے؟ ادب کا قومی اعزاز تو اس شخص کو ملنا چاہیے جس کے ادبی کاموں سے سب لوگ واقف ہوں اور جس کی عمر بھر کی کارکردگی سب کے سامنے ہو۔ انتظار حسین نے یہ بھی لکھا ہے کہ شعیب سلطان کا نام مظفر علی سیّد نے بھی نہیں سنا، حالانکہ وہ ادب کا چلتا پھرتا انسائیکلوپیڈیا ہیں۔ اس کالم کے ساتھ مظفر علی سیّد کی ایک بڑی سی تصویر

بھی چھاپ دی گئی ہے، جس میں وہ متفکرانہ انداز میں بیٹھے ہیں، جیسے سوچ رہے ہوں کہ شعیب سلطان کون ہے اور اسے تمغائے حُسنِ کارکردگی کیوں اور کیسے ملا؟

ہمارے خیال میں انتظار حسین اور مظفر علی سیّد اس بات پر ناحق پریشان ہو رہے ہیں کہ حکومت نے کسی ایسے شخص کو ادب کا سب سے بڑا قومی اعزاز کیوں دیا ہے، جس کے ادبی کارناموں سے کوئی واقف نہیں۔ ہماری حکومت عوامی اور جمہوری حکومت ہے۔ وہ ماضی کے ساتھ ساتھ اہلِ ملک کے مستقبل پر بھی نگاہ رکھتی ہے۔ اسے معلوم ہے کہ ماضی میں کس نے کیا کام کیا اور مستقبل میں کون کیا کرے گا۔ ہوسکتا ہے کہ حکومت نے مذکورہ "ادیب" کو اس توقع پر قومی اعزاز کا مستحق سمجھا ہو کہ وہ آگے چل کر ادب میں قابلِ قدر اضافے کرے گا۔ جب انجمن ترقی پسند مصنّفین کی گولڈن برسی میں ایسے لوگ بطور ادیب شامل ہوسکتے ہیں، جنھوں نے زندگی میں کبھی کچھ نہیں لکھا اور اُن سے آئندہ کی بھی کوئی امید نہیں، تو ایک ترقی پسند حکومت اُن لوگوں کو کیوں نہیں نواز سکتی، جن کی ادبی صلاحتیں مستقبل میں ظاہر ہونے کی توقع ہو۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ حکومت نے تمغائے حُسنِ کارکردگی پیشگی عطا کر کے ادب نوازی اور مستقبل بینی کی ایک شاندار روایت قائم کی ہے۔ جس کے لیے وہ خود تمغائے حُسنِ کارکردگی کی مستحق ہے۔

انتظار حسین نے ایک کالم اس موضوع پر بھی لکھا ہے کہ اُردو والے ہمیشہ کسی نہ کسی مغربی ادیب کو اپنا ہیرو بنانے کی فکر میں رہتے ہیں اور اٹھتے بیٹھتے اس کا ذکر کرنا فیشن میں داخل ہو جاتا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ اُردو والوں پر آسکر وائلڈ چھایا ہوا تھا۔ رومانی شاعری کرنے والے اور انشائے لطیف لکھنے والے آسکر وائلڈ کو دیوتا مانتے تھے۔ اس کے بعد ٹی ایس ایلیٹ کی قسمت کا ستارہ چمکا۔ اُس کی شاعری اور تنقید کا حوالہ سکۂ رائج الوقت بن گیا۔ اُردو شاعروں پر ٹی ایس ایلیٹ کی نظم "ویسٹ لینڈ" کا اتنا اثر ہوا کہ جدید اُردو شاعری کا بڑا حصہ "ویسٹ لینڈ" نظر آنے لگا۔ اس کے بعد ژاں پال سارتر جلوہ گر ہوا اور اُردو والے اُس کی وجودیت کے سیلاب میں خس و خاشاک کی طرح بہہ گئے۔ سارتر کا فیشن ایک عرصے تک رہا اور پھر کوئی ہیرو نمودار نہ ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ محمد حسن عسکری ہمارے درمیان نہیں رہے تھے، اس لیے کوئی یہ بتانے والا نہ تھا کہ مغرب میں کون کون سا رجحان ساز ادیب سرگرمِ عمل ہے۔ عسکری صاحب کی وفات کے دس برس بعد اب نئی نسل نے خود ہی ایک ہیرو تلاش کر لیا ہے اور وہ چیکوسلواکیہ کا ناول نگار اور افسانہ نویس میلان

کنڈیرا ہے، جو آج کل فرانس میں خود عائد کردہ جلاوطنی کی زندگی گزار رہا ہے۔

پچھلے دنوں انتظار حسین لندن گئے تو اُردو مرکز میں افتخار عارف نے اُن سے پوچھا، "آپ نے کنڈیرا کو پڑھا ہے؟" انتظار حسین نے کہا کہ ہاں تھوڑا بہت۔ یہ سُن کر افتخار عارف اپنے دفتر کے قریب کی کتابوں کی ایک دوکان پر گئے اور کنڈیرا کی کتابیں خرید کر لے آئے اور مہمانِ عزیز کو پیش کیں۔ انتظار حسین جب لندن سے لاہور واپس آئے تو زاہد ڈار نے اُن سے پہلا سوال یہ کیا، "آپ کنڈیرا کی کتابیں لائے ہیں؟" انتظار حسین نے اثبات میں جواب دیا، تو زاہد ڈار اتنے خوش ہوئے کہ انھوں نے زندگی میں پہلی مرتبہ انتظار حسین کو سچا اور کھرا فکشن رائٹر مان لیا۔

انتظار حسین کے کالم کا آزاد، بلکہ کچھ زیادہ ہی آزاد ترجمہ ختم ہوا۔ ہماری گزارش ہے کہ محض مذکورہ واقعات کی وجہ سے کنڈیرا کو اُردو والوں کا نیا ہیرو مان لینا بڑی زیادتی ہے۔ زاہد ڈار سے متعلق واقعے سے ہرگز کنڈیرا کی مقبولیت ظاہر نہیں ہوتی، صرف زاہد ڈار کے ذہین ہونے کا پتہ چلتا ہے کہ اس نے کنڈیرا کی کتابیں ہتھیانے کے لیے انتظار حسین کو پہلی مرتبہ سچا اور کھرا فکشن رائٹر مانا۔ اگر انتظار حسین نے یہ کتابیں واپس لے لیں، تو زاہد ڈار بھی اپنی رائے واپس لے لیں گے۔

افتخار عارف سے متعلق واقعے سے بھی کنڈیرا کی مقبولیت نہیں، خود افتخار عارف کی کشادہ دلی ثابت ہوتی ہے کہ اب وہ اپنے دیوان کے علاوہ دوسرے مصنفوں کی کتابیں بھی مہمانوں کو تحفے میں دینے لگے ہیں۔ ظاہر ہے اگر کوئی مصنف اپنے سے بہتر کسی مصنف کی کتابیں تحفے میں نہیں دے سکتا۔ لہٰذا یہ ماننا ہی پڑتا ہے کہ کنڈیرا، افتخار عارف سے کم درجے کا مصنف ہے۔ اُردو والے اگر کسی مغربی مصنف کو اپنا ہیرو بنانا ہی چاہتے ہیں، تو وہ ہرگز کوئی ایسا شخص نہیں ہوسکتا جو افتخار عارف سے کم درجے کا ہو، بلکہ ہمارا خیال تو یہ ہے کہ افتخار عارف ہی کو ہمیں بطور مغربی ہیرو قبول کر لینا چاہیے۔ وہ ایک طویل عرصے سے انگلستان میں مقیم ہیں۔ اس لیے اب ان کا شمار اہلِ مغرب میں ہوتا ہے۔ دوسری اور بڑی وجہ یہ ہے کہ اُن کے کلام کا انگریزی ترجمہ کتابی صورت میں شائع ہوگیا ہے، جس کی بناء پر مغربی ادیب اُنھیں اپنی برادری کا رُکن سمجھتے ہیں۔ سنا ہے کہ جناب عبدالعزیز خالد نے افتخار عارف کے کلام کے انگریزی متن کو اُردو میں منتقل کرنا شروع کر دیا ہے۔ جناب خالد کئی مغربی شاعروں کے منظوم اُردو تراجم پیش کر چکے ہیں۔

افتخار عارف کا کلام جب انگریزی متن کے مطابق اردو میں منتقل ہوگا تو تب ہمیں صحیح اندازہ ہوگا کہ وہ کتنے بڑے شاعر ہیں۔

افتخار عارف کا ذکر چلا ہے تو یہ بتا دینا نامناسب نہ ہوگا کہ آج کل اخبارات میں اُن کا خاصا چرچا ہو رہا ہے۔ انتظار حسین کے بعد جمیل الدین عالی نے بھی اپنے کالم میں ان کا ذکر کیا ہے۔ افتخار عارف کے کلام کے انگریزی ترجمے کا تذکرہ کرتے ہوئے عالی صاحب لکھتے ہیں:

> ''کتاب دیکھ کر جی خوش ہوگیا۔ انگریزی داں طبقے کی کوئی تعداد تو دیکھ سکے گی کہ آج کا اُردو شاعر اُن کے بہت سے مشاہیر حاضرہ سے کسی طرح کمتر نہیں سوچتا۔ افتخار عارف کی ادبی سیاست ایک الگ حقیقت یا مجبوری اور الگ موضوع ہے۔ بہر حال میں اُسے ناپسند کرتا ہوں، مگر ان کی جو شاعری پسند آئے اُس پر قلم سے یا مشاعرے اور محفل میں کھل کر داد دینے سے گریز نہیں کرتا (جب کہ وسیع احباب تک خست برت جاتے ہیں)۔ مجھے آج تک اُن کے اُردو مرکز سے کوئی رابطہ نہیں رہا۔ اُن سے انسیت پرانی ہے، جو اپنے بارے میں بار بار اُن کے اقول زریں پہنچنے کے باوجود کم نہیں ہوتی۔ نہ اُن کی خوش گوئی کے بارے میں رائے بدلتی ہے۔''

یہ بیان عالی صاحب کی عالی ظرفی کی دلیل ہے۔ انھوں نے اپنے ایک جونیئر معاصر کی جس طرح حوصلہ افزائی کی ہے، وہ انھی کا حصہ ہے۔ انھوں نے ایک طرف انگریزی داں طبقے کے بہت سے ''مشاہیر حاضرہ'' کی ناراضی کا خطرہ مول لے کر عارف افتخار کو اُن کے برابر لا بٹھایا ہے اور دوسری طرف موصوف کو مشاعروں میں کھل کر داد دینے اور آئندہ بھی دیتے رہنے کا ارادہ ظاہر کر کے مشاعروں کی حد تک عارف افتخار کے شاعرانہ مستقبل کو روشن کر دیا ہے۔ تاہم ہمارا ناقص خیال یہ ہے کہ افتخار عارف کو داد دے کر عالی صاحب اُن کے ساتھ کوئی بھلائی نہیں کریں گے، کیونکہ جس مشاعرے میں عالی صاحب داد دینے میں مصروف ہوں گے، وہاں افتخار عارف کا کلام کوئی نہیں سنے گا، سب کی توجہ عالی صاحب کی طرف ہوگی کہ وہ یہ کیا کر رہے ہیں۔

عالی صاحب نے اپنے کالم میں ساقی فاروقی کا بھی ذکر کیا ہے۔ ساقی کے کلام کا بھی انگریزی میں ترجمہ شائع ہوا ہے۔ عالی صاحب نے اس ترجمے کے حوالے سے ساقی کی شاعری

کی کم اور ترجمہ کرنے والی خاتون فرانسس پریچٹ کے علم و فضل کی تعریف زیادہ کی ہے۔ حالانکہ یہ موقع موصوفہ کے علم و فضل سے زیادہ حوصلے کی تعریف کا تھا۔ فرانسس پریچٹ بڑی حوصلہ مند خاتون ہیں کہ انھوں نے پہلے ساقی کا کلام پڑھا اور پھر اس کا ترجمہ کیا۔ یہ ترجمہ ہماری نظر سے بھی گزرا ہے۔ انگریزی بھی کیا کمال کی زبان ہے کہ ساقی فاروقی اس میں منتقل ہو کر اچھا خاصا قد آور شاعر دکھائی دیتا ہے۔ افسوس کہ اُردو میں انگریزی زبان جیسی وسعت نہیں، ورنہ ساقی کا اصل اُردو کلام پڑھ کر بھی اس کے شاعرانہ قد و قامت کا اندازہ کیا جا سکتا تھا۔ اس مقصد کے لیے انگریزی ترجمے کی ضرورت نہ ہوتی۔

ساقی کے ذکر پر یاد آیا کہ پچھلے مہینے کے ''افکار'' میں مشفق خواجہ کا ایک خط چھپا ہے، جس میں انھوں نے ساقی کی ایک نظم کی مبالغہ آمیز تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے، ''اس نظم کو میں نے آٹھ مرتبہ پڑھا۔'' ہمیں یہ تو معلوم تھا کہ خواجہ صاحب کثیر المطالعہ ہیں، لیکن اب یہ معلوم ہوا کہ اُن کے مطالعے کا انداز اور معیار کیا ہے۔ ہم نے اس کثرت مطالعہ کا سبب معلوم کرنے کے لیے خواجہ صاحب سے رابطہ قائم کیا اور پوچھا کہ آپ نے کبھی غالب کی کسی غزل کو تو آٹھ مرتبہ نہیں پڑھا، ساقی کی نظم اتنی مرتبہ کیوں پڑھی؟ انھوں نے جواب دیا، ''غالب کے پڑھنے والے لاکھوں ہیں، ساقی کا پڑھنے والا میں اکیلا ہوں۔ مجھے دوسرے قارئین کا فرض بھی ادا کرنا پڑتا ہے۔''

ضمنی طور پر خواجہ صاحب نے بتایا کہ انھوں نے مدیر ''افکار'' کے نام خط نہیں لکھا تھا، یہ خط ساقی فاروقی کے نام ہے، جسے مدیر افکار نے نہ جانے کس طرح حاصل کر لیا اور اجازت کے بغیر قطع و برید کے بعد شائع کیا۔

(۱۴ر دسمبر ۱۹۸۹ء)

پختگیِ عمر اور پختگیِ فکر کا اعتبار کرنا ہی پڑتا ہے

آج کل ادبی حلقوں میں وضاحت نسیم کی شاعری ہی کی نہیں، اُن کی مہمان نوازی کی بھی بڑی دھوم ہے۔ اُن کے دیوان "خواب دریچے" کی تقریبِ رونمائی ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں منعقد ہوئی، جس کا اختتام عشائیے پر ہوا اور اس طرح یہ تقریبِ رونمائی، عشائیہ رونمائی کا روپ دھار کر ایک یادگار ادبی واقعہ بن گئی۔ یہ مقولہ غلط ثابت ہو گیا کہ شاعری سے کسی کا پیٹ نہیں بھرتا، ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ دو سو سے زیادہ افراد کے لیے شاعری شکم سیری کا وسیلہ بنی۔

اس تقریب کے صدر عالی صاحب تھے۔ انھوں نے اپنے صدارتی خطبے میں فرمایا، وضاحت نسیم نے عشائیے کا اہتمام کر کے تقریب کا جو اونچا معیار قائم کیا ہے، اُس نے دوسرے شاعروں کے لیے مشکلات پیدا کر دی ہیں۔ پچیس تیس ہزار روپے خرچ کرنا ہر شاعر کے بس کی بات نہیں۔ اب لوگ ایسی تقاریبِ رونمائی میں شرکت نہیں کریں گے، جن میں عشائیے کا اہتمام نہ ہو۔

ہمیں عالی صاحب کے ارشاداتِ عالیہ سے اتفاق نہیں ہے۔ وضاحت نسیم بڑی سمجھ دار خاتون ہیں، انھیں اس کا احساس تھا کہ شرکائے جلسہ تین چار گھنٹے تک ان کی تعریفیں سنیں گے، اس زحمت کی کچھ تو تلافی ہونی چاہیے۔ وہ چاہتیں تو عشائیے کی بجائے شرکاء کو اپنے دیوان کا ایک ایک نسخہ دے کر بھی احسان اتار سکتی تھیں، لیکن انھیں معلوم تھا کہ کسی کو اپنا دیوان دینا، مزید زیر بار کرنے کے مترادف ہے۔ جو لوگ شاعرہ کی تعریفیں سن سن کر نڈھال ہو چکے ہوں، اُن کے لیے دیوان کا بوجھ اٹھانا مشکل ہوگا۔ عشائیے کا اہتمام کر کے دراصل انھوں نے شرکائے جلسہ کا غم غلط کرنے کی کوشش کی ہے، جس کے لیے وہ مبارکباد کی مستحق ہیں۔

رہی یہ بات کہ وضاحت نسیم نے تقریب کا اونچا معیار قائم کر کے دوسرے شاعروں کے لیے مشکلات پیدا کر دی ہیں، تو یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے، جو قابلِ اعتراض ہو۔ ہمارے شاعر اگر

شاعری کا معیار اونچا نہیں کر سکتے تو کم از کم انھیں تقاریبِ رونمائی کا معیار ضرور اونچا کرنا چاہیے، تا کہ ان کی ادبی زندگی میں کہیں تو اونچائی نظر آئے۔

عالی صاحب نے تقریب کے اخراجات کے حوالے سے دوسرے شاعروں کی مشکلات کا اندازہ کر لیا، لیکن وضاحت نسیم کی شاعری سے دوسرے شاعروں کے لیے جو مشکلات پیدا ہوں گی، اُن کا انھیں احساس نہیں ہوا۔ وضاحت نے شاعری کا جو معیار پیش کیا ہے، دوسرے شاعروں کے لیے اس معیار تک پہنچنا بھی تو مشکل ہوگا اور کسے معلوم اس معیار تک پہنچنے میں خود شاعرہ کو کتنی مشکلوں سے گزرنا پڑا ہوگا اور ان کے قارئین کی مشکلوں کا اندازہ کرنا تو ہمارے لیے ممکن ہی نہیں، کیونکہ خوش قسمتی سے ہم نے وضاحت نسیم کا دیوان نہیں پڑھا۔

وضاحت نسیم کی شاعری کے بارے میں ہم نے جو اچھی رائے قائم کی ہے، اُس کی ایک وجہ تو عشائیے میں شرکت ہے۔ کھانا نہایت عمدہ تھا، جو شاعرہ اتنا اچھا کھانا کھلا سکتی ہیں، وہ یقیناً شعر بھی اچھے کہتی ہوں گی۔ دوسری وجہ تقریب میں تقسیم ہونے والا وہ مجلّہ ہے جس میں احمد ندیم قاسمی، ظہیر کاشمیری، شہرت بخاری اور شہزاد احمد جیسے اساتین ادب نے نہایت فراخ دلی کے ساتھ وضاحت نسیم کی شاعری کے بارے میں ویسی ہی باتیں لکھی ہیں، جیسی عبدالرحمٰن بجنوری نے غالب کے بارے میں لکھی تھیں۔ فرق یہ ہے کہ بجنوری نے جب یہ مشہور مقالہ "محاسنِ کلامِ غالب" لکھا تھا تو ان کی عمر ۲۵-۲۶ برس کی تھی۔ مذکورہ حضرات میں سے کوئی ساٹھ برس سے کم کا نہیں۔ ظاہر ہے پختگیِ عمر اور پختگیِ فکر کا اعتبار کرنا ہی پڑتا ہے۔

جلسے میں مقررین کی ایک فوجِ ظفر موج موجود تھی۔ بعض نے محض لفاظی کی اور بعض نے اپنا سارا علم اسی محفل میں خرچ کر دیا اور یوں دامن جھاڑ کر اٹھے جیسے اُن کے سر سے کوئی بوجھ اتر گیا ہو۔ اپنے سر کا بوجھ دوسروں کے سروں پر ڈال دینا بھی ایک کمال ہے۔ احمد ہمدانی کا مقالہ اتنا فکر انگیز تھا کہ اکثر سامعین فکر و تشویش میں مبتلا ہو گئے۔ ہلکی پھلکی تقریروں میں ثقیل مقالے پڑھنا، ہمدانی صاحب کی ادائے خاص ہے۔ وہ گوشہ نشین آدمی ہیں، لیکن لوگ انھیں گھیر گھار کر جلسوں میں لے جاتے ہیں۔ یہ بات ہمدانی صاحب کے مزاج کے خلاف ہے، لہٰذا وہ اپنے غصے کا اظہار مقالے کی صورت میں کرتے ہیں۔ کسی کتاب کی رونمائی کے موقع پر وہ جو مقالہ پڑھتے ہیں، وہ اتنا سنجیدہ ہوتا ہے کہ معمولی لفظی تبدیلی کے بعد کسی تعزیتی جلسے میں بھی پڑھا جا سکتا ہے۔

مشہور انشاء پرداز ذاکر علی خاں قلم ہی کے نہیں، زبان کے بھی دھنی ہیں۔ اُن کی خوش گفتاری بے مثال ہے۔ وہ دوسروں کی طرح گھر سے مضمون لکھ کر نہیں لائے تھے، کیونکہ گھر میں انھیں مفید اور معقول کام کرنے کی عادت ہے۔ انھوں نے فی البدیہہ جو کچھ ارشاد فرمایا، اُس سے ثقیل مقالوں کی پیدا کردہ سرد بازاری ختم ہوئی اور محفل میں گرما گرمی کے آثار نظر آئے۔ خاں صاحب نے وضاحت کی شاعری کی خوب تعریف کی اور آخر میں فرمایا، ''میں نے پیشگی حق نمک ادا کر دیا ہے۔'' عشائیے کے حوالے سے یہ بات درست ہو سکتی ہے، لیکن شاعری کے حوالے سے درست نہیں۔ وضاحت نسیم کی شاعری تو کانِ نمک ہے، اس کا حق اُس وقت تک ادا نہیں ہو سکتا، جب تک پڑھنے والا...... ہر کہ در کانِ نمک رفت نمک شد...... کے مصداق خود نمک نہ بن جائے۔ مطلب یہ ہے کہ وضاحت کی شاعری میں ایسا جادو ہے کہ پڑھنے والا دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتا ہے۔ ''خواب دریچے'' کا کوئی صفحہ ایسا نہیں کہ دامن کشِ دل نہ ہو۔ یہاں تک کہ شروع اور آخر کے خالی صفحات بھی پڑھنے والے کو بے حد متاثر کرتے ہیں۔

ذاکر علی خان کے بعد منظر علی خان منظرِ عام پر آئے۔ ایک ''خان'' کے بعد دوسرے ''خان'' کے آنے سے محفل 'ذخیرۃ الخوانین' قسم کی چیز بن گئی، بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ یہ تقریب، طنز و مزاح کا نثری مشاعرہ بن گئی (نثری نظم ہو سکتی ہے، تو نثری مشاعرہ کیوں نہیں ہو سکتا؟) منظر صاحب نے وضاحت کی شاعری کے بارے میں کچھ نہیں کہا، کیونکہ وہ خود اپنی شاعری سے اتنے سیراب ہو چکے ہیں کہ دوسروں کی شاعری ان کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ انھوں نے صرف شاعرہ کی شخصیت نگاری کی اور یہ بتایا کہ وہ بھی ان کی طرح بینکاری کے شعبے سے تعلق رکھتی ہیں۔ منظر صاحب نے بہت کوشش کی کہ موصوفہ شاعری سے پرہیز کریں، تاکہ بینکاری کو فروغ ہو، لیکن وہ اس مقصد میں کامیاب نہ ہوئے۔ ہمیں افسوس ہے کہ شاعری کے حوالے سے منظر صاحب کی یہ دوسری ناکامی تھی۔ پہلی ناکامی یہ تھی کہ خود شاعر بن گئے تھے اور وہ بھی اس طرح کہ شاعری ان کے لیے ذریعۂ عزت نہ بن سکی۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ پہلے ہی عزت دار تھے اور مزید عزت کی ضرورت تھی نہ گنجائش۔ بہر حال منظر صاحب کا یہ جذبہ قابلِ ستائش ہے کہ وہ خود جس برائی سے نہ بچ سکے، اس سے دوسروں کو بچانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔

منظر صاحب نے جب یہ دیکھ لیا تھا کہ وضاحت نسیم شاعری چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہیں، تو

یہ چاہیے تھا کہ وہ انھیں ان کے حال پر چھوڑ دیتے۔ لیکن منظر صاحب جب خلوصِ دل سے کسی کا دامن پکڑ لیتے ہیں، تو پھر چھڑانا مشکل ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اب انھوں نے مشورہ دیا کہ وہ اپنا دیوان چھپوا لیں۔ وضاحت نسیم نے یہ مشورہ فوراً قبول کر لیا کہ دیوان کی طباعت کا کام منظر صاحب نے اپنے ذمے لے لیا تھا۔ منظر صاحب کے مضمون کا بڑا حصہ شاعرہ کی شخصیت کی بجائے ان کے دیوان کی شخصیت کے بارے میں ہے۔ انھوں نے تفصیل سے بتایا ہے کہ کتابت سے لے کر جلد سازی تک کے مرحلے کس مشکل اور مستعدی سے طے کیے گئے۔ یہ منظر صاحب نے اس سلسلے میں جو محنت کی ہے، اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ جب جلد ساز نے کتابیں تیار کر دیں، تو انھیں منی ٹرک میں لادنے اور اُتارنے کا کام بھی منظر صاحب کو کرنا پڑا۔ وضاحت نسیم خوش قسمت ہیں کہ ان کو منظر صاحب جیسا مخلص کارکن ملا، ورنہ ان کی جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو اتنی محنت کے بعد، دیوان کو شاعرہ کی بجائے خود اپنے نام سے چھاپ لیتا۔

اگر منظر صاحب اُردو ادب کی تاریخ میں محض اس وجہ سے بھی یاد رکھے جائیں کہ انھوں نے وضاحت نسیم کا دیوان چھپوایا ہے، تو یہ خسارے کا سودا نہیں ہوگا۔ لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ منظر صاحب خود ہی اُردو ادب کی تاریخ لکھیں۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ جو شخص کسی دوسرے کے دیوان کے نسخے منی ٹرک پر لادنے اور اُتارنے کا کام کر سکتا ہے۔ وہ اُردو ادب کی تاریخ بھی لکھ سکتا ہے، کیونکہ یہ کام بھی بوجھ ڈھونے سے تعلق رکھتا ہے۔

(۲۱ردسمبر۱۹۸۹ء)

کتاب لکھنے کے لیے روشنائی، کاغذ اور سہوِ قلم کی تھوڑی سی مشق کی ضرورت ہوتی ہے

صبیح محسن نامور ادیب ہیں، اور اگر کسی کو ان کے نامور ہونے میں شبہ ہے تو وہ ہمارے اس کالم کی اشاعت کے بعد دور ہو جائے گا۔ ہمارا کالم کئی اخبارات و رسائل نقل کرتے ہیں، لہٰذا ہم اگر خدانخواستہ کوئی غلط بات بھی لکھ دیں، تو وہ مشہور ہو جاتی ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم نے صبیح محسن کے مشہور ہونے کے بارے میں جو بات کہی ہے وہ غلط ہے۔ اس کی وجہ غلط ہو سکتی ہیں، لیکن بات بالکل درست ہے۔ موصوف کی شہرت کی پہلی وجہ یہ ہے کہ ان کے لکھے ہوئے ڈرامے ٹی وی پر دکھائے جاتے ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ سالہا سال اُردو اور انگریزی اخباروں میں کالم نویسی اور مضمون نگاری کرتے رہے ہیں اور اب اس لیے نہیں کرتے کہ وہ جس اخبار میں لکھتے ہیں، وہ بند ہو جاتا ہے۔ اب کوئی ایسا اخبار نہیں رہا جو اُن کی جولانیٔ طبع کا متحمل ہو سکے۔ صبیح محسن کی شہرت کی تیسری اور بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ طنز و مزاح نگار ہیں۔ ان کی ایک کتاب ''بین السطور'' آٹھ نو سال پہلے چھپی تھی۔ ان کا بوجھ ابھی کم نہیں ہوا تھا کہ دوسری کتاب ''گر قبول افتد'' منظرِ عام پر آ گئی ہے۔

باقی باتیں بعد میں ہوں گی، پہلے ذرا ''بوجھ'' والی بات کی وضاحت ہو جائے۔ صبیح محسن اُردو کے وہ باکمال ادیب ہیں، جو اپنی کتابیں نہ صرف خود لکھتے ہیں، بلکہ چھاپتے بھی خود ہیں۔ پڑھتے بھی خود ہی ہوں گے، لیکن اس معاملے میں یقین کے ساتھ کچھ کہنا مشکل ہے۔ پڑھنے کے معاملے میں ان کا معیار بہت اونچا ہے، اس لیے قرینِ قیاس یہی ہے کہ وہ دوسروں کی کتابیں پڑھتے ہوں گے۔

کتاب لکھنا تو خیر کوئی غیر معمولی بات نہیں، کیونکہ اسکے لیے صرف دوات روشنائی، ایک

رِم کاغذ اور سہوِ قلم کی تھوڑی سی مشق کی ضرورت ہوتی ہے، لیکن کتاب چھاپنا دل گردے کا کام ہے، اس کے لیے سب سے پہلے بال بچوں کا حق مار کر رقم پس انداز کی جاتی ہے اور پھر اس رقم کو کاتب، کاغذ فروش، چھاپنے والے اور جلد ساز میں خیرات کی طرح تقسیم کیا جاتا ہے۔ اس نیکی کے بدلے میں چھپی ہوئی کتاب کا بوجھ ''گناہ کے بوجھ'' کی طرح وصول کیا جاتا ہے۔ کتاب کو جب فروخت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، تو معلوم ہوتا ہے، یہ گناہ ہی کا نہیں زمین کا بھی بوجھ ہے، کتاب کا اسٹاک گھر میں رکھنے کی گنجائش نہیں ہوتی اور کتب فروشوں اور خریداروں کے دل میں اتنی وسعت نہیں ہوتی کہ وہ مصنف کی غم خواری کر سکیں۔

صبیح محسن نے اپنی پہلی کتاب کو خود چھاپنے کا دردناک بلکہ عبرت ناک تجربہ ان لفظوں میں بیان کیا ہے:

''ہماری کتاب، جسے شائع ہوئے عرصہ گزر چکا ہے، اہلِ ذوق حضرات، احباب اور عزیزوں میں مناسب تعداد میں مفت تقسیم ہو چکی ہے، باقی کاپیاں...... (خریداروں) کے انتظار میں دیمک کی خوراک بن رہی ہیں۔ افسوس کہ ہمیں تو آج تک ایسا ایک شخص (خریدار) بھی نظر نہیں آیا، ورنہ ہم ضرور اسے پکڑ کر عجائب خانے والوں کے حوالے کر دیتے، تاکہ مصنف حضرات کم از کم اس کے دیدار سے آنکھوں کو ٹھنڈک اور دل کو سرور پہنچا سکیں۔ فی الحال تو ہم یہ سوچ رہے ہیں کہ اپنی کتاب کی باقی ماندہ کاپیاں ہی عجائب خانے میں رکھوا دیں، اور کچھ نہیں تو وہاں وہ دیمک سے محفوظ رہ سکیں گی۔''

صبیح محسن سے ہمیں دلی ہمدردی ہے، لیکن ان کی دو باتوں سے ہمیں اتفاق نہیں ہے۔ پہلی یہ کہ اگر انھیں کتاب کا کوئی خریدار مل جاتا تو وہ اسے پکڑ کر عجائب خانے والوں کے حوالے کر دیتے۔ خریدار، مصنف سے نیکی کرتا ہے، اس لیے وہ سزا کا نہیں شکریے کا مستحق ہے۔ ہماری رائے میں مناسب یہ ہے کہ خود مصنف کو اپنی کتاب کے اسٹاک کے ساتھ عجائب خانے میں بود و باش اختیار کر لینی چاہیے تاکہ وہ لوگ عبرت پکڑیں جو اپنی کتابیں خود چھاپنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

موصوف کی دوسری بات جس سے ہمیں اختلاف ہے، وہ یہ ہے کہ ان کی کتابوں کا اسٹاک عجائب خانے میں دیمک سے محفوظ رہے گا۔ ہم انھیں یقین دلاتے ہیں کہ عجائب خانے پر ہی

کیا موقوف، ان کی کتابیں جہاں بھی ہوں گی، دیمک سے محفوظ رہیں گی۔ کیونکہ خدا کی یہ مخلوق انسانوں کی طرح زبان کے چٹخارے پر جان دیتی ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ صبیح محسن نے اپنی پہلی کتاب کا جو نسخہ ہمیں دیا تھا، اسے ہم نے شیلف میں ابنِ انشا، اور کرنل محمد خان کی کتابوں کے درمیان رکھ دیا تھا۔ دیمک نے دائیں بائیں کی کتابیں چٹ کرلیں لیکن صبیح محسن کی کتاب کو ہاتھ نہیں لگایا، وہ بالکل محفوظ رہی۔

اس واقعے کے بعد ہم نے ماہرین سے مشورہ کیا، تو انھوں نے ہمارے ممدوح کی کتاب دیکھ کر کہا، اگر اس کتاب کا سرورق کسی دوسری کتاب پر لگا دیا جائے تو وہ بھی دیمک سے محفوظ رہے گی۔ کتاب دوستوں کو مژدہ کہ دیمک سے کتابوں کے بچاؤ کا طریقہ دریافت ہوگیا ہے۔ صبیح محسن کو بھی خوش ہونا چاہیے کہ ان کی کتاب کے نہ سہی، کتاب کے ٹائٹل کی فروخت کے امکانات روشن نظر آتے ہیں۔

معاف کیجیے، ہم صبیح محسن کی پہلی کتاب کے ذکر میں دور تک چلے گئے حالانکہ ہمارا آج کا موضوع ان کی دوسری کتاب ''گر قبول افتد'' ہے۔ یہ نہایت دلچسپ طنزیہ و مزاحیہ مضمونوں اور تمثیلچوں کا مجموعہ ہے۔ کرنل محمد خان نے اس کتاب کو ان لفظوں میں سراہا ہے:

''صبیح محسن کی رواں دواں خودرَو تحریر میں قاری کو تین خوبیوں کا قدم قدم پر احساس ہوتا ہے۔ زبان کی پختگی، لہجے کی شائستگی اور فکر کی شگفتگی......''

اس رائے میں کچھ اضافہ کرنا ہمارے لیے ممکن نہیں، گو بات بڑی حد تک مبہم ہے۔ کرنل صاحب نے یہ تو بتا دیا ہے کہ وہ کونسی تین خوبیاں ہیں، جن کا احساس ہوتا ہے۔ لیکن یہ نہیں بتایا کہ ان خوبیوں کی موجودگی کا احساس ہوتا ہے یا عدم موجودگی کا۔ ہم چونکہ ہر چیز کا روشن پہلو دیکھنے کے عادی ہیں، اس لیے تصور کر لیتے ہیں کہ کرنل صاحب کی مذکرہ خوبیوں کی موجودگی ہی کا احساس ہوا ہوگا۔ کرنل صاحب واقعی بڑے حساس ہیں!''

کرنل صاحب سے ہمیں ایک چھوٹی سی شکایت یہ بھی ہے کہ انھوں نے صبیح محسن کی تحریر کو ''خودرَو'' کہہ کر ان کی محنت پر پانی پھیرنے کی کوشش کی ہے۔ ''خودرَو'' اُن پودوں کو کہا جاتا ہے جو خود بخود اور ایسی جگہ پر اُگتے ہیں جہاں ان کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جب کہ صبیح محسن ایک ایک لفظ پر اس طرح توجہ دیتے ہیں، جیسے کوئی تجربہ کار مالی گلاب کے پودوں کی نگہداشت کرتا ہے۔ اس

لیے ہم ان کی تحریر کو خودرَو نہیں کہیں گے۔ ہاں، خودکار کہا جاسکتا ہے۔ صبیح محسن صاحب جس مضمون کی تمہیدی سطور لکھنے میں محنت کرتے ہیں، آگے کا کام ان کی تحریر کی روانی خود کر لیتی ہے۔

یوں تو اس مجموعے میں شامل سارے مضامین پڑھنے کے لائق ہیں، لیکن ہمیں ''نوشتۂ گردپوش'' بہت پسند آیا۔ اس میں انھوں نے فلیپ نگاروں کو کھری کھری سنائی ہیں۔ مگر فلیپ لکھوانے والوں کو کچھ نہیں کہا۔ حالانکہ تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی۔ صبیح محسن نے ثابت کر دیا ہے کہ تالی ایک ہاتھ سے بھی بجائی جاسکتی ہے، بشرطیکہ دوسرے ہاتھ کی جگہ فلیپ نگار کا سر استعمال کیا جائے۔ فلیپ نگاروں کے اس قدر خلاف ہونے کے باوجود موصوف نے اپنی پہلی کتاب پر کئی لوگوں سے فلیپ لکھوائے تھے اور زیرِ نظر کتاب پر بھی مشفق خواجہ سے فلیپ لکھوایا ہے۔ مشفق خواجہ کی سادگی دیکھیے کہ صبیح محسن کا مذکورہ مضمون پڑھنے کے بعد بھی فلیپ لکھ دیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ طرفین فلیپ لکھوانے اور لکھنے کی عادتوں میں اس حد تک پختہ ہو چکے ہیں کہ ان پر اب کسی بات کا اثر نہیں ہوسکتا۔

صبیح محسن اپنے مذکورہ مضمون میں لکھتے ہیں:

''ہم نے کبھی کبھی یہ بھی دیکھا ہے کہ مصنف اگر گمنام ہے تو فلیپ نگار اس سے کچھ زیادہ ہی بے نام ہے۔ یہ صورتِ حال اس وقت پیش آتی ہے، جب صاحبِ کتاب، ادب سے کچھ گیا گزرا ہو، ویسے بھی کسی طرح کا فیض پہنچانے کی استطاعت نہ رکھتا ہو۔ ایسے شوق کے مارے ہوئے لاچار مصنفین جب بوجوہ عظیم فلیپ نگاروں تک رسائی حاصل نہیں کر پاتے تو پھر کسی ہما شما سے رائے لکھوا لیتے ہیں۔''

اس کے باوجود ''ہما شما''، یعنی مشفق خواجہ نے جو فلیپ لکھا ہے، وہ یہ ہے:

''ستم ظریف اسے کہتے ہیں، جو ظرافت کے پردے میں ستم کرتا ہے۔ آپ اسے صبیح محسن بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس کا ثبوت آپ کے ہاتھ میں ہے۔ اس کتاب میں شامل جتنی بھی تحریریں ہیں، وہ بظاہر طنزیہ و مزاحیہ ہیں، لیکن بباطن بہت المناک حقیقتوں کی عکاسی کرتی ہیں۔ قاری انھیں پڑھنے کے دوران خوش ہوتا ہے، کبھی زیرِ لب مسکراتا ہے اور کبھی قہقہے لگاتا ہے۔ اور جب کسی تحریر کے خاتمے تک پہنچتا

ہے تو ایک دم سنجیدہ ہو کر سوچنے لگتا ہے، جو کچھ لکھا گیا تھا، وہ ہنسانے کے لیے تھا یا رُلانے کے لیے۔ لیکن صبیح محسن نہ ہنساتے ہیں نہ رُلاتے ہیں۔ وہ تو ہنسی ہنسی میں قاری کو کچھ اہم اور سنجیدہ مسائل پر سوچنے کی دعوت دیتے ہیں۔ کچھ مسائل ہماری روزمرہ زندگی سے تعلق رکھتے ہیں اور کچھ ہمارے ادب سے۔ صبیح محسن کو جہاں کہیں اونچ نیچ نظر آتی ہے، اسے اپنے شگفتہ اُسلوب سے نمایاں کر دیتے ہیں۔ صبیح محسن کے ستم ظریف ہونے کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ انھوں نے ایک خوبصورت مضمون فلیپ نگاروں کے خلاف لکھا ہے۔ یہ مضمون لکھنے کے بعد انھوں نے مجھ سے اپنی کتاب کا فلیپ لکھنے کے لیے کہا۔ میری سادگی دیکھیے کہ میں نے یہ مضمون پڑھنے کے باوجود فلیپ لکھ دیا۔ خدا ہم دونوں کے گناہ معاف فرمائے!"

اور اب ہم یہ سوچ رہے ہیں کہ مشفق خواجہ نے جو لکھا ہے، وہ ہنسانے کے لیے ہے یا رُلانے کے لیے!

(یکم فروری ۱۹۹۰ء)

مشفق خواجہ نے خامہ بگوش کے روپ میں جرأت رندی سے لکھا، قلم سے نوکِ سناں کا کام لیا اور ایک لازوال کردار، استاد لاغر مراد آبادی بھی پیدا کیا جو مشفق خواجہ کا ہمزاد تھا لیکن ادبی معاشرے کی ناہمواریوں کو چشمِ نگراں سے دیکھتا اور ان پر بے لاگ تبصرہ کرنے کا کوئی موقع فروگزاشت نہیں کرتا تھا۔ مشفق خواجہ (خامہ بگوش) اب ہم میں موجود نہیں لیکن "خامہ بگوش کے قلم سے"......"سخن در سخن"......اور "سخن ہائے ناگفتنی" جیسی کتابوں کی وجہ سے وہ ادب کی دنیا سے کبھی غیر حاضر شمار نہیں ہوں گے اور بیسویں صدی میں نثر کے مزاح نگاروں...... رشید احمد صدیقی، شوکت تھانوی، ابنِ انشاء، ابراہیم جلیس، مجید لاہوری، کنہیا لعل کپور، مجتبیٰ حسین، یوسف ناظم، شفیق الرحمٰن...... محمد خالد اختر، کرنل محمد خان، سید ضمیر جعفری اور مشتاق احمد یوسفی کے ساتھ زندہ رہیں گے۔

متذکرہ تین کتابیں جناب مظفر علی سید کی نظرِ انتخاب کا نتیجہ تھیں اور مشفق خواجہ صاحب کی زندگی میں اشاعت کی منزل سر کر چکی تھیں۔ ان کی وفات کے بعد جناب خواجہ عبدالرحمٰن طارق نے ان کے تمام کالموں کی تلاش و جستجو کا فریضہ انجام دیا۔ ایک مجموعہ "سخن ہائے گسترانہ" کے عنوان سے شائع کیا جس کا پیش لفظ لکھنے کا شرف مجھے حاصل ہوا۔ طارق خواجہ صاحب نے ہی مجھے "مرتب" کے اعزاز سے بھی سرفراز فرمایا۔ "سخن در سخن" کے سلسلے کی پانچویں کتاب اب پیش کی جا رہی ہے تو میں اس افتخار پر نازاں ہوں کہ اس کا پیش لفظ لکھنے کے لیے بھی مجھے منتخب کیا گیا۔ مجھے اپنے محسن دوست مشفق خواجہ کے ساتھ مزید وقت گزارنے کا موقع دیا گیا۔ حق تعالیٰ ان کی مغفرت کرے۔ آمین

ڈاکٹر انور سدید

Rs. 395/-

ISBN-13: 978-969-8917-54-8
ISBN-10: 969-8917-54-3

9789698917547

www.poorab.com.pk